داستانِ دہقان

یا

پنجاب کے دیہات میں نئی اور پرانی روشنی

ایم ۔ ایل ۔ ڈارلنگ (مصنف پنجابی کسان)

پنجاب کوآپریٹو یونین لاہور

داستانِ دہقان

یا

پنجاب کے دیہات میں نئی اور پرانی روشنی

ایم - ایل - ڈارلنگ (مصنف پنجابی کسان)

"ہندوستان کے اندر آ۔ اس کی برائی اور بھلائی سب قبول کر اگر اسمیں کوئی عیب
ہو۔ تو اصلاح کی کوشش کر اور اس کا اندرونی علاج کر۔ لیکن پہلے
اسے خود اپنی آنکھ سے دیکھ لے۔ سمجھ لے غور کر لے۔ اسکی طرف متوجہ ہو
جا اور اسکے ساتھ ایک ہو جا"

رابندرناتھ ٹیگور

پنجاب کوآپریٹو یونین لاہور نے شائع کیا

بنام: —

رفیقۂ حیات

ایم۔ایل ڈارلنگ

فہرست مضامین

داستانِ دہقان

کہاں سے لائے گا قاصد دہن میرا زباں میری
یہی بہتر ہے خود مجھ سے وہ سن لیں داستاں میری

زیب عنوان کتاب مسٹر ایم۔ ایل۔ ڈارلنگ صاحب فائننشل کمشنر (سابق رجسٹرار انجمن ہائے امداد باہمی پنجاب) کے زورِ بیان و دور رس نگاہ اور نکتہ سنج طبیعت کا ایک روشن کرشمہ اور شاہکار ہے۔ آپ نے ۳ دسمبر سے شروع کر کے ۱۷ مارچ تک دیہات پنجاب کی سیاحت فرمائی۔ آپ نے ہوشیارپور۔ انبالہ۔ کرنال۔ گوڑگاؤں۔ جالندھر۔ لائل پور۔ جھنگ۔ ملتان۔ مظفرگڑھ واٹک کے متعدد دیہات کا معائنہ فرمایا۔ آپ نے دیہاتی زندگی کے ہر پہلو پر گہری نگاہ ڈالی آپ نے ہر قماش ہر روش اور ہر خیال کے انسانوں سے تبادلۂ خیالات کیا۔ حالات کا صحیح جائزہ لینے اور واقعی معلومات حاصل کرنے کیلئے آپ نے ہر ملنے والے سے معنی خیز سوالات کئے۔ آپنے اہل دہ کے اعمال و افکار کی نسبت پورے علم اور سچی بصیرت سے بہرہ اندوز ہونے کیلئے دہقانوں سے انکی داستان خود انکی زبانی سنی۔ آپنے ساہوکاروں۔ دینی پیشواؤں۔ پجاریوں گرنتھیوں۔ پیروں۔ زمینداروں۔ کاشتکاروں۔ کمیوں۔ وغیرہ کی زندگی کے اُتار چڑھا کا قریب ہو کر مطالعہ کیا۔ آپنے صنفِ نازک کے احوال سے آگاہی حاصل کرنیمیں ہر مناسب ممکن اور جائز کوشش سے کام لیا۔ اور ان کے خیالات معلوم کئے۔ مختصر یہ کہ دیہاتی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو آپ کی آنکھوں سے اوجھل رہ گیا ہو۔ معمولی سمجھ کا انسان بھی خرمن سے چند دانے اٹھا کر اور انہیں دیکھ بھال کر سارے ڈھیر کے متعلق جچی تلی رائے قائم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ مسٹر ڈارلنگ تو حقائق شناس ہونے میں ایک مسلمہ شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ تحریک امداد باہمی کے مشہور و معروف رہبر اور فلسفہ امداد باہمی کے روشن ضمیر فاضل اور عالم ہیں۔ آپ کی فضیلتِ علمی اور قابلیت مسلمہ ہے۔ اس پر طرفہ یہ ہے۔ کہ آپ قلم کے دھنی اور انگریزی انشاء اور علم ادب میں مہارت خصوصی سے بہرہ ور ہیں۔ مختصر سی عبارت میں مطالب کی ایک دنیا کا نقشہ کھینچ کر رکھ دینا ایک ایسا وصف ہے جسمیں آپ خاص طور پر ممتاز ہیں۔ آپ نے متذکرہ مقامات میں جو کچھ دیکھا۔ سنا۔ یا جس کے

متعلق جو کچھ پوچھا یا بتایا۔ یا جو کچھ آپ کو دکھایا۔ سنایا۔ بتایا۔ یا جتلایا۔ یا سمجھایا گیا۔ آپ نے اسے تاریخ وار قلمبند فرمایا۔ اور لندن کی فضاؤں میں بیٹھ کر اور انڈیا آفس کی بے شمار مطبوعات سرکاری سے استفادہ کے بعد نومبر ۱۹۲۹ء بنام "رسٹیکس لوکیوٹر" ایک نادر کتاب مرتب فرمائی۔ یہ دونوں الفاظ جس مغربی زبان کے ہیں۔ اردو میں اسکا ترجمہ ہو سکتا ہے: "کسان کی کہانی کسان کی زبانی"۔ کتاب بے حد دلچسپ ہے۔ عبارت غایت درجے کی شستہ اور جاذب دل ہے۔ فاضل مصنف نے اس تصنیف میں ٹیمز کی دُھلی ہوئی زبان استعمال کی ہے۔ اور پنجاب کا مرقع کھینچ کر رکھدیا ہے۔ بہت ممکن ہے۔ کہ بعض حضرات کو مصنف کی بعض تصریحات سے اختلاف ہو اور وہ اپنی خامیوں کا حال پڑھ کر مضطرب اور مشتعل ہو جائیں۔ لیکن اس نوعیت کا اضطراب اور اشتعال نہ مفید ہوتا ہے۔ اور نہ معقول۔ مصنف نے سچی اور کھری باتیں مؤثر پیرائے میں بیان کر دی ہیں۔ ہم پنجابیوں کو چاہئے۔ کہ مبصر سیاح اور ہمدرد و محسن پنجاب افسر کا شکریہ ادا کریں۔ کہ انہوں نے ہمیں بتا دیا ہے کہ ہم کیا ہیں اور ہمیں کیا ہونا چاہئے۔ ہم نے کس حد تک اصلاح کر لی ہے۔ اور کتنی مزید اصلاح ہمیں درکار ہے۔ انہوں نے دکھایا ہے۔ کہ امداد باہمی کی تحریک نے پنجاب میں کیا انقلاب پیدا کیا ہے۔ اور اس نے دیہاتی معاشرت اور دیہاتی اقتصاد پر کیا اثر ڈالا ہے۔ مسٹر موصوف نے دیہات کی معروف و سرکردہ ہستیوں پر مفصل بحث کی ہے۔ اور انکی اچھائیوں اور برائیوں کو منصفانہ طریق پر سپرد قلم کیا ہے۔

ساہوکار

اس طویل سیاحت سے مصنف کے دل پر جو اثرات پیدا ہوئے۔ انہیں بہ نظر اختصار بدیں الفاظ واضح کیا جا سکتا ہے۔ پیشہ ساہوکارہ روز بروز کم ہو رہا ہے۔ اس کی جگہ روپے کا لین دین کرنے والا زراعتی ساہوکار لے رہا ہے۔ قانون انتقال اراضیات اس کی راہ میں بطور سنگ گراں حائل ہے۔ امداد باہمی کی تحریک نے دیہاتیوں کی تنظیم اور تعلیم کے ذریعے انہیں روپیہ کے صحیح استعمال کا گر سکھا دیا ہے۔ اور انہیں مفید اور غیر مفید قرضہ کے مضرات و فوائد سے آگاہ کر دیا ہے۔ تاہم جب تک زمیندار کو روپے کی حاجت ہے۔ اور ساہوکار کی تمام ضرورتیں امداد باہمی پوری نہیں کرتی زمیندار کا ساہوکار سے تعلقاً بے نیاز ہو جانا ممکن نہیں۔ دیہاتیوں کیلئے بنک ہائے رہن اراضیات کا وجود لازمی ہے۔ تاہم اگر دیہاتی کفایت شعار، دیانتدار اور معاملہ فہم ہو جائیں۔ مفید قرضہ لینے اور قرضہ وقت پر ادا کر دینے کے عادی ہو جائیں۔ تو وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

زمیندار

پنجاب میں زمیندار یا مالکان اراضیات کا اگرچہ اتنا اثر نہیں۔ جتنا کہ یو پی یا بنگال میں ہے۔ تاہم ان کی ہستی اعلےٰ درجے کی اہمیت رکھتی ہے۔ کاشتکار اسے اس کا تعلق ذاتی نوعیت کا ہے۔ کاشتکار کا سود و بہبود زمیندار سے وابستہ ہے۔ اور زمیندار کے وقار کا باعث کاشتکار ہے۔ پنجاب میں دنیا کے دیگر حصص کی مانند اچھے زمیندار بھی ہیں۔ اور برے بھی لیکن بحیثیت مجموعی قوم پر زمیندار کا وجود ساہوکار سے بڑھ کر ایک بوجھ کا حکم رکھتا ہے۔ زمیندار کا فرض ہے کہ اپنے آپ کو قرضے کی زنجیروں سے نجات دلائے۔ قرضہ کے بوجھ سے سبکدوش ہو جائے۔ اپنے مزارعین کی مالی ضروریات کا خود کفیل ہو۔ انہیں قرضہ لینے کیلئے ساہوکار کے ہاں جانے سے بچائے۔ ان کے جھگڑوں کا فیصلہ کرے۔ ان میں سر پھٹول نہ ہونے دے۔ انہیں اپنے طرزِ عمل سے یقین دلائے کہ انہیں نکالا نہیں جائے گا۔ انہیں ان کی روزی سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ یہ جاننا اس کا فرض ہے کہ محنتی اور جفاکش مزارعین کی جائز ضروریاتِ خورد و نوش پوری ہو رہی یا نہیں؟ اس کا گذارہ معقول ہے یا نہیں؟ اگر اس نے ان امور کی پرواہ نہ کی۔ تو اسے اپنے وقار سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اپنی ملکیت اور حیثیت کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔

نہ سنبھلو گے تو مٹ جاؤ گے پنجابی زمیندارو
تمہاری داستان تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

پیر

جو رابطہ مزارع کا مالک اراضی سے ہے۔ وہی مرید کا پیر سے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اول الذکر کی نوعیت جسمانی اور آخر الذکر کی روحانی ہے۔ پرانے پیر وسط ایشیا سے یہاں آئے۔ یہ لوگ نیک تھے۔ صحیح معنوں میں روحانی پیشوا تھے۔ ان کا منصب اصلاح تھا۔ وہ رسمی پیری مریدی سے کوسوں دور تھے۔ لیکن جو پیر پیری مریدی کر رہے ہیں۔ تعویذ بیچتے ہیں۔ اور نذرانے وصول کرتے ہیں۔ ان کا وجود صوبہ پنجاب کیلئے اقتصادی مصیبت اور روحانی آفت کا حکم رکھتا ہے۔ ان کے اقتدار کی عمارت مریدوں کی جہالت اور وہم پرستی کی ریگ پر کھڑی ہے۔ انہیں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ جس عمارت کی بنیاد کمزور ہو۔ اس کا قیام چند

دنوں کا مہمان ہے۔ کاٹھ کی ہنڈیا زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رہ سکتی۔

ملّاں اور پُجاری

پنجاب میں ان کی تعداد بھی بے شمار ہے۔ اکثر ملّاں ایسے ہیں جنہیں قرآن مجید کی صرف چند سورتیں آتی ہیں۔ انہیں قرآن مجید کا ترجمہ نہیں آتا۔ وہ ان پڑھ ہیں۔ ایسے ہی ہندوؤں کے مندروں میں اکثریت ان پجاریوں کی ہے جو علم سے بے بہرہ ہیں۔ لوگوں پر ان کا اثر کیا ہو سکتا ہے۔ اور وہ عامتہ النّاس کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟

پنجاب کواپریٹو یونین لاہور

متذکرہ کتاب بہر نوع کارآمد ہے۔ اور ان میں جن شخصیتوں پر بحث کیگئی ہے۔ پنجاب میں ان کے وجود کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی اصلاح سے کل ملک کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ پنجاب کواپریٹو یونین لاہور کا یہ کارنامہ بھی قابلِ صد تشکر ہے۔ کہ اس نے جہاں متعدد انگریزی کتابوں کا ترجمہ شائع کیا ہے۔

زیرِ بحث کتاب کا ترجمہ بعنوان "داستانِ دہقان" شائع کیا ہے۔ اس کتاب کو اردو زبان کا لباس مسٹر عنایت اللہ صاحب بی۔ اے نے پہنایا ہے۔ مسٹر موصوف نے ترجمہ خاص محنت سے کیا ہے۔ اس فصیح و بلیغ تالیف کا ترجمہ آسان نہ تھا۔ لیکن فاضل مترجم اپنے پیشِ نظر مقصد میں شایانِ شان طریق پر کامیاب ہوئے ہیں۔ جس کیلئے میں بہ حیثیت مصلحِ ان کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ امید ہے۔ کہ خواندہ پنجابی اس کتاب کو خاص قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ اور جو اصحاب امداد باہمی یا اصلاح دیہات کا فریضہ سر انجام دے رہے ہیں۔ وہ فاضلِ مصنف کے تجربات و معلومات سے حظِ وافر حاصل کریں گے۔

"ایڈیٹر کواپریشن"

دیباچہ

اس کتاب میں یہ کوشش کیگئی ہے۔ کہ دیہاتی زندگی کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے جن پر میری پہلی تصنیف "پنجابی کسان قرض اور خوشحالی" میں سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ یا جنکو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مثلاً کسان کا جاگیردار۔ پیر۔ ملّا۔ اور پروہت کے ساتھ تعلق۔ معاش کے امدادی ذرائع۔ کاشتکاری میں نئی ترقیاں۔ عورتوں کی مجلسی اور اقتصادی حالت۔ نقل مکانی۔ گھر بنانا اور دیہات میں روشنی و صفائی کا خیال۔ دیہاتی طبقہ چھوت چھات اور تجدید دیہات۔ کتاب یوں لکھی گئی کہ گذشتہ موسم سرما میں بحیثیت رجسٹرار انجمنہائے امداد باہمی سرکاری فرائض بجالانے کے لئے میں نے گھوڑے کی پیٹھ پر ایک وسیع دورہ کیا جسکا اولین مدعا یہ تھا کہ امداد باہمی دیہات میں کہاں تک ترقی کر رہی ہے۔ دورے کو اس لحاظ سے ترتیب دی گئی کہ مجھے صوبے بھر کے سرسری حالات معلوم ہو جائیں۔ اسی لئے دورے کے درمیان میں ہمالیہ کے دامن میں نیم پہاڑی خطے میں سے۔ اس علاقے میں سے جو راجپوتانہ اور ہندوستان کی حدود بناتا ہے۔ ستلج اور بیاس کے درمیان اچھی طرح کاشت کئے ہوئے لیکن گنجان آباد حصے میں سے۔ لائل پور کی خوشحال نہری نو آبادی میں سے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ کے خشک اور مقابلتاً قدیم علاقے میں سے اور آخرکار شمالی بلند سطوح میں سے گذرا جنکا رخ سرحد کی طرف ہے۔ اس کے دو حصے ہو گئے اور زبان اور کسی حد تک آب و ہوا کی تقسیم کا لحاظ رکھتے ہوئے میں نے ایک کو مشرقی اور دوسرے کو مغربی پنجاب کہا۔

اسی دوران میں اس خیال سے کہ دیہاتی کی فلاح کی تمام تجاویز میں سے یہ اولین اور ناگریز ہے۔ میں نے یہ تحقیق کرنے کی کوشش کی کہ وہ ہر مسئلے کے متعلق کیا سوچتا ہے۔ اور کیا کرتا ہے۔ اور چونکہ یہ تمام امور گاؤں در گاؤں بہم پہنچائے گئے ہیں۔ اس لئے اس کتاب کا نام "داستان دہقان" رکھا ہے۔ اور دوسرا نام مجھے ان دیہاتیوں نے سمجھایا ہے جنہوں نے بار بار نئی اور پرانی تہذیب کا ذکر کیا ہے۔

رہی کتاب کی طرزِ تحریر سو آرتھر ینگ کہتا ہے۔ کہ سفرنامہ لکھنے کے دو طریق ہیں۔

سفر کا حال بجلسہ درج کیا جائے۔ یا اسکا نتیجہ سپرد قلم کیا جائے۔ میں نے سفر کا حال بجلسہ درج کر کے اور اُن اثرات کا خلاصہ درج کر کے جو اس سفر نے میرے دماغ پر ڈالے دونو طریقوں کو ملانے کی کوشش کی ہے۔ اگر سوائے چند منتشر حوالہ جات کے موجودہ زمانے کے سیاسی مسائل کی نسبت کچھ نہیں لکھا گیا تو وہ اس وجہ سے ہے کہ وہ دیہاتی کے لئے کچھ زیادہ دلچسپی کا باعث نہیں دریافت کرنے پر غالباً وہ سر رابندرا ناتھ ٹیگور کا یہ قول پیش کرے گا۔ کہ ہندوستان میں ہمارا حقیقی مسئلہ سیاسی نہیں ہے۔ بلکہ معاشرتی ہے۔ ہندوستانی کسان سیاسی صورتوں کی نسبت کسی زیادہ دیرپا چیز کا امیدوار ہے۔ وہ زندگی کے ایک ایسے طریق کو پیش کرتا ہے۔ جو اتنا ہی پرانا ہے۔ جتنی کہ خود تہذیب اگرچہ زندگی آب و ہوا۔ قومیت۔ مذہب اور زمانہ کے لحاظ سے اختلاف رکھتی ہے لیکن پھر بھی اسکی تہ میں ایک ایسا اتفاق ہے جو ہر جگہ کسانوں کو بھائی بھائی بنا دیتا ہے۔ اس لئے ایک ملک میں دیہاتی کو سمجھ لینا اسے دوسرے دوسرے ملک میں سمجھنے کیلئے مقدمہ کا کام دیتا ہے۔ اور قریب قریب یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ مشرق و مغرب کی درمیانی کڑی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس زنجیر کی بھی سب سے مضبوط کڑی ہے۔ جو مختلف زمانوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتی ہے۔ جو کچھ ایک لاطینی مصنف نے ۱۵۰۰ سال پیشتر اس کے متعلق لکھا وہی کچھ آج بھی "پنجابی کسان" کے متعلق لکھا جا سکتا ہے۔ وہ دیہاتی جو کھلے آسمان کے نیچے محنت کے ہاتھوں پرورش پاتے ہیں۔ دھوپ کو صبر سے برداشت کرتے ہیں۔ سائے کی پرواہ نہیں کرتے۔ خوشی سے ناآشنا۔ خیالات میں سادہ اور تھوڑی چیز پر شاکر ہوتے ہیں۔ ان کے اعضا ہر قسم کی مشقت کو برداشت کرنے کے لئے مضبوط اور دیہاتی طریق پر تلوار چلانے۔ خندق کھودنے اور بوجھ اٹھانے کے خوب عادی ہوتے ہیں۔

آخر میں میں اس تمام کام کا شکریہ کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں۔ جو ان ممبران انجمن امداد باہمی نے انجام دیا جن سے میں اس دورے کے دوران میں ملا اور جس سے میرے راستے میں بہت سہولت پیدا ہو گئی۔ اور ساتھ ہی اس بڑی اعانت کا بھی معترف ہوں۔ جو فراہم کی ہوئی اطلاعات کے مشتبہ امور کی آخری تصحیح کیلئے بہم پہنچائی گئی۔ میں نے اس امر کے لئے مقدور بھر کوشش کی ہے۔ کہ میں جن لوگوں سے راستے میں ملا ہوں۔ ان کے احساسات کا پورا پورا ممکن لحاظ رکھ کر لکھوں۔ اور میں امید کرتا ہوں۔ کہ اگر نادانستہ

طور پر کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ تو یہ یقین کیا جائے گا۔ کہ وہ ارادۃً نہیں کیگئی۔ دوسری طرف میں ان
تمام متعلقہ لوگوں کے اس صبر و خوش اخلاقی کو نہایت ہی پسندیدہ نظر سے دیکھتا ہوں
جو انہوں نے میرے بے شمار سوالات کے جوابات دینے میں ظاہر کی۔ میرے خاص شکریہ
کے مستحق میرے پرانے رفیق مسٹر سی۔ ایف سٹر کلینڈ آئی۔ سی۔ ایس (ریٹائرڈ) ہیں۔
جنہوں نے مہربانی فرماکر اس کتاب کے پہلے دو حصوں کا مطالعہ فرمایا۔

کیمبرج

۱۶ نومبر ۱۹۲۹ء

فصلِ اوّل مشرقی پنجاب

بابِ اوّل ہوشیار پور۔ تحصیل اُونہ شادیاں۔ تعلیم اور ہندو دھرم

۲ر دسمبر گورداسپور سے مُکیریاں

عبور دریائے بیاس:۔ آج بعد از دوپہر میں ایک کرایہ کی گھوڑی پر سوار ہو کر کرتال کی طرف روانہ ہُوا۔ جو یہاں سے تقریباً ۲۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ گھوڑی اتنی سست اور لاغر ہے۔ کہ بظاہر یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ میں کبھی بھی وہاں پہونچ سکوں گا غروب آفتاب کے وقت ہم دریائے بیاس پر پہنچے اور دولہ دھار کا خوشنما منظر دیکھا۔ یہ بڑی فصیل نقشے پر تو صرف کانگڑے کو چنبہ سے علیحدہ کرتی ہے۔ لیکن دراصل آسمان کو زمین سے جدا کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ میدانی زمین سے پندرہ ہزار فٹ اونچے اٹھ کر یہ دیوار) ثریّا سے باتیں کرتی نظر آتی ہے۔ دریائے بیاس بھی ہمیں بہادروں کی یاد دلاتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ دریا تھا۔ جس نے سکندر اعظم کو روک لیا تھا۔ وہ تین دن تک اپنے سپاہیوں کو مہم پر آگے بھیجنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن یہ جولائی کا مہینہ تھا یعنی موسم گرما کا عین وسط جبکہ بڑے بڑے بہادروں کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ دریا یکے بعد دیگرے عبور کئے گئے۔ پہلے سندھ اور پھر جہلم۔ چناب اور راوی بسرعت عبور کئے گئے تمام طغیانی پر تھے۔ اور جہلم مُنہ زور تندی پر۔ ہر شخص اس حالت کا اچھی طرح تصوّر کر سکتا ہے۔ جبکہ تھکے ماندہ اور پسینہ پسینہ ہوئے ہوئے (لوگوں نے) یہ دیکھا کہ ابھی ایک اور دریا کو پیچھے چھوڑنا ہے۔ اور اس طرح واپسی کو زیادہ خطرناک بنانا ہے۔ تو کس طرح اُن کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ اور سب نے متفقہ طور پر آگے جانے سے انکار کیا۔ آج دریا میں پانی اُتنی اعتدال سے تھا۔ جیسا کہ موسم سرما میں ہوا کرتا ہے۔ لیکن اس کی زنگار رنگ سطح پر

غروب ہوتے ہوئے آفتاب کا عکس پڑنے سے وہ نہایت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ یہ دریا ہمیشہ تمام دریاؤں سے زیادہ دلفریب ہوتا ہے۔ ہم نے اُسے اپنے ٹٹوؤں سمیت ایک بہت بڑی اونچی پچھواڑہ اور چوڑی سطح والی ایسی بے ڈول اور سادہ بناوٹ کی کشتی پر عبور کیا جسے دیکھ کر ہر ایک یقین کرے گا۔ کہ وہ کشتیاں جنہیں سکندر نے پہلے پہل دیکھا اور شاید استعمال بھی کیا۔ اسی نمونے کی تھیں۔ جب ہم کنارے پر پہنچ کر ہوشیارپور کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ تو دور فاصلے پر ہمیں گھوڑے سواروں کا ایک گروہ پا پیادہ ملا۔ جو ہمارے استقبال کے لئے انتظار کر رہا تھا۔ ہوشیارپور کا ضلع جائداد کی قلت۔ آموں کی عمدگی۔ اور لوگوں کی ذہانت و مقدمہ بازی کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ جائداد کی کمی بہت سے لوگوں کو اپنی روزی بیرونجات میں تلاش کرنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔ راجپوت فوج میں حصہ لے لیتا ہے۔ سکھ جاٹ یا تو اسی کی پیروی کرتا ہے یا نقل مکان کر جاتا ہے۔ اور اتنے جتنے کہ ممکن ہو سکیں۔ اور غالباً دوسرے اضلاع کی نسبت زیادہ لوگ گورنمنٹ کی ملازمت اختیار کر لیتے ہیں۔

دریائی علاقے کی زندگی :- ہم نے راستے میں نہایت دل خوش کن باتیں کیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں کھلے آسمان کے نیچے اس قسم کی گفتگو کرنا ہمیشہ ہی مرغوب معلوم ہوتا ہے۔ ہوتے ہوتے ہم ایک نوآباد گاؤں کے پاس پہنچے۔ جہاں دو لڑکے صرف لنگوٹی باندھے غروب ہونے ہوئے آفتاب کی آخری روشنی میں کشتی لڑ رہے تھے۔ اور اُن کے بزرگ نزدیک ہی بیٹھے سرکنڈوں سے چھپر بنا رہے تھے۔ سرکنڈے پنجاب کے تمام دریاؤں کے کنارے نہایت کثرت سے اُگتے ہیں۔ یہ گاؤں ایک سیلاب زدہ گاؤں کی بجائے بنایا گیا تھا۔ اُن لوگوں سے جو میرے ساتھ تھے۔ ایک نے کہا۔ گزشتہ سال ہمارا تمام کا تمام گاؤں سیلاب کی نذر ہو گیا تھا۔ پھر تم نے کیا کیا۔ کہا۔ آٹھ خاندان تو کسی دوسری جگہ منتقل ہو کر آباد ہو گئے۔ لیکن باقی ماندہ نے اپنے گھر دریا سے ذرا پرے بنائے۔ اور اپنی بچی کھچی زمین کو کاشت کرنے لگے۔ دریائی علاقہ کی زندگی خطرناک ہے۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو کبھی نہ کبھی موسمی ہواؤں کے پیدا کئے ہوئے تباہ کن سیلاب کا شکار نہ بنے ہوں۔

امدادی پیشے :- تحصیل دسوہہ میں جائدادیں بہت کم ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے کوئی دوسری اہم امدادی صنعت بھی ایسی نہیں۔ جو اس کا بدل ہو سکے۔ کسی نے ریشم کے کیڑے پالے تھے لیکن چھوڑ دیئے۔ لوگ مرغیاں پالتے ہیں۔ لیکن بہت کم۔ کیونکہ زمیندار انڈے بیچنے اپنی شان کے منافی خیال کرتے ہیں۔ لوگوں کا ایک خاص حصہ گاڑیوں پر بوجھ ڈھوتا ہے۔ اور بہت سے فصل کے گیہوں کاٹنے یا روئی چننے کے لئے نہری آبادیوں کو منتقل ہو جاتے ہیں۔ سکھوں کے علاقے

میں سے جاٹ فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں۔ اور اچھی حالت میں ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ ہر ایک
گاؤں میں پانچ یا چھ آدمی روپیہ کا لین دین کرتے ہیں۔ اس ملک میں روپیہ کا لین دین کرنا
فارغ البال ہونے کی علامت ہے۔

پیر۔ نمازیں اور حج :۔ مسلمانوں میں موجود ہونے کی وجہ سے ہم نے پیروں کے متعلق باتیں
شروع کر دیں۔ ایک تعلیم یافتہ پٹھان نے جو میرے ہمراہ تھا۔ یہ کہا۔ کہ اس گاؤں میں ۲۰۰۰ لوگ
آباد ہیں۔ ہر سال پانچ یا چھ پیر آتے ہیں۔ میرے والد اُن میں سے ایک کے جس سے اُن کی راہ و رسم تھی۔
اس کی ہر تشریف آوری پر پانچ روپے دیا کرتے تھے۔ اور ساتھ ہی اُن کی خاطر تواضع بھی کیا کرتے تھے۔ لیکن بعد
ازاں انہوں نے یہ نذرانہ بند کر دیا۔ کیونکہ پیر نے کوئی ایسا کام نہیں کیا۔ کہ وہ اس کا مستحق سمجھا
جاتا۔ انہوں نے یہ تبدیلی لامذہبیت کی وجہ سے نہیں کی۔ کیونکہ ایک پکے مسلمان کی طرح وہ دن میں پانچ
مرتبہ نماز پڑھتے ہیں۔ اور مکہ معظمہ کا حج بھی کر چکے ہیں۔ پانچوں نمازوں میں ہر روز قریباً ۱½ گھنٹہ
لگ جاتا ہے۔ ہر مرتبہ وہی رکعتیں بار بار پڑھی جاتی ہیں۔ (آخری مرتبہ سترہ رکعتیں) اور ہمیشہ عربی میں یہ اس
طرح پڑھی جاتی ہیں۔ کہ کوئی نہیں سمجھتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہی حال قرآن شریف کا ہے۔ اس کا عربی
میں پڑھا جانا ضروری ہے۔ کیونکہ ہر لفظ خدا کا کلام ہے۔ اور اگر ترجمہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ اس کے مفہوم
میں تبدیلی ہو جائے۔ بہت سے ملاؤں نے اسے زبانی یاد کیا ہوا ہے۔ اور انہیں عزت کی وجہ سے حافظ
کہہ کر بلاتے ہیں۔ لیکن قرآن شریف کو سمجھنے والے بہت کم ہیں۔ اور اس سے بھی کم وہ لوگ ہیں۔ جو اس
کی تفسیر کر سکتے ہیں۔ پٹھان نے کہا۔ کہ ۱۹۲۴ء میں مکہ کے حج میں چار مہینے لگے۔ اور ایک ہزار روپیہ
خرچ ہو گیا۔ چونکہ حج کے دوران میں اس کا دل و دماغ خاندانی اور دنیاوی تفکرات سے آزاد تھا۔ اس لئے
روپیہ دل کھول کر خرچ کیا گیا تھا۔ واپسی پر بعض زائرین حاجی کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ لیکن اس کے نزدیک
یہ ایک غلط خیال ہے۔

تبدیلیاں :۔ چونکہ پٹھان کی عمر چالیس سال سے زیادہ تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے
اوسط عمر میں کیا کیا تبدیلیاں دیکھیں؟ اس نے جواب دیا۔ کہ جب میں جوان تھا۔ تو ۹۰ فیصدی لوگ
کھدر پہنتے تھے۔ اور اب دس فیصدی بھی مشکل سے پہنتے ہیں۔ مشینوں سے بنے ہوئے
کپڑے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ زیادہ نفیس ہوتا ہے۔ اور بنا بنایا خریدا جا سکتا ہے۔ ان
علاقوں میں چند عورتیں اب بھی کاتتی ہیں۔ لیکن آدمیوں نے یہ کام کبھی نہیں کیا۔ اور وہ اسے عورتوں
ہی کا کام خیال کرتے ہیں۔ اس لئے گاندھی جی کی تحریک کبھی نہیں مقبول ہو سکتی۔ جنگ عظیم کے
زمانے سے کاشتکار کے معیار زندگی میں ایک خاص ترقی ہو چکی ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہ
اب زیادہ سبزیاں کھائی جاتی ہیں۔ پہلے لوگ صرف شلغم اور ساگ کھایا کرتے تھے۔ لیکن اب

مولی اور گوبھی بھی استعمال میں آنے لگی ہیں۔ لیکن سب سے بڑی تبدیلی اُن کے خیالات میں واقع ہوئی ہے۔ وہ اب محسوس کرتا ہے۔ کہ اُس کی حالت خراب ہے۔ اور اُسے ترقی دینا چاہتا ہے۔ شادی کے اخراجات کو کم کرنے کیلئے انجمن ہائے اصلاح رسوم کے قیام کی خواہش اس کی ایک مثال ہے۔ یہ خرچ اب تقریباً انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے۔ کہ دلہنوں کے لئے بہت بڑی رقمیں ادا کی جاتی ہیں۔ سکھ جاٹ کے لئے دو ہزار روپیہ دے دینا معمولی بات ہے۔ اس تحصیل کے شمالی حصے کے راجپوتوں نے بھی جو ابھی تک اس معاملے میں سختی سے کام لیتے رہے تھے۔ اب بیویاں خریدنی شروع کر دی ہیں۔

دریائی علاقہ کی سڑک کی وجہ سے جو تمام کی تمام کیچڑ اور پانی تھی۔ ہمارے قدم سست تھے۔ اور جب ہم مکیریاں پہنچے۔ تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ لیکن فلک زمہریر کے کرم فرما ستاروں کا جھرمٹ ثریا و جوزا کو لئے ہمارے سروں پر اپنا نور بکھیر رہا تھا۔ (۱۶ میل)

۴ دسمبر مکیریاں سے حاجی پور

شادی کے اخراجات :- آج میں کواپریٹو بینکنگ یونین کے اجلاس میں شامل ہوا۔ وہاں انجمن ہائے اصلاح رسوم کے لئے بے حد خواہش ظاہر کی گئی۔ تاکہ شادیوں کے گراں بار اخراجات کم کئے جائیں۔ ایک معمولی درجہ کا کسان ایک ہزار روپے سے کم میں اپنے بیٹے کی شادی کرنے کی توقع نہیں رکھ سکتا۔ اب شادی کے موقع پر گڑ یا شکر دینا بُرا خیال کیا جاتا ہے۔ کھانڈ کا ہونا ضروری ہے۔ زیورات بھی سونے کے ہونے چاہئیں۔ اور جہیز میں کم از کم ایک جوڑا دلہن کے لئے ریشمی کپڑوں کا ہونا ضروری ہے۔ محض اس ڈر سے کہ اس کا پڑوسی کیا کہیگا۔ کوئی شخص بغیر کسی انجمن کی امداد کے اپنے خرچ کو کم کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ زید بکر کے بیٹے کی شادی میں جو پرانے دستور کے مطابق کی جاتی ہے۔ شامل ہوتا ہے۔ اب وہ یہ مجال نہیں رکھتا کہ بکر کو ایک ایسی شادی میں بلائے جو ایک حد تک کفایت شعارانہ طریق پر کی جا رہی ہو۔ اور گاؤں میں جہاں ہر ایک ایک دوسرے کی شادی میں شریک ہوتا ہے۔ اصلاح ناممکن ہے۔ تاوقتیکہ اکثریت طریقہ شادی۔ مہمان نوازی۔ اور نمائش کے ایک عام معیار کیلئے رضامند نہ ہو جائے۔ دراصل دیہاتیوں کی فرقہ وارانہ زندگی اب بھی اس قدر مستحکم ہے۔ کہ معاشرتی معاملات میں انفرادی شخصیت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ جیسا کہ کسی نے کہا۔ کہ اکیلے ہم کچھ نہیں کر سکتے لیکن متفقہ طور پر سب کچھ کر سکتے ہیں۔ حال ہی میں تین دیہاتیوں نے مجبوری محسوس کرتے ہوئے مقامی انسپکٹر انجمن ہائے امداد باہمی سے درخواست کی کہ وہ فی الفور اُن کے

اؤں میں انجمن اصلاح رسوم کا اجرا کردے۔ کیونکہ وہ اپنے بچوں کی شادیاں کرنے
الے تھے۔ اور مروّجہ شادیوں کے تباہ کن اخراجات سے بچنا چاہتے تھے۔ اور اس
کے لئے اُن کے پاس وجہ تھی۔ وہ یہ کہ اس ضلع میں زمینیں اس قدر کم ہیں کہ ایک معمولی
اشتکار کے لئے بغیر قرض لئے اپنی لڑکی یا لڑکے کی شادی کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ وہ لوگ
جو کل میرے ساتھ سوار تھے۔ اس بات پر متفق تھے کہ قرض کی وجہ یہی ہے۔ اور آج یہ بھی
بتایا گیا۔ کہ کاشتکار ساہوکار کے ہاتھ سے کبھی نجات نہیں پا سکتا۔ تاوقتیکہ ایک طرف
شادیوں کے اخراجات کم نہ کئے جائیں۔ اور دوسری طرف کفایت شعاری کو ترقی نہ دیجائے
مثال کے طور پر انجمن ہائے تلافیٔ ناکامیٔ فصل کو قائم کرنا۔ اس وقت اگر وہ گاؤں کے مشترکہ بینک میں حصہ بھی
لیلے۔ پھر بھی وہ ساہوکار سے لین دین جاری رکھتا ہے۔ کیونکہ دوراندیشی کے خیال سے
انجمنیں اس قدر بڑی رقمیں نہیں دے سکتیں جتنی کہ شادیوں کے لئے درکار ہیں۔ چونکہ
ساہوکار اپنے روپے کے حصول کا طریقہ خوب جانتا ہے۔ وہ اس خطرے میں پڑ سکتا ہے
محض اپنے لئے کام کرتے ہوئے اور نیز روپے کے مارے جانے کے ڈر کی چبھن سے وہ بہ
نسبت ایک معمولی انجمن کی کمیٹی کے اپنی سامی کو زیادہ سختی سے لعن طعن کریگا۔
(۹ میل)

۵ دسمبر۔ حاجی پور سے تلواڑا

چرخہ کاتنا:۔ اب ہم ڈوگروں کے علاقے میں ہیں۔ یہ وہ راجپوت ہیں۔ جو ہمالیہ کے دامن
میں رہتے ہیں۔ حاجی پور بینکنگ یونین کے اجلاس میں جس میں ہم شامل تھے۔ جسمانی صحت
کی تبدیلی بہت نمایاں تھی۔ حاضرین میں سے اکثر ہندو تھے۔ قد کے چھوٹے۔ جسم کے دبلے
اور شکل و شباہت کے لحاظ سے گندے تھے۔ ان میں ایک دُبلا چمار تھا۔ جس کی دو نیم مردہ
ٹانگیں اسے مشکل سے سہارا دے رہی تھیں۔ یہ ایک بینک کا پریذیڈنٹ تھا۔ تقریباً
نصف لوگ کھدر پہنے ہوئے تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ پچاس سے ساٹھ فیصدی عورتیں اب
بھی کاتتی ہیں۔ اور بہت سے لوگ اس مقصد کے لئے تھوڑی سی کپاس بو لیتے ہیں۔ جو ایسا
نہیں کر سکتے۔ انہیں مشینوں سے بنا ہُوا کپڑا خریدنا سستا پڑتا ہے۔ آدمیوں کے چرخہ
کاتنے کے خیال کا مضحکہ اڑایا گیا۔ کچھ تو اس خیال سے کہ یہ عورتوں کا کام ہے۔ اور کچھ اس
لئے کہ آدمیوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر آج کل وہ گنّوں کا رس نکالنے اور
آئندہ سال کی فصل کے لئے زمین تیار کرنے میں مشغول ہیں۔

شادی کے اخراجات :- کیریاں کی طرح یہاں بھی لوگ معاشرتی رسومات کے اخراجات میں کمی کرنے میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ ایک سال ہوا پچیس گاؤں کے راجپوتوں نے ایک کمیٹی بنائی۔ جس نے خرچ کا ایک اندازہ مقرر کر دیا۔ ۲۶ گاؤں کے ہندو جاٹوں نے بھی حال ہی میں یہی کیا ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں سے کسی میں بھی اس اندازے پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

یہ امر نہایت افسوس کے ساتھ تسلیم کیا گیا۔ کہ انجمن ہائے امداد باہمی قرضہ کے چالیس فیصدی ممبر اب بھی ساہوکاروں کے ساتھ لین دین کرتے ہیں۔ اس پر سب نے اتفاق کیا کہ اس کی وجہ شادیوں کے گراں قدر اخراجات ہیں۔ ایک معمولی جائداد والا راجپوت آٹھ سو یا ایک ہزار روپیہ سے کم میں شادی شدہ کہلانے کی امید نہیں کر سکتا۔ اور اگر اسے بیوی خریدنی پڑے۔ تو کل روپیہ دو ہزار کے قریب ہو جائے گا۔ ہمیر پور کے ایک پٹھانیہ راجپوت نے کہا۔ کہ لڑائی کے زمانے سے راجپوتوں میں لڑکیوں کی فروخت دس گنا ترقی کر گئی ہے اور بڑے بڑے خاندانوں نے جو پرانے زمانہ میں ہرگز اپنی لڑکیاں چھوٹے خاندانوں میں نہیں دیتے تھے۔ اب پانسو روپے سے لے کر ایک ہزار روپیہ تک میں دینی شروع کر دی ہیں۔ نئے کانگڑہ کی یہ کہاوت کہ دلہن کی عمر کے ہر سال کے لئے . . اروپیہ ایک سچی حقیقت کا مبالغہ آمیز بیان ہے۔ اسی راجپوت نے بتایا۔ کہ بیوگان بھی دوبارہ شادی کے مواقع پانے ہی اپنے آپ کو دلالوں کی معرفت میدانی علاقوں میں خدا جانے کن کے پاس فروخت کر دیتی ہیں۔ اور زیادہ مبارک تبدیلی یہ ہے۔ کہ ملازمت کی بڑھتی ہوئی مشکلات کی وجہ سے بڑے خاندانوں کے افراد جو معاشرتی یا مذہبی خیالات پر ہل چلانا برا سمجھتے تھے۔ اب ایسا کرنے لگ گئے ہیں۔ حاجی پور کو چھوڑ کر ہم نے اپنے گھوڑوں کی باگیں اونچے پہاڑوں کی طرف پھیریں۔ اور دریائے بیاس کی وادی میں داخل ہو گئے۔ جہاں یہ شوالک کی پہاڑیوں اور ہمالیہ کی جنوبی شاخوں میں بہتا ہے۔ ہمارے ایک ہندو راجپوت ہمراہی نے کہا۔ کہ راجپوت ترکاریاں نہیں بوئینگے۔ کیونکہ اس سے اُن کی معاشرت پر حرف آتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی احتیاج کے لئے راعی مسلمانوں پر منحصر رہتے ہیں۔ جن کی عورتیں ٹوکری سر پر رکھ کر موقع بموقع پھیری لگاتی ہیں۔ اُس کا خیال تھا۔ کہ دیہاتی پہلے کی نسبت زیادہ محنت سے کام کرتے ہیں۔ لیکن وہ حاضرین کے ساتھ اس امر پر بھی متفق ہو گیا۔ کہ یہ سب محض ضرورت کے لئے کام کرتے ہیں۔ اُس نے کہا۔ جب آدمی کے ہاتھ بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ تو وہ آرام کرتا ہے۔ تلواڑ نہایت شاندار جگہ پر واقع ہے۔ اس کی ڈھلان کے نیچے دریائے بیاس کا پتھریلا چوڑا طاس ہے جس

کو ایک نیلی دھاری دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ یہاں دریا تیزی سے بہتا ہے۔ اور اس سے پرے دور دَولہ دھار کا تمام سلسلہ ہے۔ جو اب یہاں تک برف میں ڈوبا ہوا ہے شام کو وادی میں پھرتے پھراتے ہیں گدیوں کے ایک قبیلہ سے دوچار ہوا۔ جو اپنی بھیڑ بکریوں کے ساتھ رات بسر کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ وہ ان مویشیوں کو دَولہ دھار بالائی چراگاہوں سے لائے تھے۔ تاکہ سردی کا موسم جنوبی پہاڑیوں کے نالوں پر گذاریں۔ گدی زیادہ اونچی ذات والے کھتریوں کی اولاد ہیں۔ جو صدیاں گزریں اسلامی تلوار اور مذہب سے بچنے کے لئے مسلمان حملہ آوروں کے آگے آگے کانگڑہ کی پہاڑیوں کی طرف بھاگ گئے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ سیدھے سادے چرواہے تھے۔ لیکن جب یہ اس آگ کے گرد بیٹھے جو اُن کا کھانا پکا رہی تھی۔ تو اُن کے کھلے نقوش سے ہر شخص یہ دیکھ سکتا تھا۔ کہ اُن کی نسل چرواہوں سے بہت کچھ بالا تھی۔ چونکہ کل ایک چیتا ایک میلے کو لے بھاگا تھا۔ اس لئے ان کو آج رات باری باری نگہبانی کرنی تھی۔ اسی دوران میں بھیڑ اور بکریوں کے بچے خوشی سے چھوٹی دُمیں ہلاتے ہوئے۔ اپنی ماؤں کا دودھ پینے میں مشغول تھے۔ اور اُن کے چوستے ہوئے ہونٹوں کی آواز بھیڑوں کے حریصانہ گھاس کترنے کی آواز کے ساتھ نہایت مسرور کُن طریق سے مل رہی تھی۔ بھیڑیں نئی تراشی ہوئی تھیں۔ اور ایسی سفید نظر آ رہی تھیں۔ جیسی کہ دُور سے برف۔

(۹ میل)

۱۸ دسمبر۔ تلواڑا سے دولت پور

آج ہم اپنے اسباب کی چھ چھکڑوں سمیت پتھریلی سڑک کے ذریعے جو غیر آباد علاقے میں سے گزرتی ہے۔ تحصیل اونہ میں داخل ہوئے۔ ہم سڑک کے کنارے کی چند دکانوں کے پاس سے گزرے۔ قریباً تمام یہاں تک کہ بزازوں اور حلوائیوں کی دکانیں بھی برہمنوں کی ہیں وہاں کچھ بکھری ہوئی کھیتیاں تھیں۔ اور گیہوں کے ننھے پودے پتھروں میں سے نکل رہے تھے سڑک کی طرح کھیتوں میں بھی پتھر کثرت سے تھے۔ دولت پور کی طرف جہاں سڑک دریائے بیاس و ستلج کے جھرنوں کے اوپر سے گزرتی ہے۔ زمین زیادہ زرخیز ہے۔ اور کہیں کہیں کھیتوں کے گرد پتھروں کے چھوٹے خوبصورت ڈھیر لفظوں کی طرح جڑے ہوئے تھے۔ یہاں ایسے کھیت تھے۔ جن میں دو فصلیں ہوتی تھیں۔ اور بہت سے کھیتوں کو اُن مویشیوں سے بچانے کے لئے جو برسات میں آزاد چرتے ہیں۔ تھوہر اور کانٹے دار جھاڑیوں کی گھنی باڑ سے بچایا ہوا تھا۔

سکول اور تعلیم:۔ اگرچہ ہم گاہے گاہے کسی بستی کے پاس سے گزرتے تھے۔ لیکن

فضا راگ ۔ ڈھول ۔ نر سنگھے اور کرنا کی آوازوں سے گونج رہی تھی ۔ اس کی وجہ یہ تھی ۔ کہ
یہ ہندوؤں کی شادیوں کا موسم تھا ۔ جن لوگوں سے ہم ملے اُن میں سے اکثر شادی کی برات
میں شریک ہونے کے لئے جا رہے تھے ۔ ایک شخص تحفے کے طور پر ایک بستر لئے جا رہا تھا
جو چچا نے اپنے بھتیجے کو بھیجا تھا ۔ اور دوسرا مٹھائی کا ایک ٹوکرا ۔ باقی مہمان تھے ۔ ہم ایک
دیہاتی سکول کے پاس پہنچے ۔ جہاں بارہ یا پندرہ لڑکے اپنے اُستاد کا انتظار کر رہے تھے ۔
جو بقول اُن کے دو گھنٹے کے لئے دوپہر کا کھانا کھانے گیا ہوا تھا ۔ میں نے انہیں اشارۃً کھیلنے
کے لئے کہا ۔ یہ بات انہیں پہلے نہ سوجھی تھی ۔ ہم نے ایک دوسرا سکول دیکھا ۔ جس کی نصف
ایکڑ زمین میں سبزیوں کا باغ تھا ۔ جس میں کہیں کہیں شلغم اور پیاز نہایت بُری حالت میں
لگے ہوئے تھے ۔ اگرچہ صرف سو گز کے فاصلے پر ایک کنواں تھا ۔ لیکن پھر بھی پانی کا انتظام
قدرت ہی کے سپرد تھا ۔ دولہ دھار اور جموں کی پہاڑیاں پوری طرح نظر آ رہی تھیں ۔ حسب
معمول میں نے دیکھا کہ لڑکے انہیں کوہ ہمالیہ کے نام سے جانتے تھے ۔ اور انہیں کچھ خبر نہ تھی ۔
کہ وہ خود کیا کہلاتے تھے یا وہ کس ملک میں رہتے تھے ۔ میں نے کوئی مثال اس کے برعکس
نہیں دیکھی ۔ ان میں ایک نے جموں کی پہاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اچھل کر کہا ۔
"کشمیر اور تبت" اور ایک اور نے کہا "افغانستان"

دیہاتی کی تعلیم مشکلات سے پُر ہے ۔ جیسا کہ ہر ایک جانتا ہے ۔ بچے کو سکول بھیجنے
سے کسان کا یہ مطلب ہوتا ہے ۔ کہ اس کے لئے گورنمنٹ کی ملازمت میں داخلے کی
اجازت حاصل کرے ۔ اس تحصیل کا ایک راجپوت افسر تعلیم کہتا ہے ۔ کہ یہ زیادہ تر اس وجہ
سے ہے ۔ کہ نوکری سے بندھی آمدنی آتی ہے ۔ اور کاشتکاری سے بسا اوقات کچھ آمدنی نہیں
ہوتی ۔ مجھے جنوبی فرانس کی ایک دیہاتی لڑکی کا واقعہ یاد آیا ۔ جس نے یہ دیکھ کر کہ اُس کے
بھائی کھیت میں کیسی طرح کام کرتے تھے ۔ اور اُس کا ثمرہ کتنا غیر یقینی تھا ۔ ایک دیہاتی سے
شادی کرنے سے انکار کر دیا ۔ اور اس کی بجائے ایک حجام سے شادی کر لی ۔ جو ہر ہفتہ کچھ
نہ کچھ کماتا تھا ۔ راجپوت ماہر تعلیم نے بتایا کہ اُن کی تحصیل میں شاید ہی کوئی دسویں جماعت پاس
لڑکا کھیتی باڑی کرتا ہو ۔ یہی وہ حقیقت ہے ۔ جس کی بعد میں انجمن ہائے امداد باہمی کے عملے
نے بھی تصدیق کی ۔ آخر الذکر صرف دو دسویں جماعت پاس لڑکوں کے نام بتا سکے ۔ جو اپنی
زمینوں میں کاشت کرتے تھے ۔ اس کے برعکس بیس ایسے تھے ۔ جو انہی کے گاؤں میں کاہلی
کی زندگی بسر کر رہے تھے ۔ اور لگان لیتے تھے ۔ اور اس کے بدلے میں کچھ نہیں کرتے تھے
اس دیہاتی کا معاملہ اور بھی نازک ہے ۔ جو کالج ہو آیا ہے ۔ گاؤں میں واپس آ کر وہ ماہی بے آب

کی طرح بے قرار ہے۔ ایسا ہی ایک شخص تین دن ہوئے میرے ساتھ سوار تھا۔ اس نے کہا۔ کہ پہلے پہل تعلیم یافتہ سوسائٹی کے بغیر زندگی نہایت ناگوار معلوم ہوئی۔ اور کافی عرصے کے بعد میں اُن میں رہنے سہنے کے قابل ہُوا۔ ایک اور لڑکا جو کہ سکھ جاٹ ہے مجھے اپنا حال مندرجہ ذیل الفاظ میں لکھتا ہے۔

"میں نے کالج پچھلے ہفتہ چھوڑا۔ اب میں پھر اپنے ابتدائی ماحول میں ہوں ۔۔۔ لیکن میں اپنے آپ کو بالکل اجنبی محسوس کرتا ہوں۔ گاؤں کے لوگ مجھے اپنی سوسائٹی میں خواہ مخواہ دخل در معقولات دینے والا خیال کرتے ہیں۔ میں اپنی طبیعت کو اس جگہ اور یہاں کے حالات کی ضروریات کے مطابق اس طرح ڈھال رہا ہوں۔ کہ ہر ایک بوڑھے آدمی کو چچا کہتا ہوں۔ اور ہر ایک بوڑھی عورت کو ماں۔ نوجوان جب اُس شراب کی تعریف کرتے ہیں۔ جو وہ گھر پر ناجائز طور پر کشید کرتے ہیں۔ تو میں اُن کے ساتھ اتفاق کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور میں اپنے پڑوسیوں کی نکتہ چینیوں کو نہایت صبر سے سنتا ہوں۔ دراصل میں ایک مکمل ریاکار کی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ اپنی یونیورسٹی کی تعلیم کو ایک کسان کی زندگی میں غرق کر دوں۔"

ابھی ایک مشکل اور ہے۔ وہ یہ کہ گاؤں میں مذہبی تعلیم کا تقریباً نام ونشان نہیں ہے۔ راجپوت نے بتایا کہ جب وہ گورنمنٹ ہائی سکول میں تعلیم حاصل کرتا تھا۔ تو آریہ سکول کی مذہبی جماعتوں میں شامل ہو کر اُس نے کچھ مذہبی تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن عام دیہاتی یا تو بہت تھوڑی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یا بالکل نہیں کرتے۔ کیونکہ مندروں کے پروہتوں میں سے کوئی ہی تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔

چھوت چھات:۔ تمام تحصیل میں ہندو دھرم غالب ہے۔ اس کی وجہ سے چھوت چھات اب بھی زوروں پر ہے۔ اور حاجی پور کے نواح کے ہندو راجپوتوں سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ وہ لوگ مسلمانوں کے زیر اثر رہ چکے ہیں۔ اور بیرونی دنیا سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ آخرالذکر میں سے اکثریت کے لئے یہی کافی ہے۔ کہ۔ نیچ لوگ عام کنوؤں سے پانی نہ بھریں۔ صرف پرانی طرز کے لوگ ایسے ہیں۔ جو اتفاقیہ کسی سے چھو جانے پر اپنے اوپر پانی چھڑکتے ہیں۔ یا نہاتے ہیں۔ حاجی پور یونین کے اجلاس میں جب پانی چھڑکنے کا ذکر چھیڑا گیا۔ تو تمام حاضرین بلا شبہ اس طرح ہنسے جیسے کسی خبط یا خلاف دستورہات پر ہنسا کرتے ہیں۔ لیکن یہاں لوگ اس پر سنجیدگی سے عمل کرتے ہیں۔ اور اگر کسی بھنگی۔ چمار۔ یا کبیر پنتھی جولاہے سے چھو جائیں۔ تو نہ صرف

اپنے اوپر پانی چھڑکتے ہیں۔ بلکہ اس سامان پر بھی جو ایک نیچ اٹھا کر لے جاتا ہے۔ منزل پر پہنچنے پر پانی چھڑکا جاتا ہے۔ نیچ لوگ یا تو اپنے کنوئیں آپ بنائیں۔ یا ایک ہندو رکھیں۔ جو اُن کے لئے پانی کھینچے۔ اگر ان کاموں میں سے وہ ایک بھی نہ کر سکیں۔ تو پانی تالاب سے بھر سکتے۔ گاؤں میں ایک مہر صبح شام اُن کے لئے کنوئیں پر پانی کھینچنے جاتا ہے۔ اور اس کے بدلے فصل کے موقع پر غلہ لیتا ہے۔ لیکن ہر شخص بشرطیکہ وہ اُن کو نہ چھوئے۔ اُن کے لئے پانی کھینچ سکتا ہے۔ اور اُن کے برتن بھر سکتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے۔ کہ مسلمانوں کو کنوؤں کے استعمال کی اجازت ہے۔ اگرچہ باہمی سمجھوتے سے یہ ایک ہی وقت نہیں کیا جاتا۔ جس طرح کہ ہندو کرتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے۔ کہ شادی کے موقعہ پر راجپوت دولہا اور دلہن کو ہمیشہ چمار ہی پالکیوں میں اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔

(۱۳ میل)

۷ دسمبر دولت پور سے امب

دولت پور سے چل کر اُونہ کی لمبی زرخیز وادی میں نیچے اُترے جو اپنی امارت اور اشیائے گوناگوں کی وجہ سے صوبہ متوسطہ اطالیہ کی وادیوں کو یاد دلاتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ یہاں انگور کی بیلوں کی بجائے گنّے پائے جاتے ہیں۔

مکانات:۔ وادی سے اوپر پہاڑیوں کی ڈھلوانوں پر راجپوتوں کے گھروں کی سلیٹی پتھر کی چھتیں چمک رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر میرے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا۔ جس طرح چھپر والی چھت غربت کی نشانی ہے۔ اسی طرح سلیٹی پتھر کی چھت امارت کی نشانی ہے۔ اور لوہے کی چادروں کی چھت ایک ایسے شخص کی علامت ہے۔ جو نہ امیر ہے اور نہ غریب۔ یہاں اچھے گھروں کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وادی میں بارش نہایت کثرت سے ہوتی ہے۔ (۴۰ انچ) اور اُن میں سے زیادہ تر دو مہینوں میں ہوتی ہے۔ لیکن ایک اچھا گھر ایک دن میں نہیں بن سکتا۔ بعض اوقات اس میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔ باپ عمارتی لکڑی جمع کرے۔ اور بیٹا اس سے گھر بنائے۔ ہر ایک راجپوت جب وہ فوجی ملازمت سے علیحدہ ہوتا ہے۔ ہوادار گھر چاہتا ہے۔ کیونکہ یہ زیادہ صحت بخش ہوتا ہے۔ تمام علاقے پر اُس کا نمایاں اثر ہوا ہے۔ یہاں تک کہ ہر ایک گاؤں میں ایک یا دو گھر نئے معلوم ہوتے ہیں۔ پہلا گھر جو میں نے دیکھا۔ چھ بارے والا کچا مکان تھا۔ جس پر سلیٹی پتھر کی عمدہ چھت بنی ہوئی تھی۔ اس پر قریباً ۵۰ روپیہ لگے تھے۔ نیچے کے کمروں میں کھڑکیاں بالکل نہ تھیں۔ یہ وسعت ہوا اور روشنی

کے لحاظ سے مکمل کمرہ تھا۔ گھر پر ۱۰۰۰ ہزار روپے صرف آئے تھے۔ اور ایک لوہار نے بنوایا تھا۔ جو لڑائی کے زمانے میں فوج میں ملازم تھا۔ دوسرے گاؤں میں میں نے چند گھروں کی ایک چھوٹی بستی دیکھی جو چھ راجپوت بھائیوں کے قبضے میں تھی۔ اُن پر نہایت اچھے چھپر پڑے ہوئے تھے۔ اور وہ انتہا درجے کے صاف تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ عورتیں ان کو ہر روز صاف کرتی تھیں۔ اُن چھ بھائیوں سے ایک مشترکہ منبدو گنبہ بنا ہُوا تھا۔ ایسے علاقے میں جہاں زمینیں کم ہیں۔ مشترکہ جائداد رکھنے کے فوائد ظاہر ہیں۔ لیکن اس طریقہ کا جاری رکھنا زیادہ سے زیادہ مشکل ہوتا جاتا ہے۔ کیونکہ اس انفرادیت کے زمانے میں بہت سی بیویاں اپنا اپنا گھر الگ چلانا چاہتی ہیں۔ اور ایک بچے والی ماں اس چیز کو جو مشترکہ مال میں سے دو بچوں والی ماں کو دی جا رہی ہو۔ پسند نہیں کرتی ۔ اس کے ساتھ چکی پیسنے اور چرخہ کاتنے کے زوال کے سبب انہیں لڑنے کیلئے بہت وقت مل جاتا ہے۔

چکی پیسنا:۔ ان چھ گھروں میں سے ہر ایک میں ایک چکّی ہے۔ میں نے بھی چکی پیسنے کے پتھر دیکھے۔ لیکن یہ صرف اسی وقت استعمال کی جاتی ہیں۔ جب موسم اتنا خشک ہو۔ کہ مقامی پن چکیاں نہ چل سکیں۔ کسی نے کہا۔ کہ عورتیں چکی پیسنے سے تندرست رہتی ہیں۔ لیکن ایک اور نے کہا۔ کہ اگر انہیں یہ کام نہ کرنا پڑے۔ تو کاتنے اور کھیتوں میں کام کرنے کے لئے زیادہ وقت مل جائے۔ جب سے میں نے گورداسپور چھوڑا۔ یہی کہانی سنتا آیا ہوں۔ کہ اب جبکہ ہر شخص کی رسائی انجن یا بیلوں کی چکی تک ہو سکتی ہے۔ عورتوں نے گھروں میں پیسنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ بہت سے لوگ اس پر افسوس کرتے ہیں۔ اور اس بات پر زور دیتے ہیں۔ کہ انجن کی چکی کا پسا ہُوا آٹا اتنا مقوّی نہیں ہوتا جتنا کہ گھر کا۔ اور یہ کہ عورتیں اب ایسی مضبوط نہیں ہیں۔ جیسی کہ پہلے کیونکہ صبح سویرے چکی پیسنا اعضاء اور پھیپھڑوں کے لئے بہترین ورزش ہے۔ غریب لوگوں کی عورتیں کم بیمار ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ اور خوشحال لوگوں کی عورتیں جہاں تک ممکن ہو سکے یہ کام کم کرتی ہیں۔ اور یہ سمجھتی ہیں۔ کہ گھر میں چکی رکھنے سے ہماری عزت کو بٹہ لگتا ہے۔

گاؤں کا تالاب:۔ گاؤں کے گھروں کے مقابلے میں تالاب کی حالت نہایت اندوہ افزا تھی۔ اُس کی سطح جگہ جگہ سبز رنگ کی جھاگ کے ٹکڑوں سے ڈھپی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود مویشی اس میں نہاتے تھے۔ اور لوگ برتن دھوتے تھے۔

اور۔ نیچ لوگ اگر کوئی انہیں کنوئیں سے پانی کھینچ کر دینے والا نہ ہو۔ اس میں سے پیتے بھی تھے۔ اس تمام کوفت کو دور کرنے والی اس کے کنارے ایک چھوٹی سی خانقاہ تھی۔ جسے ایک بڑھئی نے بنوا لیا تھا۔

پردہ :۔ ان دونوں گاؤں میں پردہ کچھ غیر ذمہ دارنہ تھا۔ غریب لوگ اس پر سختی سے کاربند ہونے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ اور برعکس اس کے امیر لوگ اس کے سختی سے پابند ہیں۔ اگرچہ ایک سربرآوردہ راجپوت نے جس سے کہ میں آج ملا۔ یہ کہا کہ یہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور گاؤں تک میں عورتیں اس کو چھوڑنے کے متعلق باتیں کرنے لگ جاتی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ آدمی اس خیال سے کہ عورتوں پر قابو رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ اُن کو تعلیم دلانے کے خلاف ہیں۔ شہر میں یہ بات بالکل مختلف ہے۔ ایک تعلیم یافتہ شخص پڑھی لکھی بیوی چاہتا ہے۔ دو ایک دن گزرے میں نے اس موضوع پر ایک پٹھان سے گفتگو کی۔ جس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ اگرچہ اس کے اپنے گھرانے میں پردہ کیا جاتا تھا۔ لیکن وہ اس کے خلاف تھا۔ اُس نے کہا۔ کہ یہ صحت کے لئے برا ہے۔ اور فارسی کی یہ مثل سنائی "شخص بیکار یا شود دزد یا بیمار" یعنی بیکار آدمی یا چور ہو جاتا ہے یا بیمار۔ چونکہ عورتیں اب چکی نہیں پیستیں اور کاتتی بھی کم ہیں۔ اُن کی کوئی ورزش نہیں ہوتی۔ اس کا اثر بچہ جننے پر پڑتا ہے۔ ایک ایسی عورت کو جو کھیتوں میں کام کرتی ہے۔ زچگی سے بہت کم تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن پردے والی عورت کچھ عرصہ تک پڑی رہتی ہے۔ اگر بیوی کھیتوں میں اپنے خاوند کی امداد کرے تو یہ کنبہ کے لئے بھی فائدہ مند ہے۔ اور اگر وہ ایسا کرے۔ تو تھوڑی سی جائداد پر گذارہ کرنا زیادہ آسان ہے۔

تھوڑی جائداد والا کس طرح گذارہ کرتا ہے :۔ ایک ایسے ضلع میں جہاں آبادی اتنی گنجان ہو۔ جتنی کہ اس تحصیل میں گذارہ کرنے کا سوال نہایت ٹیڑھا ہے۔ یہاں پر ایک کاشت شدہ مربع میل میں ۱۰۶۵ اشخاص آباد ہیں۔ اور تمام مملوکہ رقبہ ۵ ایکڑ سے کم ہے۔ جائدادیں اتنی کم ہیں۔ کہ زمین کی آمدنی کو دیگر ذرائع سے امداد بہم پہنچانی پڑتی ہے۔ جنگِ عظیم سے پہلے ۵ لاکھ روپیہ سالانہ محض بطور تنخواہ۔ پنشن یا مزدوری صرف مالکانِ زمین کو دیا جایا کرتا تھا۔ راجپوت کے لئے ایک عام ذریعہ معاش بھرتی ہے۔ اور یہ اتنا مشہور ہے۔ جتنا کہ ممکن ہے۔ لیکن ملازمت کی بہت سی دوسری صورتیں بھی ہیں۔ جیسا کہ ایک گاؤں کے بینک میں جو آج دیکھا گیا۔ ایک ممبر سکول

ماسٹر تھا۔ دوسرا سپاہی نمبر ۱ نمبر دار بابو۔ چوتھا پیادہ سپاہی۔ پانچواں رسالہ سوار اور چھٹا امرتسر میں چوکیدار۔ ساتواں خچروں کی سوداگری کرتا تھا۔ آٹھواں بھیڑوں اور بکریوں کی تجارت کرتا تھا۔ نواں زمینی جائداد کا انتظام کرتا تھا۔ اور دسواں کسی معمولی سٹیشن پر گھنٹی بجاتا تھا۔ اکثر لوگ دیر تک باہر نہیں رہتے۔ ایک شخص نے جس سے میری ملاقات ہوئی یہ بتایا کہ اگر ملازم ایک ٹرنک ایک کپڑوں کا جوڑا۔ ایک چھتری اور ایک لالٹین لے کر واپس آجائیں۔ تو وہ مطمئن ہو گئے ہیں۔ یہ امر قابل رحم ہے۔ کہ اس قدر سخت ضرورت کے باوجود کسی گھریلو صنعت کو ترقی نہیں ہوئی۔ اُن دونوں گاؤں میں جو آج دیکھے گئے۔ لوگ اپنا فرصت کا وقت سَن سے رسی بانٹنے اور گھاس سے ٹوکریاں بنانے میں صرف کرتے ہیں۔ لیکن دونوں حالتوں میں صرف گھر کے لئے۔ اسی طرح چارپائیوں کے لئے رسّی اور نواڑ بھی بنائی جاتی ہے۔ لیکن وہ صنعت جس سے انہیں معقول آمدنی ہو سکتی ہے۔ دوسروں کے لئے چھوڑی ہوئی ہے۔ یہ صنعت بیر کے درختوں سے لاکھ اُتارنا ہے۔ لاکھ اس علاقہ کی بالائی پیداوار ہے۔ لیکن یہ کہا جاتا ہے۔ کہ صرف ۵ فیصدی دیہاتی مالکانِ زمین اسے خوب اُتارتے ہیں۔ باقی اپنے درخت مسلمانوں کو اجارہ پر دے دیتے ہیں۔ جن میں اکثر قصاب ہیں۔ اگرچہ وہ اب قصاب کا پیشہ نہیں کرتے۔ اس پر یہ کہ یہ لوگ ضلع کے دوسرے حصے سے آتے ہیں۔ بہانہ یہ ہے۔ کہ وقت نہیں ملتا۔ جب کبھی کسی کاشتکار سے پوچھا جاتا ہے۔ کہ اس کے پاس فلاں یا فلاں کام کیلئے کیوں وقت نہیں ہے۔ تو وہ ہمیشہ یہی بہانہ کرتا ہے۔

(۱۰ میل)

۸ دسمبر امب سے چیڑو

یہ علاقہ تو ہو بہو اٹلی تھا۔ اور شملہ کی طرف بلاسپور اور نالاگڑھ کی پہاڑیوں کی نیلی روشنی اس دلفریب دھوکے میں اور بھی اضافہ کرتی تھی۔ سڑک پر آم۔ شیشم اور شہتوت کے درختوں کا نہایت خوشنما سایہ تھا۔ شہتوت کے درخت خزاں کی وجہ سے سنہری ہو رہے تھے۔ پہلے کی طرح جن لوگوں سے ہم ملے اُن میں سے اکثر شادی کے لئے جلدی جلدی چل رہے تھے۔ ایک جتھا نائیوں کا تھا۔ وہ تمام نیم تعلیم یافتہ لوگوں جیسا جدید طرز کا ایسا چُست لباس پہنے ہوئے تھے۔ کہ میں یہ پوچھنے کے لئے کہ وہ کون تھے۔ جھجک گیا۔ وہ دُلہن کے تحفے کپڑوں کا ایک

جوڑا بطور تحفے کے لئے جا رہے تھے۔ ایک دوسرا راہگیر ایک بھڑک دار منقش پلنگ لئے جا رہا تھا۔ یہ کسی دُلہن کے باپ کی طرف سے دُولہا کیلئے تحفہ تھا۔

سبزیاں اور خوراک :۔ ہم ایک گاؤں میں سے گزرے۔ جہاں کا شتکاری زیادہ تر کم درجے کے لوگوں مثلاً۔ چھانگ۔ سینی اور دوسروں کے ہاتھ میں تھی۔ سبزیاں جن میں آلو۔ مولیاں۔ شکر قندیاں شامل ہیں۔ خاص طور پر زیادہ تھیں۔ یہ گردونواح کے گاؤں میں فروخت کی جاتی تھیں۔ اس تحصیل میں یہ پہلا موقع ہے۔ کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں۔ کہ سبزی کسی نہ کسی قدر اُگائی جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے ظاہر کیا گیا۔ راجپوت اس خیال سے کہ ایسا کرنے سے اس کی عزت پہ حرف آتا ہے۔ انہیں نہیں پیدا کرے گا۔ لیکن وہ انہیں خریدنے کے لئے بالکل تیار ہے۔ اور اب وہ پہلے کی نسبت زیادہ آزادی کے ساتھ خرید سکتا ہے۔ کیونکہ لاریاں ہوشیارپور سے سبزیاں لے آتی ہیں۔ یہ خیال کہ کاشتکار پہلے کی نسبت زیادہ کھاتا ہے۔ ناقابل یقین ہے۔ لیکن اس امر پر سب متفق ہیں۔ کہ اس کی غذا مختلف قسم کی اور مزیدار ہوتی ہے۔ پہلی بات تو اس لئے کہ وہ زیادہ سبزیاں کھاتا ہے۔ اور دوسری اس لئے کہ وہ اپنی خوراک کو بہت سے مسالوں اور گھی سے خوش ذائقہ بناتا ہے۔ بعض یہ بھی خیال کرتے ہیں۔ کہ وہ دودھ زیادہ پیتا ہے۔ لیکن اسی تحصیل کی اس خوراک اب بھی تین مہینے تک گیہوں اور نو ماہ تک مکئی ہے۔ اس لئے نہیں کہ مکئی کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ گیہوں روپیہ دینے والی فصل ہے۔ اور اس روپیہ سے مالیہ۔ سود۔ شادیوں اور کپڑوں کے اخراجات پورے کئے جاتے ہیں۔ گنا بھی کسی حد تک اسی مطلب کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک ایکڑ سے زیادہ کوئی ہی بوتا ہے۔ کیونکہ یہ سال کی ایک ہی فصل ہے۔ اور اس کے لئے زیادہ کھاد اور محنت کی ضرورت ہے۔ اور اگر یہ خراب ہو جائے۔ تو سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ جس سے کم جائداد والے پر بھاری بوجھ پڑ جاتا ہے۔ ہر حالت میں چھوٹے درجے کا زمیندار اس چیز کا خیال کرتا ہے۔ جو اسے یقینی طور پر ملے گی۔ مثلاً گیہوں۔ روئی۔ کھانڈ اور نقدی۔ اور اس طرح کاشتکاری میں ایک خاص توازن قائم رکھتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے۔ کہ وہ گیہوں اور چنے ایک کھیت میں ملا جلا دیتا ہے۔ اگر بارشیں نہ ہوں تو چنے سرسبز ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کثرت سے ہوں تو گیہوں۔ موسم بہار کی فصل کیلئے ہلائی کا کام نہایت زوروں پر ہے۔ اور ایک کھیت میں ایک عورت ہل کی بنائی ہوئی لکیر میں بیج ڈالتی ہوئی ہل کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ جب گیہوں دوپہر میں بوئی جائے اور نمی شکل سے کافی ہو۔ تو

یہی طریقہ ہے لیکن دیسی بارشوں کے بعد جبکہ مٹی بہت کافی ہوتی ہے۔ بیج بکھیرا جاتا ہے۔

دیسی بھائی چارہ:۔ دیسی بھائی چارہ کے مختلف طریقے ابھی تک راجپوتوں کے گاؤں میں باقی ہیں۔ جب کوئی مرجاتا ہے۔ تو وہ ہر شخص جو کریا کرم میں شامل ہوتا ہے۔ اپنے ساتھ لکڑی کا ایک پودا یا درخت کی ٹہنی چتا کے لئے لاتا ہے۔ شادی کے وقت ہر ایک مہمان کچھ نقدی پیش کرتا ہے۔ جس کی تعداد ایک روپیہ سے لے کر دس روپے تک ہوتی ہے۔ اسے نیوتا کہتے ہیں اور بعض کپڑوں کا جوڑا بھی دیتے ہیں اگر رشتہ قریبی ہو۔ تو وہ کھانا بھی لے آتا ہے۔ تاکہ رسد میں مدد مل سکے۔ اور گاؤں تمام برادری مہمانوں کے لئے خیمے لگانے۔ پانی اور ایندھن جمع کرنے کے لئے نکل پڑتی ہے۔ اور مہمانوں کے آرام کا خیال رکھتی ہے۔ فصل کے موقع پر اگر ایک آدمی اپنی ساری فصل نہیں کاٹ سکتا۔ تو وہ رسم آہیت پر عمل کرتے ہوئے اپنے پڑوسیوں کو بلا لیتا ہے۔ اور اُن کی امداد کے صلے میں دوپہر کے وقت ان کو کھیر کی اور غالباً بکرے کے گوشت کی دعوت دیتا ہے۔

جہاں کہیں فصلوں کو اٹھتے ہوئے طوفان سے بچانے کے لئے پشتے باندھے ہوئے ہیں۔ اُن کی مرمت ہر سال عوام کی کوشش سے کی جاتی ہے۔ اور اسی طرح گاؤں کے "نالایوں کی بھی۔ چوری اور نقصان سے فصلوں کی حفاظت کے لئے اکثر ایک رکھوالا ملازم رکھا جاتا ہے۔ اور اسی طرح ایک چرواہا مویشی چرانے کے لئے۔ مسافروں کو ٹھہرانے کیلئے کوئی انتظام نہیں ہے۔ اگر کوئی مندر ہو۔ تو اپنی رات وہاں گزار لیتے ہیں۔ ورنہ انہیں کسی ایسے شخص کی مہمان نوازی کی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ جس کے گھر میں بیٹھک ہو۔

زمانہ کی ایک اور تبدیلی جو میرے معمّر راجپوت ساتھیوں میں سے ایک نے محسوس کی یہ تھی۔ کہ وہ اُن برائیوں سے جن سے سرکار انگریزی نے ملک کو نجات دلائی ہے۔ بالکل ناواقف تھے۔ اُس کی جوانی کے ایام میں بہت سے لوگ اُن کی یاد دلایا کرتے تھے۔ اور اُن کی داستانیں سنایا کرتے تھے۔ جب یہ آواز سُنی جایا کرتی تھی۔ اپنی عورتوں اور جواہرات کو بچاؤ۔ لیکن نئی نسل اس سے بالکل بے خبر ہے۔

(۷ میل)

۹ ردسمبر - چترّو سے اُونہ براستہ پام جوار

ایک پُرانی انجمن امداد باہمی :- آج صبح ناشتے کے وقت دوکز دھار کا تمام منظر میرے سامنے تھا۔ برف پڑی ہوئی تھی۔ اور بادل کا نشان نہ تھا۔ نیچے نیلی گھاٹیاں اوپر زردی مائل نیلا آسمان تھا۔ ہم چترّو سے ۱۱ بجے روانہ ہوئے تھے۔ لیکن چونکہ راستے میں ایک بینکنگ یونین اور ایک پنچایت کا معائنہ کرنا تھا۔ اسلئے چھ بجے تک اُونہ پہنچے۔ یونین کا صدر مقام پنجاور میں ہے۔ جہاں ۱۸۹۱ء میں گاؤں کی مشترکہ زمین پر قابو رکھنے کے لئے ایک انجمن امداد باہمی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ پنجاب اور غالباً ہندوستان میں سب سے پہلے یہی انجمن جاری کی گئی تھی۔ یہ ایکٹ انجمن ہائے امداد باہمی کے منظور ہونے سے بہت پہلے جاری کی گئی تھی۔

ایک نیک جاگیردار :- ۱۹۲۲ء میں جبکہ زمین کے حصے بخرے کر دئے گئے۔ انجمن بھی بند کر دی گئی۔ راستے کے کچھ حصے تک ایک ہندو راجپوت۔ جو کہ انجمن امداد باہمی کا سرگرم ممبر اور تحصیل کا بہترین جاگیردار ہے۔ میرے ساتھ ہے۔ اُس کے پاس تقریباً پانسو ایکڑ زمین ہے۔ اور کسی نے بتایا کہ وہ خود تکلیف اٹھا لیتا ہے۔ لیکن اپنے مزارع کو تکلیف نہیں پہنچنے دیتا۔ ایک دوسرے راجپوت نے بتایا۔ کہ سب سے بڑی خدمت جو ایک جاگیردار اپنے مزارعین کے لئے کر سکتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ وہ اُن کے جھگڑوں کا فیصلہ کر دے۔ اور اگر اُس پر اعتبار بیٹھ جائے۔ تو وہ اپنے تمام جھگڑے اُسی کے پاس لاتے ہیں۔ وہ اُن کو ظلم سے بھی محفوظ رکھ سکتا ہے۔ حال ہی میں ایک ساہوکار نے میاں کے ایک مزارع کے ساتھ حساب بیباق کرنے سے انکار کر دیا۔ بلاشبہ اُس کی مرضی یہ تھی۔ کہ وہ اُس کا مقروض رہے۔ جو کچھ اُسے دیا جا رہا تھا۔ نہ وہ اُسے قبول کرتا تھا۔ اور نہ رسید دیتا تھا۔ میاں نے اُسے بلوایا۔ اور اُس کی موجودگی میں معاملہ صاف کر دیا۔ ایک اچھا جاگیردار اپنے مزارعین کو بغیر سود کے روپیہ ادھار دے کر بھی امداد کر سکتا ہے۔ میاں ایسا کرتا ہے۔ اور ان کو اچھا بیج بھی مہیا کرتا ہے۔ اس میں اُس کا اپنا فائدہ ہے۔ کیونکہ وہ پیداوار کا نصف لیتا ہے۔ اس لئے وہ مختلف قسم کے بیجوں کا تجربہ کر رہا ہے۔ چنانچہ پچھلے سال بھی اس نے گیہوں والی زمین کے

تین چوتھائی حصہ میں نئی نئی قسموں کی گیہوں بوئی تھی۔

مذہبی تعلیم :- پنجاب میں شاذ ہی کوئی شخص ایسا ہوگا۔ جس کا کوئی مذہب نہ ہو۔ میاں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ وہ دن میں دو دفعہ پوجا کرتا ہے۔ پون گھنٹہ صبح اور پندرہ منٹ شام کو۔ اُس نے بتایا۔ کہ یہ اُس کی ماں کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اُس کے گاؤں میں جہاں ۲۵۰۰ کی آبادی ہے۔ تین مندر ہیں۔ لیکن اُن کے پروہتوں میں سے کوئی کسی قسم کی تعلیم نہیں دیتا۔ البتہ یہاں پر ایک برہمن ہے جس کے خاندان کو عرصہ ہوا۔ نو ایکڑ زمین بخش دی گئی تھی۔ اُس کے عوض میں وہ کبھی کبھی رامائن۔ شاستر اور کرشن مہاراج کی کہانی مجتمع دیہاتیوں کو پڑھ کر سُنا دیتا ہے۔ اس تحصیل کے جنوب میں بمقام اندپور۔ ایک نہایت پرہیزگار ساد ہو رہتا ہے۔ جو تحصیل اور ضلع کانگڑہ کے گرد و نواح کا دورہ کرتا ہے۔ اور لوگوں کو مقدس کتابیں پڑھ کر سناتا ہے۔ اس کی اتنی عزت کی جاتی ہے۔ کہ لوگ اسے پالکی میں موضع بموضع بغیر اُجرت کے لے جاتے ہیں۔ میرے ایک راجپوت ہمراہی نے بتایا۔ کہ اکثر ہندو ہر روز پوجا نہیں کرتے۔ لیکن غیر رسمی ذرائع سے انہیں مذہبی تعلیم کی کافی معلومات ہو جاتی ہیں۔

مویشی اور مذہب :- جوان بچھڑے اختہ کرنے پر اعتراض نہیں کیا جاتا۔ مگر بیکار گائے یا بیل کے بیچنے سے سخت اجتناب کیا جاتا ہے۔ لیکن بھینس کی فروخت کے متعلق جذبات اتنے سخت نہیں ہیں۔ ہندوؤں میں گائے پوتر جانور ہے۔ اور اُس کے بچھڑے بھی اس تقدس میں حصہ لیتے ہیں۔ پنجاور میں جو کوئی ان دونوں میں سے کسی کو بیچتا ہے۔ اُس کا حقہ پانی بند کر دیا جاتا ہے۔ اور اگر ممکن ہو۔ تو تمام گاؤں فروخت شدہ مویشی کو خرید کر واپس لے لیتا ہے۔ دوسروں نے بتایا۔ کہ یہی حال اُن کے گاؤں میں ہے۔ انہوں نے اس طریقہ کی حمایت کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ بوڑھے مویشیوں کو چرنے کے لئے باہر نکال دیا جا سکتا ہے۔ اور اُن کے رکھنے پر کوئی خرچ نہیں آتا۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے اس حقیقت کو مد نظر نہ رکھا۔ کہ اگر پچھلے ہفتہ بارش نہ ہوتی۔ تو چارہ کس قدر کمیاب ہو جاتا۔ اور اب بھی گھاس حاصل کرنا مشکل ہے۔ اس کے ساتھ ہی مویشیوں کو فصلوں میں جا گھسنے کی عادت ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سے انہیں مار مار کر باہر دھکیل دیا جاتا ہے۔ اور اکثر ایسی چوٹیں ماری جاتی ہیں۔ جن سے بعض اوقات خطرناک

زخم ہو جاتے ہیں۔ اب بھی یہ رواج ہے۔ کہ کنبہ کی گائے کے لئے تھوڑا سا آٹا مزدہ علیحدہ رکھا جاتا ہے۔ اور مہینے کے پہلے دن ہر ایک گائے اور بیل کو آدھ سیر آٹا اور نمک دیا جاتا ہے۔ ہر کوئی اندازہ لگا سکتا ہے۔ کہ ابتدا میں یہ بات برہمنوں نے مویشیوں کو تندرست رکھنے کیلئے تجویز کی ہوگی۔ کیونکہ گاؤں میں ہندوؤں کی مذہبی رسومات میں سے اکثر کی بنیاد فوائد پر ہے۔ اسی قسم کی ایک دوسری رسم یہ ہے۔ کہ نمک کا ایک بڑا ڈلا گزرنے والے مویشیوں کے لئے راستے کے ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ اس وقت کیا جاتا ہے۔ جبکہ خاندانی جوتشی یہ بات معلوم کرتے ہیں۔ کہ ستارے گردش میں ہیں۔ اور کسی مصیبت کی دھمکی دیتے ہیں۔ ایک دن گزرتے ہم نے اُن میں سے ایک ڈلا گیلا اور دھوپ میں چمکتا ہوا دیکھا تھا۔

جادو :- جب مویشی بیمار ہو جاتے ہیں۔ تو لوگ گائے کی عظمت کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے گاؤں کے گرد آٹا چھڑکنے یا ٹوٹے ہوئے برتن کے کسی ٹکڑے پر منتر لکھ کر راستے کے آر پار لٹکا کر مویشیوں کو اس کے نیچے گذارنے کو کسی بیطار سے مشورہ لینے کی نسبت بہتر سمجھتے ہیں۔ ابھی تک جادو ٹونے پر اعتقاد بہت راسخ ہے۔ ہم میں اکثر اس پرانی ہندوانہ کہاوت سے اتفاق کرینگے۔ کہ جس طرح انسان اپنی محنت پر اعتقاد رکھنے سے اُس کا پھل اُٹھاتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ منتروں پر اعتقاد رکھے تو اُن سے بھی فائدہ حاصل کرے گا۔ بعض گھرانے خاص بیماریوں کے لئے نہایت پرتاثیر منتر جانتے ہیں۔ یہ اُن میں نسلاً بعد نسل چلے آئے ہیں۔ مثال کے طور پر قریب کے ایک سکھ بڑھئی کا ذکر کیا گیا۔ اسی طرح دوسروں کو عجیب عجیب خاصیتوں کے منتر ملے ہوئے ہیں۔ میرے ایک راجپوت ہمراہی نے دعوٰے کیا۔ کہ ہمارے گاؤں میں ایک شخص جو بیوی کی طرف سے میرا رشتہ دار ہے۔ مارگزیدہ کے علاج کا ماہر ہے میں نے اسے ایک زہریلے سانپ پر آزماتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

ستی :- اسی راجپوت نے مجھے عجیب باتیں بتائیں۔ اُس نے بتایا۔ کہ میری ماں میرے باپ کے مرنے کے دو گھنٹے بعد انتقال کر گئی۔ اس لئے نہیں کہ وہ بیمار تھی کیونکہ وہ بالکل اچھی تھی۔ اور اس کی تیمارداری کر رہی تھی۔ بلکہ انتہائی غم کی وجہ سے اور اس لئے کہ وہ یہ نہیں چاہتی تھی۔ کہ اس سے جدا کی جائے۔ ضروری غسل کرنے کے بعد وہ اس کے پاس لیٹ گئی۔ اور اپنے آپ کو ایک چادر

سے ڈھانپ لیا۔ اور تھوڑی دیر بعد جب اسے اٹھایا گیا۔ تو وہ مردہ تھی۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے۔ جو بظاہر روحانی ستی معلوم ہوتا ہے۔ جس میں روح جسم کو بھسم کر دیتی ہے۔ اس نے یہ بیان کیا۔ کہ جنگِ عظیم کے دوران میں اسی طرح کانگڑہ کی ایک راجپوت عورت نے یہ سن کر کہ اس کا خاوند مارا گیا تھا۔ اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند کر لیا تھا۔ اور اگلی صبح وہ گھر راکھ کا ایک ڈھیر تھا۔ رسالے کے ایک مستعفی افسر نے جو ہمارے ساتھ تھا۔ راجپوت کے ساتھ اس امر پر اتفاق کیا اور کہا کہ اگر ستی کی بندش اڑا دی گئی۔ تو یہ پھر عام ہو جائے گی۔ ایک اور شخص جو ہندوستان سے خوب واقف ہے۔ یہ کہتا ہے۔ کہ ستی کا حقیقی نصب العین یعنی یہ کہ۔ بیوی خاوند کے ساتھ مرجانے کو زندگی پر ترجیح دیتی ہے۔ اب بھی پرزور طریق سے پیشِ نظر ہے۔

مقدس درخت:۔ جب اس راجپوت کا باپ مرا۔ تو اس نے ایک سو ایک ۱۰۱ مرتبہ اپنے گاؤں کے پیپل کے درخت کے گرد دھاگا لپیٹا۔ اور ۱۰۱ مرتبہ اس پر پانی چڑھا کر چھڑکا۔ بعض اس طریق سے پیپل کے درخت کی پوجا کرتے ہیں۔ اور یہ اتنا مقدس درخت ہے۔ کہ اسے کبھی نہیں کاٹنے دیا جاتا۔ اور اسے گر جانے پر بھی ایندھن کے طور پر نہیں استعمال کرتے یہ غالباً اس کی طویل زندگی کے لئے خراج ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ اس کے سائے کے لئے جس کی وجہ سے سب کو اسے عزیز سمجھنا چاہیئے۔ گرمی کے موسم میں یہ گاؤں کا بڑا کمرہ بن جاتا ہے۔ جہاں لوگ آپس میں ملتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔ حقہ پیتے ہیں۔ اور آرام لیتے ہیں۔ اور جب کہ بعض لوگوں کا یقین ہے۔ دیوتا خود اس کی شاخوں پر بیٹھتے ہیں۔ اور اس وقت جبکہ اس کے پتے ہلکی ہلکی ہوا میں سرسراتے ہیں۔ وہ ان کا راگ سنتے ہیں۔ بڑ کا درخت اس سے کم مقدس ہے۔ لیکن گرانے یہ بھی نہیں دیا جاتا۔ پوجا اکثر گاؤں کے مندروں میں کی جاتی ہے۔ اور مندر کی گھنٹیاں بجانا اور پروہت سے اپنے ماتھے پر ٹیکہ کا سرخ نشان لگوانا اسمیں شامل ہوتا ہے۔

پروہت:۔ کانگڑہ میں مندر کا پجاری عام طور پر پڑھا لکھا ہوتا ہے۔ لیکن لونہ میں شاذ ہی ایسا ہوتا ہے۔ یہ پجاری مہینے میں ایک یا دو مرتبہ لوگوں کے سامنے مہا بھارت شاستر اور ہندوؤں کی دوسری کتابیں پڑھتا ہے۔ اس کے مطابق کبھی صرف آدمیوں کو۔ کبھی عورتوں کو اور کبھی دونوں کو پڑھ کر سناتا ہے۔ پروہت یا خاندانی پجاری کو اگر وہ اپنا کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو ضرور تعلیم یافتہ ہونا چاہیئے۔

کیونکہ اسے زائچے ڈالنے پڑتے ہیں۔ اور مبارک ساعتوں اور موسموں کے متعلق خبر دینی ہوتی ہے۔ پیغام لے جانے پڑتے ہیں۔ دیہ فرض وہ حجام کے ساتھ مل کر ادا کرتا ہے۔) اور مشکلات کے وقت اسے خود مشورہ کرنا اور دوسروں کو مشورہ دینا پڑتا ہے۔ حجام کے ساتھ وہ گاؤں کا سب سے معتبر ملازم شمار کیا جاتا ہے۔ اور فصل کے موقعہ پر اس کے برابر غلّہ لیتا ہے۔ شادی کے موقع پر وہ عام طور پر پندرہ یا بیس روپے لیتا ہے۔

مذہبی دستورالعمل کے متعلق ایک دلچسپ نکتہ یہ ہے۔ کہ مسلمان راجپوت اب تک بہت سی ہندوانہ رسوم بجالاتے ہیں۔ اور مندر کے پجاری یا پروہت کو بھی شادی پر بلاتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہندو اور مسلمانوں میں کشیدگی کی طرف رجحان ہے۔ ایک مسلمان افسر نے جو میری ملاقات کے لئے چرّو آیا۔ یہ کہا کہ میرے زمانے میں فرقہ بندی کو سب سے زیادہ ترقی ہوئی ہے۔ جب میں لڑکا تھا۔ تو میرے والد جو کہ لمواکر تھے۔ ایک بنیئے کو دوست رکھتے تھے۔ اور دونو ایک دوسرے کو بھائی کہتے تھے۔ اور میں اور اُس بنیئے کا لڑکا بھی اسی طرح رہتے تھے۔ بنیئے کا لڑکا لمواکر کو والد کہا کرتا تھا۔ اور اسی طرح ازراہِ ادب اس کے پاؤں پڑتا تھا۔ گویا وہ اُس کا بیٹا تھا۔ اب یہ بات ناممکن ہے۔ لیکن وادی میں اصل کشیدگی راجپوت اور برہمن میں ہے۔ ایک کہتا ہے۔ کہ یہ ہنگامہ انتخاب اور فرقہ پرستی کے خیالات کی وجہ سے ہے۔ دوسرے نے کہا۔ کہ یہ دیہاتی بکھیڑوں کی وجہ سے ہے۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ وادی میں آگ لگی ہوئی ہے۔ بچاؤ کا باعزت ذریعہ یہ ہے۔ کہ امداد باہمی کی انجمنیں اپنے دروازے سب ذاتوں کیلئے یہاں تک کہ اچھوت قوم کیلئے بھی کھول دیں۔

ایک پسماندہ وادی :- دریائے ستلج کا ایک پایاب معاون سوان اُونہ کی وادی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ہم نے اس کے پُرسکون بہتے ہوئے پانی کو آج دو دفعہ عبور کیا۔ دوسری مرتبہ اُس وقت جبکہ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اُس وقت کوئی چیز اتنی خوبصورت نہ تھی جتنی کہ سرکنڈہ گھاس کی وہ روشنی جس سے وہ مجلّا سونے کی طرح چمک رہی تھی۔ اور دور افتادہ دَولہ دھار کی آب وتاب جس کی برفانی فصیل پر آگ لگی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ انجمن امداد باہمی آبادکار اُونہ کے نزدیک دریا کے طاس میں بہت سی

سرکنڈہ گھاس لگائی ہے۔ جس سے اُس کے ممبروں کو بہت فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ نہ صرف گھاس قیمتی ہی ہے۔ بلکہ یہ زمین کو بہ جانے سے بھی بچاتی ہے۔ اور اس کی تحصیل کو سخت ضرورت ہے۔

وادی کا ایک خوشنما پہلو جسے ایک تحریر میں جو میں نے آج دیکھی۔ پسماندہ وادی کے لفظ سے ظاہر کیا گیا تھا۔ یہ ہے۔ کہ بے شمار گھروں کے احاطے کھیتوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کسان کھیت میں رہنے کے فوائد کی قدر کرتا ہے۔ ہم ایک احاطے کے مابین سے گزرے۔ جس کا مالک ایک راجپوت تھا۔ اُس نے حال ہی میں سبزی کی کاشت شروع کی ہے۔ اور اب اُس کے پاس گاجروں کا ایک کھیت تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ سبزیاں۔ لوئے کے خلاف راجپوتوں کا دیرینہ اعتقاد کمزور ہوتا جارہا ہے۔ میرے راجپوت ہمراہیوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی۔ جب ہم اُونہ میں داخل ہوئے۔ تو کمہاروں کے ایک گروہ سے ملے جو ایک نوجوان کی شادی کے لئے چالیس میل سے آئے تھے۔ یہ نوجوان پھولوں کے ہار پہنے ہوئے اُن میں موجود تھا۔ اس ملک میں غریب سے غریب کے لئے بھی ایک دن عزت و مبارک باد کا ضرور ہوتا ہے۔ پچیس آدمی نوجوان کمہار کے ساتھ آئے تھے۔ اور شادی کے لئے تین رات ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ شادیوں کے گراں قدر اخراجات کی ایک وجہ یہ بڑی بڑی براتیں ہیں۔ یہ قیاس کیا گیا تھا۔ کہ اس شادی پر دُلہا کے ایک ہزار روپے صرف ہو جائیں گے۔ اس لئے عزت و مبارکبادی کا دن بہت گراں قیمت پر خریدا جاتا ہے۔

(۱۵ میل)

۱۰ دسمبر اُونہ سے بجول

واجباتِ جاگیرداری:۔ آج صبح ایک مال افسر جو اس علاقے سے خوب واقف ہے۔ میری ملاقات کے لئے آیا۔ وہ کہتا ہے۔ کہ اب مزارعین اپنے جاگیرداروں کے لئے بیگار پر کام کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ پرانے زمانے میں شادی پر مزدوروں کا تمام کام یہی کرتے تھے۔ اور براہمن مزارع کو کھانا پکانے کا کام کرنا پڑتا تھا۔ ان کو باری باری اپنے مالکوں کے گھروں کی نگہبانی و حفاظت بھی کرنی پڑتی تھی۔ پانسو سال گزرے بھائی نظام (اسٹوریشن) سے پہلے

انگلستان و فرانس میں بھی یہی دستور تھا۔ اب اس قسم کی تمام خدمات بند کر دی
لئی ہیں۔ اور بغیر اجرت کے چمار تک دلہن کی پالکی کو اٹھانے سے انکار کر دیتے
ہیں۔ کیونکہ وہ ایک دن کا ایک روپیہ لیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی کھانا بھی۔ اور ہر ایک
پالکی کو اٹھانے کیلئے چھ کہار درکار ہوتے ہیں۔ پالکی کی بجائے دُلہا گھوڑے پر بیٹھتا
ہے۔ گزشتہ سال چماروں نے اپنے ایک اجلاس میں یہ تجویز منظور کی کہ وہ
پٹواری کے لگان کے کاغذات کی گٹھڑی بغیر اجرت کے نہیں لیجائیں گے یہی وجہ تھی
کہ حسب دستور پڑتال کے لئے گاؤں کے حقوق کے کاغذات اگلے دن لانے پڑے
تھے۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ پٹواریوں کو مجبور کر دیا گیا تھا۔ کہ یا تو وہ چماروں کو کچھ ادا کریں
یا ایک اونٹ یا خچر کرائے پر لیں۔

ساہوکار:۔ تحصیل کا ایک خوشگوار پہلو یہ ہے۔ کہ ساہوکار کو زیادہ برا نہیں کہا
جاتا۔ بڑی سے بڑی بات جو اس کے خلاف کہی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب کھاتے پیتے لوگ اسے
روپیہ دیتے ہیں۔ تو وہ انکار کر دیتا ہے۔ اور غریبوں کے ساتھ سختی سے پیش آتا
ہے۔ حاصل کلام یہ کہ راجپوت محض اس لئے کہ سپاہیانہ پیشہ ان کی مالی اور
تعلیمی حالت کو نہایت مستحکم بنا دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ کھڑے رہ سکتے
ہیں۔ دولت پور کے نواح میں یہ امر خاص طور پر اسی طرح ہے۔ اور سود کی عام شرح
۱۲ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ امب کے گردو نواح میں جہاں کے لوگ بہت
کم بھرتی ہوتے ہیں۔ شرح سود وہی ۱۸ فیصدی روپیہ ہے۔ اور آگے جنوب
میں انند پور کے اردگرد جہاں بالکل کوئی بھرتی نہیں ہوتا۔ سود کی عام شرح ۲۵
یا ۳۷½ فیصدی ہے۔ اور ساہوکار من مانی کارروائی کرا سکتا ہے۔

شادی کی دعوتیں:۔ اونہ کو چھوڑ کر ہم نے پھر دریائے سوان کو عبور کیا۔ اور
پہاڑیوں کی دوسری طرف چڑھے اور راوی سے پرے۔ جموں کی پہاڑیوں سے لے کر
برف سے ڈھکی ہوئی چوڑی چوٹی تک ہمالیہ پہاڑ کا منظر دیکھا۔ یہ چوٹی دریائے چناب
پر جھکی ہوئی ہے۔ جو یہاں سے سو میل سے کچھ زیادہ فاصلے پر واقع ہے۔ ہمیں سڑک
پر بہت سی براتیں ملیں۔ ایک غریب ستوں کی تھی۔ جنہوں نے ۱۲۰۰ روپے خرچ کر
دئے تھے۔ اور دوسری سکھ جاٹوں کی جنہوں نے دو ہزار روپیہ خرچ کر دئے تھے
اس پر بھی دُلہا جو کہ بے داغ چوڑی دار پاجامے کے ساتھ خاکی لباس میں
محجوب تھا۔ اُس کے پاس صرف ۱۲ ایکڑ زمین گزارے کے لئے تھی۔ سکھوں

کے پاس سامان اٹھانے کیلئے دو اونٹ تھے۔ لیکن سقے جو تیزی سے جا رہے تھے۔
نفیروں کا باجہ اور دو علم بردار ساتھ لئے ہوئے تھے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک بیس
فٹ لمبے بانس پر ایک بڑا جھنڈا لئے جا رہا تھا۔ باجہ کرائے پر سستا ہی مل جاتا ہے۔
ہم اُن باجہ والوں سے ملے جو شادی سے واپس آرہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ۸۰ روپے
کے لئے ۲۰ میل گئے تھے۔ قیاس یہ ہے کہ انہیں کھانا بھی دیا گیا تھا۔ بعض براتوں
کے ساتھ پالکیاں تھیں۔ جن میں دُلہن سرخ پردوں میں بالکل چھپی ہوئی تھی۔ ان میں
سے ایک میں سے جس میں کسی سقے کی لڑکی تھی سسکیوں کی آواز آرہی تھی لیکن
یہ اردگرد کے جشن منانے والوں کی کوئی توجہ اپنی طرف نہیں کھینچتی تھی۔

کامل جوتشی :۔ چونکہ ہم پہاڑیوں پر سے میدان میں اُترنے والی سڑکوں میں سے
ایک پر چل رہے تھے۔ اس لئے جن لوگوں سے ہم ملے وہ بہت تھے۔ اور مختلف قسم
کے تھے۔ ان میں سے ایک ضعیف خاندانی پروہت تھا۔ جو ایک راجپوت کی شادی
سے واپس آرہا تھا۔ جس میں اس نے ضروری رسومات ادا کیں تھیں۔ ہمیں ایک
راجپوت ملا۔ جس کے سر پر قوس و قزح کے رنگ کا کپڑوں سے بھرا ہوا ایک ٹرنک
تھا۔ یہ کپڑے اس نے حال ہی میں امرتسر سے خریدے تھے۔ اور ابھی تیس میل اور
چلنا تھا۔ زمانہ کی نیرنگیوں کی علامات کا ایک نظارہ یہ تھا۔ کہ سڑک پر دو مسافر پہلو بہ
پہلو چل رہے تھے۔ اُن میں سے ایک سیاہ بوٹ پہنے ہوئے اور دوسرا ننگے پاؤں
اور ہاتھ میں دیسی جوتیوں کا جوڑا اٹھائے ہوئے تھا۔ اس سے بھی زیادہ قابل بیان
ایک نوجوان جوتشی ہے۔ جو نوق ابھڑک لباس پہنے کندھے پر بھوری دھاریوں والی
لوئی لئے جا رہا تھا۔ اس علم کو حاصل کرنے کے لئے اُس نے بنارس کے ایک کالج میں
تین سال گذارے تھے۔ اُس نے بتایا۔ کہ اب زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ پرانے زمانے
میں کاشتکار جوتشی سے یہ رائے لئے بغیر کہ کب کام شروع کریں۔ نہ ہل چلاتے تھے
نہ بوتے تھے اور نہ کاٹتے تھے۔ اب ایسے لوگ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اور نہ ہی آئندہ
لوگ ساحرانہ تاویلوں کو قبول کیا کریں گے۔ لیکن خوش قسمتی سے ایسے بہت ہیں۔ جو
یہ جاننا چاہتے ہیں۔ کہ بیٹا کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اُن کے بچوں کے لئے کون
سی بات بہتر ہے۔ اور وہ اپنے مقدمہ یا سفر کو کب اور کس طرف شروع کریں۔ یا
کسی مہم میں کب حصہ لیں۔ یہ لوگ ابھی تک ایسی ہدایات پر چلنے کے لئے تیار ہیں۔
جن کی بنیاد ستاروں کے اثرات پر ہے۔ لیکن ہر شے کو علم و تجربہ کی بنیاد پر پرکھنے

کا رجحان یا سائنس کی مانگ اس قدر زیادہ ہے۔ کہ اس کا ایک عنصر باقی ماندہ علوم
کے ساتھ ملانا پڑتا ہے۔ سو یہ کام وہ نہایت فراخ حوصلگی سے کرتا ہے۔ خدا کا شکر
ہے کہ وہ ابھی تک اپنی روزی کما لیتا ہے۔ وہ رنگیلا نوجوان پہاڑ کی عین بلندی پر
جہاں سے سڑک اونچی نیچی ہوتی ہوئی میدانوں کی طرف اترتی ہے۔ پرماتما کے ایک
بھگت برہمن نے مسافروں کے لئے ایک سرائے بنوائی ہوئی تھی۔ لیکن افسوس کہ زمانہ
کی موجودہ روش نے اس پر بھی اثر جما لیا تھا۔ اور اس کی دیواروں کو سگرٹوں کے
اشتہاروں نے بدنما کر دیا تھا۔ انسان خوبصورتی کی حس رکھنے کا دعوےٰ رکھتا ہے
لیکن جب اشتہار دینے والا مٹھی میں روپیہ لے کر آجاتا ہے۔ تو وہ کتنی جلدی روپیہ لے
کر حسین منظر کی قسمت روپیہ دہندہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ اور اس وسیع ملک کی حکومت
اپنے بدنام تار فارم کے ساتھ اس باب میں رہنمائی کرتی ہے۔

(۱۴ میل)

باب دوم ہوشیار پور۔ تحصیل گڑھ شنکر

۱۱ دسمبر جائیجان سے ماہل پور

گاؤں کے مالک خود کاشت کی مشکلات

ناکام ذریعہ آب رسانی :- آج صبح ہم پہاڑیوں سے باہر میدان میں نکلے۔ اور پھر سفید چیتوں والے کچے گھروں کے گاؤں کی حدود میں داخل ہو گئے۔ جہاں مویشی اور انسان بالکل اکٹھے رہتے ہیں۔ اور جس کی تنگ بل کھاتی ہوئی گلیوں میں ہوا سڑ جاتی ہے۔ اور گندگی جمع ہو جاتی ہے۔ اُونہ کے دیہات کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم تہذیب میں ایک درجہ نیچے اُتر آئے ہیں۔ تاہم گڑھ شنکر کی تحصیل جس میں ہم اب ہیں۔ اُونہ سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس میں زیادہ تر سکھ جاٹ آباد ہیں۔ صوبے میں مشکل سے کوئی تحصیل ایسی ہوگی۔ جہاں لوگوں نے اپنی کاشتکاری کے طریقوں کو ترقی دینے کے لئے اس سے زیادہ چارہ جوئی اور طاقت و جرآت سے کام لیا ہو۔ اور بیرون سنجات میں ملازمت کی نئی راہیں تلاش کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کیا ہو۔ آبادی اس قدر گنجان ہے۔ کہ فی کاشت شدہ مربع میل ۸۲۸ آدمی آباد ہیں۔ اور اوسطاً ہر مالک زمین کا زیر کاشت رقبہ ۵ ایکڑ سے کم ہے۔ زمین پر زیادہ زور اس لئے ہے۔ کہ یہاں بارش اچھی (۳۵ انچ) ہوتی ہے۔ اور کنوؤں سے آبپاشی کا رواج عام ہے۔ لیکن بدقسمتی سے پانی کی سطح روز بروز نیچے ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس کی وجہ سے کوئیں آئے دن بیکار ہوتے جا رہے ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں تحصیل میں ۱۷۳۳ کنوئیں تھے۔ اور ان میں ۱۶۰ غیر مستعمل تھے۔ ۱۹۱۸ء تک آخر الذکر کی تعداد ۷۷۴ تک پہنچ گئی۔ یہ اضافہ قریب قریب کلیتہً پانی کی سطح نیچی ہوجانے کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اوسط اندازے سے ۵۰۰ روپیہ فی کوئیں کے حساب کاشتکاروں کو تین لاکھ روپیہ کے بیش قیمت سرمائے کا نقصان پہنچا ہے۔ پھر بھی کاشتکار ایک خاص استقلال سے نئے اور گہرے کوئیں زمین میں اُتارتا رہتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی بیباکانہ کوشش اس چیز کا علاج کرنے میں صرف کرتا ہے۔ جو آخر

کار لا علاج ہو جائے گی۔ ماہل پور میں ۱۱ کوؤں میں سے ۹ بیکار ہیں۔ ایک سینی سبزی کی کاشت کرنے والے نے مجھے بتایا۔ کہ ہمارے گاؤں میں ۱۲ کوئیں تھے۔ اور وہ سب خشک ہو گئے ہیں۔ اور وہ سبزیاں جو خاص طور پر اسی گاؤں میں پیدا ہوتی تھیں اب نہیں اُگائی جا سکتیں۔ اسی لئے بہت سے لوگوں نے فوج میں بھرتی ہونے یا کہیں اِدھر اُدھر ملازمت حاصل کرنے کے لئے گاؤں کو چھوڑ دیا ہے۔ یہ بات تحصیل میں خاص طور پر پائی جاتی ہے۔ فوجی ملازمت یہاں اتنی عام نہیں جتنی کہ اُونہ میں۔ لیکن ضرورت کے لحاظ سے کافی ہے۔ اور یہ بقول اس صوبیدار کے جو میرے ہمراہ سوار تھا۔ اتنی ہر دلعزیز ہے۔ جتنی کہ ہو سکتی ہے۔ لوگ فوج میں کیوں بھرتی ہوتے ہیں؟ آیا یہ شوق کی وجہ سے ہے یا بھوک کی وجہ سے۔ اُس نے جواب دیا۔ کہ پہلے بھوک اور پھر شوق۔ اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ ۹۰ برس گذرے سلیمان دورے کے تذکرے میں بیان کرتا ہے۔ جب گھر کی ضرورت مجبور کرتی ہے۔ تو خواہ وہ کسی وجہ سے ہو (ٹیکس کی زیادتی سے یا افراد خانہ میں اضافہ ہونے سے) ایک بیٹے کے بعد دوسرا بیٹا ہماری رجمنٹوں میں بھرتی ہونے کیلئے بھیجا جاتا ہے۔

نقل مکان:۔ میرے ہمراہ ایک انسپکٹر گھوڑے پر سوار تھا۔ نو برس گذرے جب میں نے آخری مرتبہ اس کے ساتھ سواری کی تھی۔ میں نے پوچھا۔ کہ اُس وقت سے اب تک دیہات میں کیا تبدیلی آئی ہے۔ اس نے بتایا کہ بے شمار زمیندار ایسے ہیں۔ جن کے لئے کافی مشغولیت نہیں ہے۔ یہ امر اُس نے زمین کی متواتر تقسیم کی طرف منسوب کیا۔ دوسرے الفاظ میں آبادی کے اضافے کی طرف ۱۹۱۴ء میں افسر بندوبست نے دیکھا۔ کہ جائیدادیں پچھلے بندوبست کی نسبت کافی چھوٹی ہیں ہم قیاس کر سکتے ہیں۔ کہ اب وہ اس سے بھی زیادہ چھوٹی ہوں گی۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ اس قدر کنوؤں کے خشک ہو جانے سے تحصیل ایک ایسے علاقے کا افسوسناک نمونہ پیش کرتی ہے۔ جہاں اصلاحی تبدیلیوں کے بغیر کسان آیندہ اپنی زمین پر گزارہ نہیں کر سکتا۔ اس نے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کو نقل مکان کے لئے دھکیل دیا ہے۔ گذشتہ بارہ مہینے میں تقریباً ۱۲۰۰ عرضیاں پاسپورٹ کے لئے وصول ہوئی ہیں۔ لڑائی سے پہلے نقل مکان کے لئے پہلی جگہ اضلاع متحدہ امریکہ اور دوسری آسٹریلیا ہوئی تھی۔ لیکن اب ان دونوں ملکوں نے اپنے دروازے ہندوستان کے لئے بند کر دئے ہیں۔ اس لئے اِدھر

اُدھر جانے والوں کی نسبت زیادہ لوگ کینیا یا جزائر فجی جاتے ہیں۔
آج بینکنگ یونین کے اجلاس میں جس میں قریباً ۳۰ اشخاص شامل تھے۔ (دس یورپین طرز کے کوٹ پہنے ہوئے تھے) ہم نے اس امر پر بحث کی کہ آیا نقل مکان اچھی چیز ہے یا نہیں۔ سب نے اتفاق کیا کہ "ہے"۔ اور یہ کہ باہر سے واپس آیا ہوا شخص باہر رہنے کی وجہ سے کبھی سے بھی بڑی حالت میں نہ تھا۔ اور قریباً ہمیشہ روپیہ کماتا رہا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا ہے۔ جیسا کہ ایک شخص نے بتایا۔ کہ اگر بیس بھوکے مر رہے تھے۔ تو اُن کی بجائے بیس کو روٹی ملنے لگ گئی ہے۔ ایک بھوری داڑھی والے نے بتایا کہ میں نے جوانی کے ایام میں پندرہ سال امریکہ میں گذارے تھے۔ اور میں نے اپنے بیٹے کو خوشی سے وہاں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ دوسرے نے کہا۔ کہ امریکہ میں تکلیف کوئی نہیں ہے۔ انسان جس طرح چاہے کر سکتا ہے۔ وہاں زمین بھی کافی ہے۔ اور روپیہ بھی۔ اس کے برعکس یہاں زمین ناکافی ہے۔ اور روپیہ کمیاب۔ یہاں یہ بھی ہے کہ اگر تم غریب ہو۔ تو روپیہ ادھار نہیں لے سکتے۔ کیونکہ کوئی تمہیں روپیہ ادھار نہیں دے گا۔ سب کی رضامندی اس امر پر تھی۔ کہ اگر امریکہ اور اسٹریلیا کے دروازے کھول دئے گئے۔ تو جانے والوں کی بھیڑ لگ جائے گی۔ ایک کسان نے حال ہی میں میرے عملہ کے ممبروں میں سے ایک کو بتایا۔ کہ ہمارے گاؤں والوں کو صرف پاسپورٹ دے دو۔ اور ہم خوشی سے اپنی زمینیں یہیں چھوڑ دیں گے۔ میں نے بیکانیر کی نئی نہری بستی کی تدبیر سمجھائی۔ لیکن اس پر اعتراض کیا گیا۔ کہ وہاں زمین خریدنے کے لئے کافی روپیہ کی ضرورت ہے۔ اور وہاں ریت کے طوفان اس قدر پرزور ہوتے ہیں۔ کہ تمام پیداوار برباد کر دیتے ہیں۔ ۲۵ سال گزرے جب لائل پور کی بستی آباد کی گئی تھی۔ تو بہت کچھ اسی قسم کی باتیں کہی گئی تھیں نقل مکانی کئے ہوئے لوگوں میں ایک خاص تعداد شاید ۵ فیصدی شراب پیتے ہیں۔ اور بری عادتوں میں پھنس جاتے ہیں۔ واپسی پر ہر کوئی ہی زیادہ کام کرتا ہے۔ بلکہ سب روپیہ اپنے لئے مکان تعمیر کرانے اور بیویاں حاصل کرنے پر خرچ کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد پھر چلے جاتے ہیں۔ آخرکار اکثر گھر واپس آجاتے ہیں۔ لیکن بعض برائیوں میں پھنس جاتے ہیں۔ اور واپسی کا ٹکٹ نہیں خرید سکتے اور چند لوگ وہیں آباد ہو جاتے ہیں۔ میرے عملے کا ایک سکھ ممبر جو نقل مکانی کرنے والوں سے خوب واقف تھا۔ زیادہ نکتہ چینی کر رہا تھا۔ اُسی نے بتایا کہ

جب میں گاؤں میں واپس آیا۔ تو میں عام طور پر بے صبری کی حالت میں رہتا تھا اور جلد ہی میں نے اپنا تمام روپیہ صرف کر دیا۔ تاہم اس نے تسلیم کیا۔ کہ میں اشتمال اراضی کو پسندیدہ نظر سے دیکھتا ہوں۔ میں نے گاؤں کے بینک میں روپیہ جمع کرایا ہے۔ اور بعض اوقات کاشتکاری کے ترقی یافتہ ذرائع استعمال کئے ہیں۔ لیکن میرا خیال یہ ہے۔ کہ نقل مکانی سے دل و دماغ پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس نے ایک سکھ ساتھی نے جو باہر چلا گیا تھا۔ اسے یہاں تک کہ دیا تھا۔ کہ گرو گوبند سنگھ نے اُن کوششوں کے خلاف جو اسے اور اس کے پیروؤں کو مسلمان بنانے کے لئے کی گئیں۔ مقابلہ کرنے میں سخت غلطی کی تھی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج تمام سکھ مسلمان بن گئے ہوتے۔ اور اب ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ نہ ہوتے۔

ایک کفایت شعار فرقہ :- بال پور کے نزدیک بیس گاؤں کا ایک مشہور مجموعہ مہتوں کے قبضے میں ہے۔ وہ پرلے درجے کے کفایت شعار ہیں۔ انہیں دیکھ کر ایک کفایت شعار شیخ کی کہانی یاد آتی ہے۔ جس کے پاس اپنے اپنے ٹٹو اور اپنے مرغ اور خود اپنے کھانے کے لئے صرف دو پیسے تھے۔ اس نے تربوز خریدا چھلکا ٹٹو کو دیا۔ بیج مرغ کو اور باقی اپنے لئے رکھ لیا۔ تربوز یہاں کی خاص پیداوار ہے۔ اور جب پک جاتا ہے۔ تو اُن کی خوراک کا بڑا جزو بنتا ہے۔ اور وہ اس کے بیج تک پکا کر کھا جاتے ہیں۔ بہ حیثیت کاشتکار بہت ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ لیکن ان کی زمینیں اس قدر ٹکڑے ٹکڑے ہیں۔ اور اُن میں سے بعض اتنی چھوٹی ہیں۔ کہ نقشے پر بھی نہیں دکھائی جا سکتیں۔ جب توریے کے پتے توڑنے کے دن آتے ہیں۔ تو لوگوں کو کھیتوں کے انتشار سے فائدہ اٹھا کر پاس والے کی چوری کرنے سے روکنے کے لئے گاؤں کی طرف سے ایک تنخواہ دار محافظ فصل کی نگہبانی کرتا ہے۔ تاکہ وہ ہر کسی کو اُن کے چننے سے روکے رکھے۔ تاوقتیکہ ہر ایک اُسے شروع کرنے کے لئے تیار نہ ہو جائے۔ جب زمین میں ہل چلانا ہوتا ہے۔ یا فصل کاٹنی ہوتی ہے۔ تو سب کو اسے مقررہ وقت پر کرنا پڑتا ہے۔ جس کا اعلان منادی کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ انجمن امداد باہمی کے ذریعے اشتمال اراضی قدرتی طور پر ہر دلعزیز ہے۔ کیونکہ تھوڑی جائیداد اگر بے شمار ٹکڑوں میں گاؤں کے گرد بکھری ہوئی ہو۔ تو اس پر

گذارہ کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ جائداد کی کمی نے ان کو اور سینکڑوں دوسروں کو فوج میں جانے کے لئے مجبور کر دیا ہے۔ لیکن اس نے انہیں کافی سرمایہ فراہم کرنے سے نہیں روکا۔ کیونکہ وہ نہ صرف اچھے کاشتکار اور کفایت شعار ہی ہیں۔ بلکہ انتہائی درجے کے محنتی بھی ہیں۔ ایک گاؤں کے بینک میں جہاں صرف ۸۰ گھر ہیں۔ ماہل پور یونین کے پاس پچاس ہزار روپیہ جمع ہے۔ اور بینک کے صرف چار ممبر مقروض ہیں۔ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اُن کے خوشحال ہونے کی دوسری وجہ جو نہایت نمایاں ہیں۔ یہ ہے کہ یہ لوگ شادیوں پر بہت کم خرچ کرتے ہیں۔ عام طور پر ۲۵۰ روپے سے زیادہ خرچ نہیں۔

جاٹوں کی شادیاں:۔ شادی پر جاٹ کا اسی قدر خرچ ہوتا ہے۔ جتنا کہ راجپوت کا۔ لیکن جاٹ نہایت دور اندیش ہیں۔ اور بہت سے بیویاں خریدنے ضلع سے باہر مثلاً کانگڑہ میں، ہمیرپور اور شملے کے جنوب میں پہاڑی ریاستوں میں اور اس سے بھی آگے مغرب میں بیکانیر اور مشرق میں گیا اور بنارس تک چلے جاتے ہیں۔ جہاں پنجاب کی طرح عورتیں کمیاب ہونے کی وجہ سے قیمتاً نہیں دی جاتیں۔ اس طرح اگر گرد و نواح میں ایک یا دو ہزار روپیہ سے بیوی خریدی جاتی ہے۔ تو وہاں پانچ چھ روپیہ میں کام بن جاتا ہے۔ میرے مخبروں میں سے ایک نے جو کہ ایک افسر ہے۔ یہاں تک کہ دیا کہ جاٹوں میں سے ۷۵ فیصدی اپنی بیویاں دوسری ذاتوں میں سے لے آئے ہیں۔ اور زیادہ تر غریب ذاتوں میں سے پنجاب میں عورتوں کی نسبت ۲۰ لاکھ مردوں کی زیادتی کے یہ مہلک نتائج ہیں۔

۱۲ دسمبر ماہل پور سے گڑھ شنکر (۱۷ میل)

اشتمال اراضی:۔ اس سفر میں پہلے چند میل ہم ہوشیارپور سے گڑھ شنکر جانے والی اونچی سڑک پر چلے۔ یہ ایک اچھی پکی سڑک ہے۔ اور اس پہ سایہ خوب ہے۔ ہر چند لمحوں کے بعد لاریاں ہمارے پاس سے گزرتی تھیں۔ اب پیدل کوئی نہیں چلتا۔ اگرچہ میں ایک ننگے پاؤں جانے والے سے ملا۔ جو ہاتھ میں سیاہ جوتوں کا ایک جوڑا اُٹھائے لئے جا رہا تھا۔ ہم بہت سے بچوں سے ملے جو سکول جا رہے تھے۔ بعض سروں پر سلیٹیں اور کتابیں اُٹھائے ہوئے ایک

یا دو یا بیشکلوں پر اور باقی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں خوشی خوشی جا رہے تھے
ایک نوجوان سکھ بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ گرنتھ صاحب پڑھتا جا رہا تھا۔
یہ ایک ایسا نظارہ تھا۔ جو میں نے ہندوستانی شاہراہ پر کبھی نہیں دیکھا۔ کوئی
شاذ ہی یہ دیکھے گا۔ کہ کوئی ہندوستانی اپنی فرصت کے لمحات میں پڑھتا ہو۔
لیکن بظاہر بہت سے اکالی سکھ اپنے ساتھ ایک جیبی گرنتھ صاحب لے جاتے
ہیں۔ تاکہ وہ فرصت میں پڑھیں۔ پیشِ نظر دوسرا نظارہ یہ تھا۔ کہ ایک سکھ اپنی
زمین میں کام کر رہا تھا۔ اور اُس کے پاس ہی سڑک کے کنارے ایک شکستہ
حال چھپر تھا۔ یہ چھپر اُس نے اپنے مویشیوں کے لئے بنایا تھا۔ اور رات کو اُس
کے کنبے میں سے ہر ایک آدمی اُن کی رکھوالی کے لئے وہاں سوتا تھا۔ یہ صورت
حال گاؤں چھوڑنے اور اپنی زمینوں پر رہنے کے انتہائی اشتیاق پر روشنی
ڈالتی ہے۔ لیکن یہ اُس وقت تک مشکل ہے۔ جب تک کہ اشتمال اراضی نہ
ہو جائے۔ کیونکہ فی الحال دنیا کے اس حصے میں زمینیں ناقابل یقین ٹکڑوں میں
منقسم ہیں۔ اُس سکھ نے بتایا۔ کہ میرے پانچ چھ کھیت ہیں۔ جو گاؤں کے
گرد بکھرے ہوئے ہیں۔ اور میں خوشی سے اپنی تمام زمین ایک جگہ کر دوں گا۔
بعد ازاں پوسی میں۔ جہاں میں ایک مقامی بینکنگ یونین کے اجلاس میں
شامل ہوا۔ بہت سے مالکانِ زمین نے یہ کہا۔ کہ ہماری زمینیں مشتمل کر دی جائیں
بہتوں نے اشتمال اراضی کے فوائد کو تسلیم کیا۔ اور کئی ایک نے کہا۔ کہ اسے
جاری کرنے کے لئے قانون ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کے لئے قیمت ادا کرنے
پر سب نے پرزور اعتراض کیا۔ اُنہوں نے کہا۔ کہ روپیہ کہاں سے آئے گا۔ میں
نے جواب دیا کہ تم شادیوں پر بہت کافی خرچ کرتے ہو۔ اُن میں سے ایک
نے کہا۔ اب کوئی شادی نہیں کراتا۔ ہم اُن کی استطاعت نہیں رکھتے۔ میں
نے پوچھا۔ پھر یہ بچے کہاں سے ہوئے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی میں نے صحن
کی دیواروں پر بیٹھے ہوئے چیتھڑے پوش گندے بچوں کے ہجوم کی طرف
اشارہ کیا۔ جس کا نظارہ معززین کے اجتماع کے وقت ہر گاؤں میں عام ہوتا ہے۔
نقل مکانی :۔ پوسی میں میرا خیر مقدم بینڈ سے کیا گیا۔ جس کے بجانے
والوں کے کوٹ سرخ تھے۔ بینڈ بجانے والے نو آدمی جو سب کے سب
اسی گاؤں کے مسلمان ہیں۔ سوائے شادیوں پر باجہ بجانے کے اور کچھ

نہیں کرتے۔ اس کے لئے انہیں کھانے کے علاوہ پچیس سے تیس روپے تک دئے جاتے ہیں۔ یونین کے اجلاس میں پھر نقل مکانی کے متعلق گفتگو ہوئی۔ اجلاس میں ایک صاف ستھرا بوڑھا آدمی تھا۔ جس نے ۲۲ سال اسٹریلیا میں گذارے تھے۔ اور جو ٹوٹوں کی دکان کر کے چھپن ہزار روپیہ لایا تھا۔ اُس نے کہا۔ کہ اسٹریلیا اس سے اچھا ملک ہے۔ کیونکہ وہ صاف اور پاکیزہ ہے۔ وہاں غیبدت یا مقدمہ بازی نہیں ہے۔ اور اُجرت معقول ہے۔ لیکن وہاں شراب خوری بہت ہے۔ اور بہت سے لوگ نشے میں چور ہو جاتے ہیں۔ ایک بے وطن شخص کا چھپن ہزار روپیہ لانا کسی طرح بھی سب سے بڑی رقم نہیں ہے۔ گورداسپور میں ایک راجپوت نے چار منزلہ مکان بنوایا ہے۔ اُس کے متعلق یہ شہرت ہے۔ کہ وہ اضلاع متحدہ امریکہ سے ایک لاکھ روپیہ لایا تھا۔ اٹلی کے جنوب میں نقل مکانی کر کے واپس آئے ہوئے لوگوں کے روپیہ نے سود خواروں کا تقریباً خاتمہ کر دیا ہے۔ لیکن نقل مکانی اور امداد باہمی کا اجتماعی اثر زیادہ تر ساہوکار کی طاقت کو کم کرنے پر پڑا ہے۔ اور زمیندار ساہوکاروں کی تعداد زیادہ ہونے سے یہ رجحان اور بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ ایسے ساہوکاروں کی تعداد دوسرے بہت سے ضلعوں کی نسبت یہاں بہت زیادہ ہے۔ یونین کے پریذیڈنٹ نے بتایا۔ کہ بہت سے پیشہ ور ساہوکاروں کو اپنا کام چھوڑنا پڑا ہے۔ اور پوسی میں سے جہاں کی آبادی ۲۷۰۰ نفوس پر مشتمل ہے۔ چار ساہوکار کہیں چلے گئے ہیں۔ اور انہوں نے اپنا روپیہ تجارت اور بیکانیر میں زمینیں خریدنے میں لگا دیا ہے۔

سبزیوں اور پھلوں کا باغ:۔ پوسی میں مجھے ایک چھ ایکڑ زمین میں پھلوں اور سبزیوں کا باغ دکھایا گیا۔ اس میں سنگترے۔ آم اور کیلے کے درخت اور تمباکو اور مرچوں کی فصلیں کھڑی تھیں۔ ابھی سال ہی گذرا۔ کہ یہ تمام زمین ریت ہی ریت تھی۔ بیس آدمیوں نے ۲۳ دن میں اسے صاف کیا۔ اور اس کی سطح کو درست حالت میں لانے کیلئے پانسو گڑھے کھاد کے ڈالے۔ پوسی کے باشندوں نے مالک زمین کو ممنون کرنے کے لئے کھاد اور مزدوری کے لئے کچھ نہیں لیا۔ کیونکہ باغ کے مالک نے یونین کے پریذیڈنٹ کی حیثیت سے امداد باہمی کی اچھی خدمات انجام دہی ہیں۔ وہ تین دن کی باری سے کام کرتے تھے۔ اور ملک کے رواج کے مطابق اس کے معاوضے میں دوپہر کا کھانا کھاتے تھے۔ سنگترے

کے درخت گوجرانوالہ سے لائے گئے تھے۔ کیلے کے درخت صوبہ بمبئی سے اور مالی یو پی سے۔ اب کوئیں کو گہرا کیا جا رہا ہے۔ اور مویشیوں اور باغ کے مالیوں اور رکھوالوں کی رہائش کے لئے پختہ مکان اور ایک چھپر بنایا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ حوصلے اور ایک دیہاتی کی دوسرے دیہاتی کے ساتھ بخوشی امداد کی ایک نمایاں مثال ہے۔ صحت بخش زندگی کی بنیاد یہی ہے۔ ایسی زندگی اور اس کے ساتھ ہی پنجاب کی ظاہری حالت بہت کچھ بدلی جا سکتی ہے۔ لیکن فتنہ و فساد جو کہ پنجاب کے گاؤں میں انتہائی درجے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کام کو بہت مشکل بنا دیتا ہے۔ اور ممکن ہے۔ کہ فرقہ داری اسے وقتاً ناممکن بنا دے۔

فرقہ داری:۔ ایک اعلےٰ تعلیم یافتہ زمیندار جو وسطی پنجاب کے دیہاتیوں کو میرے ملاقاتیوں میں سے سب سے زیادہ اچھی طرح جانتا ہے۔ اور جس کو میں رام لال کے نام سے پکاروں گا۔ یہ خیال کرتا ہے۔ کہ پارٹی بازی بڑھ رہی ہے۔ کیونکہ حسد اور لالچ بڑھتا جاتا ہے۔ حسد زمانہ کی انفرادیت کی وجہ سے اور لالچ زندگی کے اس بلند معیار سے جس کے سب خواہشمند ہیں۔ اور جسے اب بہتیروں نے حاصل کر لیا ہے۔ خوش قسمتی سے فرقہ داری نے ابھی گاؤں پر اس قدر قبضہ نہیں پایا ہے۔ جس قدر کہ شہروں پر۔ لیکن خطرہ ہے۔ کہ یہ ایک سے دوسرے میں پھیل جائے گی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ آیا وہ ایک ایسے گاؤں میں رہنا پسند کرے گا۔ جہاں ایک مشترکہ زندگی میں پیش قدمی کرنے والی قوم رہتی ہو۔ یا ایک ایسے گاؤں میں جہاں ہر ایک قوم اپنی زندگی اور طاقت بیرونی قومی جماعت سے حاصل کرتی ہے۔ ہر ایک دیہاتی کی حیثیت سے اُس نے بتایا۔ کہ وہ پہلی صورت کو ترجیح دے گا۔ اور اس کے ٹھیک ہونے پر شبہ کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ پانچ یا چھ سو باشندوں کے گاؤں میں جو پنجاب کے گاؤں کی عام آبادی ہے۔ وہاں کے نظام کی صحت و پاکیزگی مشترکہ زندگی کی طاقت پر منحصر ہے۔ ابھی تک سیاسی طاقتیں اپنے پُرزور فرقہ دارانہ حسد سے مشترکہ زندگی کو ناممکن بنانے کی دھمکی دیتی ہیں۔ مثلاً اُونہ میں انجمن امداد باہمی اس قسم کے جذبہ کو دُور کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ مختلف فرقے اور ذاتیں ہماری انجمنوں میں

خوب ملے جلے ہیں۔ اور دوکاندار عام طور پر ممبر ہوتے ہیں۔

دیہاتی سکھ کا مذہب:۔ رام لال خیال کرتا ہے۔ کہ یہ فرض کر لینا کہ دیہاتی سکھ مذہب کے لئے بہت تکلیف اٹھاتا ہے۔ غلطی ہے۔ اس نے اس موضوع پر مختلف گاؤں کے لوگوں سے گفت و شنید کی ہے۔ اور تمام متفق ہیں۔ کہ چند رسومات کو ادا کرنے کے علاوہ اور وہ بھی خاص خاص اوقات پر مذہب اس کی روزانہ زندگی میں دخل نہیں دیتا۔ اور یہ رسومات بھی مردوں کی نسبت عورتوں سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں۔ خاندانی پروہت کی طرف سے یاد دہانی کرائی جاتی ہے۔ اور یہ بہ نسبت لوگوں کی محبت کے ذاتی مفاد پر زیادہ مبنی ہوتی ہے۔ اگر اس طرح یاد دہانی نہ کرائی جائے۔ تو اکثر لوگ مذہبی رسومات کو ادا ہی نہ کریں اس نے دیکھا۔ کہ ایک گاؤں میں جہاں ۲۰۷ بالغ سکھ رہتے ہیں۔ صرف ۱۱ آدمی اپنی عبادت باقاعدہ طور پر کرتے ہیں۔ اس میں ان کے دس سے بیس منٹ تک صرف ہو جاتے ہیں۔ اور یہ عبادت تقریباً ہمیشہ جسمانی محنت کے ساتھ مثلاً ہل چلانے کنواں کھودنے یا چارہ کاٹنے کے ساتھ۔ اس طرح سے عورتیں اس وقت عبادت کرتی ہیں۔ جبکہ وہ چکی پیستی ہیں۔ یا دودھ دوہتی ہیں۔ پلنگ یا کسی چبوترے پر مؤدبانہ طور پر دو زانو بیٹھ کر بہت کم عبادت کی جاتی ہے۔ ان گیارہ اشخاص میں سے اکثر ۴۵ سال سے زیادہ عمر کے تھے۔ اور رام لال نے بتایا کہ یہ ایسی عمر ہے جبکہ آغاز کی نسبت انجام زیادہ نزدیک ہوتا ہے۔ اور دوسری دنیا کی تیاری کے لئے سنجیدہ طور پر سوچا جاتا ہے۔ اگرچہ صرف گیارہ ہی مقررہ عبادت باقاعدہ طور پر کرتے تھے۔ لیکن دس اور آدمی بھی کچھ کچھ جانتے تھے۔ اور ایسے موقعوں پر مثلاً اتوار اور پوُر نمائشی کے دن پڑھتے تھے۔ رام لال کہتا ہے۔ کہ وسطی پنجاب کے اکثر سکھ دیہات میں یہ گاؤں ایک نمونہ کا گاؤں ہے۔ اور یہاں اکالی سکھ جو دوسرے اکثر سکھوں کی نسبت مذہب کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ کافی آباد ہیں۔ اس کی تشریح یہ ہے۔ کہ کسان سب سے پہلے اپنے گذارے کے لئے روپیہ کمانے میں مستغرق ہیں۔ اس لحاظ سے ایک مغربی تاجر اور اس میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ وہ بھی ہفتے کے چھ دن سخت کام کرتا ہے۔ اور ساتویں دن مذہبی رسومات کو مختلف نسبت سے تفریح کی تلاش اور آرام کی خوشی کے ساتھ ملا جلا لیتا ہے۔ تاہم مشابہت حقیقی ہونے کی نسبت نمائشی زیادہ ہے۔ اگرچہ پنوزمیند

مذہب کسان کا بہت تھوڑا وقت اور بہت کم توجہ جذب کر رہا ہے۔ لیکن اس کی خواہشات اور خیالات کو تبدیل کرنے میں اس کا اثر بہت کافی ہے۔ اس زندگی کو آئندہ کی ابدی زندگی کا پیش خیمہ تصور کیا جاتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اس کی تیاری کے لئے کافی فرصت اور قوت درکار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُس کے لئے کافی خوراک کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ تیاری میں امداد کی بجائے اور بھی رُکاوٹ ہے۔ جب کسان دعا مانگے گا۔ تو اُس کی دعا یہ ہوگی کہ آٹا۔ دال نمک اور گھی زیادہ ملے۔ جسم کے لئے اچھے کپڑے ملیں۔ اور پاؤں کے لئے جوتے ایک تکیہ۔ توشک اور لحاف والا پلنگ۔ ایک دودھ والی گائے یا بھینس۔ سواری کے لئے ایک گھوڑی۔ ایک اچھی بیوی۔ اور ایک یا دو بیٹے ہو جائیں۔ اور اگر اُس کے ساتھ قرض سے آزادی بھی شامل ہو جائے۔ تو وہ اپنے نفس کو پہچاننے کی بہترین شرائط حاصل کرے گا۔ جو سکھ اور ہندو دونوں کے نزدیک بہترین بھلائی ہے۔ اس سے کم میں اس کی روح کو وہ پوری تسکین حاصل نہ ہوگی۔ جو مکمل مذہبی ریاضت کے لئے ضروری ہے۔ رام لال دراصل اس بیان میں گرنتھ صاحب کے دو بھجنوں کا خلاصہ ظاہر کر رہا تھا۔ پہلا بھجن کبیر صاحب کی دعا ہے۔ اور دوسرا ایک جاٹ بزرگ دھانا نام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ بزرگ باقی ماندہ چیزوں کا ذکر کرتا ہے۔ جسمیں سات ہوں کا اناج بھی شامل ہے۔

یہ بھجن ایک بوڑھے کسان کے اُن الفاظ کی یاد دلاتا ہے۔ جو اُس نے اُسی وقت کہے تھے۔ جبکہ حقہ پیتے وقت ایک اسٹریلیا سے واپس آئے ہوئے شخص کی لائی ہوئی دولت کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ کہ خدا مجھے میرے گاؤں میں میرے بچوں کے ساتھ مجھے دو روٹیاں دے دیتا ہے وہ شخص بھی اتنا ہی کھا سکتا ہے۔ مجھے زیادہ کی ضرورت نہیں۔ غالباً پنجاب کے چونتیس ہزار گاؤں کے لوگوں میں سے اکثر یہی کہیں گے۔ لیکن زمانہ بدل رہا ہے۔ آج کل بیس ہزار میل لمبی نہروں اور چھ ہزار میل لمبی ریلوں کی لائی ہوئی دولت کو دیکھ کر روپیہ حاصل کرنے کا شوق بڑھ رہا ہے۔ اور یہ امر کہ آیا آج سے دس یا بیس سال بعد بھجنوں کی تعلیم کو مقبولیت عام حاصل ہوگی یا نہیں مشتبہ ہے۔ تاہم اگر سادہ ضروریات کی فہرست میں چند اشیاء کا اضافہ کر دیا جائے۔ مثلاً کسی طرح کا کھانا۔ صاف گرد و نواح صحت اور

آدمی و عورت دونوں کے لئے معمولی سی تعلیم اور یہ کہ دنیاوی ضروریات کے متعلق تسکین انسانی کوشش پر اسی قدر منحصر ہے۔ جس قدر کہ خدا کی مرضی پر۔ تو کسان زندگی کا فلسفہ حاصل کر لے گا۔ اور وہ کم از کم اس حریصانہ تجارت سے بہتر ہوگا۔ جس میں دولت کی خواہش کبھی کم نہیں ہوتی۔

تقدیر پر شاکر ہونا :- اس وقت گاؤں کے تمام مذہبی خیالات کی تہ میں یہ عقیدہ ہے۔ کہ ہر ایک چیز خدا کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے۔ کہ حضرت محمدؐ نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا۔ کہ وہ پہلے اپنے اونٹوں کو رسیوں سے باندھیں اور پھر خدا پر بھروسہ کریں۔ اور قرآن شریف میں بھی یہ کہا گیا ہے۔ کہ انسان کو کوشش کے بغیر کچھ نہیں ملتا۔ لیکن عام لوگوں کا رویہ اس کہاوت سے اچھی طرح واضح کیا گیا ہے۔ اگر کیکر کے درخت میں پتے نہیں لگتے۔ تو کیا یہ بہار کا قصور ہے؟ اگر اُلّو دن میں نہیں دیکھ سکتا۔ تو کیا یہ سورج کا قصور ہے؟ اسی امر کا تذکرہ دوسری جگہ کرنے سے مجھے معلوم ہوا۔ کہ نہری آبادیوں میں جو مالی حیثیت سے صوبے میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ تقدیر پر اس قدر بھروسہ نہیں کیا جاتا۔ جتنا کہ پہلے کیا جاتا تھا۔ رام لال کے خیال کے مطابق یہی بات پنجاب کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ میرے عملے کے ممبروں میں سے ایک نے اسی امر کو تسلیم کرتے ہوئے۔ یہ بات کہی۔ کہ میں نے کسان کو یہ دلیل ماننے کے لئے کہ دولت تقدیر کی نسبت تدبیر پر زیادہ منحصر ہے۔ پہلے کی نسبت زیادہ تیار پایا جاتا ہے۔ عرصہ نہیں گذرا۔ کہ میں اپنے گاؤں میں اسی موضوع کی ایک بحث میں شامل تھا۔ میرا چچا یہ کہتا تھا۔ کہ سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔

کنبے کے ایک نوجوان ممبر نے اس دلیل کو ادا کرنے کے لئے یہ کہا۔ کہ دیکھو ہل لگانے اور اچھے بیج ڈالنے سے کتنا فرق پڑ گیا ہے۔ چچا نے جواب دیا " اولے اچھے اور بُرے سب کو تباہ کر دیتے ہیں۔" ایک دفعہ رام لال نے ایک زندہ دل مزارع کو اپنے جاگیردار سے جسے وہ ایک پرانے کوئیں میں ٹل اُتروانے کے لئے زور دے رہا تھا۔ یہ کہتے سُنا۔ کہ بادلوں کی نسبت کنوآں انسان کے زیادہ نزدیک ہے۔ رام لال کہتا ہے کہ بادل زمیندار میں روح پھونکتے رہتے ہیں۔ لیکن اب وہ اپنے کوئیں کے پانی کے ذخیرہ اور اُس کو زیادہ کرنے کے طریقوں کی طرف

زیادہ توجہ اور مجبوری سے کے ساتھ دیکھنے لگا ہے۔ کھاد کی طرف بھی اس کا رجحان بدل رہا ہے۔ سنا جاتا ہے۔ کہ وہ اسے دوسرا خدا (دوڑی دوجا رب) کہہ کر پکارتا ہے۔ اگلے دن رام لال نے ایک سفید داڑھی والے سکھ سے جو ایک بھری ہوئی ٹوکری سر پر اٹھائے اپنے کھیت کو جا رہا تھا۔ یہ پوچھا۔ کیا یہ کام کرنے کیلئے تمہارے کوئی بیٹا نہیں ہے۔ سکھ نے جواب دیا۔ بیٹے کو جوان ہونے اور پھل دینے میں ۱۵ سال لگتے ہیں۔ لیکن کھاد چھ ماہ میں غلہ دے دیتی ہے۔

تحدید تولید :۔ افزائش نسل کے متعلق ابھی تک تقدیر کا اثر غالب ہے لیکن اس میں بھی انقلاب کے آثار نظر آتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر جو قرآن کریم سے لیا گیا ہے۔ یہ ہے کہ کوئی روح ایسی نہیں پیدا کی جاتی۔ جس کے لئے خداوند تعالےٰ رزق مہیا نہیں کرتا۔ ہندوؤں اور سکھوں کا نظریہ بھی تقدیر پر مشاکر رہتا ہے۔ ایک سکھ نے جس کے ہاں پچپن سال کی عمر میں بھی بچے پیدا ہو رہے تھے۔ یہ کہہ کر اپنا پہلو بچا لیا کہ "بیٹے والدین کی امداد اور بھائیوں کے بازو ہیں۔" لیکن رام لال نے کہا۔ کہ وہ کھائیں گے کیا؟ اسی نے جواب دیا۔ کہ ہر ایک اپنا حصہ اپنی پیشانی پر لکھوا کر لاتا ہے۔ یہ نہایت پختہ عقیدہ ہے۔ اور عام طور پر لوگ اس کے معتقد ہیں۔ اسی گاؤں کے ایک سکھ نے ذرا موجودہ نظریہ پیش کیا۔ وہ تیس سال کا تھا۔ اور ۱۷ ایکڑ زمین کا مالک تھا۔ وسطی پنجاب میں اتنی زمین کافی جائداد ہے۔ اس کی شادی گیارھویں سال میں ہو گئی تھی۔ اور پہلے چھ سال میں اس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ اور اس کے بعد نہ لڑکا اور نہ لڑکی کچھ نہ ہوا۔ اس نے بتایا کہ یہ ضبطِ نفس اور حکمت کی وجہ سے تھا۔ اور اس وجہ سے بھی کہ وہ مہینے کے خاص ایام میں باہر کوئیں پر سوتا تھا۔ اس نے بتایا کہ زیادہ بچوں کے پاس کاشت کے لئے زمین نہ ہوگی۔ اور میں ان سب کو فقیر نہیں بنانا چاہتا۔ اس نے پھر یہ مثل بیان کی۔ بہت سی بارش فصل کو گھٹا دیتی ہے۔ اور بہت سے بیٹے بدنامی لاتے ہیں۔ پہلا سکھ اس مشہور مثل کو ضرور رد کر دیتا کہ جاٹ کے ہاں کبھی کافی بچے۔ دودھ یا بارش نہیں ہوئی۔ دو لوکہاوتیں پرانے اور نئے طریقے کو ظاہر کرتی ہیں۔ اور نیا طریقہ پرانے پر اس سے زیادہ دست اندازی کر رہا ہے۔ جتنی کہ اس سے اُمید ہو سکتی ہے۔

ایک سب اسسٹنٹ سرجن نے جو ہوشیار پور کی دیہاتی ڈسپنسری کا انچارج تھا۔ رام لال سے یہ کہا۔ کہ اس باب میں اُسے دیہاتیوں نے بہت

سے واقعات بتائے ہیں۔ اور بہت سے پیچیدہ حالات ہیں۔ جو ضبط کی بے اصول کوششوں سے پیدا ہو گئے تھے۔ اُسے علاج کے لئے بلایا گیا تھا۔ رام لال کو معلوم ہؤا۔ کہ گورداسپور کے ایک سکھ گاؤں میں ایک مشہور دایہ نے جو اپنے کام میں ماہر تھی۔ ۱۵۰ عورتوں کو آئندہ بچے جننے کے ناقابل بنا دیا تھا۔ اُس نے یہ کام ایک دوائی کے ذریعے کیا تھا۔ جو اُسے اُس کی ماں نے بتائی تھی۔ تقریباً تمام عورتیں جاگیرداروں کی بیویاں تھیں۔ اور کسی کا علاج۔ بغیر اس کے خاوند کی رضامندی کے نہیں کیا گیا تھا۔ اور اس بات کا بھی خیال رکھا گیا۔ کہ اُس کے تین بیٹے ہو چکے ہوں اس کام کو شروع کئے اسے بارہ یا تیرہ سال گذر چکے تھے۔ لیکن ۱۵۰ میں سے ۵۰ کو اُسی نے گذشتہ سال بانجھ کیا۔ اس کی کم سے کم فیس دس روپے تھی۔ رام لال کی مزید معلومات سے یہ پتہ چلتا ہے۔ کہ صرف وہی ایک ایسی دایہ نہیں۔ بلکہ بہت سی اور بھی ہیں۔ اُس نے یہ بتایا کہ یہ رَو چل نکلی ہے۔ اور زوروں پر ہے۔ اور ہوشیارپور جیسے ضلع میں جہاں ہر شخص کی اوسط جائداد پانچ ایکڑ ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ کہ خواہ کوئی کتنا ہی تقدیر پر شاکر کیوں نہ ہو۔ چوتھے یا پانچویں بیٹے کی ولادت پر جو اپنی پیشانی پر اپنا حصہ لکھوا کر لائے گا۔ بمشکل اظہار مسرت کیا جائیگا۔

شادی:۔ ہندوؤں میں بیوہ کی شادی کی ممانعت کسی حد تک افزائش نسل پر روک ہے۔ اگرچہ یہ انسانیت پر مبنی نہیں ہے۔ اپنے گاؤں کے نزدیک چار گاؤں میں رام لال نے معلوم کیا۔ کہ سولہ اور چالیس سال کے درمیان پچاس بیوائیں تھیں، اس پر ایک اور معمولی بندش بہت سے ہندو خاندانوں کی وہ رسم ہے۔ جس کی وجہ سے مرد تمام ایک جگہ سوتے ہیں۔ سکھوں میں قلیل الازدواجی اس پر ایک اور بندش ہے۔ یہ رواج عورتوں کی کمی کا نتیجہ ہے۔ جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اور جس سے سکھ بڑی طرح تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ رام لال نے بتایا۔ کہ یہ طریقہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اُس نے اُن گیارہ بھائیوں کی حالت بتائی۔ جو اُن میں سے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ اور اُن کی صرف پانچ بیویاں تھیں۔ بچپن کی شادی کی عالمگیر عادت بیشک مخالف سمت میں کام کرتی ہے۔ اب اُس کی برائیاں معلوم ہوتی جاتی ہیں۔ اور بچپن کی شادی کم ہوتی جاتی ہے۔ تاہم ۱۲ سال کا دولھا عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے۔ اور نہایت تہذیب یافتہ بھی اس کو نہایت ضروری خیال کرتے ہیں۔ کہ لڑکی کی شادی بلوغت کے وقت فوراً

کر دینی چاہیئے۔ بالغ ہونا شادی کا ایک قدرتی نشان سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد دیر لگانے سے خاندان پر دھبّہ لگتا ہے۔ رام لال کہتا ہے۔ کہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ۱۷ برس کی لڑکی کا کنوارا رہنا اس امر پر دلالت کرتا ہے۔ کہ یا تو والدین کے دماغ میں خرابی ہے۔ یا اُن کی مالی حالت خراب ہے۔ اور بعض ہندو تو یہاں تک کہتے ہیں۔ کہ اگر ایک ایسی لڑکی کا چہرہ جو بالغ اور کنواری ہو۔ ماں باپ یا بھائی دیکھتے ہیں۔ تو وہ خدائی سزا کے مستوجب ہیں۔ وہ سزا جس کا خاص طور پر ڈر ہوتا ہے۔ یہی خیال کی جا سکتی ہے۔ کہ گرم آب و ہوا خون پر اثر کرتی ہے۔ تاہم صرف دو گاؤں میں جن میں ۲۸۰ گھر آباد تھے۔ ۱۸ سے لے کر ۲۲ سال تک کی تین چار لڑکیاں کنواری تھیں۔ اور وہ بھی اس لئے کنواری تھیں۔ کہ لکاؤ تھیں۔ اور انہیں اسی قیمت سے جو ابھی تک پڑ چکی تھیں۔ زیادہ ملنے کی امید پر روکا ہُوا تھا۔

دُلہنوں کی خرید:۔ دُلہنوں کی خرید کا پہلے بھی کئی بار ذکر آ چکا ہے۔ رام لال کہتا ہے۔ کہ یہ طریقہ بڑھ رہا ہے۔ اور اُس نے برہمن سے لے کر بھنگی تک سوسائٹی کے ہر طبقہ میں گھر کر لیا ہے۔ حال ہی میں ایک سوڈی سکھ نے اپنی لڑکی تین ہزار روپیہ میں فروخت کی۔ اس کا اندازہ ہے۔ کہ پنجاب کی شادیوں میں سے ۷۰ فیصدی اسی طرح کی جاتی ہیں۔ میں نے قیمتوں کا اندازہ کسی اور جگہ بھی درج کیا ہے۔ اور اس دورہ کی معلومات سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ان میں کسی طرح بھی مبالغہ نہیں ہے۔ لیکن روپیہ کا ادا کرنا اتنا شرمناک نہیں ہے۔ جتنا کہ عورتوں کا خریدنا یا بیچنا۔ تاہم یہ صاف ظاہر کرتا ہے۔ کہ یہ مہذب زندگی کے ہرگز شایان نہیں۔ موجودہ دَور ترقی کے پہلو بہ پہلو اس رواج کا بڑھتے جانا یہ شبہ پیدا کرتا ہے۔ کہ آیا کوئی ترقی ہوئی بھی ہے یا نہیں؟

(۱۴ میل)

۱۳ دسمبر۔ گڑھ شنکر سے بلاچور

ہندو مسلمانوں کے تعلقات:۔ چونکہ کام بہت زیادہ لگایا تھا۔ اس لئے وقت بچانے کے خیال سے میں نے پہلے چھ میل موٹر میں طے کئے۔ اگر سڑک کو گھوڑے کی بجائے موٹر میں سے دیکھا جائے۔ تو اس کی تمام دلچسپیاں جاتی رہتی ہیں۔ نہ وقتاً فوقتاً ادھر اُدھر پھر سکتے ہیں۔ نہ سڑک کے آس پاس کی سیر ہو سکتی ہے۔ نہ راہگزاروں سے صاحب سلامت تاکہ اُن سے اُن کے کام کاج کے

متعلق دریافت کیا جائے۔ تاہم ہم بمقام شمندرا ٹھہر گئے۔ کیونکہ لوگ ہمارے استقبال کے لئے آگئے تھے۔ وہ گاؤں کے بینک کے ممبر تھے۔ اور ان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ ہندو اور مسلمان ایک ہی نسل سے تھے۔ اور مذہبی تفریق محض اس وجہ سے تھی۔ کہ گاؤں کا کچھ حصہ چودہ نسلیں گزریں۔ اسلام لے آیا تھا۔ اُن کے اب بھی دوستانہ تعلقات ہیں۔ اور ہندو اپنی شادیوں پر مقامی ملا کو دعوت دیتے ہیں۔ اور اُسے وضو کے لئے تانبے کا لوٹا دیتے ہیں۔ اور اسی طرح مسلمان پروہت کو دعوت دیتے ہیں۔ اور اُسے بھی تحفہ پیش کرتے ہیں۔ رام لال کہتا ہے۔ کہ تحائف کا یہ تبادلہ پہلے کی نسبت اب بہت کم عام ہے۔ لیکن اب بھی ایسے علاقوں میں جہاں دنیاوی سادگی پر زیادہ اثر نہیں پڑا۔ اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ (مثال کے طور پر شکار گڑھ میں) ہندو اور مسلمانوں میں ملا اور پروہت کو شادیوں پر دعوت دینے کی رسم اب بھی عام ہے۔

کوئیں:۔ اس گاؤں کے نصف کوئیں خشک ہو چکے ہیں۔ اور انہی کی جگہ زیادہ گہرے کوئیں نہایت دلیری سے کھودے جا رہے ہیں۔ سطح زمین سے پانی کا فاصلہ قریباً ۳۰ فٹ ہے۔ ایک کوئیں پر پانسو یا چھ سو روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ بشرطیکہ کاشتکار اپنے مزدور لگائے۔ لیکن اس میں چرسے یا رہٹ کے لوازمات شامل نہیں۔ ان لوگوں کی نہایت پرزور شکایت یہ تھی۔ کہ ان کی زمینیں ناکافی ہیں۔ بینک کے پریذیڈنٹ نے تسلیم کیا۔ کہ وہ اپنی ۱۲ ایکڑ زمین پر اچھی طرح گذارہ کرتا تھا۔ لیکن اس کے دو بیٹے تھے۔ اور ہر ایک کے لئے ۶ ایکڑ زمین ناکافی ہوگی۔ اس لئے اُس نے بیکانیر میں زمین خریدنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے اپنی کوششوں میں کامیابی نہ ہوئی تھی۔ اُس نے کہا کاش ہمیں امریکہ یا آسٹریلیا جانے کی اجازت ہوتی۔

دسویں پاس زمیندار:۔ ممبروں کی طرف سے بولنے والا شخص جس نے موٹر کار کو گھمایا۔ ایک سفید ریش مسلمان راجپوت تھا۔ یہ ان پڑھ تھا۔ لیکن قدرتی طور پر فہم و قوتِ بیان کا عطیہ لئے ہوئے تھا۔ جسے دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی۔ کہ ان نہایت پسندیدہ اوصاف کا سکول میں پیدا کرنا۔ کیوں اس قدر مشکل ہے۔ تمام ممبر نہایت پرزور الفاظ میں یہ کہہ رہے تھے۔ کہ دسویں جماعت کے لڑکے کی تعلیم اسے کاشتکار کی زندگی بسر کرنے کے ناقابل بنا دیتی

ہے۔ ایک نے کہا کہ وہ دھوپ میں کام نہیں کر سکتا۔ دوسرے نے کہا وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا۔ جس کے لئے طاقت کی ضرورت ہو۔ تیسرے نے کہا۔ اس کی ٹانگیں اُسے سہارا نہیں دیتیں۔ غرضیکہ اُسی کے خلاف دلیل پر دلیل پیش کی گئی۔ میرے ہمراہی سب انسپکٹر نے کہا۔ کہ میرے حلقے میں بہت سے دسویں پاس کسان ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف دس فیصدی اپنی زمینوں کو کاشت کرتے ہیں۔ اور باقیوں میں سے اکثر کچھ نہیں کرتے۔ ایک دوسرے سب انسپکٹر نے کہا۔ کہ میرے حلقے میں رہنے والے بیس یا پچیس دسویں پاس طلبا میں سے صرف ایک تہائی کاشت کرتے ہیں۔ البتہ دونوں اس امر پر متفق تھے۔ کہ وہ جو کچھ کام نہیں کرتے۔ اپنا وقت تاش کھیلنے یا گردو نواح میں پھرنے میں صرف کرتے ہیں۔ اِس تحصیل میں دسویں پاس طلبا کی تعداد بہت کافی ہے۔ ایک گاؤں میں جہاں بائیس سو کی آبادی ہے۔ ۲۵ میٹرک اور چار گریجوائیٹ ہیں۔ ان سب کو ملازمت مل چکی ہے۔ لیکن کہیں کہیں بہت سے لڑکوں کو سخت ضرورت کی وجہ سے اپنے کھیتوں کی طرف واپس آنا پڑا ہے۔ افسوس ہے۔ کہ وہ ترقی یافتہ ذرائع اختیار نہیں کرتے۔ کیونکہ کوؤں کے خشک ہونے سے پانی بہت کمیاب ہوگیا ہے۔ اور پانی کی بہتات کے بغیر مستقل طور پر کاشتکاری ناممکن ہے۔ سمندریا بینک کے ممبروں نے کہا۔ کہ محض اسی وجہ سے ہمارے لئے سبزیاں پیدا کرنا مشکل ہے۔ تاہم ایک سبزی فروش جس کی دوکان سڑک کے کنارے اُس جگہ تھی۔ جہاں ہم گفتگو کر رہے تھے سبزیاں پیدا کر رہا تھا۔ اُس کا مقابلہ امرتسر کے ضلع سے کیاگیا۔ جہاں۔ پانی کافی ہے۔ اُس نے کہا۔ کہ وہاں سکھ جاٹ اپنے لئے سبزیاں پیدا کرتے ہیں۔ اور حال ہی میں رام لال ایک ایسے گاؤں میں پہنچا۔ جہاں بعض سکھوں نے ایک لاری ڈرائیور کے ساتھ یہ فیصلہ کیا ہوا تھا۔ کہ وہ انکی پیداوار یعنی آلو۔ گوبھی۔ مولیاں وغیرہ ہر روز امرتسر (۱۷ میل کے فاصلے پر) لیجائے۔ اور ایک سبزی فروش کے حوالے کردے جو اُن کی فروخت کا حساب رکھتا تھا۔ اگلے گاؤں میں جہاں ہم نے اپنے ٹٹوؤں کو دیکھا۔ ہم ایک دوسرے بینک کے پریذیڈنٹ سے ملے۔ وہ ایک غیر معمولی شخصیت تھی۔ چار سال گزرے۔ اُس نے ایف۔ اے کا امتحان پاس کر کے فورمن کرسچن کالج چھوڑ دیا تھا۔ خوش قسمتی سے اپنے گاؤں میں

کچھ نہ کچھ پڑھے لکھے کافی آدمی ملے ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک مستعفی اسسٹنٹ سرجن تھا۔ اور اسی طرح کے اور لوگ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ دیہاتی زندگی اسے وہاں جان نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس امر پر متفق تھا۔ کہ دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کرکے ہر طالب علم کے لئے ناممکن ہے۔ کہ وہ کھیتوں میں اتنا سخت کام کرے جتنا کہ کاشتکار کرسکتا ہے۔ کیونکہ وہ مئی اور جون کے مہینوں کی گرمی کی تاب نہیں لا سکتا۔ لیکن اُس نے بتایا۔ کہ میں سات یا آٹھ گھنٹے روز کام کرسکتا ہوں۔ اور مفید امداد دے سکتا ہوں۔ اور تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے غالباً زیادہ ترقی کرسکتا ہوں۔ تمام لوگ جو چاروں طرف کھڑے تھے۔ اس امر پر متفق ہوگئے۔ کہ اگر لڑکے کو لوئر مڈل تک تعلیم دی جائے۔ تو وہ کاشتکاری کے قابل نہیں بن جاتا۔ اس سے کم تعلیم عملی نہیں ہے۔ کیونکہ ہر ایسا لڑکا جو پرائمری تعلیم سے آگے نہیں پڑھا جلد پڑھنا لکھنا بھول گیا۔

مذہبی تعلیم:۔ ایک مرتبہ ہم اپنے ٹٹوؤں پر ہی ٹھہر کر راستہ میں ملنے والے لوگوں سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ ہم نے ایک ہندو جاٹ کو اپنے باغ میں آم کے پودے لگاتے ہوئے اور ایک کنواں اُتارنے کی تیاری کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک چھوٹا گھر بھی تعمیر کرا رہا تھا۔ جہاں وہ خود اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اُس کے ہاں بچہ کوئی نہ تھا۔ رام لال نے بتایا کہ وسطی پنجاب میں اب بہت سے لوگ ہیں۔ جو اپنی زمینوں پر محض اس لئے رہنا چاہتے ہیں۔ کہ اس سے وہ بہت سی تکلیف سے بچ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر چارہ گاڑی میں لاد کر نہ گاؤں سے لے جانا پڑتا ہے۔ اور نہ وہاں سے لانا پڑتا ہے۔ لیکن کچھ اس وجہ سے بھی کہ وہ ایک اچھا ہوا دار مکان چاہتے ہیں۔ راستے میں ہمیں ایک ذیلدار ملا۔ جس کی داڑھی سُرخ اور اگلے دانت بڑے بڑے تھے۔ اُس کی ذیل میں آٹھ یا نو مسجدیں تھیں۔ لیکن تین یا چار ملاؤں سے جنہوں نے تیسری یا چوتھی جماعت تک بھی تعلیم حاصل نہیں کی ہوئی تھی۔ میں نے دریافت کیا وہ کیا پڑھاتے ہیں۔ ایک نے جواب دیا کہ وہ اپنی شکم پُری کے لئے خدا کی یاد کرتے ہیں۔ ان کی تمام تعلیم یہ ہے۔ کہ نماز پڑھو اور مسکینوں کو کھانا دو۔ لیکن امسال گرمیوں میں ہمارے قرب و جوار میں ایک مولوی صاحب آئے تھے۔ ذیلدار کو یہ معلوم نہ تھا۔ کہ وہ کہاں سے آئے ہیں۔ اور وہ دو ماہ تک ٹھہرے رہے۔ اور لوگوں میں وعظ

کرتے رہے۔ اور اُنہیں محنت کرنے۔ آرام نہ لینے۔ اور شادیوں پہ کم خرچ کرنے کی ہدایت کرتے رہے۔ وہ اچھے آدمی تھے۔ اور لوگ اُن کی باتیں خوب سنتے تھے ہندوؤں کا بھی یہی حال ہے۔ وہ کبھی کبھی اور عام طور پر موسم سرما کے خالی دنوں میں مذہبی کتابوں یا بھجنوں کو سننے کے لئے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ بھجن ہارمونیم کے ساتھ مقامی بولی میں گائے جاتے ہیں۔ مذہبی کتابوں کی نسبت جن کا سمجھنا مشکل ہے۔ بھجن زیادہ مقبول ہیں۔ لیکن ان میں سے پڑھنا یا گانا کچھ بھی ہو ہر شام ایک مقررہ وقت تک ہوتا رہتا ہے۔ اس کی میعاد دس سے چالیس دن تک ہوتی ہے۔ اور آخری دن پڑھنے والے برہمن یا گوسیے کے لئے چندہ جمع کیا جاتا ہے۔ لوگ ایک آنہ سے لے کر ایک روپیہ تک چندہ دیتے ہیں۔ انفرادی تعلیم تو بالکل ناپید ہے۔ اور انفرادی عبادت جیسا کہ ایک تعلیم یافتہ راجپوت نے بتایا۔ گھنٹی بجانے اور پوجا کرنے تک محدود ہے۔ اگرچہ خوشی کے موقعہ پر اکثر لوگ مندروں میں جاتے ہیں۔ لیکن میرے گاؤں میں باقاعدہ طور پر جانے والے نصف سے زیادہ نہیں ہیں۔ اور بہت سے صرف اُسی وقت جاتے ہیں۔ جبکہ کھیتوں میں کچھ زیادہ کام نہیں ہوتا۔ اس راجپوت کے پاس ۲۰ ایکڑ زمین ہے۔ اور مندر کے پروہت کو ہر فصل پر پانچ چھ من غلّہ اور بارہ یا تیرہ تہواروں میں سے ہر ایک پر ایک روپیہ دیتا ہے۔ اکثر لوگ ایک یا دو من غلّہ اور ہر تہوار پر چار آنے یا تقریباً ہر سال ایک روپیہ فی ایکڑ دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض پروہت اس کے عوض تقریباً کچھ نہیں کرتے۔ کیونکہ کل ایک دیہاتی بینک کے پریذیڈنٹ نے مجھے بتایا۔ کہ ہمارا خاندانی پروہت یا تو کبھی کبھار شادی کرنے یا صرف فصل کے موقع پر اپنا حصہ لینے آتا ہے۔

(۱۴ میل)

۱۴ر دسمبر بلاچور سے روپڑ

مسافر۔ دریائے ستلج جانے والی سڑک تمام ریتلی تھی۔ کبھی کم کبھی زیادہ مگر تھی تمام ریتلی۔ ہم دو پھلوں کے باغوں کے پاس سے گذرے۔ ایک تازہ لگا ہوا ہوا تھا۔ اور دوسرے کی بنیادیں باوجود ریت کے اچھی طرح جمی ہوئی تھیں۔ پختہ گھروں کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن ہر گاؤں میں صرف ایک یا دو۔ وہ اُن گرے پڑے رہائشی مکانوں سے جو اکثر لوگوں کی قسمت میں ہیں۔ بدرجہا بہتر تھے۔ دریائے ستلج کے کنارے ہندو جاٹوں اور گوجروں کا ایک گاؤں اپنی

نیم بربادی کا پُر درد نظارہ پیش کر رہا تھا۔ گھروں کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ برسوں سے اُن پر لپائی نہیں ہوئی۔ تاہم اُس کے وسط میں جہاں گذشتہ ایام میں کسی ساہوکار کی عمارت ہوتی ہوگی۔ ایک بڑھئی کا دو منزلہ مکان تھا جس نے ۲۷ سال مشرقی افریقہ میں گذارے تھے۔ گاؤں میں نہایت بلند ہونے کی وجہ سے وہ موجودہ حالت کے تفاوت کا اعلان کر رہا تھا۔ ذرا آگے ہم۔ ایک چمڑا رنگنے والے چمار سے ملے جو سادھو بن گیا تھا۔ وہ ایک چمٹا اور بالٹی لئے گرد و نواح سے بھیک مانگنے جا رہا تھا۔ اس کا چمٹا دو فٹ لمبا تھا۔ اور وہ اسے گاؤں میں اپنے پہنچنے کا اعلان کرنے کے کاسہ گدائی لئے ہوئے اہل کرم سے خیرات لینے کے لئے جا رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹی کٹیا میں رہتا تھا۔ اور صرف اسی قدر خدمت انجام دیتا ہے۔ کہ گزرنے والے مسافروں کو جو رات کا کھانا اور آرام کرنا چاہیں۔ کھانا کھلا دیتا ہے۔ ہم پھر ایک کاشتکار سے ملے جو ایک معمولی شراب کی بوتل روح گلاب سے نصف بھری ہوئی لئے جا رہا تھا۔ یہ اس نے ایک عطار سے خریدی تھی۔ جو چند میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ اسی کا بیٹا پیٹ کے درد میں مبتلا تھا۔ جو ہر پندھویں یا بیسویں روز دورہ کرتا تھا۔ اور اسی سے اُس میں کمی ہو جائے گی۔ ستلج پہنچنے سے پہلے ہماری آخری ملاقات تین دیہاتیوں سے ہوئی۔ جو روپڑ سے گھر واپس آ رہے تھے۔ جہاں وہ ۸ ایکڑ زمین پر قبضہ کرنے کے لئے مقدمہ پر زور لگانے گئے ہوئے تھے۔ مقدمہ پہلے انبالہ سنایا گیا تھا۔ اور وہاں انہیں ایک وکیل کو پچاس روپے دینے پڑے تھے۔ روپڑ میں انہیں ۳۵ روپے میں وکیل مل گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ ۱۲۵ روپے خرچ کر چکے تھے۔ اور مقدمہ ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ اب انہیں گواہی پیش کرنی ہوگی۔ چونکہ وہ روپڑ سے ۱۵ میل دُور رہتے تھے۔ اسی لئے مقدمہ کی ہر ساعت پر انہیں دو دن اپنے کھیتوں سے الگ رہنا پڑتا تھا۔ یہ ایک ایسا ہی مقدمہ ہے۔ جیسے کہ پنجاب میں ہر سال ۲۴۰۰۰۰ ہوتے ہیں۔

کھاد کے ڈھیروں کا مسئلہ:۔ راستے میں ہم ایک گھنٹہ گا بوراں نامی ایک گاؤں میں ٹھہرے۔ جس میں مسلمان راجپوت اور ہندو جاٹ آباد ہیں۔ ایک بوڑھے سفید ریش وقومی مسلمان راجپوت نمبردار نے ہمارا استقبال کیا۔ وہ ایسا معزز اور استقامت سے شمائل لئے ہوئے تھا۔ کہ جب وہ اپنی اُس لاٹھی پر جو

وہ تھوڑی سے نیچے تھانے ہوئے تھا۔ جہ کا۔ تو وہ عقل و انتظام کا وہی مجسمہ نظر آتا تھا۔ جس نے ہندوستانی گاؤں کو صدیوں سے متحد رکھا ہے۔ حسب معمول کھاد کے ڈھیر دیکھتے ہوئے جب ہم گاؤں میں داخل ہوئے۔ تو میں نے لوگوں سے پوچھا۔ کہ تم اپنے کھاد کو گڑھوں میں کیوں نہیں ڈالتے۔ انہوں نے بتایا کہ حال ہی میں ڈپٹی کمشنر نے دورہ کیا تھا۔ اور ہم نے اسے خوش کرنے کے لئے تمام کھاد گڑھے کھود کر دبا دیا تھا۔ اور مٹی سے ڈھانپ دیا تھا۔ لیکن اس کے چلے جانے کے بعد پرانے ڈھیر پھر کبھی ظاہر ہو گئے تھے۔ جالپور کے نزدیک ایک ذیلدار نے بھی مجھے اسی قسم کی بابت سنائی تھی۔ جب ڈپٹی کمشنر نے اس کی ذیل کا ملاحظہ کیا تھا۔ تو ہر ایک گاؤں صاف تھا۔ لیکن اب ایسے نہ تھے۔ اُس نے بتایا۔ کہ ہر شخص سے گاؤں سے دور کھاد جمع کرانا۔ اور اسے گڑھوں میں رکھوانا آسان نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں گاؤں کے بیچ لوگ کیا کریں گے جن کے پاس گائیں ہیں۔ لیکن زمین نہیں ہے۔ دوسرے یہ لوگ اس ڈر سے کہ کبھی دن وہ ان کی زمین پر قبضہ کرنے کا دعوئے نہ کر دیں۔ یہ پسند نہیں کرتے۔ کہ وہ اسے استعمال کریں۔ اور اُن لوگوں کو بھی جن کے پاس زمینیں ہیں۔ کوڑا کرکٹ اسی فاصلے سے زیادہ دور لیجانا پڑے گا۔ جہاں تک کہ وہ ہر روز آسانی سے لے جا سکتے ہیں۔ جب میں نے ذیلدار سے پوچھا۔ کہ ان چیزوں میں پہلے کی نسبت کیوں زیادہ دلچسپی ہے۔ تو اُس نے بتایا کہ جہاں حاکم رہنمائی کرتا ہے۔ لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں۔ اور جہاں افسر نکمے ہیں۔ وہاں لوگ بھی نکمے ہیں۔ اُس نے ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ کہ غیر تعلیم یافتہ کی نسبت تعلیم یافتہ لوگ ان باتوں کے آسانی سے قائل ہو جاتے ہیں۔ مقابلتاً اس گاؤں میں نئے گھر ہیں۔ ایک باورچی خانے میں ایک باقاعدہ چمنی تھی۔ جس کے آتشدان میں ایک مٹی کا چولہا تھا۔ گھر کی مالکہ چمنی کو پسند کرتی تھی۔ کیونکہ جب وہ کھانا پکاتی تھی۔ تو دھواں اُس کی آنکھوں میں نہیں جاتا تھا۔ اور نہ ہی کمرہ سیاہ ہوتا تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ کچے گھر کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یا پکے کو۔ تمام لوگ پکے کے حق میں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان میں سالانہ مرمت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اگرچہ گرمیوں میں ذرا گرم اور سردیوں میں ذرا سرد ہوتا ہے۔ لیکن برسات میں ٹپکتا نہیں۔ اور اس صورت میں جیسا کہ اس گھر میں تھا۔ اگر دیواروں پر اندر کی طرف پلستر کرایا ہوا ہو۔ تو یہ

کچے گھر سے زیادہ گرم نہیں ہوتا۔ میرے حلقے کے دو ممبروں نے جو میرے ساتھ تھے۔ یہ کہا۔ کہ کاشتکار اپنے لباس اور خوراک کی نسبت اپنے گھر کو بہتر بنانے میں زیادہ سرگرم ہے۔ آخری دو گھر کافی اچھے تھے۔ لیکن اس کے اپنے گھر میں ابھی بہت سی ضروریات کی کمی تھی۔ سب پختہ مکان چاہتے تھے۔ بعض تو دکھلاوے کیلئے بعض آرام کے لئے اور بعض صحت کیلئے۔

راجپوت اور سبزیاں :- دوسری چیز جس کی سب خواہش کرتے ہیں۔ اور ان کی مانگ اس قدر زیادہ ہے۔ کہ راجپوت بھی ان کی کاشت کے متعلق اپنا تعصب دور کر رہے ہیں۔ اور اس گاؤں میں گذشتہ ایک یا دو سال سے معمولی سبزیاں مثلاً بینگن - گھیا - شکر قندی اُگا تے رہے ہیں۔ اور ایک نزدیک کے گاؤں میں بھی بہت کچھ یہی حقیقت ہے۔ میرا انسپکٹر مجھے بتاتا ہے۔ کہ امسال روہڑ کے قریب میں نے ایک راجپوت کو سڑک کے کنارے ایک پھوس کی جھونپڑی میں ۔۔ اکیلے آم کے درخت کے نیچے ان پھلوں کی حفاظت کے لئے چوکڑی مارے بیٹھا دیکھا۔ جنہیں وہ راہگیروں کے پاس بیچتا تھا۔ اُس کے پڑوسی اُسے حقارت آمیز لہجے میں کہتے تھے کہ تم راجپوت نہیں ہو۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اگر راجپوت کی نظر میں سبزیاں پیدا کرنا معیوب ہے۔ تو کسی چیز کی خوردہ فروشی کرنا سراسر ذلت ہے۔ اور یہ زیادہ تر سبزیوں کی عام خوردہ فروشی کا نتیجہ ہے۔ کہ ان کی کاشت کے خلاف تعصب پیدا ہوگیا ہے۔

عورتوں کا کام :- گاؤں میں اکثر عورتیں اب بھی چکی پیستی ہیں۔ لیکن یہ تحصیل کی خصوصیت نہیں ہے۔ کیونکہ تقریباً ہر جگہ آئل انجن یا خراس موجود ہیں۔ بچوں والی عورتوں کے لئے یہ ایک نعمت ہے۔ اور غریب بھی بہ نسبت خود پیسنے کے پیسے دے کر پسوانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ رام لال کا خیال ہے۔ کہ عورتیں نہ پیسنے کی وجہ سے عام طور پر زیادہ اچھی ہیں۔ کیونکہ اس سے بہت بھاری بوجھ پڑتا ہے۔ اور انہیں کاتنے پکانے دھونے اور بچوں کو کھلانے پہنانے کا کافی کام کرنا پڑتا ہے۔ رہتک میں جاٹ کی بیوی ہل چلانے اور بیج بونے کے علاوہ وہ تمام کام کرتی ہے۔ جو جاٹ کرتا ہے۔ وہ نہایت تنو مند رہتی ہے۔ لیکن ضرورتاً اپنے بچوں کی طرف سے غافل ہو جاتی ہے۔ ارائیوں کی عورتیں بھی جو کہ پنجاب کی منڈیوں کے بڑے سبزی اُگانے والے ہیں۔ اسی قدر

سخت کام کرتی ہیں۔ وہ مویشیوں کے چارہ لے جاتی ہیں۔ کھیت میں کھاد
پھیلاتی ہیں۔ کاٹنے میں امداد دیتی ہیں۔ اور کوئیں پر بیلوں کو بھی ہانکتی ہیں۔
نیپلیز کے باغبانوں کی بیویوں کی طرح دودھ پیتے بچوں کو کھیتوں میں لے آتی
ہیں۔ اور کام کے درمیانی وقفوں میں انہیں دودھ پلاتی ہیں۔ ان تمام امور کے باوجود
بہت سی عورتیں اپنے خاوندوں کی کاشت کردہ سبزیاں فروخت کرتی ہیں۔
ان عورتوں کو عرف عام میں "کھاری ہیک" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ سبزیوں
کی ایک ٹوکری سر پر رکھ کر شہر یا گاؤں میں جاتی ہیں۔ اور دکان دکان یا گھر
یا گھر لئے پھرتی ہیں۔ اراعیوں میں اس بات پر اکثر بحث رہتی ہے۔ کہ آیا اس
امر کی اجازت ہونی چاہیئے یا نہیں۔ بہت سے یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ ان
کی بیویاں گھر پر محفوظ رہتی ہیں۔ اور وہ لوگ جو غیرت مند اور اپنی عزت کے
خواہاں ہیں۔ اس کام سے منع کرتے ہیں۔ لیکن عورتیں جو بلا شبہ بازاروں
میں جانے کا لطف اٹھاتی ہیں۔ یہ دعوے کرتی ہیں۔ کہ وہ آدمیوں کی نسبت
سبزیوں کی زیادہ قیمت وصول کرتی ہیں۔ کیونکہ سبزیاں اکثر عورتیں ہی خریدتی
ہیں۔ اور ایک عورت عورت کے ساتھ بہ نسبت مرد کے زیادہ اچھا سودا کر
سکتی ہے۔

چرخہ کاتنا :- اگر اراعیوں اور رہتک کے جاٹوں کی بیویاں نہایت سخت
کام کرتی ہیں۔ تو پردہ نشین راجپوتنیاں غالباً بہت کم ہوتی ہیں۔ تاوقتیکہ وہ چکی
نہ پیستی ہوں۔ یا سرگرم چرخہ کاتنے والی نہ ہوں۔ لیکن کاتنے کا رواج بھی مٹتا
جا رہا ہے۔ کارخانوں کے بنے ہوئے کپڑے نہایت آسانی سے مہیا ہو جاتے
ہیں۔ اور بے شمار دلفریب اقسام کے ہوتے ہیں۔ اور نہ ہی کاتنا اتنا مفید
ہے۔ جتنا کہ ہوا کرتا تھا۔ میرے عملے کے ایک راجپوت ممبر کو ایک عورت نے
بتایا۔ کہ اگر وہ اور اس کی لڑکیاں ۴۴ دن تک دس گھنٹے روز کام کریں۔ تو وہ ۱۸
روپے کی روئی میں سے صرف تین روپے کما سکیں گی۔ تاہم اس منافع میں گھر کے کاتے
ہوئے۔ سوت سے بنے ہوئے کپڑوں کی پائیداری بھی مزید شامل کرنی چاہیئے۔

جاٹوں کی بیویاں :- وسطی پنجاب میں جٹی عورتوں کے کام کا سنہری طریقہ
پیش کرتی ہے۔ اسے پیسنا نہیں پڑتا۔ وہ پانچ اور چھ بجے کے درمیان اٹھتی
ہے۔ اور رات کے رکھے ہوئے دودھ کو بلوتی اور مکھن یا گھی نکالنے کے بعد

مویشیوں کا دودھ دوہتی ہے۔ اور گھر باورچی خانہ اور صحن صاف کرتی ہے۔ اگر کوئی بھنگی لگا ہوا ہے۔ تو وہ اُسے ایک ڈھیر کی صورت میں اکٹھا کر دیتی ہے۔ جسے وہ اس وقت صاف کر دیتا ہے۔ جبکہ وہ چکّر لگانے آتا ہے۔ ورنہ وہ اُسے خود صاف کر دیتی ہے۔ پھر بچوں کو جگایا جاتا ہے۔ کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ اور کھانا کھلایا جاتا ہے۔ پانی لایا جاتا ہے۔ اور اپنے خاوند کا کھانا کھیتوں میں لے جایا جاتا ہے۔ وہاں سے واپسی پر وہ کاتتی ہے۔ یا اگر سردی کا موسم ہے تو روئی بیلتی ہے۔ یہاں تک کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ اس میں قریباً ایک گھنٹہ لگ جاتا ہے۔ اگرچہ اُس میں صرف بغیر خمیر کے آٹے کی گول روٹی اور مصالحہ دار دال شامل ہوتی ہے۔ جبکہ دال چولھے پر کھڑ بڑ کھڑ بڑ کرتی ہے۔ وہ کاتتی ہے۔ دوپہر کے بعد اُپلے تھاپے جاتے ہیں۔ مویشیوں کیلئے چارہ کاٹا جاتا ہے۔ اور سرسوں کا ساگ توڑا جاتا ہے۔ تاکہ شام کو سبزی کے طور پر کام آ سکے۔ زیادہ آسودہ گھرانوں میں راجپوتی رواج کے زیر اثر عورتوں سے سوائے روئی چننے کے کھیت کا اور کوئی کام نہیں لیا جاتا۔ اس کی بجائے زیادہ تر چرخہ کاتنے اور شاید کسی قدر کشیدہ نکالنے کے کام کئے جاتے ہیں۔ شام کے وقت مویشی گرد و غبار کے بادل میں گھر آتے ہیں۔ جو شام کی روشنی میں سونے کی طرح جھلکتا ہے۔ گائے اور بھینس کا دودھ نکالا جاتا ہے۔ اور غالباً پانی بھی پلایا جاتا ہے۔ شام کے کھانے کی تیاری میں ایک گھنٹہ اور لگ جاتا ہے۔ اور جب سب کو کھانا کھلا دیا جاتا ہے۔ اور بچے بستروں پر لٹا دئے جاتے ہیں۔ تو بیوی خود بستر پر جاتی ہے۔ اور اس وقت قریباً دس بجے کا وقت ہوتا ہے۔ ایک ایسی عورت کے لئے بھی جو جاٹوں میں پیدا ہوئی ہو۔ دن بھر کے لئے کافی کام ہے۔ جب چکی بھی پیسنی پڑتی ہے۔ تو دن بہت لمبا ہو جاتا ہے۔ اور رات بہت چھوٹی۔ کیونکہ دن بھر کا آٹا وقت پر تیار کرنے کے لئے چکی کا پانچ بجے سے چلنا ضروری ہے۔

پردہ:۔ اُونہ کی طرح یہاں بھی پردے کی موافقت و مخالفت پر مباحثے ہو رہے ہیں۔ ایک معنوٹ راجپوت نے جو ایک یا دو دن ہوئے میرے ساتھ سوار تھا۔ خیال کیا۔ کہ اگر راجپوت عورتیں بجائے تمام دن بند رہنے کے کھیتوں میں کچھ کام کریں۔ تو یہ کاشتکاری اور صحت دونوں کے لئے بہتر ہوگا

اس نے کہا کہ اُن میں سے بعض پردے سے باہر آنا پسند کریں گی۔ اس امر کی ایک اور سمجھوٹ راجپوت نے جو کہ انجمن امداد باہمی کا با رسوخ ممبر ہے۔ تصدیق کی۔ اور یہ کہا کہ جو نہی کہ پرانی نسل معدوم ہو جائے گی۔ وہ باہر آجائینگی اور اس کی وجہ سے بہتر بھی ہو جائیں گی۔ وہ لڑکیوں کے سکول اور عورتوں کی انجمن ہائے امداد باہمی کے حق میں بھی تھا۔ یہاں پردہ اتنا سخت نہیں ہے۔ جتنا کہ اُونہ میں۔ ایک راجپورت عورت ایک پڑوسی کے ہاں بغیر پردہ کئے جا سکتی ہے۔ اور جب گاؤں کے کمیں اپنے اپنے کام کرنے کیلئے گھر میں داخل ہوں۔ تو اُسے اُن سے اپنے آپ کو چھپانے کی ضرورت نہیں۔ اور شادی یا غمی کے وقت وہ عوام میں گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ جمع ہوتی ہے۔

دیہاتی بھائی چارہ :- اس سے پہلے کہ ہم اس تحصیل کو چھوڑ دیں۔ چند معمولی باتیں اور بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ چونکہ جائیدادیں کم ہیں۔ اور گذارہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی کوئی گھریلو صنعتیں نہیں ہیں۔ اور کاشتکار کی امدادی آمدنی صرف گاڑی چلانا ہے۔ تاہم بہت سے راجپوت گھر پر خانگی ضروریات کے لئے چند ایک مرغیاں پالتے ہیں۔ امداد باہمی کا ایک خاص مادہ پایا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ اُونہ کی نسبت کم ہے۔ پکتی ہوئی فصلوں کو آوارہ مویشیوں اور چوروں کی دستبرد سے بچانے کے لئے تقریباً ایک ماہ تک ایک چوکیدار مشترکہ طور پر ملازم رکھا جاتا ہے۔ کنوئیں بھی ایک دوسرے کی اعانت سے اُتارے جاتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں اس کام کے لئے پندرہ یا بیس زمیندار اکٹھے ہو جاتے تھے۔ لیکن اب تین یا چار سے زیادہ شاید ہی اس کام کو کرتے ہوں۔ اس طریقے سے اُتارے ہوئے کنوؤں کو یا تو ہر حصہ دار اپنا بیل ساتھ لگا کر رہٹ کو پھراتا ہے۔ یا چرسہ کھینچتا ہے۔ یا ہر ایک کھیت کی آبپاشی کے لئے باری باری کنواں لے لیتا ہے۔ کوئیں کی خواہش اور اشتراک سے یکجہتی کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے باہمی انتظام سے بدل لئے گئے ہیں۔ اور اس طرح زمینوں کی کسی قدر وابستگی ہو گئی ہے۔ جس آسانی سے ہم نے دریائے ستلج کو پایاب عبور کیا۔ ایک دریا کیلئے باعث ہتک تھا۔ کیونکہ یہ پنجاب کے پانچوں دریاؤں سے بڑا ہے۔ اور کبھی ہماری سلطنت کی آخری حد تھا۔ نہر سرہند نے اسے دو ایسی تنگ ندیوں میں بانٹ دیا ہے۔ جو مشکل سے گھٹنے تک گہری ہیں۔ وہ پہاڑیاں جو شملے کو میدانوں سے اوجھل کر دیتی ہیں۔ اب بالکل سامنے ہیں۔ اور دھولہ دھار کی بڑی فصیل جو کل تک نظر نہ آتی تھی۔ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔

باب سوم انبالہ

راجپورت اور اصلاح رسومات

پہلا حصہ تحصیل کھرڑ

۱۶ دسمبر۔ روپڑ سے کھرڑ

تحصیل کھرڑ:۔ کل میرا پہلے روز کا قیام تھا۔ اور خوش قسمتی سے بارش کا دن تھا۔
آج جب میں جاگا تو دنیا تازگی و خوبصورتی سے غسل کئے ہوئے تھی۔ اور برف
شفاف و منور نظر آتی تھی۔ روپڑ پہنچ کر ہم انبالہ میں داخل ہوگئے۔ یہ وہ ضلع ہے
جو پانچ دریاؤں والے پنجاب کو گنگا جمنا والے ہندوستان سے علیحدہ کرتا ہے۔
تحصیل کھرڑ میں پنجاب اور وہاں کے لوگوں کی عادات ابھی تک غالب ہیں۔
لیکن پیداوار میں تبدیلی کے آثار ابھی سے شروع ہیں۔ مثلاً سڑک کے دونو طرف
نیم کے درختوں کی لمبی قطاریں اور جا بجا آم کے درختوں کے جھنڈ ہیں۔ موخرالذکر
اپنی لمبی نشیبی راہوں اور تہ خانوں جیسے دھند لکے کی وجہ سے مقابلتہً روز روشن
نمایاں طور پر مختلف تھے۔ زمین کی قلت کی کوئی شکایت نہیں ہے۔ شاید
اس لئے کہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۱ء تک کے زوال میں آبادی ۲۰ فیصدی کم ہوگئی
گروہ کاشتکار کے ۸۲۰ کس فی مربع میل کے مقابلے میں صرف ۵۶۲ آدمی فی کاشت
شدہ مربع میل آباد ہیں۔ اگرچہ بارش صرف ۳۰ انچ ہوتی ہے۔ لیکن کبھی نے
کوئیں اتارنے کی تکلیف برداشت نہیں کی۔ ممکن ہے۔ اس خیال سے کہ بغیر
اس کے زندگی کا سادہ معیار کافی حد تک قائم رکھا جا سکتا ہے۔ ایک خاص
تعداد نقل مکانی کر جاتی ہے۔ لیکن یہ تعداد گروہ کاشتکار کی نسبت کہیں کم ہے
اور گذشتہ بارہ مہینے میں صرف ۱۱۹ آدمیوں نے پاسپورٹ کے لئے درخواستیں
دی ہیں۔ تحصیل کا نصف حصہ ہندو جاٹوں کے زیر کاشت ہے۔ یہ کفایت شعار
اور محنتی . . . اور کافی بہتر [illegible] کاشتکاری کرتے ہیں۔ ان میں یہ

خصائل بہت کم ہیں۔ اُن کو زیادہ سہارا دینے والی چیز دودھ اور گھی کی فروخت ہے۔ اُس سے انہیں ہر سال قریباً تین لاکھ روپیہ مل جاتا ہے۔

پیشہ و تیتر پیشے اور ذات :- سڑک پر ایک انوکھا نظارہ یہ تھا۔ کہ چالیس پچاس (پیروں) تیتروں کے غول کو ایک بھنگی اور ایک سید لئے جا رہے تھے۔ بلاشبہ یہ دوسرے سیدوں جیسا سید تھا۔ اور پیغمبر اسلام کی نسل سے ہونے کا دعوےٰ رکھتا تھا۔ سید نے اُنہیں بارہ آنے فی تیتر کے حساب سے خریدا تھا۔ اور چند میل آگے قریب کے اسٹیشن پر جا رہا تھا۔ تاکہ انہیں دہلی کے لئے گاڑی میں بٹھا دے۔ جہاں اُن میں سے اُن میں سے ہر ایک کے لئے دو روپیہ فی تیتر ملنے کی امید تھی۔ گرمی کے موسم میں وہ شملے کے ساتھ تجارت کرتا تھا۔ ایک معمولی دیہاتی جاگیردار اب بھی (پیرو) تیتروں کے پالنے کو ہتک سمجھتا ہے۔ کیونکہ ان کو بھنگی پالتے ہیں۔ لیکن ہر شخص جو اُنہیں حاصل کرنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ کھاتا خوب مزے سے ہے۔ اس وقت اپنے پیغمبر کی نسل سے بتانے والا بناوٹی سید راہ چلتے غول کو ٹھیک سمت میں چلانے کے لئے اتنی ہی محنت کر رہا تھا۔ جتنی کہ اُس کا غریب ساتھی۔ وہ ایک ایسے زمانے کی خصوصیات لئے ہوئے ہے۔ جس میں اقتصادی دباؤ اونچی ذات کے لوگوں کو مجبور کر رہا ہے۔ کہ وہ اپنے وقار کو بالائے طاق رکھ کر اپنی روزی ایسے طریقوں سے کمائیں۔ جو کسی وقت معیوب سمجھے جاتے تھے۔

اب برہمن کرانے پر گاڑی چلاتے ہوئے۔ درزی کا کام کرتے ہوئے۔ ڈاک لے جاتے ہوئے (باورچی کے طور پر) اور یہاں تک کہ اسٹیشنوں پر قلیوں کا کام کرتے ہوئے ...... اور پرندوں کو پھانستے ہوئے اور مچھلیاں پکڑتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ راجپوت سبزیوں کی کاشت کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح یہاں چاروں طرف گذشتہ تین یا چار سال سے مسلمانوں اور سکھوں نے خانگی ضروریات کے لئے مرغیاں پالنی شروع کی ہیں۔ اور اُن کی دیکھ بھال کے لئے بھنگی مقرر کئے ہیں۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ یہاں تک ذات کی بنیاد پیشے پر ہے۔ اُس کا زور پہلے کی نسبت بہت کم ہے۔

چائے اور نسوار :- دو اور تبدیلیاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ چائے پینا۔ اور نسوار

پینا۔ چائے پینا ہندؤں اور سکھوں تک محدود ہے۔ بہت سے لوگوں کو جنگِ عظیم میں کام کرتے وقت اس کی عادت ہو گئی۔ مٹھی بھر چائے ایک برتن میں پھینک دی جاتی ہے۔ جس میں قریباً دو سیر پانی ہوتا ہے۔ اور نصف سیر گڑ۔ اور یہ صبح سویرے تمام خاندان پیتا ہے۔ میرے ایک ہمراہی سکھ نے بتایا۔ کہ وہ اس کا دوگنا حصہ تیار کرتا تھا۔ اور تمام دن اس میں اتنا دودھ ملاکر جتنا کہ وہ بچا سکتا تھا۔ وقفے وقفے سے پیتا تھا۔ نسوار لینا حال ہی کی بات ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ سکھوں میں زیادہ مقبول ہے۔ اس امر کی ایک تعلیم یافتہ سکھ نے تصدیق کی۔ ہم نے ایک نہایت بوسیدہ حال بوڑھے آدمی کو سڑک کے کنارے سگریٹ اور مٹھائیاں بیچتے ہوئے دیکھا۔ معلوم ہؤا۔ کہ وہ گرد و نواح کے بہت سے کھیتوں کا پروہت تھا۔ اور اس اوسط درجے کی تجارت سے فصل کے موقعہ پر اپنی آمدنی میں ہر شخص کی دی ہوئی چار سیر گیہوں کا اضافہ کر لیتا تھا۔ اُس نے تفصیلاً بتایا۔ کہ یہ کام میں یونہی کرتا ہوں۔ دراصل میرا کام پیاسے راہگیروں کو سڑک کے دوسرے کنارے کے کوئیں سے مفت ٹھنڈا پانی پلانا ہے۔ اگرچہ وہ خاندانی پروہت تھا لیکن نہ پڑھ سکتا تھا۔ اور نہ لکھ سکتا تھا۔ البتہ وہ پیدائشی پروہت ضرور تھا۔

ترقی یافتہ راجپوت:۔ راستے میں مجھے ایک مستعفی فوجی افسر ملا۔ وہ ایک راجپوت اور گاؤں کے بینک کا پریذیڈنٹ تھا۔ اور صوبیدار میجر بہادر کا بیٹا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو "لیس نائک" بھرتی کرا دیا تھا۔ اگر اُس نے خود ملازمت کیشن سے شروع کی تھی۔ یہ امر کہ وہ اچھے چلن کا شخص تھا۔ اس بات سے ظاہر ہے۔ کہ مویشی پالتا ہے۔ اور اپنی ۱۴۰ ایکڑ زمین میں ہل بھی چلاتا ہے۔ اُس کے پڑوسی راجپوت اس وجہ سے اُسے حقارت سے دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص جس کی پنشن دو سو روپیہ ماہوار ہو۔ کیوں تمام دن مویشیوں کے پیچھے پیچھے پھرے۔ ۱۷۸۷ء میں آرتھر ینگ نے بھی جنوبی فرانس میں ایک اسی قسم کی مثال دیکھی تھی۔ اُمرا اپنی زمینوں کو کاشت کرنا حقیر جانتے تھے۔ اُس کی تنقید موجودہ حالات کے عین مطابق ہے۔ بہت ممکن ہے۔ کہ اُن بے وقوفوں اور بد دیانت لوگوں کی نسبت جو ان پر ہنستے ہیں یہ لوگ سوسائٹی کے زیادہ ممتاز رکن نہ ہوں۔ کھرڑ میں بھی میں نے ایک راجپوت کو ایک یا دو گوجروں کی مدد سے سبزیاں اُگاتے ہوئے دیکھا تھا۔ آج بوقت شام میں نے اُس کا کھیت دیکھا۔ اس میں امرودوں کا ایک چھوٹا باغ اور آلو۔ گاجر۔ شلغم

اور مرچوں کی عمدہ فصلیں تھیں۔ وہ بھی ایک بینک کا پریذیڈنٹ ہے۔ وہ ایک
ایسی مثال ہے۔ جو یہ ظاہر کرتی ہے۔ کہ امداد باہمی کس طرح اچھے لوگوں کو آگے
لیجاتی ہے۔ اب ہم کسولی کے پہلو بہ پہلو ہیں۔ (چھ ہزار فٹ) اور چور کی چوٹی
تمام کی تمام سامنے ہے۔

۱۷ دسمبر۔ کھرڑ سے منولی

بچپن کی شادی :- جب میں دھوپ میں ناشتہ کر رہا تھا۔ ایک موٹر لاری
نزدیک سے گذری جس میں باہر بھی تقریباً اتنے ہی آدمی تھے۔ جتنے کہ اندر دو
موٹر انجن کے غلاف پر تھے۔ ایک پائیدان پر۔ ہر ایک پہلو میں اور پانچواں چھت
پر سامان لئے ہوئے تھا۔ ناشتہ کے بعد میں نے مقامی مشن ہائی سکول کا معائنہ
کیا۔ مجھے بچپن کی شادی کے متعلق دو قابلِ ذکر نمونے دکھائے گئے۔ پہلا ایک
سنار کا لڑکا تھا۔ جو چھٹی جماعت میں تھا۔ اس کی عمر تیرہ سال کی بتائی جاتی
تھی۔ لیکن وہ دس سال سے ایک دن بھی بڑا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اُس نے
اپنی بیوی کے ساتھ جو اسی سے ایک سال چھوٹی ہے۔ رہنا شروع کر دیا
ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اس بات کے لئے ضد کرنے والی اس کی ماں ہے۔ دوسرا
ایک سولہ سال کا لڑکا تھا۔ وہ سکھ جاٹ تھا۔ اس کی شادی ۱۳ برس کی عمر
میں ہوئی تھی۔ اور اب بیوی اور لڑکی دونو کو کھو چکا تھا۔ مجھے چھٹی جماعت کے
ایک برہمن کے لڑکے کے متعلق بھی بتایا گیا۔ جو اگرچہ ۱۴ برس کا تھا۔ لیکن اُس
کے ہاں ایک لڑکی ہو چکی تھی۔ اس کی بیوی نے ۱۱ برس کی عمر سے اس کے ساتھ
رہنا شروع کیا تھا۔ ایک برہمن نے جو وہیں موجود تھا۔ اس کی تصدیق کی۔ ان
علاقوں پر شادی کی مقررہ عمر لڑکیوں کے لئے ۱۳ سے ۱۴ اور لڑکوں کے لئے ۱۵ سے
۱۶ سال ہے۔ شادی سے جیسا کہ لڑکے خود کہتے ہیں۔ دوسری شادی مراد ہوتی ہے
مجھے بتایا گیا۔ کہ ہوشیارپور کے ایک سکول میں بچپن کی شادی کا رواج کم کرنے
کے خیال سے یہ قانون بنایا گیا ہے۔ کہ وہ شادی کے بعد کسی لڑکے کو اپنے
سکول میں نہ رکھیں گے۔ اس قسم کے ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت اس امر سے
ظاہر ہے۔ کہ ہندوستان میں ۱۵ برس کی عمر تک ہر پانچ لڑکیوں میں سے دو شادی
شدہ ہوتی ہیں۔ اور ۱۹۲۱ء میں اُن میں سے ۴۰۰۰۰۰۰ بیوائیں تھیں۔

عورتوں کا کام:- کھرڑ چھوڑتے وقت ایک دانشمند سکھ میرے ساتھ ہوا جو کئی سو ایکڑ زمین کا مالک ہے۔ اس نے گاؤں میں عورتوں کے لئے انجمن امداد باہمی بیت و کفایت شعاری کھولنے کی درخواست کی بناپر عورتوں اور اُن کے کام کے متعلق گفتگو شروع ہوگئی۔ اُس نے بتایا۔ کہ اب چکی کوئی نہیں پیستا۔ اور راجپوتنیوں کے علاوہ کوئی کاتتا بھی نہیں۔ کیونکہ کارخانے کے بنے ہوئے کپڑے زیادہ سستے خریدے جا سکتے ہیں۔ اس علاقے میں جہاں کپاس کافی ہوتی ہے۔ یہ امر نہایت تعجب خیز ہے۔ سردار نے اس پر افسوس ظاہر نہیں کیا۔ کیونکہ اس سے عورتوں کے پاس دوسرے کاموں کے بہت سا وقت بچ جاتا ہے۔ وہ اب اپنے پلنگوں کے لئے سوتی نواڑ بُنتی ہیں۔ اونی و سوتی جرابیں بناتی ہیں۔ اپنے پاجاموں کے لئے ریشمی یا سوتی ازاربند بُنتی ہیں۔ اور رومال بناتی ہیں۔ اس میں سے بہت سے کام ایک پادری کی بیوی کے احسان کا نتیجہ ہے۔ جو کبھی کبھی گاؤں میں آیا کرتی تھی۔ گھر سے باہر سکھ جاٹ کی بیوی کا کام یہ ہے۔ کہ وہ صبح کو کھیتوں میں اپنے خاوند کا کھانا لیجاتی ہے۔ کپاس چنتی ہے۔ چارہ لاتی اور کاٹتی ہے۔ اور اُپلے تھاپتی ہے۔ موخرالذکر پہلے کی نسبت کم استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کا خیال تھا۔ کہ یہ بالکل استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ کیونکہ دودھ لکڑی کی آگ سے بھی گرم کیا جا سکتا ہے۔ اتفاقیہ طور پر اس نے اسی حقیقت کا اظہار کیا۔ جس کے متعلق میں نے پہلے بھی ہوشیارپور میں سُنا تھا۔ یعنی یہ کہ عورتیں اب اپنے زیورات صرف کسی خوشی یا جشن کے موقعہ پر پہنتی ہیں۔ کیونکہ یہ اُن کے کام کاج میں ہارج ہوتے ہیں۔ اس کا خیال تھا۔ کہ عورتیں اسے جلد چھوڑ دیں گی۔ اس کے بعد جب میں نے گاؤں کے ایک مجمع سے پوچھا۔ کہ عورتیں اپنے زیورات ہر روز کیوں نہیں پہنتیں۔ تو گروہ میں سے ایک پکار اُٹھا۔ "اللہ کی حکمت" اور دوسرے نے کہا "حکم آگیا ہے"۔ یہ کلمات اس امر کی اچھی مثالیں ہیں۔ کہ زندگی میں قسمت کا کس قدر دخل ہے۔

معیار زندگی:- سردار کا خیال تھا۔ کہ گذشتہ ایام کی نسبت کاشتکار کا کھانا متفرق ہونے کی وجہ سے پہلے سے بہت ترقی کر گیا ہے۔ کیونکہ اب وہ انڈے اور سبزیاں دونو کھاتا ہے۔ وہ خود بھی کھرڑ سے سبزی لاتا ہے۔ اکثر گاؤں میں بھی سبزیاں بیچنے کے لئے لائی جاتی ہیں۔ ایک اور فرق یہ پڑا ہے۔ کہ کھرڑ

کے سیلنی پھول گوبھی کی کاشت کرنے لگ گئے ہیں۔ زمین اور بارش دونو کی بہتات کی وجہ سے کوئیں بہت کم ہیں۔ اور اُن میں اکثر دن میں صرف چند گھنٹے استعمال کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ جب پانی کھینچا جاتا ہے۔ تو پانی کی سطح بہت جلد جلد نیچی ہوتی ہے۔ اس لئے لوگوں کے پاس سال میں صرف تین چار مہینے کام رہتا ہے۔ اور باقی سال مقدمہ بازی میں پورا کرتے ہیں۔ جو اس علاقہ کی خاص لعنت ہے۔ وہ اس بات پر متفق تھا۔ کہ اگر کوئیں اُٹھا رہے جائیں۔ تو باوجود اس امر کے کہ وہ زیادہ پانی نہیں دیتے۔ اکثر لوگ کثرتِ باراں کی مدد سے اپنی سبزیاں کاشت کر سکیں گے۔ جن گاؤں میں سے ہم گذرے اُن میں سے اکثر میں ایک یا دو گھر پختہ تھے۔ لیکن سردار نے کہا۔ کہ جہاں کہیں کاشتکار راجپوت ہیں۔ وہیں کوئی پختہ گھر ایسا نہ ملے گا۔ جو اُن کی ملکیت ہو۔ البتہ سکھوں کے گاؤں میں کافی ہیں۔ اور اُس کے اپنے گاؤں میں چند گھروں میں چمنیاں لگی ہوئی تھیں۔ جس کا یہ مطلب ہے۔ کہ وہاں سردی کے موسم میں حرارت کا بہت اچھا انتظام ہے۔ اُس کے گاؤں میں ایک لائبریری بھی تھی۔ جس میں اُس نے دو سو کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ نصف گاؤں میں تین سو روپیے کی لاگت سے سڑکیں بنائی گئی تھیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ سوائے اس کے کہ وہ بڑے پیمانہ پر قرضہ دیتا تھا۔ نئی روشنی کا ایک اچھا نمونہ تھا۔

دو انجمن ہائے اصلاح رسومات:۔ راجپوت مسلمانوں کے دو گاؤں کی انجمن ہائے اصلاح رسومات کو دیکھنے کیلئے میں سیلوارہ ٹھہر گیا۔ ان انجمنوں کی مہربانی کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ جس شادی میں ۸۰۰ سے لے کر ۱۰۰۰ روپیہ تک خرچ ہوتا تھا۔ اب صرف ۷۰ روپیہ میں کی جا سکتی ہے۔ حال ہی میں ایک ممبر نے اپنی دونوں لڑکیوں کی شادی اتنے ہی روپے میں کی ہے۔ اس کے بموجب دوسری رسومات کے تخمینے بھی کم کر دئے گئے ہیں۔ اور اُن ممبروں پر جو اُس کے قواعد پر عمل نہیں کرتے۔ جرمانہ کیا جاتا ہے۔ ایک کو لڑکی نزد خت کرنے کی وجہ سے سو روپیہ جرمانہ دینا پڑا تھا۔ اس قسم کی انجمنوں کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ روپڑ میں مجھے ایک سید نے بتایا۔ کہ ایک سید کی تجہیز و تکفین کی رسومات ۵ مختلف دعوتوں پر مشتمل ہیں۔ ایک موت کے تیسرے دن۔ دوسری نویں دن۔ تیسری انیسویں دن۔ چوتھی بتیسویں دن اور پانچویں چالیسویں دن اور پھر سال میں ایک

دفعہ۔ ہر موقعہ کا خرچ کم از کم پندرہ یا بیس روپے ہے۔ اور اس طرح یا پچاس موقعوں پر تین سو روپے خرچ ہوتے ہوں گے۔ کیونکہ نہ صرف سید بھائیوں کو ہی بلایا جاتا ہے۔ بلکہ گاؤں کے کمینوں کو بھی کھانا دیا جاتا ہے۔ انجمن ہائے اصلاح رسومات معاشرتی رسومات کے اخراجات کم کرنے تک ہی محدود نہیں ہے۔ ایک سال گذرا۔ جبکہ گردونواح میں پلیگ پھیل رہی تھی۔ اور سیواڑہ میں چوہے مرنے شروع ہوئے۔ تو انجمن نے ہرایک کو گاؤں خالی کرنے اور ٹیکہ لگوانے کے لئے کہا۔ ہرایک بچ گیا۔ اگرچہ قریب کے ایک گاؤں میں جہاں اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ پچاس آدمیوں کے مرنے کی خبر سنی جاتی ہے۔ انجمن کے پریذیڈنٹ نے اپنی عورتوں کے بھی ٹیکے لگوائے تھے۔ ملا نے اس کے خلاف یہ کہہ کر احتجاج کیا۔ کہ کسی غیر مرد کو عورت کا بازو چھونا حرام ہے۔ لیکن پریذیڈنٹ نے یہ کہہ کر خوب جواب دیا۔ کہ جب عورت منہار کو چوڑیاں چڑھاتے وقت اپنا بازو چھونے کی اجازت دے دیتی ہے۔ تو کیا ہرج ہے۔ اگر ڈاکٹر کو اس کے فائدے کیلئے اس کا بازو چھونے دے دیا جائے۔ تاہم لوگوں نے ملا کا ساتھ دیا۔ لیکن آج انہوں نے کہا۔ کہ اگر عورت کو ٹیکہ لگوانے بھیجا جائے۔ تو ہم معترض نہ ہوں گے۔ اگر لوگوں کا یہ رویہ عام ہے۔ تو عورتوں کو ڈاکٹروں کے پاس بھیجنے کی یہ دلیل بہت قوی ہے۔ اس قدر ترقی یافتہ گاؤں میں روشنی و صفائی کا مسئلہ تسلی بخش طریق سے حل کیا ہوا دیکھنا لازمی امر ہے۔ تمام گاؤں ہر روز صاف کیا جاتا تھا۔ اور کوڑا کرکٹ کمینوں کو لے جایا جاتا ہے۔ یہ کام گاؤں کے بھنگی کرتے ہیں۔ جنہیں اپنے مخصوص کام کے علاوہ کام کرنے کی اُجرت دی جاتی ہے۔ ہر گھر سے تیسرے دن روٹی لینے کے علاوہ ہر فصل کے موقعہ پر اُنہیں دس سے پندرہ فیصدی تک زائد غلہ دیا جاتا ہے۔ اور روٹی اب ہر روز کی ہے۔

گاؤں کی دایہ:- ایک پرانی بڑی رسم بغیر ذکر کئے رہ گئی ہے۔ وہ یہ کہ کسی گاؤں میں بھی تربیت یافتہ دایہ نہیں ہے۔ سیواڑہ میں تین دائیاں ہیں۔ ایک بھنگی کی بیوی ہے۔ دوسری جوگی کی۔ تیسری ایک تیلی کی آخری دایہ اندھی ہے۔ اور کام نہیں کرسکتی۔ بھنگی کا مرتبہ کسی تفصیل کا محتاج نہیں۔ جوگی تمام ذاتوں سے نیچی ذات ہے۔ اور جوتوں پر، ٹیلوں پر جو صدقے چڑھائے جاتے ہیں۔ وہ انہیں کو دئے جاتے ہیں۔ تیلیوں کا درجہ ذرا بلند ہے۔ لیکن ابھی گاؤں کے رذیل لوگوں میں

شمار کئے جاتے ہیں۔ دوسرے گاؤں میں صرف ایک ہی دایہ ہے۔ جو فقیروں
کی یا راہی ذات سے تعلق رکھتی ہے۔ دونو گاؤں میں دایہ لڑکے کے لئے ایک
روپیہ اور لڑکی کے لئے آٹھ آنے لیتی ہے۔ لڑکی کی پیدائش کے متعلق
ہندوستان کا رویہ اس فرق سے بخوبی ظاہر ہے۔ دونوں صورتوں میں دایہ
وہ کپڑے بھی لیتی ہے۔ جو بچے کی پیدائش کے وقت اس کی ماں نے
پہنے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی بڑا عطیہ نہیں ہے۔ کیونکہ بچہ جننے وقت سب
سے پرانے کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ سیلواڑہ ایک اچھا گاؤں ہے۔ اور یہاں
کے لوگ مستعد زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ امر خالی از دلچسپی نہیں۔ کہ ۱۸ سال
ہوئے۔ انہوں نے ایک اچھے مُلّا کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے۔ ایک
مخبر کو ہدایات دے کر جالندھر بھیجا۔ کہ وہ ایک ایسا مُلّا ساتھ لائے۔ جو بقول
اُن کے انہیں یہ بتائے۔ کہ چوری مت کرو۔ بدمعاشی سے بچو۔ وغیرہ وغیرہ
چنانچہ ایک ایسا آدمی مل گیا۔ اور وہ اُس وقت سے یہیں ہے۔

پنچ لوگ:۔ چھوت چھات کا خیال اسی تحصیل میں بھی اُتنا ہی قوی ہے۔ جتنا
کرتھنہ میں۔ پنچ لوگوں کے کوئیں اکثر اپنے ہیں۔ اور کہیں کہیں تالاب بھی اپنے
ہیں۔ جہاں اِن دونو میں سے کچھ نہیں ہے۔ وہاں وہ ایک ہندو سقے کو صبح
شام پانی کھینچنے کے لئے نوکر رکھ لیتے ہیں۔ اسکول میں اُن کے بچے علیحدہ
بیٹھتے ہیں۔ اور دوسروں کے ساتھ نہیں کھیل سکتے۔ چھوئے ہوئے شخص
پر پانی چھڑکنے کی رسم ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن دسوہہ اور گڑھ شنکر
میں جہاں آریہ سماجیوں نے کچھ کام کیا ہے۔ یہ بات نئی نسل میں سے مٹتی جارہی
ہے۔ اور لوگ اس معاملے کے متعلق زیادہ آزاد خیال ہوتے جاتے ہیں۔

مویشی و مذہب:۔ گڑھ شنکر میں پرانے اور بیکار مویشی آزادی سے
قصابوں کے پاس فروخت کر دئے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں ہندو اور
سکھ دونوں میں اُس کے خلاف جذبات اتنے ہی تیز ہیں۔ جتنے کہ اُونہ
میں۔ کوئی کبھی کبھی بیل یا گائے کو عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے نہیں بیچتا۔
جیسا کہ آرنہ ایک کاشتکار نے بتایا۔ کہ جب ایک بیل نے میرے لئے
دس سال کام کیا ہے۔ تو کیا میں اُسے اب، اس لئے بیچ دوں۔ کہ وہ کام
نہیں کر سکتا۔ میں دوسروں کی طرح رحم کے جذبے سے بالکل عاری

نہیں ہوں۔ آر تھر ینگ نے ایک اندھی گھوڑی کا جو اُسے فرانس کے دوروں میں سے ایک میں لئے لئے پھری۔ ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "بغیر آنکھوں کے اُس نے مجھے پندرہ سو میل نہایت سلامتی سے پھرایا ہے۔ اور اب اس کی باقی ماندہ زندگی میں سوائے میرے اور کوئی اس کا مالک نہ ہوگا" دونوں حالتوں میں جذبات وہی ہیں۔ اور چونکہ ٹھیک انسانی دل سے نکل رہے ہیں۔ اس لئے انہیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ خواہ وہ گھوڑے کے متعلق ہوں۔ خواہ بیل یا گائے کے۔ بعض ہندو تاجر آجاتے ہیں۔ اور مویشیوں کو بظاہر اپنے استعمال کے لئے خرید لیتے ہیں۔ لیکن دراصل وہ قصابوں کے پاس بیچ دیتے ہیں میرے ہمراہیوں میں سے ایک مسلمان سفید پوش نے بتایا۔ کہ بہت مسلمان بھی پرانے مویشیوں کو نہیں بیچتے۔ جب میں نے اس سے دریافت کیا۔ "کیا بالکل نہ فروخت کرنے والوں کی نسبت فروخت کرنے والے لوگ زیادہ ہیں؟ تو اُس نے جواب دیا۔ تمام وہ لوگ جن کے دل صاف ہیں۔ فروخت نہیں کرتے۔

ہندو مسلم تعلقات:۔ ایسے گاؤں میں جہاں ہندو مسلمان اکٹھے رہتے ہیں۔ مسلمان مقامی پروہت کو اپنی شادیوں پر بلاتے ہیں۔ اور اُسے ایک روپیہ دے دیتے ہیں۔ جو بلاشبہ اُن دنوں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ جبکہ وہ ہندو تھے۔ اور خاندانی پروہت دستور کے مطابق اُن کے ہاں آتا تھا۔ بعض گاؤں میں ہندو اس مدارات کا بدلہ ملّاں کو دعوت دے کر اور ایک روپیہ مسجد کے لئے عطا کر کے اُتار دیتے ہیں۔ میرے عملے کا ایک ممبر۔ جو رہتک کا رہنے والا ہے۔ یہ کہتا ہے۔ کہ وہاں بہت سے گاؤں ایسے ہیں۔ جہاں مسلمان دیہاتیوں نے دیر ہوئی کہ اپنے مسلمان ہونے سے پہلے اپنے خاندانی پروہت کو زمین کا ایک ٹکڑا دیا ہوا تھا۔ لیکن اُس کا جانشین اب بھی سال میں ایک یا دو روپیہ کا رسمی پیشکش لینے آتا ہے۔ اگرچہ اب اُس کا کنبہ وہاں نہیں رہتا۔ اور دیر ہوئی کہ زمین کا وہ ٹکڑا چھوڑ دیا ہے۔ یہاں بھی اُس کی مثالیں موجود ہیں۔ بدقسمتی سے دونو بڑی قوموں کی باہمی خوش خلقی زمانے کے فرقہ وارانہ خیالات کی وجہ سے دبتی جا رہی ہے۔ گذشتہ جون میں روپڑ سے تین میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں سخت لڑائی ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نو دس آدمی مارے گئے۔ لیکن یہ زیادہ تر شہریوں کے اُکسانے

کی وجہ سے تھا۔ خوش قسمتی سے وہ فرقہ داری جس کی وجہ سے لڑائی برپا ہوئی۔ گردونواح کے گاؤں میں نہیں پھیلی۔ حال ہی میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے انتخاب نے بھی بہت کچھ فرقہ داری کے جذبات اُبھار دئے تھے۔ جن کی بنا پر ایک تحصیل میں ہندو مسلمانوں میں تفرقہ ہو گیا تھا۔ اور دوسری میں راجپوتوں اور جاٹوں میں۔ اس موقع پر ہندو اور مسلمان راجپوت مل جل گئے تھے۔ تاہم اس انتخاب نے کوئی دیرپا خصوصیت نہیں چھوڑی۔ اور یہ عام طور پر کیا جاتا ہے۔ کہ ابھی تک فرقہ داری نے دیہات کی راہ نہیں لی۔

منولی:۔ جب ہم منولی کے نزدیک پہنچے۔ تو ہمارے ملاقاتیوں نے فوراً ہی جنگلی جانوروں کی تباہ کاریوں کی شکایت کرنی شروع کر دی۔ یہ جانور قریب کی ریاست سے جہاں غالباً اُن کی حفاظت کی جاتی تھی۔ بھٹک کر اُن کے کھیتوں میں آجاتے تھے۔ انقلاب فرانس سے پہلے فرانسیسی دیہاتیوں کی طرح انہوں نے بھی مخالفت کے لئے التجا کی۔ ایک شخص نے اپنے نئے سبزیوں اور پھلوں کے باغ کو محفوظ رکھنے کے لئے تین سو روپے تار کے جنگلے پر خرچ کئے تھے۔ اور یہ بھی جانوروں کو ہمیشہ باہر میں رکھ سکتا تھا۔ منولی کی آبادی دو ہزار کے قریب تھی۔ لیکن اُس کے نزدیک کا حصہ اتنا گندہ تھا۔ جتنا کہ ہو سکتا ہے۔ اور ہر شخص کی مایوسی کو مکمل کرنے کے لئے ایک آئل انجن شام کے وقت کو اپنی متواتر دھکا چھک سے ہیبتناک بنا رہا تھا۔ جو لوگ ہمیں ملنے کے لئے آئے۔ انہوں نے اس کی سخت شکایت کی۔ انہوں نے کہا۔ کہ اس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کو بولتے ہوئے نہیں سُن سکتے۔ اور یہ ایک اسکول کے نزدیک ہے۔ اس سے پڑھائی میں سخت دقت پیش آتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ آدھی رات تک چلتا رہتا ہے۔ اور ہمارے آرام میں خلل آتا ہے۔ ایک آزاد مسلمان کے ہاتھوں کا اٹھارھویں صدی کا بنا ہوا قلعہ اس کی متروک جگہ کی خاص شہرت کا باعث ہے۔ اب ہم تقریباً کسولی سے پرے ہیں۔ اور سلسلہ چور کو (۱۱۹۸۲) فٹ سیدھے اوپر دیکھ سکتے ہیں۔ ایک ہفتہ ہوا اسے پہلے پہل ہم نے اُدھر سے اُوپر کی پہاڑیوں پر سے دیکھا تھا۔ شام کی روشنی میں جب کہ غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی ایک جھلک ایک لمحے کے لئے اُس کی برفانی چوٹی پر سے ہوتی ہوئی چلی گئی۔ یہ نہایت خوبصورت نظر آرہا تھا۔

۱۸ دسمبر ـ منولی سے مبارکپور (۱۳ میل)

راجپوت اور پردہ :- جن سڑکوں پر ہم نے آج تک سفر کیا۔ آج ہم اُن تمام سڑکوں سے زیادہ گندی سڑکوں پر چلے اور ایک جگہ تو سڑک ۱۰۰ گز تک پانی ہی کے نیچے غائب تھی۔ میرے ہمراہ ایک سکھ سفید پوش اور ایک مسلمان راجپوت تھا۔ ہوتے ہوتے عورتوں کی مشغولیت کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ گزشتہ دو یا تین سال سے انہوں نے دریاں بُننے اور ازار بند۔ تولیئے اور تکیوں کے غلاف بنانے کا کام اختیار کیا ہے۔ کیونکہ جب سے انہوں نے چکی پیسنا چھوڑا ہے۔ اُن کے پاس وقت بچ رہتا ہے۔ جلاہوں کی مزدوری پہلے کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ راجپوت عورتوں کے پاس پردہ نشین ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ وقت فالتو ہوتا ہے۔ وہ دودھ دوہتی ہیں۔ روٹی پکاتی ہیں۔ کپڑے دھوتی ہیں۔ چرخہ کاتتی ہیں۔ اور پھر بیکار بیٹھ جاتی ہیں۔ ابھی تک پردہ اُٹھانے کی کوئی علامات نہیں ہیں۔ تمام راجپوت جن سے میں نے گفتگو کی ہے۔ اس امر پر متفق ہیں۔ لیکن دو راجپوتوں نے جن سے میں بعد میں ملا یہ تسلیم کیا۔ کہ مسلمان عورتوں کو پردہ میں رکھنے والا وہ عقیدہ ہے جس کی وجہ سے مسلمان یہ سمجھتے ہیں۔ کہ پردہ جزو مذہب ہے۔ اگر یہ نہ ہو۔ تو وہ جلد باہر آ جائیں۔ کیونکہ پردہ میں رہ کر عورتوں کے لئے تندرست رہنا نہایت مشکل ہے۔ راجپوتوں میں سے ایک نے بتایا۔ کہ ہم پانچ بھائی ہیں۔ اور پانچوں کھیتوں میں کام کرنے والے ہیں۔ لیکن اگر پردہ نہ ہوتا۔ تو ہم دس کمانے والے ہوتے۔ اور کوئی ہماری روٹی لانے والا ہوتا۔ اب ہمیں اپنے گھر روٹی کھانے واپس جانا ہے۔ اور ہم اپنے سروں پر آگ جلانے کیلئے لکڑیاں بھی لے جائیں گے میرے راجپوت افسروں میں سے ایک کے سامنے جبکہ وہ اپنے راجپوت بھائیوں کو یہ نصیحت کرنے لگا۔ کہ عورتیں پردے سے باہر نکل آنی چاہیئے۔ دینداری کا ایک اور سخت نظریہ پیش کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ خدا کے لئے خاموش رہو۔ کیا تم مسلمان نہیں ہو۔ اس حالت میں دینداری سخت اقتصادی کمزوریوں میں پھنسا دیتی ہے۔ چونکہ اُن کی روٹی لانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اس لئے راجپوت صبح کی روٹی کا وقت ختم ہونے تک لاچار گھر ٹھہرے رہتے ہیں۔ اور کام نہ ہونے

کی وجہ سے گاؤں کے مہمان خانے میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور حقہ پیتے ہیں۔ آخرکار جب صبح کے دس یا گیارہ بجے کوشش کر کے اُٹھتے بھی ہیں۔ تو وہ نیم بیہوشی کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اور باقی ماندہ نصف دن کے تھوڑے سے وقت میں بھی اچھی طرح کام کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔

ملازمت یا زراعت:۔ راستے میں ہم نے ایک سکھ جاگیردار کو ہل چلاتے ہوئے دیکھا۔ اگرچہ اس کی جاگیر سے سالانہ آمدنی صرف تین روپیہ تھی۔ لیکن جاگیردار کی شخصیت ہمیشہ کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتی ہے۔ اُس مستعفی فوجی کی طرح جس سے ہم دو دن ہوئے ملے تھے۔ اُسے بھی اُس کی شخصی اہمیت ہل چلانے سے نہیں روکتی تھی۔ اور یہ امر نہایت مسرت کا باعث ہے۔ اُس نے ہمیں ایک کنواں دکھایا۔ جو پانی کی سطح تک تیس فٹ گہرا تھا۔ یہ اُس نے حال ہی میں دو ہزار روپے میں لگوایا تھا۔ اور ۱۴۰ روپے رہٹ کے لئے اور ادا کئے تھے۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ اُس کے پاس ایک کھیت آلوؤں کا ایک مرچوں کا اور تیسرا لہسن کا تھا۔ جن میں سے تمام کی تمام گردونواح کے لئے نئی فصلیں تھیں۔ چونکہ اُس کے پانچ بچے تھے۔ اُس نے تعلیم کا بھی ذکر کیا۔ اُس نے کہا۔ تین تو سکول میں ہیں۔ ایک مویشیوں کی نگہبانی کرتا ہے۔ اور سب سے چھوٹا ابھی بچہ ہے۔ اُس نے بتایا کہ آٹھویں جماعت تک لڑکا کھیتوں میں کام کاج کے لائق رہتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ اتنا کمزور ہو جاتا ہے۔ کہ اُسے نہیں کر سکتا۔ تعلیم کی غرض و غایت صرف ملازمت ہے۔ کیونکہ نوکری سے باقاعدہ مقررہ تنخواہ ملتی ہے اور مستقل آمدنی ہوتی ہے۔ خواہ مینہ جائے یا آندھی ملازم اپنی روٹی ہر روز حاصل کرتا ہے۔ جبکہ کاشتکار کو اکثر بھوکا رہنا پڑتا ہے۔ اُونہ میں بھی اسی وجہ سے نوکری کی تعریف کی گئی تھی۔ لیکن جاگیردار نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اب نوکری حاصل کرنی مشکل ہے۔ کیونکہ غریب امیر سب اپنے بچوں کو سکول بھیجتے ہیں۔ امیر لوگ بڑی جماعتوں کی فیس ادا کر سکتے ہیں۔ پس اُن کے لڑکے ملازمت حاصل کر لیتے ہیں۔ اور ہمارے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

فقرا:۔ ہماری دوسری ملاقات دو سادھوؤں سے ہوئی۔ ایک سفید لباس میں ملبوس تھا۔ اور پھول ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔ اور دوسرا ایک سکھ۔ عام دیہاتیوں کا لباس پہنے ہوئے اور بالکل ایسا ہی جسم لئے ہوئے تھا۔ اُس نے

بتایا کہ سات سال ہوئے میں نے دنیا ترک کر دی تھی۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ اُس نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور اب میں اپنا وقت خدا کے نام کی تسبیح کرنے میں گذارتا ہوں۔ اس کا سفید کپڑوں والا ساتھی پٹنہ کے نزدیک سے آیا تھا۔ اور راستے میں مانگتا کھاتا شمال کی طرف گھومتا ہُوا آرہا تھا۔ وہ ہر ایسی جگہ جاکر ٹھیرتا تھا۔ جہاں ..... وہ اپنی مانگی ہوئی بھیک پر گذارہ کر سکتا تھا۔ اُس کے تھوڑی دیر بعد ہم ایک اور سکھ سادھو سے ملے۔ جو زعفرانی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اور اتنا ہی تنومند تھا۔ جتنا کہ اس سے پہلا ملاقاتی دیہاتی بلتے کا۔ ایسے مشٹنڈے لوگوں کی امداد پر طیار ہو جانا اُمن کی خوشحالی کے سخت منافی ہے۔

مبارک پور میں ہم نے گھگر کو پایاب عبور کیا۔ پنجاب کے پانچوں دریاؤں میں کوئی جگہ نہ پاکر یہ دریا انبالہ۔ پٹیالہ اور حصار میں سے اپنا پایاب راستہ بناتا ہُوا۔ آخرکار بیکانیر کی ریت میں غائب ہوجاتا ہے۔ لیکن موسمی ہواؤں کے دنوں پہاڑوں پر سے اس قدر شدید ریلے آتے ہیں۔ کہ گذشتہ ایام میں شملے کی ڈاک ہاتھیوں پر سے جانی پڑتی تھی۔ اور اب ایک بہت سے ستونوں والے ریلوے کے لوہے کے پُل کی ضرورت ہے۔

دوسرا حصّہ
تحصیل نرائن گڑھ

۱۹ دسمبر مبارک پور سے گڑھی

تحصیل نرائن گڑھ :- دریائے گھگر کو عبور کرکے ہم تقریباً پنجاب سے گزر کر صوبجات متحدہ میں داخل ہوگئے ہیں۔ دریائے جمنا جو دونوں کے درمیان سیاسی و ملکی حد ہے۔ یہاں سے دور نہیں ہے۔ ہندوستان کی زیادہ شائستہ علامات کچھ کچھ ظاہر ہوتی جاتی ہیں۔ اور کثرتِ باراں (۴۴ اِنچ) کے ساتھ ساتھ آموں کے جھنڈ تعداد اور اونچائی کے لحاظ سے بڑھتے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں بارش کی افراط ہے۔ قوتِ نمو کم ہے۔ اور جہاں یہ کم ہے۔ وہاں آموں کی خاصیت پر

اثر پڑا ہے۔ افسران بندوبست یہاں کے لوگوں کے متعلق کوئی اچھی بات نہیں لکھتے۔ جاٹ جو کہ کھرڑ میں اسی قدر کفایت شعار اور محنتی ہیں۔ یہاں اپنے گردونواح کے لوگوں کی غیر مستقیم نالائقی سے خراب ہوئے ہیں۔ آخرالذکر راجپوت ہیں۔ جن میں اکثر مسلمان ہیں۔ اور جن کے پاس کاشت شدہ رقبہ کا ۴۷ فیصدی ہے۔ سستی، فضول خرچ اور بال بال قرض میں پھنسے ہوئے ہونے کی وجہ سے وہ بد سے بدتر حالت کو پہنچ رہے تھے۔ کہ امداد باہمی اپنی جدوجہد کی پکار اور رہائی کی امید لئے ہوئے اُن کے پاس آئی۔ اب تحصیل میں تقریباً دو سو دیہاتی بینک ہیں۔ اگرچہ بہت سے بینکوں کی بنیادیں پختہ نہیں ہیں۔ لیکن آئندہ کسی وقت یہی بینک نیک دَور کے آغاز کی امید دلاتے ہیں۔

بیل گاڑی اور موٹر:- گھگر کے اونچے کنارے پر جہاں سے گھگر اور موروی کسولی کی قریب کی پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔ دھوپ میں ناشتہ کرتے ہوئے میں نے بیل گاڑیوں کو گھگر کے طاس میں پست ریتلی ڈھلانوں کی مشکلات سے کشمکش کرتے ہوئے دیکھا۔ چابک کے آزادانہ استعمال اور پہیوں پر تمام زور لگانے کے باوجود وہ مشکل سے چلتے تھے۔ اور تھوڑی دیر تک انسان بالکل مبہوت ہو جاتا تھا موٹروں کی اس آسانی سے جس سے کہ وہ دریا کو نہایت عمدہ بنی ہوئی سڑک سے عبور کر رہی تھیں۔ اس کا مقابلہ کرنا بالکل ناممکن تھا۔ سڑک سفیدی کئے ہوئے پتھروں سے نمایاں کی گئی تھی۔ اور اسے مضبوط و ہموار بنانے کے لئے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک فولاد کا ۲۰۰ گز لمبا جال پھیلایا ہُوا تھا۔ بعد ازاں دن کے وقت جب ہم سڑکوں کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ میرے ہمراہیوں میں سے ایک نے اس مقابلے کا تنقیدی طور پر ذکر کیا۔ جس سڑک سے ہم آج آئے۔ یہ ڈسٹرکٹ بورڈ کی تھی۔ اور اُس کا ایک حصہ اتنا خراب تھا۔ جتنا کہ ہونا ممکن ہے لیکن اس پر بغیر زیادہ تکلیف یا خرچ کے ایسی ہی قابل گذر بنائی جا سکتی تھی۔ جیسی کہ یہ صرف بیل گاڑیوں کے لئے تھی۔ جب میں نے اس پر تبصرہ کیا۔ تو مجھے بتایا گیا۔ کہ یہ اسی لئے خراب ہے۔ کہ افسر اس راستے سے بہت کم آتے ہیں۔ کوٹ میں جو کہ ایک بڑا گاؤں ہے۔ اور جہاں ہم چند انجمنیں دیکھنے کے لئے ٹھہرے لوگ سڑکوں کے متعلق میری نسبت زیادہ فلسفہ چھانٹتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم نے اپنی تمام سڑکوں کی مجموعی طور پر کبھی مرمت نہیں کی ہر شخص اس حصے

کی مرمت کر دیتا ہے۔ اور اُسے تنگ کر دیتا ہے۔ در اصل اُن کے گردونواح کی سڑکیں کافی اچھی تھیں۔ چونکہ زمین اونچی تھی۔ پانی کھڑا نہیں ہوتا تھا۔

حفظان صحت و ترقی:۔ جب ہم کوٹ پہنچے تو گاؤں کے لوگوں نے یہ بتانے میں بڑی بیدار مغزی کا ثبوت دیا کہ۔اب کھاد کے ڈھیر گاؤں میں نہیں ہیں۔ بلکہ اسی سے ذرا باہر مشترکہ زمین پر ہیں۔ یہ دریافت کرنے پر کہ انہوں نے یہ تبدیلی کیوں کی تھی۔ انہوں نے جواب دیا۔ حضور کا حکم۔ میں نے کہا۔ میں نے تو کوئی حکم نہیں دیا۔ تو انہوں نے کہا پھر کسی اور کا حکم ہوگا۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی بتایا۔کہ اس میں بڑی تکلیف ہے۔ چونکہ گاؤں کے نزدیک ہر ایک کے ڈھیر کے لئے کافی مشترکہ زمین نہیں ہے۔ بہت سے لوگوں کو کھاد لے کے پار لے جانا پڑتا ہے۔ (گاؤں سے ۰۰ اگز کے فاصلے پر ایک چوڑی خندق تھی)۔ اور جب نالا پانی سے بھرا ہوا ہو۔ تو پھر یہ کیسے کیا جائے۔ ہم تمام راستے میں اسی قسم کی شکایتیں سنتے چلے آئے ہیں۔ جہاں کہیں بجائے گاؤں کے اور کھاد کے ڈھیر لگانے کے اسے باہر جمع کیا جاتا ہے۔ یہ بات صاف طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔کہ یہ حکماً کیا گیا ہے۔ یہ اُس منظم کوشش کا نتیجہ ہے۔ جو اس گاؤں میں گوڑ گاؤں کی پیروی کرنے کے لئے کی جارہی ہے۔ زیادہ دانشمند لوگ نکتے کو سمجھ جاتے ہیں۔ لیکن اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ یہ ایک اور کام اوپر سے ان کے ذمے لگا دیا گیا ہے۔ اس طریق سے اصلاحات عمل میں لانے کے فوائد پر کافی شکوک ظاہر کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس امر میں شبہ کا کوئی امکان نہیں کہ اصلاح نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ جتنا ہم جنوب کی طرف جائیں۔ اُتنا ہی گاؤں ہوتے جاتے ہیں۔ بڑے گاؤں یا قصبے سب سے زیادہ خراب ہیں۔ مثلاً منولی جسے کل دیکھا تھا۔ اور رائے پور جسے آج دیکھا ہے۔ اور جس کی گندگی تقریباً ناقابل یقین ہے۔ اگر موسےٰ علیہ السلام کے سادہ فرمان پر جو انہوں نے ڈیوٹیرونومی کے تیئسویں حصے اور تیرھویں سطر میں دیا ہے۔ عمل کیا جاتا۔ یا صرف سکولوں ہی میں پڑھایا جاتا۔ تو بے شمار گاؤں کے گردونواح کے علاقے اب ہیبتناک جگہیں نہ ہوتیں۔ اور گاؤں کی زرخیزی اتفاقیہ طور پر بڑھ جاتی۔

بہتر رہائش:۔ سو کے قریب دوسرے آدمیوں کے ساتھ جو کہ تقریباً تمام کے تمام مسلمان راجپوت تھے۔ ہم دن کے کام کے لئے ایک بڑے نیم کے درخت

کے نیچے نہایت آرام سے بیٹھ گئے۔ یہ درخت اتنا پرانا تھا۔ کہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسے کب لگایا گیا تھا۔ وہاں تین انجمن ہائے اصلاحِ رسوم کے ممبران موجود تھے۔ تینوں کی تینوں خوب کام کر رہی تھیں۔ اور بے شمار لوگوں کو قانون شکنی کی بنا پر جرمانہ کیا گیا تھا۔ اور خلافِ معمول ادائیگی کی مشق کرائی گئی تھی۔ مثلاً ایک نے برادری کو دعوت دینے کی بنا پر دو روپے دئے تھے۔ اور دوسرے نے آٹھ آنے۔ کیونکہ اس کی بیوی نے ڈومنی کو ڈھول بجانے اور ناچنے کے لئے بلایا تھا۔ یہ دونوں پرانی رسمیں بند کردی گئی ہیں۔ کیونکہ یہ فضول خرچی کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ دو اور آدمیوں کو اپنے گھرانوں کی عورتوں کو بازار میں خرید و فروخت کی اجازت دینے پر دس دس روپے جرمانہ کئے گئے تھے۔ انجمن ان کو منع کرتی ہے۔ کچھ تو اس لئے کہ پردہ کے خلاف ہیں۔ اور عورتیں نامناسب ارادوں کے خطرات کا شکار بنتی ہیں۔ اور کچھ اس لئے کہ مردوں کا یہ خیال ہے۔ کہ بازاری بھاؤ سے بے خبر ہونے کی وجہ سے عورتیں ان کی پیدا کردہ اشیا نہایت سستی فروخت کرتی ہیں۔ اور طبعاً فضول خرچ واقع ہونے کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ خرید لاتی ہیں۔

گھر کا بُنا ہُوا کپڑا:— عورتیں مشین کے بُنے ہوئے نازک کپڑے کو ترجیح دینے کی وجہ سے گھر کا بُنا ہُوا کھدر بہت کم پہنتی ہیں۔ لیکن وہ اپنے خاوندوں کے کپڑوں کے لئے اب بھی سوت کاتتی ہیں۔ البتہ وہ خود نہیں پہنتیں۔ تاوقتیکہ وہ جلاہوں کی بیویاں نہ ہوں۔ البتہ آدمیوں نے کبھی کاتنے کا کام نہیں کیا اور جب اُن کے سامنے مسٹر گاندھی کا نظریہ پیش کیا گیا۔ تو وہ ہنس پڑے۔ تاہم یہ اُن کے لئے ایک نعمت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اُن کے پاس کسی قسم کی گھریلو صنعت نہیں ہے۔ اور کاشتکاری جو سراسر بارش پر منحصر ہے۔ اب سے لے کر فصل کٹنے کے موقعہ تک اُنہیں کافی فرصت کا وقت چھوڑ دیتی ہے۔ اس کی انہوں نے قطعاً تصدیق نہیں کی۔ انہوں نے کہا۔ کہ گیہوں کی گوڈائی میں ایک مہینہ لگ جائے گا۔ اس کے بعد وہ زمینوں کو دوسرا بیج ڈالنے کے لئے تیار کریں گے۔ پھر بھی بہت سے لوگوں کو فرصت ہوتی ہے۔ یہ امر اس بات سے ظاہر ہے۔ کہ زیادہ طاقتور لوگ اپنی گاڑیاں

پتھر ڈھونے کے لئے کالکا کی سڑک پر لے جاتے ہیں۔ اور وہ جن کے پاس گاڑیاں نہیں ہیں۔ گھگر کے کنارے پتھر توڑنے کا کام کرتے ہیں۔ اُن تمام لوگوں میں سے جو نیم کے درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ صرف دو آدمی مکمل طور پر کھدر پہنے ہوئے تھے۔ دونوں اس نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ جواب نابود ہو رہی ہے۔ اور دونوں میں جو دوسرے سے بڑا تھا۔ وہ گاؤں کا نمبردار تھا۔ وہ بے داغ سفید لباس میں ملبوس تھا۔ لیکن دوسرا اپنے بدرنگ لباس کی وجہ سے پرانے طریقوں کا کچھ زیادہ اچھا اشتہار نہ تھا۔ بہت سے کھدر کی چادر میں ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن نیچے مشین کا بُنا ہُوا کرتا پہنے ہوئے تھے۔

- - - - - - - - - اور تقریباً سب کے پاس کارخانوں کی بنی ہوئی پگڑیاں تھیں۔ کھدر کا مشین سے بُنے ہوئے کپڑے سے تبادلہ ہمارے مفروضہ وقت سے بھی پہلے عمل میں آیا۔ کیونکہ ۱۸۸۰ء میں افسر بندوبست نے یہ لکھا۔ کہ زراعت پیشہ آبادی کا بڑا حصہ خوراک پر زیادہ صرف نہیں کرتا لیکن کپڑے پر اُن کا خرچ بہت بڑھ گیا ہے۔ کیونکہ لوگوں نے گھٹیا انگریزی کپڑوں کی خاطر گھر کا بنا ہُوا کھدر پہننا چھوڑ دیا ہے۔

پیدائش و اموات:۔ میں نے گاؤں کے پیدائش و اموات کے رجسٹر پر جو چوکیدار کے پاس رہتا ہے۔ نظر ڈالی۔ ایک میلی بوسیدہ چیز تھی۔ جو دراصل درد بھری داستان سُنا رہی تھی۔ کیونکہ گزشتہ مارچ میں جب گاؤں میں پلیگ پڑی۔ تو ۴۵ آدمیوں کا صفایا کر گئی۔ انہوں نے بتایا۔ کہ ہم سب کے اور ہماری بیویوں کے بھی ٹیکے لگائے گئے تھے۔ لیکن یہ ضرور بہت دیر میں لگے ہوں گے کیونکہ اُن لوگوں میں سے جو طاعون کا شکار ہو گئے تھے۔ صرف دو یا تین کو لگائے گئے تھے۔ عورتوں کے معاملے میں کوئی دِقّت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ جب انہوں نے یہ جان لیا۔ کہ چاروں طرف پھیلی ہوئی وحشت سے بچاؤ کا صرف یہی ممکن ذریعہ ہے۔ تو انہوں نے ٹیکہ لگوانے کو کہا۔ کوئی یہ خیال کرے گا۔ کہ بچہ جننے وقت بھی وحشت ہوتی ہوگی۔ کیونکہ دونوں مذکورہ دیہات میں سے کسی میں بھی تربیت یافتہ دایہ نہیں ہے۔ دو گاؤں کی بیچ عورتیں ہیں۔ دیتلی اور بھنگن کی بیویاں۔ ایک فقیر کی بیوی اور چوتھی خلافِ توقع راجپوت تنی ہے۔ اسی خیال سے کہ آئے دن کی غیر تربیت یافتہ کیغی والیوں سے بچنے کا ایک موقع ہے۔ میں

نے یہ تجویز کی کہ اسے تربیت دلانی چاہئیے۔ لیکن انہوں نے اپنے سر ہلائے اور کہا کہ وہ اتنی بوڑھی ہے۔ کہ اب نہیں پڑھ سکتی۔

مقامی طریق امداد باہمی :- میں نے لوگوں سے پوچھا۔ کہ کسی قسم کی وطنی معاونت ابھی تک دیہات میں باقی ہے۔ انہوں نے اس جگہ سے جہاں وہ بیٹھے تھے۔ ذرا پیچھے ایک پختہ عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ اور بتایا کہ یہاں پٹی کے لوگ مشورے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اور اُن کے بڑے کشادہ کمرے میں مہمانوں اور مسافروں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ ایسا گھر ہر پٹی میں ایک ہے۔ اور گاؤں میں چار پائیاں ہیں۔ یہ عمارتیں تمام پٹی کے ہر ایک گھر پر چندہ لگا کر بنائی گئی تھیں اور اس ایک پر چھ سات روپے خرچ ہوئے تھے۔ ہمارے پاؤں نیچے کی دریاں بھی پٹی کی ملکیت تھیں۔ اور اس طرح شادیوں کی ضروریات کے مطابق چاول پکانے کی ایک بڑی دیگ بھی پٹی کی تھی۔ پانی پینے کے اور دوسری قسم کے تمام کنوؤں کی مرمت مشترکہ خرچ سے کی جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی فصلوں کو چوری سے بچانے کے لئے ایک رکھوالا ملازم رکھ لیا جاتا ہے۔ یہ رواج تحصیل میں عام ہے۔ کیونکہ گاؤں کے کمین لوگ اتنے ایماندار نہیں۔ جتنا کہ انہیں ہونا چاہئیے۔ در عام طور پر زمین کے ٹکڑے بکھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے علیحدہ علیحدہ رکھوالا رکھنا ناممکن ہے۔

برہمن رہگیر :- آج جن لوگوں سے ہم سڑک پر ملے۔ اُن میں سب سے زیادہ دلچسپ تین چیتھڑے پہنے ہوئے برہمن تھے۔ جو ہمالیہ کی اُن وادیوں سے جو گنگوتری سے نیچے واقع ہیں۔ اور جہاں سے دریائے گنگا نکلتا ہے۔ اس لئے چلے آرہے تھے۔ کہ لاہور و امرتسر میں اپنے ججمانوں سے سالانہ واجبات کا مطالبہ کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گرمی کے موسم میں جب جاتری گنگا کے منبع کو دیکھنے آتے ہیں۔ تو وہ اُن کی روحانی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ اور انہوں نے بہت سے ایسے خاندانوں سے گہرے تعلقات پیدا کر لئے ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً گنگا کے درشن کو جانا دھرم کا نہایت ضروری حصہ خیال کرتے ہیں۔ آخرالذکر میں سے انہوں نے لاہور کے دو مشہور خاندانوں کا نام لیا۔ وہ سنگین پہاڑوں سے چل کر ہردوار سے جو کہ صرف آٹھ منزل کے فاصلے پر ہے۔ گزرتے ہوئے اکیس منزلیں پیدل طے کر کے آئے تھے۔ مجھے اُن سے کچھ ہمدردی محسوس

ہو ئی ۔ اور بلا شبہ تقریباً ایک رشتہ سا پیدا ہو گیا ۔ کیونکہ وہ اُسی راستے سے جانے کا ارادہ رکھتے تھے ۔ جو ہم نے ابھی طے کیا تھا ۔ میں نے پوچھا اس طویل سفر کے تمہیں کیا ملے گا ۔ انہوں نے کہا ۔ تین چار سو روپے اور نئے کپڑے ۔ اور یہ نئے سال تک اُن کے قیام و طعام کیلئے کافی معلوم ہوتا ہے ۔

ایک دیہاتی سوار ۔ سینیوں کے ایک گاؤں میں سے گزرتے ہوئے ہم ایک کھتری ساہوکار سے ملے جو اپنے ایک نادہندہ مقروض سے تقاضا کر کے واپس آ رہا تھا ۔ اُس نے بڑبڑا کر کہا ۔ یہ ایسا زمانہ نہیں ہے ۔ کہ آدمی قرض دیا ہوا روپیہ واپس لے لے ۔ پرانا زمانہ اچھا تھا ۔ اب زمیندار غریب ہیں ۔ اور واپسی کچھ نہیں دیتے ۔ یہ بات خاص طور پر راجپوتوں میں ہے ۔ سینی پھر شریف آدمی ہیں ۔ کچھ نہ کچھ واپس دے دیتے ہیں ۔ یہ الفاظ سامعین کی تعریف میں کہے ۔ میرے موکلوں میں سے ایک نے ستر روپے نقد ادھار لئے اور دو سیرہ پر کاغذ لے گیا ۔ ۲۰ روپے سود کے اور پانچ روپے اخراجات کے اس طرح اس نے کل ۱۲۰ روپے مجھے دینے تھے ۔ اس کے بدلے میں اُس نے ایک بھینس دے کر حساب بیباق کر دیا ۔ بھینس سے مجھے صرف ستر روپے آئے ۔ یہ ہے وہ سلوک جو زمیندار ہمارے ساتھ کرتا ہے ۔ جب اس پر زیادہ دباؤ ڈالو ۔ تو وہ ایک بوڑھی بھینس آگے کر دے گا ۔ لیتا ہے تو نقد روپیہ اور دیتا ہے ۔ بوڑھے مویشی ۔ ایک زمیندار نے جو پاس ہی کھڑا تھا ۔ کہا ہم کیا کر سکتے ہیں ۔ روپے کے بدلے میں ہمیں مویشی دینے پڑتے ہیں ۔ کیونکہ ہمارا تمام سرمایہ یہی ہوتے ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی ساہوکار کا اصل زر پر پندرہ یا بیس سال کے سود کا ڈھونگ رہ جاتا ہے ۔ اور ہمارے مویشی لوٹ کرلے جاتا ہے ۔ میں نے ساہوکار سے دریافت کیا ۔ آیا تم ہمیشہ اپنے موکلوں کو رسید دیتے ہو ؟ اُس نے کہا ۔ لازمی طور پر زمیندار نے پھر دخل دیتے ہوئے کہا ۔ صرف اُس وقت جب ہم اُسے سب کچھ ادا کریں ۔ گفتگو کا باقی حصہ مندرجہ ذیل طریق پر بیان کیا جا سکتا ہے ۔

تم کتنا سود لیتے ہو ؟

پیسہ روپیہ (۱۸ ۳/۴ فیصدی)

پانچ یا دس سال میں تمہیں سالانہ کیا پڑتا ہے ۔

آٹھ آنے دو فیصدی

پھر تم اپنا روپیہ کوآپریٹو بنک میں کیوں نہیں جمع کراتے جو تمہیں اتنا یا اس سے زیادہ سود دے گا؟ پیپلز بینک ناکامیاب رہا۔ اور الاونس بینک بھی رہ گیا۔ تمہارے بینکوں کے ممبر میرے پاس آتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ جب سے ہم نے تمہارے ساتھ لین دین چھوڑا ہے۔ ہم سخت مصیبت میں ہیں۔ کیونکہ ہمیں مبارک پور جانا پڑتا ہے۔ (غالباً کل کے اجلاس کی طرف عیارانہ اشارہ تھا۔ جس میں انجمن کے سکرٹری نے ممبروں کو بلایا تھا)۔

کیا تم اُن لوگوں کو روپیہ دیتے ہو جو بینک سے تعلق رکھتے ہوں؟

اگر یہ مجھے معلوم ہو جائے۔ تو نہیں دیتے۔ لیکن وہ بعض اوقات یہ بات مجھ سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ میں نے کہا۔ خواہ کچھ بھی ہو۔ اُن کو روپیہ اُدھار نہ دو۔ نصیحت کے ان الفاظ کے ساتھ جن پر وہ عمل کرتا معلوم نہیں ہوتا۔ ہم رخصت ہو گئے

روپیہ اودھار دینا۔ اس امر پر تمام متفق ہیں۔ کہ پہاڑوں کے دامن میں ساہوکار کا ہاتھ ابھی تک غالب ہے۔ مثال کے طور پر انند پور سے روپڑ کے علاقے میں ساہوکار ادھار دیئے ہوئے روپیہ پر سود لیتا ہے۔ لوگوں کو بیگاریں پکڑتا ہے۔ اور اُن سے ایندھن چارہ اور گھی مفت لیتا ہے۔ اور اپنا روپیہ جتنا نقد لیتا ہے۔ اتنا ہی غلے کی صورت میں بھی لے لیتا ہے۔ سود کی اوسط شرح بجائے ۱۸ ۳/۴ فی صدی کے ۲۵ فیصدی ہے۔ مجھے اس وقت ایک اور کوہی علاقے یعنی شکار گڑھ کی تحصیل یاد پڑتی ہے۔ جسے میں نے دس برس ہوئے۔ دیکھا تھا۔ یہ تمام حالات وہاں بھی پائے جاتے تھے۔ لیکن امداد باہمی اور بہتر ذرائع آمدورفت کے اثر سے بہت تبدیل ہو گئے ہیں۔ اس علاقے میں ساہوکار کو زیادہ عروج دینے والی بات یہ ہے کہ یہ علاقہ نہایت دشوار گزار ہے۔ کاشتکار عمدہ منڈی سے اس قدر دور ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنی پیداوار کی مناسب قیمت نہیں حاصل کر سکتا۔ اور اس طرح تجارتی معاملات سے ناواقف و بے بہرہ رہ کر وہ دفعتہً ساہوکار کے ہاتھوں میں پڑ جاتا ہے۔ جو قرض دینے والا بھی ہوتا ہے۔ اور بیوپاری بھی۔ ایسی حالت میں صرف دو چیزیں اُسے بچا سکتی ہیں۔ کفایت شعاری اور مضبوط دیہاتی فرقہ داری کلو کی تنہا ولوہی میں جہاں یہ دونو باتیں موجود ہیں۔ قرضہ بہت کم ہے۔ لیکن سراج کے پہاڑی علاقے میں جو کلو کو شملہ کی پہاڑیوں سے جدا کرتی ہے۔ ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں ہے۔ اور بہت سے دیہاتی حقیقت میں غلام ہیں۔ اسی طرح

شمال مغربی سرحدی صوبے میں ممکن ہے۔ کفایت شعاری نہ ہو۔ لیکن بھائی بندی کا احساس بہت زیادہ ہے۔ اور یہ لوگ شخصی طور پر اس قدر ہیبت ناک ہیں۔ اور علاقہ اس قدر دشوارگذار ہے۔ کہ ہندو ساہوکار کو اپنی ہستی کو غیر ضروری طور پر منوانے کا خطرہ لاحق نہیں ہے۔ یہاں اس کے متعلق جو بڑی سے بڑی بات کہی جاتی ہے۔ اور وہ واقعی بڑی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ وہ سادہ لوح اور جاہل لوگوں کو زیادہ دھوکا دیتا ہے۔ ممکن ہے۔ کہ دوسروں سے خود بھی دھوکا کھا جاتا ہو۔ اور میرا عملہ اس بات پر متفق ہے۔ کہ اس صورت میں تمام الزام ساہوکار کے ذمّے نہیں۔ وہ اس بات پر بھی متفق ہیں۔ کہ ہندو ساہوکار مسلمان ساہی سے بھی اتنا ہی بُرا سلوک کرتا ہے۔ جتنا کہ ہندو سے اگر وہ بُرا ہے۔ تو دونوں کے لئے برابر ہے۔ سوائے کہیں کہیں کے جہاں اُس کے رسوخ پر ابھی تک زمانے کا اثر نہیں ہؤا ہے۔ وہ انتخاب کے موقعوں پر بھی کوئی زیادہ سیاسی اثر نہیں رکھتا ہے۔

سڑکیں:۔ اگر اس نیم پہاڑی علاقے کی سڑکیں زیادہ اچھی ہوں۔ تو ساہوکار کی طاقت بہت کم ہو جائے۔ آج کی سڑک اتنی خراب تھی۔ کہ ایک جگہ بیل گاڑی جس پر میرا سامان لدا ہؤا تھا۔ بالکل پلٹی کھا گئی۔ گذشتہ صدی کے وسط میں کیپٹن وینیارڈ افسر بندوبست نے لکھا۔ کہ انبالہ کی سڑکیں ہندوستان بھر میں سب سے خراب تھیں۔ اور معمولی قدم سے ذرا بھی تیز قدم اٹھانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ جہاں تک اسی گردو نواح کا تعلق ہے۔ تمام باتیں ویسی ہی ہیں۔ جیسی کہ پہلے تھیں۔ دوسری تکلیف جس کا سال کے اس حصے میں یہاں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور جو خراب سڑکوں سے بھی زیادہ بڑی ہے۔ دھوئیں والی چمنی ہے۔

(۱۴ میل)

۲۰ دسمبر۔ گڑھی سے نرائن گڑھ۔

پردہ اور امیر افغانستان:۔ میری روانگی سے پہلے ایک مسلمان راجپوت ذیلدار مجھے ملنے کے لئے آیا۔ اور پردے کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگا۔ کہ افغانستان میں امیر کے پردہ اُٹھا دینے کے متعلق دیہات میں بہت چہ میگوئیاں ہوتی ہیں۔ اس کے متعلق دو فریق تھے۔ ایک کٹّر مسلمان اور دوسرا آزاد خیال۔ عورتوں نے بھی اس کے متعلق گفتگو کرنی شروع کر دی

تھی۔ وہ خود اُسے اپنا ورثہ سمجھنے کے حق میں تھا۔ اس کے اسباب میں سے ایک یہ سبب تھا۔ کہ اس قدر کافی محافظت کے ہوتے ہوئے اس کی اب ضرورت نہ تھی۔ اس کے بعد دن میں بھورے والے گاؤں میں مسلمان راجپوتوں کا ایک بڑا ہجوم تھا۔ انہوں نے امیر کے متعلق بہت کچھ سن رکھا ہے۔ اس نے اسلام کے خلاف کیا تھا۔ اور اس لئے بغاوت ہو گئی تھی۔

سکاؤٹ طلبا:۔ بھورے والے سے ایک میل کے فاصلے پر گھوڑے سواروں کا ایک گروہ ملا۔ جو سب کے سب راجپوت تھے۔ ہم گاؤں میں دو گھنٹے تک اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ اجلاس کی جگہ گاؤں کے دوسری طرف تھی لیکن ہمیں گاؤں میں سے گزر کر وہاں جانے کی اجازت نہ دی گئی۔ اس لئے کہ ممکن تھا۔ کہ ہم گاؤں میں گذرتے ہوئے پردے کی اونچی دیواروں پر سے دیکھنے میں راغب ہو جاتے۔ پس اسی کی بجائے ہم چکر کاٹ کر گئے۔ سکاؤٹ طلبا کا ایک گروہ ہمارے استقبال کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ ایک لڑکا انگریزی جوتے پہنے ہوئے تھا۔ جنہیں اردو میں بوٹ کہتے ہیں۔ یہ اُس نے آٹھ – ۲ روپے میں خریدا تھا۔ دوسرے بھی جوتیاں پہنے ہوئے تھے۔ جن کی قیمتیں ایک روپیہ سے دو روپیہ تک تھیں۔ بوٹ والے لڑکے نے کہا۔ کہ میں اُن کو دیسی جوتیوں پر اس لئے ترجیح دیتا ہوں۔ کہ ان میں ریت داخل نہیں ہوتی۔ تمام چھ اُنے جوڑے والی جرابیں پہنے ہوئے تھے۔ اور یہ ایک ایسی چیز تھی۔ جس کی مغرب میں ضرورت ہو سکتی ہے۔ ایک احمقانہ نقل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس ملک میں جہاں جُرابیں نہیں پہنی جاتیں۔ یہ یقینی طور پر فضول چیز ہے۔ ہمیں اس سوال کا جواب طلب کرنے میں بہت دقت پیش آئی کہ سکاؤٹ کو کیا کرنا پڑتا ہے۔ آخرکار ایک نے کہا۔ کہ اسے امداد دینی پڑتی ہے۔ جب یہ پوچھا گیا۔ کہ اس نے گذشتہ تمام سال میں کیا امداد دی تھی۔ تو اُس نے بتایا کہ اُس نے آگ بجھانے میں مدد دی تھی اور سڑک پر سے کانٹے دار جھاڑیاں دور کی تھیں۔ اس قسم کی وردی پر جو یہ لڑکے پہنے ہوئے تھے۔ تین روپے خرچ آتے ہیں۔ یہ ایک اور ٹیکس ہے۔ جو دیہاتی پر وردی کی وجہ سے لگایا جاتا ہے۔ عام دیہاتی اس قسم کے بار کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے "دیہات صاف کرو" کی تدبیر کے ہردلعزیز نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے ابھی دیکھا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب

ہے۔ کہ بھنگیوں کو زیادہ اُجرت دی جائے۔ اس علاقے میں ذرا سا اضافہ بھی محسوس کیا جائے گا۔ کیونکہ یہاں ایک چپاتی روز دینے کا رواج ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے۔ کہ راجپوت اپنے لئے اُن سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ یہاں اس علاقے کی طرح جہاں سے ہم تین دن ہوئے گزرے تھے۔ ہر تیسرے دن روٹی دینے کا دستور نہیں ہے۔ اگرچہ دیہاتی اصلاح کے وقت میں نام سے بھی کسی مزید لگان کو دلی طور پر ناپسند کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اُن سب کو خوشی سے قبول کرے گا۔ جب اُسے یہ بات سمجھا دی جائے۔ کہ یہ اس کے فائدے کے لئے ہیں۔ سکاؤٹنگ کی تحریک جس سے کہ نوجوانوں کی صحت و خوشی اور خدمت عوام مقصود ہے۔ دیہاتی زندگی کے لئے اس قدر مفید خدمات بہم پہنچاتی ہے۔ کہ دیہاتی کو اُس کی امداد کی طرف رجوع کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ لیکن اس مقصد کے علاوہ گاؤں کی صحت و صفائی کے متعلق جو کچھ کیا جائے۔ اُس کے حصول کے لئے رغبت دلانے کا ہنر اور مثال کی طاقت استعمال میں لائی جائے۔ اور حکومت کی مہمیز کو ایک طرف رکھا جائے۔ اور اِس لئے کہ یہ تحریک مضبوط جڑیں پکڑ جائے۔ اس کی ترقی کے قدم کو تمام اُن امور کی جو اس کے علم سے متعلق نہیں۔ مناسب بنیادوں اور اسے قوت دینے والے اصولوں پر عمل کرنے سے پیچھے نہیں رہنا چاہیئے۔

امداد باہمی کی دوسری صورتیں:۔ میں نے اُن تمام لوگوں سے جو کھدر کے سوا اور کچھ پہنے ہوئے نہ تھے۔ کھڑا ہونے کے لئے کہا۔ ساٹھ ستر کے گروہ میں سے مشکل کے صرف تین نکلے۔ اور وہ تینوں پرانی نسل کے لوگ تھے۔ عورتوں میں بیٹنے کا رواج ابھی تک ہے۔ لیکن مشین سے بُنے ہوئے کپڑے کی دست درازی کی وجہ سے کتائی معدوم ہوتی جاتی ہے۔ لیکن بعض عورتوں نے کسی گھرانے سے جرابیں بُننی سیکھ لی ہیں۔ اُس کہنے کو یہ کام پٹیالہ میں ایک پادری ایک عیسائی عورت۔ جو تبلیغ مذہب کا کام کرتی ہے ہا نے سکھایا تھا۔ گاؤں میں لازمی تعلیم کے لئے یہ وقت پیش آتی ہے۔ کہ اسی وقت جبکہ مویشی کے ایک مشترکہ چرواہا ملازم رکھا ہوا ہے۔ دوسرے مشترکہ انتظامات تقریباً وہی ہیں۔ جو کل بیان کئے جا چکے ہیں۔ مشترکہ خرچ سے شادیوں کے لئے تین بڑے برتن اور کچھ دریاں رکھی جاتی ہیں۔ ایک رکھوالا فصلوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اور پانی پینے کے کنوئیں کی مرمت کی جاتی ہے۔ انجمن امداد باہمی

کی ایک نئی صورت خود بخود پیدا ہو رہی تھی۔ ایک ہوشیار راجپوت نے بے شمار پڑوسیوں کو اسی امر پر رضامند کر لیا تھا۔ کہ وہ مرغیاں پالنے میں اُس کے ساتھ شامل ہوں۔ اور ۴۹۸ مرغیوں اور ۸۰ پیرو میٹروں اور ۱۰۰ بطخوں کے ساتھ ابتدا کر دی گئی تھی ایک گوجر اور ایک بھنگی اُن کی حفاظت کرتے تھے۔ اور ایک منشی اُن کا حساب کتاب رکھتا تھا۔ تجویز یہ ہے۔ کہ گرمی کے موسم میں اُن کو شملہ کی منڈی میں فروخت کیا جائے عمومی حیثیت سے راجپوتوں کے حوصلے کی یہ ایک نادر مثال ہے۔

مہمان نوازی:۔ اس سے پہلے کہ ہم وہاں سے رخصت ہوں۔ ہمیں خوشامدانہ نظموں اور گیتوں کے مکمل نشے میں چور ہونا پڑا۔ آخر کار ہمیں ایک بڑے کمرے میں لے گئے۔ جہاں تین میزیں سیبوں اور سنگتروں کی ڈھیریوں سے سجی ہوئی تھیں ہمیں اسی دعوت میں شریک ہونے کے لئے کہا گیا۔ ہمارے بے حد مہمان نواز میزبان کے ساتھ جو یہ چاہتا تھا۔ کہ ہم تمام پھلوں کو قبول کر لیں ایک مختصر اور دوستانہ جھڑپ کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ سکاؤٹوں میں سے ہر ایک کو ایک سیب اور ایک سنگترہ ملا۔ اور ایک سنگترہ دعوت کے خیال سے اُٹھا لیا گیا۔ اور یہ بھی محض میزبان کا لحاظ رکھتے ہوئے۔ اس لئے کہ اُس نے کہا۔ کہ اگر آپ نے اس میں سے کچھ نہ لیا۔ تو میری عزت خاک میں مل جائے گی۔ جو گھاس ہمارے گھوڑوں نے دوران قیام میں کھائی۔ ہم نے اس کے عوض ایک روپیہ مسجد میں چندہ دے دیا۔ اس طرح طرفین کی عزت بچالی گئی۔ مشرق کی مہمان نوازی شاید بے حد فریفتہ کرنے والی خصلت ہے۔ تمام ہندوستان میں اور غالباً تمام ایشیا میں یہ تین عظیم خصلتوں میں سے ایک کا درجہ رکھتی ہے۔ اور اس کی معقول وجہ یہ ہے۔ کہ مسافر خانے نہیں ہیں۔ اور سرائیں چند ہیں۔ اور وہ بھی دُور دُور۔ ہر ایک گاؤں کے لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں۔ کہ اُن پر مسافر کے ایک رات کے کھانے اور ٹھہرنے کا حق ہے۔ مسلمانوں کے گاؤں میں اسے عام طور پر مسجد میں جگہ دی جاتی ہے۔ اور سکھوں کی صورت میں گوردوارہ میں اور دونو حالتوں میں ذمہ وار شخص اسی کے آرام کا خیال رکھتا ہے۔ ہندؤں کے گاؤں میں کوئی مخصوص انتظام نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ چوپال میں چلا جائے۔ تو کوئی نہ کوئی اسے چارپائی اور خوراک بہم پہنچا دے گا۔ لیکن لاریوں کے پھیل جانے کی وجہ سے پہلے کی نسبت کہیں کم مسافر ایسے ہوتے ہیں۔ جو شب باشی کے متمنی ہوتے ہیں۔ (باقی)

۱۲ر دسمبر!

پردہ:- ہمارا دوسرے دن کا قیام۔ بہت سے لوگ مجھے ملنے کے لئے۔ اور ان میں ایک پٹھان بھی آیا۔ وہ اُس کمیاب شئے یعنی اول درجے کی انجمن امداد باہمی کا پریذیڈنٹ تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے پردے کے متعلق امیر افغانستان کا حکم سنا ہے۔ اُس نے جواب دیا۔ میں وہاں نہیں گیا ہوں۔ وہ ملک بہت دُور ہے۔ لیکن افواہ ہے۔ کہ اُسی نے اس مضمون کا ایک اشتہار دیا ہے۔ کہ عورتوں کو آزاد کر دو۔ اور اُن کو باہر پھرنے دو۔ اکثر لوگ اسے اچھا خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے وہ صحت مند ہو جائینگی۔ دو چار گھنٹے پیدل چلیں گی۔ اور اس سے انہیں فائدہ پہنچیگا۔ پیچھے سے ایک ہندو راجپوت بولا۔ گاؤں میں چار یا پنج سال سے پردہ کے متعلق بحث ہو رہی ہے۔ لیکن اب بھی ۵ فیصدی سے زیادہ لوگ اسے ترک کرنا پسند نہیں کریں گے۔ میں نے پوچھا کہ جب ہندوؤں کے مذہب میں کوئی ایسی بات نہیں۔ جو انہیں پردے کے لئے مجبور کرے۔ تو وہ پردہ کیوں کرتے ہیں؟ جواب ملا۔ کہ پرانا رواج ہے۔ جواب سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان میں مذہب اور رواج میں ذرا بھی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ ہندو اور مسلمان راجپوت دونو پردے کے سختی سے پابند ہیں۔ ایک اپنی بنیاد رواج پر رکھتا ہے۔ دوسرا مذہب پر۔ دراصل دونو باتیں ضرورت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ راجپوت نے بتایا کہ ہمارے گاؤں میں پسائی چھوڑ دی گئی ہے۔ لیکن اس کی بجائے آزار بند اور دریاں بنانے اور چارپائیوں کی نواڑ اور جرابیں بُننے کے کام کئے جاتے ہیں۔ یہ ہنر انہوں نے اُن رشتہ داروں سے حاصل کئے ہیں۔ جو جمنا پار سہارن پور اور مظفر گڑھ میں رہتے ہیں۔ ایک بات جس پر وہ سختی سے پابند تھے۔ یہ تھی کہ وہ بیکار مویشیوں کو نہیں بیچتے تھے۔ تاجر انہیں لالچ دیتے تھے۔ لیکن اس ترغیب کو رد کر دیا جاتا تھا۔ البتہ افتہ کرنے پر کوئی اعتراض نہ کرتا تھا۔ اور نہ ہی اب تک مجھے کوئی ایسا شخص معلوم ہوا ہے۔ جس نے اعتراض کیا ہو۔

گاؤں کا کوڑا کرکٹ:- کھاد اور نئے آئین حکومت کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے۔ راجپوت نے بتایا کہ کھاد کو گاؤں سے اٹھوا کر کھیتوں میں ڈلوانا مشکل ہے

کیونکہ بھنگی زیادہ پیسوں کے لئے زور دیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے اٹھانے کے لئے ایک گدھا یا بھینس بھی مانگتے ہیں۔ اور پھر یہ کہ کسان کس طرح دیکھے کہ ہر ایک کا کھاد اُن کے اپنے کھیت میں ڈھیر کیا جاتا ہے۔ اور کسی نزدیک کے کھیت میں نہیں۔ ایک ہندو گوجر نے ساتھ ہی کہا۔ کہ پہاڑوں کے دامن میں رہنے والے گوجر اپنا کھاد گھر کے پاس یا گاؤں کے ذرا باہر جمع کرنے کی بجائے ہمیشہ کھیتوں میں لے جاتے رہے ہیں۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے زمین اونچی نیچی تھی۔ اور اگر کھاد کسی طریقے سے لے جایا سکتا تھا۔ تو اس کا بہتر طریقہ یہی تھا کہ اسے ہر روز لے جایا جائے۔ کل راستے میں ہم نے اس بات پر بحث کی کہ کیا ایسا وقت آگیا ہے۔ کہ گاؤں والوں کو صاف رہنے کے لئے مجبور کیا جائے۔ میرے دو میں راجپوت ہمراہیوں کا خیال تھا۔ کہ آگیا ہے۔ کیونکہ تمام تعلیم یافتہ لوگ صحت کے لئے اس کی ضرورت کا احساس رکھتے ہوئے یہ چاہتے ہیں۔ کہ اُن کے دیہات کو صاف رکھا جائے۔ آج بھی ایک تجربہ کار ہندوستانی افسر نے مجھے یہ بتایا۔ کہ ڈر بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔

ایک مارگیج بینک:۔ یہاں ایک نئی طرح کا مارگیج بینک ہے۔ جو تمام تحصیل میں کام کرتا ہے۔ اور جاگیرداروں کو مختلف رقمیں دیتا ہے۔ اور اکثر صورتوں میں ایک ہزار سے تین ہزار روپیہ تک قرضہ دیتا ہے۔ رہن کی ہوئی زمین کے تیس گنے لگان سے زیادہ کسی کو نہیں دیا جاتا۔ اور چونکہ لگان اس کی پیداوار کے ۲۵ فیصدی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اُس کا یہ مطلب ہے۔ کہ وہ اس سے زیادہ نہیں لے سکتا۔ جتنا کہ زمین ۷ سال میں نقدی کی صورت میں پیدا کر دے گی۔ اور رہن پر بھی پانچ ہزار تک کی حد لگی ہوئی ہے۔ قرضہ انفکاک اراضی کے لئے دیا جاتا ہے۔ لیکن زمین خریدنے کے لئے قطعاً نہیں دیا جاتا۔ کیونکہ موجودہ قیمتوں کی وجہ سے بینک کی ۹ فیصدی شرح پر قرض لئے ہوئے روپیہ سے ایسا کرنا اقتصادی اصولوں کے خلاف ہے۔ غیر محفوظ قرضوں کو بیباق کرنے کے لئے بھی روپیہ دیا جاتا ہے۔ اور زمین کو ترقی دینے کے لئے بھی مل سکتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں روپیہ بہت کم طلب کیا جاتا ہے۔ اس تحصیل میں قرضہ بہت زیادہ ہے۔ اور جب تک رہن کیا ہوا رقبہ نہ چھڑا لیا جائے۔ اور پرانا قرضہ نہ ادا کر دیا جائے۔ یہ امید نہیں ہو سکتی کہ انسان ترقی کے متعلق سوچے۔ تمام قرضے دس

سال کے اندر اندر واپس دینے پڑتے ہیں۔ بعض زیادہ طویل مدت پسند کریں گے۔
لیکن جب تک زمیندار کی بابت یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ روپیہ کا دانشمندانہ استعمال
کرے گا۔ اور اسے فصل بہ فصل ادا کرتا رہے گا۔ ایسا کرنا خطرناک ہوگا۔ گاؤں
کے بینک روپیہ واپسی کی تمام مدت سہولتوں اور قلیل المیعاد قرضہ
کا لین دین کرنے کے باوجود (طویل سے طویل تین سال ہے۔) ان میں سے اکثر سے
میعاد مقررہ کے اندر روپیہ وصول کرنے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ اور انہیں ہر سال بارہ
ہزار سے زیادہ نادہندوں کے خلاف عدالتی کارروائی کرنی پڑتی ہے۔ یہ سوال زیادہ تر
کاروباری سیرت کا ہے۔ اور ایک بار گیج بینک کی تمام گنجائش اس کے ممبروں کے
چال چلن پر منحصر ہے۔ تحصیلوں کی حدود کسی قدر تنگ ہیں۔ دوسری مشکل یہ ہے۔
کہ ایسے معتبر اور ہوشمند جاگیردار نہیں ملتے۔ جو بغیر کسی معاوضے کے نہایت
وفاداری سے بہ حیثیت ڈائرکٹر اپنے فرائض ادا کرنے کے لئے رضامند ہوں۔ یہ لوگ
گاؤں کے بینکوں کی نسبت کہیں زیادہ جابر ہوتے ہیں۔ قرضے کی ہر درخواست
کے متعلق نہایت احتیاط سے اسی جگہ تحقیق کی جائے۔ اور اس پر خفیہ اطلاع دی
جائے۔ اور جب روپیہ قرض دے دیا جائے۔ تو زمین چھڑانے کی صورت میں
ڈائرکٹر یہ ضرور دیکھے۔ کہ یہ روپیہ دراصل مُرتہن ہی کو دیا جاتا ہے۔ اور پرانے قرضے
کی ادائگی کی صورت میں یہ کہ روپیہ متعلقہ ساہوکار کو دیا جاتا ہے۔ اور اُس سے
رسید لی جاتی ہے۔ یہ کارروائی قرضے کے ناجائز استعمال کو روکنے کے لئے کی
جاتی ہے۔ جس کا دوسری صورت میں عام ہو جانا ممکن ہے۔ اس کے ساتھ ہی
بار بار کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کرنی پڑتی ہے۔ اور عام طور پر ان میں وقت لگتا
ہے۔ کیونکہ اطلاعات کی نہایت احتیاط سے چھان بین کرنی پڑتی ہے۔ اور بہت سے
دوسرے امور جو بڑی رقموں کے قرضے کے متعلق اتفاقیہ طور پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ مدنظر
رکھنے پڑتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو بغیر ان کی خوبیوں کا لحاظ رکھے اپنے رشتہ
داروں یا دوستوں کی عرضیوں کو سہارا دینے کی بہت رغبت ہوتی ہے۔ اور جب غیر موزوں
لوگ ڈائرکٹر منتخب کرلئے جاتے ہیں۔ تو حالات بدترین ہو جاتے ہیں۔ خوش قسمتی
سے اس جگہ ناتجربہ کاری سے زیادہ بُری کوئی بات نہیں تھی۔ اور اس کے دُور کرنے
کیلئے ڈائرکٹر نہایت مستعدی سے کام کر رہے تھے۔

۲۲ر دسمبر۔ نرائن گڑھ سے ساڈھورہ

جاگیردار:۔ ہم نے ۱۵ میل تک شاندار آموں کے درختوں والے علاقے میں سے سفر کیا۔ آموں کے درخت اُلجھے ہوئے گنّوں سے مل کر زمرّدین سبزے کی اُن ہموار سطوح کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے۔ جہاں اب گیہوں کے ننھے ننھے پودے نہایت زوروں سے نکل رہے ہیں۔ البتہ جو حسب معمول یہاں بھی تھے۔ ہم نے تقریباً ہر سفر میں دیکھا ہے۔ اور جیسا عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے۔ اُن کی تباہ کاریوں کا خاتمہ کرنے کے لئے کسی کوشش کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ اس ضلع میں کوئی بھی جاگیردار ایسا نہیں ہے۔ جو اس سلسلے میں کوئی کام کر رہا ہو۔ تاہم فضیلت حاصل کرنے اور یادگار باقی چھوڑنے کا کیا اچھا موقع ہے۔ اگرچہ اس علاقے میں بہت سے بڑے بڑے جاگیردار ہیں۔ لیکن ایسا کوئی نہیں جو اپنی ترقی کے لئے مواقع ڈھونڈھتا ہو۔ ۱۸۱۹ء میں افسر بندوبست نے اُس تحصیل کے لوگوں کے متعلق مندرجہ ذیل بیان لکھا: "یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بڑے جاگیرداروں کی موجودگی سے دیہاتی علاقے کو کوئی فائدہ پہنچ رہا ہے۔ کاشتکاری کے رائج الوقت طریقوں کو اختیار کر کے یا منتخب کردہ بیج کو باہر بھیج کر بہتری کے اسباب پیدا کرنے کے متعلق وہ کچھ نہیں کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہ حیثیت اعلیٰ جاگیردار انہیں اپنے فرض کا احساس نہیں ہے۔" میری تحقیقات یہ ظاہر کرتی ہیں۔ کہ گذشتہ دس سال میں بہتری کے لئے کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اس تحصیل میں دو بڑی جائدادیں رکورٹ اُوف وارڈ کے ماتحت ہیں۔ اور پانچ اور گذشتہ تین سالوں میں چھڑائی گئی ہیں۔ ایک افسر جو یہاں تقریباً ۱۸ مہینے رہا ہے۔ مجھے یہ بتاتا ہے۔ کہ اُس نے بڑے جاگیرداروں میں سے کسی ایک کو بھی کبھی نہیں دیکھا ہے۔ جاگیردار صرف اُس وقت نظر آتا ہے۔ جب لاٹ صاحب آتے ہیں۔ ایک اور غیر حاضر رہنے والے کے متعلق کسی نے کہا۔ کہ وہ دو سال میں صرف ۱½ مرتبہ آتا ہے۔ اور اُس وقت بھی صرف چند دن کے لئے۔ چند جاگیردار اپنے مزارعین کو پیشگی روپیہ دے دیتے ہیں۔ اور دو نے جن میں سے ایک بنیا ہے کنوؤں میں نل اُترائے ہیں۔ لیکن اگر ضلع کے بڑے جاگیردار زمانے کے پہلو بہ پہلو

آتا چاہیں۔ تو وہ گذشتہ ایام کی نسبت اپنی ذمین اور مزارعین کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو یہ نصیحت کرنی چاہیئے۔ کہ وہ رومانیہ اور روس کا دَورہ کریں۔ اور یہ دیکھیں کہ جب جذبات بھڑکائے جاتے ہیں۔ تو بڑے جاگیردار کا کیا حشر ہوتا ہے۔

ایک دیسی حکیم :۔ ساڈھورے میں جہاں کی آبادی آٹھ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ اور جو محمود غزنوی کے زمانے سے آباد چلا آیا ہے۔ میں ایک قابل ذکر مسلمان راجپوت سے ملا۔ جو تین گاؤں کا نمبردار۔ میونسپل کمیٹی کا ممبر اور حکیم تھا۔ اُس نے یہ فن اپنے باپ سے خود سیکھا تھا۔ وہ تیس سے پینتیس مریض تک ہر روز دیکھتا تھا۔ اور وبائی مرض کے دنوں میں اس سے بھی زیادہ اور سب کا علاج مفت کرتا تھا۔ ساڈھوڑہ حکیموں سے پُر تھا۔ وہاں غالباً بیس یا پچیس حکیم تھے۔ ان میں سے اکثر سیّد تھے۔ اور ۱۵ سے ۲۰ روپے تک ماہوار کما لیتے تھے۔ اُن میں سے جو بہترین تھے۔ وہ تیس سے چالیس روپیہ تک کماتے تھے۔ (مقامی ڈاکٹر نے بھی یہی کہا) پرانے زمانے کی نسبت اب حکیم کی تلاش کم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ انگریزی دوائیاں بغیر تکلیف نوش اور استعمال کی جا سکتی ہیں۔ جبکہ بہت سی دیسی دوائیوں کو کافی تیاری اور آمیزش کی ضرورت ہوتی ہے۔ حکیموں کے علاوہ دس یا پندرہ مسلمان تھے۔ جو قرآنی تعویذات اور ٹونے ٹوٹکے کرتے تھے۔ اور بعض بچوں پر دم کر کے انہیں شفا دینے کی کوشش کرتے تھے۔ وہاں چند برہمن بھی منتروں سے کام لیتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ پردے اور صحت کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ اُس نے بتایا کہ جہاں چکی پیسنے کا کام چھوڑ دیا گیا ہے۔ بلا شبہ عورتوں کو کافی ورزش آنی مشکل ہے۔ اور اس سے اُن کے ہاضمے پر اثر پڑتا ہے۔ لیکن جب انہیں ورزش کی عادت نہ تھی۔ پردے سے اُنہیں کوئی نقصان نہ پہنچتا تھا۔ یہ رائے شاید اُس نے پردے کا لحاظ رکھتے ہوئے دی تھی۔

دیسی علاج :۔ کاشتکار تا وقتیکہ وہ کچھ تعلیم یافتہ نہ ہو۔ پہلے اس شخص کے پاس جاتا ہے۔ جو تعویذ دیتا ہے۔ یا منتر جپتا ہے۔ تعویذ لکھے جاتے ہیں۔ اور آدمی کے کسی حصے پر باندھ دئے جاتے ہیں۔ سوائے اُن لوگوں کے جو لوٹتے ہیں۔ اور کوئی شخص کچھ چارج نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ جادو اپنا کام کرتا ہے۔ اس صورت میں ایک روپیہ لے لیا جاتا ہے۔ اگر جادو اپنا کام نہ کرے۔ تو اُس کے

بعد وہ مقامی حکیم کے پاس جاتے ہیں۔ خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ عام طور پر پیسے لے لیتا ہے۔ تین دن ہوئے اُن میں سے ایک اتفاقیہ طور پر ہمارے ساتھ ریل گاڑی میں تھا۔ وہ ایک انجمن کا سکرٹری تھا۔ میں نے پوچھا۔ تمہارے کاروبار کا کیا حال ہے۔ اُس نے بتایا۔ کہ جس دن سے قریب ہی ایک ہسپتال کھلا ہے۔ پہلے سے بہت گر گیا ہے۔ لیکن زیادہ تر اِس کی وجہ یہ تھی۔ کہ ہسپتال کا انچارج ڈاکٹر بہت ماہر تھا۔ اور اپنے مریضوں کا علاج بہت اچھی طرح کرتا تھا۔ اگر یہ وصف موجود نہ ہو۔ تو حکیم کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ہسپتال کی تلاش اُس وقت کی جاتی ہے۔ جب حکیم ناکامیاب رہ جاتا ہے۔ اور اُس وقت عام طور پر اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ علاج نہیں ہو سکتا۔ جب کسی بچہ کو کوئی تکلیف ہوتی ہے۔ تو اسے مغرب کی نماز کے وقت مسجد میں لے جاتے ہیں۔ اور پہلے آدمی کو جو تازہ تازہ خدا کا نام لیتا ہوا آتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ وہ اس کی بیماری کو شفا دینے کے لئے اس پر دم کرے۔ یہ ہے وہ بات جس کے متعلق حکیم کنایۃً کہہ رہا تھا۔ ہندو بھی جہاں کہیں اُن کے گاؤں میں مسجد ہے۔ اسی طرح کرتے ہیں۔ اس خیال سے کہ بچہ کسی کی بُری نظر سے تکلیف اٹھا رہا ہے۔ اور اسی طرح سے وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

ایک بینک اور اُس کا پریذیڈنٹ:۔ براڑہ سے چار میل کے فاصلے پر ہم نے سڑک کے ایک طرف ایک شامیانہ لگا ہُوا اور تقریباً سو دیہاتیوں کو مجتمع دیکھا۔ یہ دو گاؤں کے نمائندے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام ملّانہ تھا۔ جس میں ہندو و مسلمان راجپوت۔ جاٹ اور ارائیں رہتے ہیں۔ وہ اپنے بینک اور انجمن اصلاح رسوم دکھانے آئے تھے۔ ملّانہ کا بینک ایک قابلِ ذکر بینک ہے۔ اس میں تقریباً ایک درجن مختلف ذاتوں مثلاً راجپوت۔ ارائیں۔ سینی۔ گوسائیں۔ جوگی۔ کمہار۔ دھوبی۔ جلاہے۔ بہشتی۔ تیلی اور نائی وغیرہ ممبر شامل ہیں۔ ان میں سے صرف ایک ممبر انجمن سے باہر کسی کا مقروض ہے۔ ان کا چھ ہزار روپیہ جمع ہے۔ اور تقریباً آٹھ ہزار بطور حصص اور پس انداز ہے۔ پریذیڈنٹ بھی اتنا ہی قابلِ ذکر ہے۔ جتنا کہ بینک۔ ایک ارائیں کے پاس صرف اتنی زمین ہے۔ جسے اُس کا کنبہ کاشت کرتا ہے۔ اور وہ خود ملانہ میں کٹ پیس کی تجارت کرتا ہے۔ اور ایک دیہاتی ماہواری رسالہ کا ایڈیٹر ہے۔ اس پر یہ کہ اُس نے صرف نویں جماعت

تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اُس نے ایک لائبریری بھی جاری کر رکھی ہے۔ اور سات یا آٹھ پڑوسیوں کے ساتھ شامل ہو کر ایک کم علم ادا میں بیوہ کو اپنی بیٹی کی لڑکیوں کو قرآن شریف اور پڑھنا لکھنا سکھانے کے لئے ملازم رکھا ہوا ہے۔ وہ شادی نہیں کر سکتی۔ اور ہمارا خیال ہے۔ کہ یہ کام اس کے لئے اچھا رہے گا۔ اسے ۵ روپیہ ماہوار اور فصل کے موقع پر بیٹی میں سے آٹھ سیر غلّہ فی ہل مل جاتا ہے۔ خواہ لوگ اپنی بچیوں کو اس کے پاس بھیجیں یا نہ بھیجیں۔ ہر روز اُس کے پاس تیس لڑکیاں جاتی ہیں۔

پردہ :- ہم نے پردے کے متعلق نہایت دلچسپ بحث کی۔ مسلمان اور ہندو راجپوت دونوں نے کہا۔ کہ ابھی تک اس کا زور ہے۔ لیکن ہندوؤں میں جو اپنی عورتوں کو ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ اس کا اتنا زور نہیں ہے۔ جب میں نے یہ پوچھا۔ کہ جب ہندوؤں کو کوئی مذہبی مجبوری نہیں ہے۔ تو پردہ کیوں کرتے ہیں۔ تو ایک سربرآوردہ ہندو راجپوت نے کہا۔ کہ یہ ہمارے بڑوں کی بات ہے۔ ایک سفید ریش مسلمان نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ کہ اگر راجپوت پردہ چھوڑ دیں۔ تو اُن میں باقی کیا رہ جائے گا۔ وہ بھی ایسے ہی ہو جائیں گے۔ جیسے اور لوگ۔ لیکن اگر پردہ نہ ہوتا۔ تو بجائے بھوکے مرنے کے جیسے کہ ہم اب مرتے ہیں۔ کسی نہ کسی کو اپنی روٹی لانے کے لئے کہتے۔ اور ہمیں اپنے سروں پر لکڑیاں نہ اٹھا کر لانی پڑتیں۔ میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہُوا کہ ایک اور سفید ریش نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ لیکن جب مجھے یہ معلوم ہُوا کہ وہ بینک کا خزانچی تھا۔ تو میری حیرانی میں کمی واقع ہو گئی۔ کیونکہ دیہاتیوں کے خیالات کو وسعت دینے کیلئے گاؤں کے بینک سے بہتر کوئی شے نہیں ہے۔ اس کے بعد کی بحث سے یہ ظاہر ہُوا کہ اس کے متعلق دو گروہ ہیں۔ اور یہ امر بدات خود تبدیلی پر دال ہے۔ ایک ہندو راجپوت وکیل جو ذرا بعد میں مجھے ملنے کیلئے آیا۔ بہت کچھ عورتوں کے پردہ سے باہر آنے کے حق میں تھا۔ کیونکہ اب جب کہ چکی پیسنے کا کام چھوڑ دیا گیا ہے۔ اُن کی کوئی ورزش نہیں ہوتی۔ اور اُس کے ساتھ ہی انہیں گھر کے اندر ہی بول و براز کرنا پڑتا ہے۔ اور اُس سے گھر گندے اور مضر صحت ہو جاتے ہیں۔

کشیدہ کاری اور زیورات :- میرے سامنے میز پر کشیدہ کاری کا ایک

دلپذیر نمونہ تھا۔ اراعیں پریذیڈنٹ نے بتایا۔ کہ یہ ہماری عورتوں کا کام ہے۔ جنہوں نے مدتوں یہ کام کیا ہے۔ میری والدہ صاحبہ نے یہ فن بہت سی عورتوں کو سکھایا تھا۔ جو شادی ہونے پر وہی فن اپنے ساتھ دوسرے گاؤں میں لے گئی تھیں۔ اب جبکہ پسائی نہیں کی جاتی۔ اور کتائی بھی کم ہوتی ہے۔ بہت سی لڑکیاں سیکھنے آتی ہیں۔ اور میری ہمشیرہ دس یا بارہ کو ہر روز سکھاتی ہے۔ زیورات کے متعلق مجھے وہی جواب ملا۔ جو کہیں اور ملا تھا۔ یعنی یہ کہ وہ پرانے زمانے کی نسبت اب بہت کم پہنے جاتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے کہا۔ بیشمار زیورات خریدنے کا فائدہ ہی کیا ہے جبکہ کبھی نہ کبھی وقت انہیں ضرور بیچنا پڑتا ہے۔ اور پھر ان کی قیمت بہت کم وصول ہوتی ہے

مرغیاں پالنا:۔ میں نے مرغیاں پالنے کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے کہا۔ کہ بہت سے لوگ انہیں پالتے ہیں۔ لیکن صرف گھر کے استعمال کے لئے۔ ملانے میں ایک ملا انہیں بیچنے کے لئے پالتا ہے۔ ایک سال ہوا۔ اس کے پاس تیس تھیں۔ لیکن ایک دن جب وہ واپس آیا۔ تو اس کا گھر جل کر خاک ہو گیا تھا۔ اور اس کی تمام مرغیاں مرگئی تھیں۔ دل شکستہ ہوئے بغیر اس نے پھر رکھنی شروع کر دی ہیں۔ اور اب اس کے پاس تقریباً ایک درجن ہیں۔ ایک اراعیں استاد بھی انہیں بیچنے کے لئے پالتا ہے۔ اور انڈوں سے اسے اتنی آمدنی ہوتی ہے۔ کہ وہ لگان ادا کر سکتا ہے۔ انڈے ایک مقامی کاروباری کے پاس ۴½ آنے فی درجن فروخت کئے جاتے ہیں۔ اور وہ انہیں انبالہ فروخت کر دیتا ہے۔ ہندو راجپوت مرغیاں نہیں پالتے۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ سراسر سبزی خور ہیں۔ ملانہ کے مسلمانوں نے بتایا کہ دو ہفتے میں ایک بار پیر کے دن گوشت کھاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ان کے ہفتہ وار میلے کا دن ہوتا ہے۔ ہفتہ واری میلہ کا باقاعدہ دستور ہے۔ اور چار گاؤں اسے مختلف دنوں میں اس نواح میں مناتے ہیں۔ یہ مسٹر گلیڈ سٹون نے جاری کئے تھے جو انیسویں صدی میں انبالہ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ ایک سفید ڈاڑھی والے بوڑھے نے بتایا۔ کہ یہ اس وقت جاری کئے گئے تھے۔ جبکہ میرے بال پہلی مرتبہ سفید ہونے شروع ہوئے تھے۔ اگرچہ اتنے سال گذر چکے تھے۔ لیکن بوڑھے آدمی جو اس وقت موجود تھے۔ اس کا ذکر دلی خلوص سے کرتے تھے۔ اور یہ کہتے تھے۔ کہ اس نے ہم سے چرّیں گھاس لگوائی تھی۔ اور اس سے نہ صرف ان کی زمینیں بچ گئی تھیں۔ بلکہ ان کی آمدنی کا ذریعہ بھی بن گیا تھا۔ ملانے میں صرف چند اراعیں سبزیاں

اُگاتے تھے۔ لیکن دوسرے گاؤں میں پانچ چھ سال سے راجپوت بھی پیدا کر رہے تھے۔ اس میں کوئی معیوب بات نہ تھی۔ کیونکہ وہ انہیں اپنے سروں پر رکھ کر بازاروں میں خوردہ فروشی کے لئے نہیں جاتے تھے۔ بلکہ کھڑی فصل کی صورت میں سبزی فروشوں کے پاس بیچ دیتے تھے۔ لوگوں نے مقامی ڈاکٹر کی تعریف کی۔ اور کہا۔ کہ وہ تمام دن صبح سے شام تک ہسپتال میں رہتا ہے۔ اور اگر بلایا جائے۔ تو رات کو بھی باہر چلا جاتا ہے۔ یہ ایک کھلی تعریف ہے۔ اور کم سننے میں آتی ہے۔ ملّانے میں دو دیسی حکیم تھے۔ ایک بنیا اور ایک تیلی۔ لیکن جب سے یہ ڈاکٹر آیا تھا۔ اُن میں سے کسی کو زیادہ کام نہ کرنا پڑتا ہے۔ چھوت چھات لوگوں میں زیادہ ہے۔ وہ اب بھی چمار کے چھوئے ہوئے کپڑوں کو دھوتے ہیں۔ لیکن جو نئی روشنی کے لوگ ہیں۔ (یہ جملہ میں اس دورے میں متواتر سنتا چلا آیا ہوں۔) اس کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ اور اسی لئے سکول میں کوئی تفریق نہ تھی۔ جب ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ تو میں نے بہت زیادہ بوجھ سے لدی ہوئی ایک بیل گاڑی کو نزدیک ہی ایک کچی سڑک پر پانی اور دلدل میں سے گزرنے کی کشمکش کرتے ہوئے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ یہ کامیاب ہو۔ بیس منٹ تک محض اس لئے کشمکش کرتی رہی۔ کہ سڑک کو درست کرنے کے لئے دیہاتیوں کی صرف ایک دن کی محنت درکار تھی۔

پیر ۲ چار :- ان لوگوں میں سے جو وہاں مجتمع تھے۔ دو گویّے تھے۔ ایک کے پاس سارنگی تھی۔ اور دوسرے کے پاس طبلہ۔ ایک اُستاد کے پاس ہارمونیم تھا۔ اور دو راگی لڑکے تھے۔ جن میں سے ایک کی انگلیاں پتلی اور آواز اونچی اور کرخت تھی۔ اور دوسرے کی انگلیاں کھردری اور گھٹی ہوئی تھیں۔ اور آواز ایک پرندے سے ملتی جلتی تھی۔ ہمارے جانے سے پہلے انہوں نے تین نظمیں گا کر سنائیں۔ ایک اشتمال اراضی کے متعلق اور دوسری " ساہوکار بنئے کی بدتر ین ہجو میں "۔ آخر الذکر میں سے ایک کی گت نہایت عمدہ تھی۔ اور مل کر گانے کی طرف بہت کھینچتی تھی۔ حاضرین میں سے بہت سے لوگ خوشی میں آکر اسی طرح گانے لگ گئے تھے۔ یہ یوں شروع ہوتی تھی " او بنیا جی ! او بنیا جی ! خدا کی عدالت میں تیرا منہ کالا ہو گا "۔ یہ اتنی اچھی طرح گائی گئی۔ کہ مجھے مزدوری احتجاج کے لئے اٹھنا پڑا۔ میں نے اس سے نفرت دلانے کے لئے کہا۔ کہ یہ

امداد باہمی نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح زمین کو سورج کی روشنی اور بارش کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اس کے لئے اتفاق اور نیک نیتی کی ضرورت ہے۔ اسسٹنٹ رجسٹرار نے اسے اس قدر پُر زور طریق سے واضح کردیا۔ کہ وہ تمام اپنا سر اثبات میں ہلانے لگے۔ ہم سوار ہوکر براڑہ روانہ ہوگئے۔ جو انبالہ سے لکھنؤ جانے والی ریل کی بڑی لائن پر ہے۔ ہم نے آج دس دن کے بعد ریل دیکھی ہے۔ (۱۷ میل)

باب چہارم کرنال

چھوت چھات۔ مذہبی تعلیم عورتیں

۲۴ر دسمبر برارہ سے لاڈوہ ؟

آج میں ضلع کرنال میں داخل ہؤا۔ ہندو اسے دھرم دھرتی یا مقدس زمین کہتے ہیں۔ کیونکہ سری کرشن جی نے بھگوت گیتا کے اسباق کروکشیتر ہی کے میدان میں دئے تھے۔ جو یہاں سے دور نہیں ہے۔ مسلمانوں کے لئے بڑی اہمیت کے نظارے ہیں۔ کیونکہ ان کی نوجوں نے پانی پت کے میدان میں تین مرتبہ شمالی ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کیا ہے۔ پوراکا سلسلہ ابھی تک نظر کے سامنے تھا۔ لیکن وہ نیم پہاڑی علاقہ جس میں سے میں گزشتہ دس دن سے سوار چلا آیا ہوں۔ پیچھے رہ گیا تھا۔ اور میں ایک بڑے ہموار میدان میں آگیا۔ جو شمال میں جہلم۔ جنوب میں دہلی اور مغرب میں ۸۰۰ میل پرے سمندر تک پھیلا ہؤا ہے۔ ڈھاک کے درختوں کا جنگل جو کسی زمانے میں دریائے بیاس تک پھیلا ہی تھا۔ اور اس کی علامات گڑھ شنکر اور انبالہ میں نظر آئی تھیں۔ ابھی تک یہاں پاؤں جمائے ہوئے ہے۔ اور جہاں کہیں ڈھاک نہیں ہے۔ وہاں سرکنڈے پھیلے ہوئے ہیں۔ دونو مشترکہ طور پر مویشیوں کے چرانے کیلئے چرائی کا مکمل میدان پیش کرتے ہیں۔ جو کاشتکاری کی نسبت اس علاقے سے زیادہ واقف ہے۔ یہاں کاشت ہوتی ہے۔ لیکن یہ کاشت صرف اُن لوگوں کی ہے۔ جو دردور مصیبت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ غیر یقینی منتشر اور قدیم طرق کی ہے۔ جن کھیتوں سے ہم گزرے اُن میں سے اکثر کے نصف حصوں میں ڈھاک کی جھاڑیاں اور چھوٹے چھوٹے درخت اُگے ہوئے تھے۔ اور ایک میں تقریباً سو بندر اپنی شام کی خوراک سرسبز گیہوں میں سے حاصل کر رہے تھے۔ لغوی معنی میں یہ کہیں گے۔ کہ وہ مٹھیاں بھر رہے تھے۔ ابھی تک قدرت غالب ہے۔ لیکن انسان اُس پر قابو

پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوسرے کھیتوں کے گرد نئی باڑیں بنائی جارہی تھیں اس کے لئے ڈھاک ہی کو استعمال کیا جا رہا تھا۔ وہاں کوئیں زیادہ نہ تھے۔ لیکن جہاں زمین آبپاشی ہو سکتی تھی۔ اس کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک گاؤں میں جہاں ایک کھتری اور کچھ جھیوروں نے زمین کو تقسیم کر لیا تھا۔ ہم نے نصف ایکڑ زمین میں سرسبز آلوؤں کے پودے دیکھے۔ اُن سینیوں کی نقل کرتے ہوئے جو پاس کے گاؤں میں آلو کاشت کرتے تھے۔ دو سال ہوئے۔ یہاں بھی انہیں رواج دیا گیا تھا۔ انہوں نے بتایا۔ کہ اگر پالا نہ پڑے۔ تو ان سے ہمیں کافی نفع ہوتا ہے۔ اور اگر پڑے تو ہمیں کچھ نہیں ملتا۔ اس گاؤں میں نے ایک پرانے سرسبز پیپل کا درخت دیکھا۔ میں نے جھیوروں سے پوچھا۔ کہ تم اس کی پوجا کرتے ہو۔ انہوں نے کہا۔ کہ ہاں امرت کے دنوں میں کرتے ہیں۔ کسطرح ؟ میں نے پوچھا۔ کیا تم اس کے گرد ڈورا باندھتے ہو۔ بولے نہیں۔ ہم اُس کے گرد پانی چھڑکتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا۔ کہ ہم مہینے کے پہلے دن اپنے مویشیوں کو آٹا دیتے ہیں۔ کبھی ایک مویشی کو۔ کبھی دوسرے کو۔ جب مویشی بوڑھے ہوجاتے ہیں۔ یا دودھ سے بھاگ جاتے ہیں۔ یا ناکارہ ہوجاتے ہیں۔ تو ہم کسی حالت میں ان کو فروخت نہیں کرتے۔

چھوت چھات:۔ جتنا ہم جنوب کی طرف بڑھتے جائیں۔ اتنا ہی ماحول ہندوانہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کی ایک علامت یہ ہے۔ کہ وہ چھوت چھات کے زیادہ سختی سے پابند ہیں۔ ہم ایک ہی گاؤں کے ایک ہندو جاٹ اور ایک چمار سے ملے۔ جو دونو ساتھ ساتھ آ رہے تھے۔ ایک اپنے اوزاروں کے لئے لوہا لئے جارہا تھا۔ اور دوسرا نمک۔ ہم نے اُن سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ ہمیں بتایا گیا۔ کہ چماروں کو گاؤں کے کوئیں سے پانی نہیں بھرنے دیا جاتا۔ اور چونکہ اُن کے اپنے کنوئیں نہ تھے۔ اُن کو کسی بہشتی یا کسی واقف کاشتکار کی نیک خدمات پر رہنا پڑتا ہے۔ تاکہ وہ پانی کھینچیں۔ اور اُن کے گھڑوں میں ڈالیں۔ میں نے کہا۔ اگر وہ نہ کرے تو پھر؟ چمار نے نہایت عاجزانہ و دلسوز لہجے میں جواب دیا۔ اگر وہ ہماری اس طرح پرواہ نہ کریں۔ تو ہم پیاسے مرجائیں۔ یہ بات اُس نے کچھ اس طرح کہی۔ گویا کہ تمام ہمدردی دوسرے کے ہاتھ میں تھی۔ اُس نے دوسری پابندیوں کا ذکر بھی کیا۔ ہم کسی زمیندار کے گھر میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتے۔ ہم باہر

کھڑے ہوتے ہیں۔ اور آواز دیتے ہیں۔ اور اگر کوئی نہ آئے تو ہم پھر اُسی وقت آتے ہیں۔ جب وہاں کوئی موجود ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ جب گاؤں کے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔ تو کیا تم دوسرے لوگوں کے ساتھ اُسی چادر پر بیٹھتے ہو؟ اُسی نے جواب دیا۔ "کبھی نہیں"، "کبھی نہیں" ہم زمین پر بیٹھتے ہیں۔" اس کے لہجے اور بشرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا۔ کہ اس قسم کی بات کبھی اُس کے خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ ہم نے پوچھا۔" اگر تم ٹاٹ کے ٹکڑے یا کپڑے پر بیٹھ جاؤ تو کیا ہے۔ " نہیں! ہمارے لئے زمین پر اور صرف زمین پر ہی بیٹھنا ضروری ہے۔ میں نے جاٹ کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ اگر تم اتفاقیہ چمار سے چھو جاؤ۔ تو تم کیا کرو گے۔ کیا تم اپنے اوپر پانی چھڑکو گے۔ اُس نے جواب دیا نہیں۔ اور ساتھ ہی توبہ توبہ کرتے ہوئے انگلی ہلائی۔ اور کہا۔" میں اپنے کپڑے دھوؤنگا۔ اور نہاؤں گا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہم ایک دوسرے چمار سے ملے جس نے پہلے چمار کی بیان کی ہوئی تمام باتوں کی تصدیق کی۔ بظاہر یہ خصوصیت نہ صرف کرنال میں پائی جاتی ہے۔ بلکہ رہتک اور گوڑگاؤں میں بھی ہے۔

لاڈوے کے نزدیک جاٹوں کے ایک گاؤں میں ہم نے ایک پختہ مکان دیکھا جو صاف طور پر نیا معلوم ہوتا تھا۔ معلوم ہؤا۔ کہ یہ گاؤں کی چوپال تھی۔ اور اس پر پندرہ سو روپیہ خرچ ہؤا تھا۔ چوپال گاؤں کے ہر آدمی پر دس روپے ٹیکس لگا کر بنائی گئی تھی۔ یہ چوپال اپنے آپ پر ٹیکس لگانے اور امداد باہمی کی ایک اچھی مثال ہے۔ لیکن دیہاتیوں کی اس باہمی معاونت کا دائرہ اُس سڑک کی مرمت تک نہیں پھیلتا۔ جو گاؤں سے ۱۰۰ گز کے فاصلے پر پانی اور کیچڑ کی وجہ سے تقریباً ناقابل گزر ہے۔ دیہاتیوں نے اُس پر یہ اعتراض کیا۔ کہ یہ نقشے میں گورنمنٹ کی ملکیت دکھائی گئی ہے۔ اور گورنمنٹ ہی کو اس کی مرمت کرنی چاہئیے۔ گاؤں کے لوگ شاذ ہی اپنی سڑکوں کی مرمت کرتے ہیں۔ البتہ قیمتی چوپالیں پیسے دے دے کر بنوائی جا رہی ہیں۔ تاکہ رشتہ دار یا براتی جب اُن سے ملنے آئیں۔ تو انہیں شرمندہ نہ کریں۔

۲۶ دسمبر۔ لاڈوہ سے اندری (۱۶ میل)

مذہبی تعلیم:۔ چونکہ آج تعطیل تھی۔ ہم اطمینان سے ۱۰½ بجے چلے۔ اور ۱۲ بجے

سے پہلے نہ پہنچے۔ راستہ زیادہ آباد علاقے میں گذرتا تھا۔ اور ایک گاؤں سے دوسرا گاؤں نظر آتا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ انسان نے قدرت پر پورا قابو پالیا ہے۔ ہم دو گاؤں کے بینکوں کے ۳۶ نمائندوں سے ملنے کے لئے ایک گاؤں میں ٹھہرے۔ سوائے ایک کے باقی سب اُداسیوں کے فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن جب میں نے اُن سے پوچھا۔ آیا وہ ہندو تھے یا سکھ۔ تو وہ بہت گھبرائے کہ کیا جواب دیں۔ آخرکار بہت ہچکچاہٹ کے بعد انہوں نے کہا۔ کہ ہم سکھ ہیں۔ یہ بات اُس وقت پیدا ہوئی۔ جب میں نے اُن سے مذہبی تعلیم کے متعلق چند سوالات دریافت کئے۔ اس کے بعد اُداسیوں اور غیر اُداسیوں میں بہت تکرار ہوئی۔ آخرالذکر ایک ادھیڑ عمر کا اکھڑ آدمی تھا۔ یہ تیز مزاج بگو اسی دوسروں کی باتوں سے اس قدر برانگیختہ ہُوا کہ ایک بات پر تو وہ بالکل چادر میں غائب ہوگیا۔ اور پھر جو نکلا تو اُن پر نہایت تندی سے غرّایا۔ دونو گاؤں میں سے ایک کوئی کسی قسم کا مندر نہیں ہے۔ دوسرے میں ایک گوردوارہ ہے۔ جہاں گرنتھی تو ہے۔ لیکن گرنتھ صاحب نہیں ہے۔ سال میں ایک یا دو مرتبہ گرنتھی لاڑوے جاتا ہے۔ اور کسی سے مانگ کر لے آتا ہے۔ اور اسے آٹھ یا دس تک زور زور پڑھ کر گاؤں والوں کو سُناتا ہے۔ ان کی تمام مذہبی تعلیم اس پر ختم ہے۔ ان میں سے نہ کوئی لکھ سکتا ہے۔ اور نہ پڑھ سکتا ہے۔ دونو بینکوں میں سب انسپکٹر کو بہ حیثیت سکرٹری کام کرنا پڑتا ہے۔ اور میرا خیال نہیں کہ گرنتھی بھی کچھ زیادہ پڑھا لکھا ہے۔ گرنتھ صاحب کے وقتاً فوقتاً پاٹھ کے علاوہ وہ ہر شام کو سنکھ بھی بجاتا ہے۔ اور اگر کوئی مسافر آجائے۔ تو اُسے روٹی بہم پہنچاتا ہے۔ ان خدمات کے صلے میں اسے سال میں دو مرتبہ گاؤں میں چلنے والے ہر ہل کے بدلے پانچ سیر غلّہ مل جاتا ہے۔ ایک ذیلدار نے جو ذرا بعد میں میرے ساتھ شامل ہُوا۔ یہ بتایا۔ کہ میرے حلقے میں بارہ یا پندرہ پجاری ہیں۔ اور اُن کا کام محض یہ ہے۔ کہ مندر کی گھنٹیاں ٹھنکاتے ہیں۔ اور سنکھ بجاتے ہیں۔ اس طرح لوگ بھی آرام میں ہیں۔ اور پجاری بھی کیونکہ اُنہیں روٹی مل جاتی ہے۔

مویشی پالنا:۔ مویشیوں کے متعلق ہر جگہ احساسات قومی ہیں۔ اِن دیہاتیوں نے بتایا۔ کہ اگر کوئی بوڑھی گائے یا بیل یا ایک بوڑھی بھینس بھی فروخت کردے۔ تو اسے جانوروں کے زمرے سے خارج کردیا جاتا ہے۔ اور

۲۵ روپیہ جرمانہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ایسی کوئی بات انہیں یاد نہ پڑتی تھی۔ ذیلدار نے جو کہ جھلسے ہوئے رنگ کا ایک اچھا خاصہ بوڑھا آدمی ہے۔ اور بے داغ سفید چادر لئے ہوئے ہے۔ یہ بتایا کہ پہلے بیل کم فروخت کئے جاتے تھے۔ لیکن جب سے یہ معلوم ہوا ہے۔ کہ ہمارے مویشی کیوں خریدے جاتے ہیں۔ ایسا نہیں کیا جاتا اب جبکہ نیا آلہ آ گیا تھا۔ وہ اخۃ کرنے پر اعتراض نہیں کرتے تھے۔ یہ آلہ دو یا تین سال ہوئے لایا گیا تھا۔ اس سے پہلے چونکہ مسلمان اسے کچلا کرتے تھے۔ تو مویشی کو سخت تکلیف ہوا کرتی تھی۔ اور وہ اخۃ نہیں کرایا کرتے تھے۔ وہ اس میں سچے ہیں۔ کیونکہ کچلنے کا یہ طریقہ نہایت ظالمانہ تھا۔ یہ کاٹنے کے بدلے استعمال کیا جاتا تھا۔ تاکہ خون جس پر بہت سے ہندو اعتراض کرتے تھے نہ بہے۔ نئے آلے نے جس کو برڈیزو کا سٹریٹر کہتے ہیں۔ یہ مسئلہ ہر ایک کی تسلی کے مطابق حل کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ بغیر کھال کاٹنے یا خون بہانے کے اخۃ کر دیتا ہے۔ (۱۲ میل)

۲۷ دسمبر۔ اندری سے رمبہ

ضلع رہتک:۔ آج ہماری سڑک نہر کے کنارے کنارے تھی۔ چونکہ ہمارے ساتھ ایک آدمی ایسا تھا۔ جو رہتک سے خوب واقف تھا۔ اس لئے ہم نے متعلق کے ضلع رہتک کے متعلق بہت باتیں کیں۔ اسی ضلع میں فوجی سپاہی بہت ہیں۔ اور لڑائی کے بعد جب تمام سپاہیوں کے پاس اتنا روپیہ تھا۔ کہ وہ اس کا مصرف نہیں جانتے تھے۔ اور بہت لوگوں نے روپیہ چلانا شروع کر دیا۔ لیکن اب چونکہ روپیہ کمیاب ہے۔ اس لئے پہلے کی نسبت بہت کم آدمی ایسا کرتے ہیں۔ پیشہ ور ساہوکار کی نسبت کاشتکار ساہوکار کی حالت نہایت زبوں ہے۔ کیونکہ پیشہ ور ساہوکار چھڑی ہاتھ میں لے کر اپنے کام پر چلا جاتا ہے اور جلد سے جلد مقروض کی زمین پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دیہاتی جاگیر دار کے لئے عام طور پر ۲۵ فیصدی شرح سود ہے۔ یہ وہی شرح ہے جو ہمیشہ سے چلی آئی ہے۔ یہ وسطی پنجاب کی نسبت زیادہ ہے۔ وہاں ۱۸¾ فیصدی یعنی پیسہ روپیہ ہے۔

عورتیں:۔ عورتوں کے متعلق قابل ذکر امر یہ ہے۔ کہ پہلے کی نسبت بلوغت سے

قبل شادی کا رواج بہت کم عام ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ نئی تہذیب ہے۔ جو نوج کے ساتھ گہرے تعلقات کی وجہ سے کرنال کی نسبت ان میں زیادہ اثر کر گئی ہے۔ اور دوسری وجہ احتیاط کا بڑھتا ہوا احساس ہے۔ اس کے دوسرے ہی دن یہی وجہ پردے کے آیندہ غیر ضروری ہونے کے متعلق بیان کی گئی۔ گاؤں کی لڑکیاں عام طور پر بالغہ ہونے پر بیاہی جاتی ہیں۔ اور لڑکے سولہ یا اٹھارہ سال کی عمر میں۔ اس کی تکمیل شادی کے پہلے یا تیسرے سال ہوتی ہے۔ دوسرے میں کبھی نہیں۔ کیونکہ اسے منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ لوگ اس بات کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ کہ دیر میں کی ہوئی شادی سے صحت برقرار رہتی ہے۔ کثرت ازدواج شاذ ہے۔ اور عام طور پر یہ کہا جاتا ہے۔ کہ اگر تم کسی کو مصیبت میں پھنسانا چاہتے ہو۔ تو اس کی دوسری شادی کر دو۔ رہتک میں عورت کی زندگی آسان نہیں ہے۔ راجپوت اپنی عورتوں کو پردے میں رکھتے ہیں۔ اور جاٹ اپنی بیویوں سے اتنا سخت کام لیتے ہیں.......................... کہ پنجاب میں اور کوئی نہیں لیتا۔ ان کو آدمیوں سے زیادہ سخت کام کرنا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے بچوں سے غافل ہو جاتی ہیں۔ ایک شخص جو اس ضلع سے خوب واقف ہے۔ کہتا ہے۔ کہ یہ مشقت کی نسبت غلامی کی زیادہ علامت ہے۔ کیونکہ اگر عورتیں کافی سخت کام نہ کریں۔ تو ان کے خاوند ان کو سزا دیتے ہیں۔ ان کو پانچ بجے سے پہلے چکی پیسنے کے لئے اٹھنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ وہ دس بجے سے پہلے نہیں سوتیں۔ انہیں بہت کم نیند میسر آتی ہے۔ اس مروجہ طریقے کے متعلق اگر کوئی خوبی بیان کی جا سکتی ہے۔ تو یہ ہے۔ کہ اس کی وجہ سے وہ برائیوں سے بچی رہتی ہیں۔ اسی ڈر سے کہ عورت کے دل میں اور وسوسے نہ پیدا ہوں۔ اس علاقے کے لوگوں کا عام نظریہ یہ ہے۔ کہ اسے یا تو بالکل فرصت نہ دی جائے۔ یا اگر دی جائے تو بہت کم۔ ایک نوجوان بیوہ کے متعلق یہ کہانی بیان کی جاتی ہے۔ کہ وہ اپنے خاوند کی وفات کے بعد جلّاں نامی ایک زاہد کے پاس گئی۔ اور اس سے استدعا کی کہ وہ یہ دعا مانگے۔ کہ وہ اپنی بیوگی کا زمانہ اس طرح گذار دے۔ جیسا کہ ایک بیوہ کو گذارنا چاہیئے۔ اور جلّاں نے اُسے یہ نصیحت کی۔ کہ دیوار کے ساتھ بیٹھو۔ اور چرخے کو سامنے رکھو۔ اور اپنے آپ کو پیسنے اور کاتنے میں مصروف رکھو۔ اس طرح تم اپنے دن اچھی طرح سے گذارو گی۔

لیکن اگر تم نے ریشم پہنا اور کھانڈ اور گھی کھایا تو جلاّں کی دعائیں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتیں"۔ اسی وجہ سے پرانے زمانے کے لوگوں کے نزدیک آٹا پیسنے کا کام ایک نیک عمل خیال کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پانی بھرنے اور گھر کے برتن صاف کرنے کا کام بھی مفید معاشرتی خدمت سمجھا جاتا ہے۔ اور ایسا ئی کے تنزل پر افسوس ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس سے اقتصادی فائدہ مطلوب ہے۔ بلکہ اس لئے کہ یہ ان کے قدیمی احساسات کی مفید رکاوٹ کو کمزور کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ تھکان عورت کے لئے بہترین محافظ فرشتے کا حکم رکھتی ہے۔ ایک بوڑھے نے میرے عملے کے ایک آدمی کو یہ نصیحت کی کہ جب تمہارے پاس عورت کو گھر پر دینے کے لئے کافی کام نہ ہو۔ تو چاولوں کو دال میں ملادو اور اُسے کہو کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرے کیونکہ بیکار رکھنا عورت کے دل و دماغ میں یقینی طور پر بُرے جذبات کا طوفان پیدا کر دیتا ہے۔ اگر دیہاتی عورت کو دہقانیت سے تہذیب کی طرف لایا جا سکے۔ تو اس سے کم بامشقت علاج تجویز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُن عقلمندوں کا نقطۂ نظر بھی قابلِ توجہ ہے۔

مویشی:۔ مویشیوں کے معاملے میں رہتک کرنال سے بھی زیادہ سخت ہے۔ حال ہی میں ایک ہندو دیہاتی نے ایک گائے قصائی کے پاس بیچدی تھی۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور ایک قریب کے گاؤں کے لوگوں نے گائے کو چھڑالیا۔ اور ملزم سے قطع تعلق کر لیا۔ یہاں تک کہ اُس نے ۵ روپے بہ طور جرمانہ ادا کئے۔ لیکن دونوں ضلعوں میں بہت سے لوگ اپنے مویشیوں کو عیارانہ طریق سے فروخت کرتے ہیں۔ اور اکثر لوگ نکمے مویشیوں کو اچھے مویشیوں سے بدل لیتے ہیں۔ اور اس کا فرق نقدی کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔ تاہم اس سے بہ ہیئتِ مجموعی نہ مویشیوں پر اور نہ ہی اُن کے پالنے پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ جنگِ عظیم سے پہلے تین تحصیلیں اپنے مویشیوں کی فروخت سے ۱۵ لاکھ روپیہ سے زیادہ نفع حاصل کرتی تھیں۔ مویشی پالنے کا کام جو رہتک میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ایسی مایوس کن حالت میں ہو رہا ہے۔ کہ پنجاب گورنمنٹ کے سابق ماہر حیوانات نے بتایا کہ پچاس فی صدی مویشی ناکارہ ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ مویشی بالکل ناکافی

چراگاہوں میں مخلوط ہو کر چرتے ہیں۔ آرتھر نیگ نے لکھا ہے کہ مویشی اور احاطہ مترادف الفاظ ہیں۔ نیز مویشی مخلوط ہو کر پرورش پاتے ہیں۔ اور جیسا کہ مسٹر گرشیم کے قانون سے ظاہر ہے۔ بُرے مویشیوں کی وجہ سے اچھے مویشیوں کی قیمت بھی کم پڑتی ہے۔ خرابی اور نئے درجے کے مویشیوں کو آختہ کر کے کم کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ دس یا پندرہ سال ہوئے۔ ہندو اسے پاپ خیال کرتے تھے۔ لیکن اب یہ کام نہایت آزادی سے کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس سے ناکافی چراگاہوں کی مشکل حل نہیں ہوتی۔ ہر جگہ مویشی چرانے پر پورا پورا قابو نہیں رکھا جاتا۔ اور کسی اچھے بیل یا گائے کو بُروں کی نسبت کافی گھاس حاصل کرنے کا زیادہ موقع نہیں مل سکتا۔ مغربی خیال کے مطابق دارمی چراہ گاہیں نہیں ہیں۔ گاؤں کی چراگاہ میں ہر شخص جتنے مویشی چاہے۔ چرا سکتا ہے۔ اس طرح صفات کی نسبت بہتات کا فائدہ زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس بات پر کوئی غور نہیں کرتا۔ کہ اس کے مویشیوں میں سے کتنے رکھنے کے قابل ہیں۔ مذہب کا مقرر کردہ یہ سادہ اصول کہ جو جانور ایک مرتبہ پیدا ہو جائے۔ وہ ضرور زندہ رہے خواہ اُس سے انسان کو کچھ فائدہ ہو یا نہ ہو۔ تمام اقتصادی مصلحتوں کو دبا دیتا ہے۔ ماہر حیوانات کا بیان ہے۔ کہ ان تمام امور کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ کسی مشترکہ چراگاہ میں مویشیوں کی تعداد اس قدر کم کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ کہ چراگاہ ان کے لئے کافی ہو سکے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے۔ کہ بارانی علاقوں میں سوائے برسات کے ایک یا دو مہینوں کے مویشیوں کی عملی ضروریات کے لئے سبز چارہ بالکل نہیں ملتا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں اصطبل میں چارہ دینے کی آزمائش کرنی چاہیے۔ اس میں مشکل یہ ہے۔ کہ مویشیوں کی قیمت کے مقابلے میں چارہ بہت زیادہ گراں ہے۔ ماہر حیوانات کا یقین ہے۔ کہ اگر کوئی ان طریقوں پر کاربند ہو کر مویشیوں کی نسل بڑھائے گا۔ تو وہ بہت جلد تباہ ہو جائے گا۔ کیونکہ اُس نے اندازہ لگایا ہے۔ کہ بہت سے چار سالہ بیلوں نے جو رہتک اور حصار کے بیلوں میں فروخت کئے گئے۔ اپنی قیمت فروخت سے حاصل کی ہوئی اوسط رقم سے زیادہ کا چارہ کھایا۔ جنوب مشرقی پنجاب میں ضلع حصار میں بہت مویشی پالے جاتے ہیں۔ اس لئے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ۵۰ فیصدی نکمے مویشیوں کو کم کرنے کی آزمائش کی جائے۔ اور اگر یہ

بات ہو سکی تو باقی ماندہ مویشیوں کے لئے پہلے سے دوگنا چارہ باقی رہ جائے گا۔ اس کی ضرورت پنجاب سے باہر بھی ہے۔ کیونکہ لنلتھگو کمیشن نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے ہر حصے میں گاؤں کے نزدیک تمام مشترکہ چراگاہوں اور گھاس والی زمینوں میں حد سے زیادہ مویشی چرتے ہیں۔ اور یہ نہایت مایوس کن ہے۔ پروفیسر فنڈلے شراس نے اعداد و شمار سے اندازہ لگایا ہے۔ کہ ملک میں دو کروڑ پچاس لاکھ مویشی فالتو ہیں۔ اور سالانہ اقتصادی نقصان زمین کے لگان کے چوگنے سے بھی زیادہ ہے۔

پنچائتیں اور سیاست :۔ مویشیوں کے معاملے میں اگر رہتک کرنال کی نسبت زیادہ سخت ہے۔ تو اس کی کچھ وجہ یہ ہے۔ کہ رہتک میں ذات پات کی پنچائتیں ابھی تک دیہاتی زندگی کا جزو ہیں۔ انفرادیت کا دائرہ وسیع ہو جانے سے اس کا زور پہلے کی نسبت کم ہے۔ لیکن بہت سے دیہات میں ابھی تک یہ رواج ہے۔ کہ ایک فرقے کے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔ اور مشترکہ امور کا فیصلہ کرتے ہیں۔ کوئی رسمی پنچ یا چودھریوں کی جماعت نہیں ہے۔ بلکہ عام منظوری سے فیصلے کئے جاتے ہیں۔ اور مشکل یا ضروری معاملات میں کسی شخص کو گنگا کا پانی ہاتھ میں لے کر گواہی دینے پر مجبور کرنے سے سچائی معلوم کر لی جاتی ہے۔ رہتک اور کرنال میں سے کسی ایک میں بھی دیہات میں فرقہ داری نہیں ہے۔ لیکن پھوٹ بہت ہے۔ جو عام طور پر ذاتی معاملات سے پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں کا کاشتکار ذرا بھی سیاست کی پرواہ نہیں کرتا۔ بشرطیکہ اُسے امن سے گزارہ کرنے دیا جائے۔ اُسے اس امر سے کوئی غرض نہیں ہے۔ کہ وہ کس قسم کی حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرتا ہے۔ سو برس گزرے سلیمان نے لکھا تھا۔ کہ یہ ایک نادر حقیقت ہے۔ کہ دیہاتی کبھی بھی کسی موجودہ سلطنت کے دوست نہیں بنے۔ اور نہ ہی انہوں نے اپنے اور اپنی حکومت کے مفاد کو ایک سمجھا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ انہوں نے اس کی کامیابی یا قیام کی کبھی خواہش محسوس نہیں کی۔ یہاں بھی ابھی تک حکومت دیہاتی کی زندگی سے کسی حد تک بالکل باہر ہے۔ اور ایک ایسی طاقت کی مظہر ہے۔ جو قدرت کی طرح کبھی مہربان ہوتی ہے۔ اور کبھی نامہربان۔

جاگیردار:۔ دونوں ضلعوں میں سے کسی میں بھی یہ ممکن نہیں کہ رفاہِ عام کا کوئی ایسا کام دیکھا جائے۔ جو کسی جاگیردار کے طفیل ظہور پذیر ہوا ہو۔ اور بڑے سے بڑے درجے کا بھی مشکل سے کوئی جاگیردار ایسا ہوگا۔ جو زمین یا مزارعین کی بہبود کے لئے کوئی کام کرتا ہو۔ اس دورے میں مَیں نے بار بار یہ دریافت کیا ہے۔ کہ اس تحصیل یا ضلع کے جس میں سے ہم گزر رہے ہیں۔ اچھے جاگیردار کون کون ہیں۔ اس کے جواب میں مجھے اچھے اور بُرے تمام بڑے بڑے لوگوں کی فہرست بتادی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہندوستانی زبان میں گڈ کیلئے عام طور پر لفظ اچھا کا استعمال کوئی اخلاقی پہلو نہیں رکھتا۔ بلکہ صرف دنیاوی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔ کل میرے ایک ہمراہی کو جو ایک مشہور افسر ہے۔ یہ تسلیم کرنا پڑا کہ لفظ گڈ جب کہ جاگیردار کے لئے اخلاقی رو سے استعمال کیا جائے۔ تو اسکا ترجمہ اچھا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے۔ جو اس امر پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔

۲۸ دسمبر۔ ایک دن کا قیام

مویشی:۔ ایک ذیلدار کے ہمراہ جو اٹی کے خوش وضع کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ ہم ناشتہ کرنے سے پیشتر کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے چلے تاکہ رامبہ میں جاری کی ہوئی تین انجمنوں کو دیکھیں۔ رامبہ ۲۰۰۰ باشندوں کا ایک بڑا گاؤں یا قصبہ ہے۔ یہاں مویشی چرنے کے لئے جانے والے تھے۔ اور چند چھوٹے لڑکوں کی سپردگی میں تھے۔ جن میں سے ہر ایک کئی گھرانوں کے مویشیوں کی حفاظت کرتا تھا۔ میں نے ایک ٹھیکری گاؤں کی گذرگاہ کے آر پار لٹکائی ہوئی دیکھی۔ یہ مویشیوں کی بیماری کی عام علامت ہے۔ ان میں سے ایک انجمن کے صدر نے کہا کہ ہاں مویشی بیمار ہیں۔ کل ایک ڈاکٹر یہاں آیا تھا۔ اور اُس نے ۱۵۰ مویشیوں کے ٹیکہ لگوایا تھا۔ وہ سیرم کی بیس بوتلیں لایا تھا۔ اور بارہ واپس لے گیا۔ کیونکہ بہت سے لوگوں نے اپنے مویشیوں کو ٹیکہ کرانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ خدا کی مرضی سے بیمار ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ ڈاکٹر کے پاس جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن دوسرے یہی بہتر سمجھتے ہیں۔ کہ خدا کا کلام ٹھیکری پر لکھ کر گلی کے آر پار لٹکا دیا جائے۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ اپنے مویشیوں کو فروخت کرنے میں کوئی برائی

نہیں سمجھتے۔ اور بہت سے ہندو یہ دریافت کئے بغیر کہ ان کے مویشیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا کرتے ہیں۔ ایک مسلمان راجپوت نے کہا۔ کہ خدا نے مویشیوں کو اپنی مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور جب وہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔ تو انہیں رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مویشیوں کی نسبت اپنے لئے لوگ سائنس پہ ذرا زیادہ اعتقاد رکھتے ہیں۔ گاؤں میں تین بار پلیگ پڑی۔ اور کسی نے ٹیکہ نہ لگوایا لیکن ایک سال گذرا جب یہ چوتھی مرتبہ آئی۔ تو ان انجمنوں میں سے ایک کے صدر نے اپنے اور اپنے تمام کنبے کو ٹیکہ لگوایا۔ اور بہت سے لوگوں نے اس کی تقلید کی۔ اسی لئے اس مرتبہ بہت کم لوگ مرے۔ اس دورے میں مجھے ایک کوآپریٹر کو پیش قدمی کرتے ہوئے دیکھنے کا یہ پہلا ہی موقع نہیں ہے۔ کوآپریٹر۔ جو پیش قدمی کرتے ہیں۔ بلاشبہ رہنمائی کرتے ہیں۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلی عمارت۔ جو ہماری نظر پڑی ایک مسجد تھی۔ جس کے برآمدے میں جھریلوں والا لوہا لگا ہوا تھا۔ یہ حال ہی میں ۔۔ روپے کے خرچ سے لگوایا گیا تھا۔ مسجد کا ذمہ وار مُلّا ضلع بجنور واقع اضلاع متحدہ آگرہ واودھ سے آیا تھا۔ اس دور دراز جگہ سے اس کا تعلق ایک پرہیزگار شیخ کی وجہ سے تھا۔ جو ۵۰ سال گذرے وہاں آباد ہو گیا تھا۔ اگرچہ مُلّا اس قدر دور سے آیا تھا۔ لیکن وہ سوائے عربی میں قرآن شریف پڑھنے کے اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اور یہی بات دوسری ۵ مسجدوں کے مُلّاؤں پر صادق آتی تھی۔ ان میں سے ایک حافظ تھا۔ لیکن گاؤں میں ایسا شخص کوئی نہ تھا۔ جو لوگوں میں اس کی تفسیر بیان کر سکے۔ لڑکیاں لازمی طور پر کچھ زیادہ اچھی نہ تھیں۔ کیونکہ انہیں دو تین عورتوں سے جو قرآن شریف پڑھ کر سنا سکتی تھیں۔ اُسے عربی میں سُن لینے پر ہی صبر کرنا پڑتا تھا۔ بجنور کا مُلّا شادی شدہ تھا۔ وہ لوگ جو مسجد سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اُسے اس کے کنبے کے گذارے کیلئے ۳۰ من گیہوں سالانہ دیتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی اُسے نمازیوں میں سے ہر ایک کے گھر سے باری باری روزانہ کھانا ملتا تھا۔ ایک راجپوت کی سخاوت سے جو ۲۰ سال ٹرینسوال میں دوکانداری کرتا رہا تھا۔ حال ہی میں ایک نئی مسجد اور عیدگاہ بنائی گئی تھی۔ ۲۵۰ راجپوت گھرانوں میں سے صرف وہ اکیلا راجپوت ایسا تھا۔ جو سمندر پار گیا تھا۔ اُس نے مقامی بزرگ حضرت شاہ جمال صاحب کے مزار کی مرمت بھی کرائی تھی۔ اور اس کے گرد نہایت مضبوط چار دیواری بھی بنوائی

تھی۔ مجموعی حیثیت سے اُس نے ۱۴۰۰ روپیہ خرچ کیا تھا۔ ایک ایسے شخص کی جو اپنی دولت میں سے اپنے پڑوسیوں کو بھی حصہ دیتا ہے۔ یہ ایک اچھی مثال ہے۔

پردہ۔ شادیاں اور دائیاں:۔ اس کے بعد پردے کا سوال پیدا ہوگیا۔ ہم تقریباً سو آدمی جن میں سے اکثر مسلمان تھے۔ بہت سی چوپالوں میں سے ایک میں جو کہ گرد۔ آندھی اور کوڑے سے دور تھی۔ نہایت چاک چوبند ہوئے بیٹھے تھے۔ انہوں نے امیر افغانستان کا حکم سنا ہوا تھا۔ لیکن ان کے لئے پردہ ایک مذہبی معاملہ تھا۔ اور تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس موضوع پر تمام کے خیالات ایک ہی تھے۔ ان میں پنجایت کا نہایت سمجھدار صدر بھی شامل تھا۔ اس کے ساتھ ہی کیتھل کی تحصیل میں راجپوت پردے کے کم سختی سے پابند ہیں۔ لیکن یہاں یہ پرانے طریقے کی سختی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور عورتیں کبھی گھر سے باہر پیدل نہیں جاتیں۔ کاتتی بھی بہت کم ہیں۔ کچھ تو اس لئے کہ یہاں بہت کم کپاس اُگائی جا سکتی ہے۔ اور کچھ اس لئے کہ یہ کارآمد ثابت نہیں ہوتا۔ پیسنے والی عورتیں ان سے بھی کم ہیں۔ کیونکہ اس کام کے لئے ایک آئل انجن موجود ہے۔ بعض کچھ سینے کا کام کرتی ہیں۔ لیکن سوئی کا اور کوئی کام نہیں کرتیں۔ البتہ مہاجنوں میں لڑکیوں کے سکول کی وجہ سے دستکاری کے کاموں کی ابتدا ہو رہی ہے۔ راجپوتوں اور مہاجنوں نے جن میں سے موخرالذکر کے سات یا آٹھ آدمی حاضر تھے۔ اس امر پر اتفاق کیا۔ کہ گذشتہ دس سال میں شادی کی عمر بہت بڑھ گئی ہے۔ اس سے پہلے لڑکیوں کی شادیاں متواتر بچپن میں ہوتی رہتی تھیں۔ اور بہت سی لڑکیاں جوان ہونے سے پہلے بیوہ ہو جاتیں تھیں۔ اور چونکہ وہ دوبارہ شادی نہ کر سکتی تھیں۔ اس لئے یہ ایک ذلت تھی۔ اب عام طور پر لڑکیاں بالغہ ہونے سے پہلے نہیں بیاہی جاتیں۔ اور راجپوتوں میں شادی کی عام عمر لڑکیوں کی پندرہ سولہ اور لڑکوں کی اٹھارہ ہے۔ دائیوں کے متعلق تحقیق کرنے پر حسب معمول جواب ملا۔ ایک جوگن۔ ایک فقیرنی اور ایک وہ جولا محالہ ضرور ہوتی ہے یعنی بھنگن تسلیم کیا گیا کہ وہ اکثر گندے کپڑوں میں کام کرنے آتی ہیں۔ اور بالکل غیر تربیت یافتہ ہیں۔ اور ان کی خدمات کے دوران میں بچے لگا تار مرتے رہتے ہیں۔ وہ لڑکے کے لئے ایک روپیہ اور لڑکی کے لئے آٹھ آنے فیس لیتی ہیں۔ ۲۵۲ راجپوت ایک

انجمن اصلاح رسومات میں شامل ہو گئے ہیں۔ اور لڑکے کی شادی جس پر ۵۰۰ روپیہ خرچ ہوا کرتا ہے۔ اب ۷۰ روپے میں اور لڑکی کی شادی جس پر ۸۰۰ روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ ۳۰۰ روپے میں کی جا سکتی ہے۔ اُن مہمانوں کی جو دولہا کے ساتھ دلہن کے گھر تک جا سکتے ہیں۔ تعداد مقرر ہے۔ اور بَری لیجانے کا پرانا رواج بند کر دیا ہے۔ تمام تحائف ایک صندوقچے میں ڈال کر بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اور صندوقچہ سپرد کر دیا جاتا ہے۔ پس۔ لوگ اسمیں کم یا زیادہ جتنا چاہیں ڈال سکتے ہیں۔ زیورات پر ۱۵۰ سے لے کر ۳۰۰ روپیہ تک خرچ کیا جا سکتا ہے۔ انبالہ اور ہوشیارپور کے رواج کے خلاف یہاں زیورات بہت زیادہ پہنے جاتے ہیں۔

روپیہ قرض دینا:۔ میں نے مہاجنوں سے روپیہ چلانے کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ آج کل زمینداروں سے کچھ واپس لینا بڑا مشکل ہے۔ میں نے کہا تم ان کو قرض کیوں دیتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا۔ "وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں۔" اس موضوع کے متعلق طرفین بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ مہاجنوں نے بیان کیا اور بتایا کہ ہمارے حسابات صاف اور باقاعدہ ہیں۔ اور ہر وقت دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور یہ کہ ہمیں اپنے موکلوں کو ششماہی حساب دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ایک پرجوش دیہاتی نے کہا کہ یہ ہماری اداکردہ رقوم کو کاغذ کے پرزوں پر لکھتے ہیں۔ اور اپنی بہیوں میں جو چاہتے لکھ لیتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ ساہوکار کو اوسطاً ۵ برس میں سود کی شرح کیا پڑتی ہے۔ مہاجنوں کے نمائندے نے بتایا کہ ۱۵ فیصدی۔ میں نے کہا "تم اپنے آپ کو تمام تکالیف سے بچانے کے لئے اپنا روپیہ انجمن امداد باہمی میں کیوں نہیں جمع کرا دیتے۔ انبالہ کے ساہوکاروں کی طرح اس نے جواب دیا۔ کہ پیپلز بینک ناکامیاب ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہ ہمیں صرف اتنا وصول ہوتا ہے۔ جس پر ہم گذارہ کر سکتے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہمیں جس قدر روپیہ نقد وصول ہوتا ہے۔ اُتنا ہی غلے کی صورت میں ملتا ہے۔ اور اسمیں بے شمار مویشی بھی شامل ہوتے ہیں۔ فصلوں کے غیر یقینی اور لوگوں میں اخلاق کی کمی ہونے کی وجہ سے کرنال میں روپیہ چلانے کا کام مشکل ہے۔ وہ سست۔ گندے۔ فضول خرچ۔ مویشی چرانے کے بے حد عادی اور ملیریا میں مبتلا رہتے ہیں۔ بیماری اور لڑائی نے اُن کے اخلاق بہت پست کر دیئے ہیں۔ جب سے محمود غزنوی نے ۱۰۱۴ء میں تھانیسر کو لوٹا۔

حملہ آور یکے بعد دیگرے یہاں سے گذرتے رہے ہیں۔ اور اس لحاظ سے اس ضلع کو ہندوستان کا مجسم کہا جا سکتا ہے۔ لڑائیوں کی تباہ کاریاں ختم ہو چکی ہیں۔ لیکن بیماری کے حملے ابھی تک باقی ہیں۔ اور تمام قوت کا صفایا کر جاتے ہیں۔ وسطی پنجاب کے لوگوں کی بہادرانہ روح نہیں ہے۔ اور انجمن امدادباہمی کی نسبت ساہوکار کے زیادہ مزے ہیں۔ کاشتکار اپنے واہیات طریق کاشت و رہائش سے بہت کم بچا سکتا ہے۔ اور انجمن اتنا کم روپیہ لے نہیں سکتی۔ اور نہ ہی یہ امر ساہوکار کے لئے زیادہ آسان ہے۔ لیکن چونکہ وہ صرف اپنی ذات کے لئے کام کرتا ہے۔ اور اس کا گذارہ اس کی کامیابی پر منحصر ہے۔ اس لئے وہ انجمن کی کمیٹی کی نسبت زیادہ منضبوط اور مستقل مزاج ہے۔ جب گیہوں صاف کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ تو کھلیان میں ہی کاشتکار کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ اور اسے عدالت اور جیل کی دھمکی دیتا ہے چونکہ وہ زیادہ وصول کر سکتا ہے۔ اس لئے وہ انجمن کی نسبت زیادہ روپیہ چلا سکتا ہے۔ اور چونکہ کاہل اور فضول خرچ لوگ اُن ساہوکاروں کے پاس جاتے ہیں۔ جو زیادہ روپیہ چلا سکتے ہیں۔ وہ اکثر لوگوں کی عادت سے خوب واقف ہے۔ اور ایسی جگہ روزی کماتا ہے۔ جہاں ایک اچھی انجمن مشکل سے قائم رہ سکتی ہے۔ اگر کاشتکار کا اخلاق زیادہ اچھا ہوتا تو حالات بالکل مختلف ہوتے۔ کیونکہ اچھی آمدنی اور اخلاق کا اتحاد غیر ممکن التفریق ہے۔ اُن پہاڑی علاقوں کے لوگ جہاں تحریک امدادباہمی کام کرتی ہے۔ اور بہت سے گاؤں کے بینکوں کے ممبر (ایک سب انسپکٹر نے بتایا کہ ۵۰ فیصدی) نمایاں طور پر ساہوکار اور بینک کو نقصان پہنچانے کے لیے لین دین کرتے ہیں۔

اُن تمام باتوں میں سے ایک جس کے لئے روپیہ قرض دیتے وقت انجمن کو ہمیشہ ضرور پس و پیش کرنا چاہیئے۔ اور جس کے لئے ساہوکار بہت جلد روپیہ اُدھار دے دیتا ہے۔ مقدمہ بازی ہے پنجاب میں شراب نوشی کی نسبت یہ زیادہ بڑی لعنت ہے۔ ہر سال ۲۰۰۰۰۵ مقدمے دائر کئے جاتے ہیں۔ اور نصف سے زیادہ کی انفرادی مالیت ۰۰اروپیہ سے بھی کم ہوتی ہے۔ اور تقریباً ۷۰۰۰۰ مقدمے ۵۰ روپیہ کی مالیت سے بھی کم کے ہوتے ہیں۔ جس قدر روپیہ اور وقت اس طرح ضائع ہوتا ہے۔ صاف ظاہر ہے ناظرین کو وہ تین مقدمہ باز جو روہتک کے نزدیک ملے تھے۔ غالباً یاد ہوں گے جو اس سے کم نمایاں اور زیادہ سنجیدہ

خصومت ۔ کدورت اور دروغ حلفی کی وہ فضا ہے ۔ جو اُن لوگوں میں سے اکثر پر چھائی رہتی ہے ۔ جو اخلاق کو پست کرنے اور انصاف کو پس پشت ڈالنے کے لئے اکثر ضلع کی کچہریوں میں جاتے رہتے ہیں ۔ اپنے گاؤں میں اور اپنے لوگوں کے مابین دیہاتی کا سچ بولنا اتنا ہی ممکن ہے ۔ جتنا کہ اس کے برعکس عدالت میں یقینی طور پر جھوٹ بولنا اس لئے ہر معمولی مقدمے کے حالات آسانی سے معلوم کئے جا سکتے ہیں ۔ اور اگر قانونی پیچیدہ سوالات نہ کئے جائیں تو نہایت جلد اور یقینی طور پر انصاف کیا جا سکتا ہے ۔ انہی وجوہات کی بنا پر پنجاب میں ۰ ہ پنچایتوں کا اجرا کیا گیا ہے ۔ تاکہ وہ تمام جھگڑوں کا اسی جگہ فیصلہ کر دیں ۔

ان میں سے ایک رامبہ میں ہے ۔ اور عام طریقے کے مطابق اس طرح بنی ہوئی ہے کہ ہر ایک ممبر داخلے کے وقت ایک عہد نامے پر دستخط کرتا ہے ۔ کہ اگر وہ کسی ایسے جھگڑے کا جو کسی ممبر کے ساتھ یا کسی ایسے شخص کے ساتھ ہوا ہو ۔ جس کی مجموعہ قوانین میں تخصیص کر دی گئی ہو (ان کی تعداد مختلف انجمنوں میں مختلف ہے) انجمن کو فیصلہ نہ کرنے دے ۔ یا انصاف کی رو سے کسی شے کے دلائے جانے میں حائل ہو تو وہ ۱۰۰ روپیہ بطور جرمانہ دینے کے لئے تیار ہوگا ۔ اس سزا کے لئے ممبران کے اجلاس عام یا رجسٹرار کے پاس اپیل کیا جا سکتا ہے ۔ جب کوئی جھگڑا پیدا ہوتا ہے ۔ مدعی کمیٹی کے پاس درخواست بھیجتا ہے ۔ کمیٹی مقدمے کی سماعت کے لئے تاریخ مقرر کر دیتی ہے ۔ اور ساتھ ہی مدعا علیہ کو بھی حاضر ہونے کے لئے مطلع کر دیتی ہے ۔ مقررہ تاریخ کو کمیٹی اپنی سعی کوشش کرتی ہے ۔ کہ مقدمے کا فیصلہ دوستانہ طریق سے ہو جائے ۔ اگر اس میں کامیابی نہ ہو ۔ تو طرفین کو کہا جاتا ہے ۔ کہ وہ اپنا جھگڑا کسی ایک ثالث یا تین ممبروں کی مجلس کے سپرد کریں ۔ ان ممبروں میں سے ایک کو بطور صدر کام کرنے کے لئے کمیٹی خود نامزد کرتی ہے ۔ ثالث کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ بارہ ممبروں میں سے منتخب کرنے ہوتے ہیں ۔ جنکو انجمن کے عام اجلاس میں جسمیں کم از کم نصف ممبران حاضر ہوتے ہیں ۔ مقرر کیا جاتا ہے ۔ کسی مقررہ تاریخ کو وہ گواہ گذارتے ہیں ۔ اور وقت آنے پر فیصلہ سنا دیتے ہیں ۔ کمیٹی یا رجسٹرار کے پاس اپیل کرنا مدعا علیہ کی مرضی پر ہے اگر فیصلے پر عملدرآمد کرنے میں کوئی مشکل پیش آتی ہے ۔ تو کامیاب فریق اسے معتدقہ کرانے کے لئے مقامی عدالت میں درخواست دے سکتا ہے ۔ عدالت

فیصلہ کے مخالف دلائل پر غور کرے گی۔ لیکن شہادتیں نہیں لے گی۔ اگر مدعا علیہ کمیٹی یا ثالثوں کے طلب کرنے پر نہ آئے۔ تو مدعی کے پاس سوائے اس کے اور کوئی علاج نہیں کہ وہ حسب معمول عدالت میں چارہ جوئی کرے۔ لیکن مدعا علیہ ۱۰۰ روپیہ جرمانہ دینے کا سزاوار ٹھہراتا ہے۔ یہ جرمانہ انجمن کی دوسری واجبات کی طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کہ کسی فریق کی طرف سے کوئی وکیل نہ ہو۔ اور نہ ہی کوئی ثالث یا کمیٹی کا ممبر مقرر کیا جائے۔ لیکن کوئی شخص بیان کردہ قانونی سوالات کی بنا پر یا خاص حالات میں ایسے سوالات کی بنا پر جو حقیقت پر مبنی ہوں کمشنر مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اگرچہ قانون کے ابتدائی مراحل کسی طرح بھی بالکل نظر انداز نہیں کئے جاتے۔ لیکن دیہاتی کو پھر بھی بہت فائدہ ہے۔ کیونکہ گاؤں کی تمام بہترین قوتیں حرکت میں لائی جاتی ہیں۔ تاکہ اگر ہو سکے تو ہر پیدا شدہ جھگڑے کا دوستانہ اور یہ نہیں تو منصفانہ۔ مناسب اور کم خرچ فیصلہ کیا جا سکے۔ اور فریقین کو عدالتوں کی ناپاک فضا سے بچایا جا سکے۔

ان میں سے ایک انجمن رامبہ میں قائم ہے۔ اور خوب کام کر رہی ہے۔ جب اس کا اجرا کیا گیا۔ تو راجپوتوں نے مہاجنوں کو اس میں شامل ہونے کے لئے کہا۔ لیکن انہوں نے جواب دے دیا اور کہا "اس کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے"۔ بعد میں یہ دیکھ کر کہ جھگڑوں کے فیصلے ہو جاتے ہیں۔ اور عدالتوں میں جانے کی تمام تکلیف اور خرچ سے بچ جاتے ہیں۔ ان میں سے بھی سولہ اسمیں شامل ہو گئے۔ اگرچہ وہ گذشتہ جون میں اس میں شامل ہوئے۔ لیکن پھر بھی انجمن نے پندرہ ایسے جھگڑوں کا فیصلہ کیا ہے۔ جس میں اُن کا تعلق تھا۔ ان میں سے بارہ میں راجپوت مدعا علیہ تھے۔ اگرچہ وہ قرض کے متعلق تھے۔ لیکن پھر بھی انجمن نے بغیر ثالث مقرر کئے اُن کا فیصلہ کر دیا۔ ہر مقدمہ میں مہاجن نے اپنے دعوے کا ایک جز چھوڑ دیا ۔ قرض دینے کے متعلق موجودہ ظاہر کردہ احساسات کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ انجمن میں شامل ہوتے وقت مہاجنوں نے یہ عہد نہیں کیا۔ کہ انہیں ثالثوں کی جماعت یا کمیٹی کا نمائندہ بھی بنایا جائے۔ ان میں سے ایک نے آج کہا کہ اس کی اصلاح کرنی چاہئیے۔ لیکن یہ بھی مطالبے کے لہجے میں نہ تھا۔ اس کی یہ درخواست اس قدر منصفانہ تھی۔ کہ فوراً منظور کر لی گئی۔

اس سے پہلے کہ ہم گاؤں چھوڑیں تین معمولی باتوں کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ گاؤں کی آبادی ۲۰۰۰ نفوس پر مشتمل ہے۔لیکن کوئی سبزی نہیں کاشت کرتا۔ مرغیاں صرف بھنگی پالتے ہیں۔ اور گھر پر چار پائیوں کے لئے سن کی رسی بنانے کے علاوہ کچھ کام نہیں کرتے۔

۲۹ردسمبر۔ رامبہ سے کرنال

مقامی امداد باہمی :۔ مقامی امداد باہمی کی ایک صورت جو اس ضلع میں بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہے۔ کاشتکاری کا وہ طریق ہے۔ جسے لانا کہتے ہیں۔کسی مقررہ رقبے کو ایک سال کاشت کرنے کے لئے دو یا تین اور بعض اوقات دس کاشتکار تک آپس میں مل جاتے ہیں۔ ہر فصل کے موقع پر پیداوار کو ہر حصہ دار کے بیلوں اور اس کی اپنی محنت کے تناسب سے تقسیم کر لیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ حصہ داریاں صرف ایک سال کیلئے کی جاتی ہیں۔ لیکن اکثر انہیں سال بہ سال تازہ کر لیا جاتا ہے۔ مقامی امداد باہمی کی بہت سی صورتیں جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس ضلع میں بھی عام ہیں۔ پانی پینے کے کنوئیں مشترکہ طور پر مرمت کرائے جاتے ہیں۔ فصلوں کو بندروں۔ سوروں اور آوارہ مویشیوں سے بچانے کیلئے محافظ رکھے جاتے ہیں۔ فصل بوتے اور کاٹتے وقت رشتہ دار اور پڑوسی رسم آبت پر جسے یہاں منگ کہتے ہیں۔ عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ براتوں کے لئے ایک دو دریاں بھی رکھی جاتی ہیں۔ بعض اوقات رکابیاں بھی لیکن ہمیشہ نہیں رکھی جاتیں۔ کیونکہ اس گاؤں میں جسے تین دن ہوئے ہم نے دیکھا تھا۔ رکابیوں کی بجائے ڈھاک کے پتے استعمال کئے گئے تھے۔ گرداسپور سے ۷۰ میل چل کر میں مغرب کے وقت کرنال میں داخل ہُوا۔ میری گھوڑی مجھے میری توقعات سے زیادہ لئے پھر رہی ہے۔ جرنیلی سڑک پر آکر ہم اس کے نرم کنارے پر نہایت تیزی سے چلے۔ آج باہر نکلے ہوئے مجھے ستائیسواں دن ہے۔ میں نے چار دن قیام کیا ہے۔ اور پانچ جگہوں پر ریلوے لائن کے قریب آیا ہُوں۔ جن میں سے تین جگہ ریلوے جنکشن تھے۔

(۸ میل) ۔۔۔۔۔

۳۰ر دسمبر۔ کرنال

چھوت چھات:۔ ناشتہ کرنے کے بعد ہم ہندو جاٹوں کا ایک بینک دیکھنے کے لئے سوار ہو کر چل دیئے۔ ہم نے گاؤں کے چوپال کے سامنے نیم کے ایک درخت کے نیچے اس کا معائنہ کیا۔ چوپال خوش وضع نمونے کی ایک پختہ عمارت تھی لیکن بڑی گندی تھی۔ پیپل کا درخت دیکھکر میں نے پوچھا کیا اُسے اب بھی پوجا جاتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا بوڑھے لوگ کبھی کبھی اس پر پانی ڈال دیتے ہیں۔ لیکن جونہی یہ بات کہی گئی۔ ہر ایک شخص مذاق کے طور پر اس طرح ہنسا گویا وہ پرانے زمانے کے منبط پر ہنس رہا تھا۔ چماروں میں بھی تبدیلی آ گئی ہے۔ ان میں سے سات بینک کے ممبر ہیں۔ اور حسب معمول کسی نہ کسی کے پیچھے کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب انہیں نیچ نہیں خیال کیا جاتا۔ کیونکہ گذشتہ ایک یا دو سال سے انہوں نے مردہ جانوروں کا گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے۔ کسی وقت اُن سے چھو جانے پر اب نہ کوئی اپنے اوپر پانی چھڑکتا ہے۔ اور نہ کپڑے دھوتا ہے۔ اور نہ ہی دیہاتی سکول میں ان کے بچوں کو علیحدہ بٹھایا جاتا ہے۔ ایک بلند ہمت جاٹ نے کہا کہ ہم کئی دن کے بعد نہاتے ہیں۔ اور یہ ہر روز نہاتے ہیں۔ ان کا اپنا مندر کوئی نہیں ہے۔ لیکن ایک کھتری سادھو جو چند میل کے فاصلے پر رہتا ہے۔ ان کی مذہبی خدمات بجالاتا ہے۔

مذہبی تعلیم:۔ ایسے گاؤں میں جہاں تقریباً ۰۰ا گھر ہیں۔ حقیقی طور پر کسی قسم کی مذہبی تعلیم نہیں ہے۔ یہاں تین مندر ہیں۔ لیکن کوئی پروہت گاؤں میں نہیں رہتا کیونکہ وہ گذارہ کرنے کے لئے کافی روپیہ نہیں کما سکتا۔ دیہاتی اپنی روحانی خدمات کے لئے دورہ کرنے والے پجاریوں پر منحصر رہتے ہیں۔ تاہم چار پروہت مقامی طور پر رہنے والے بھی ہیں۔ جن میں سے ایک کاشتکاری کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی کچھ حکمت بھی کرتا ہے۔ ہر شادی یا غمی پر جو پروہت رسومات بجالاتا ہے۔ وہ پانچ سے لے کر دس روپیہ تک لیتا ہے۔ اور ہر ایک فصل کے موقع پر اُن تمام کنبوں سے جن کی وہ خدمت کرتا ہے۔ ہر ایک سے پیداوار کے ایک من میں سے نصف لیتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی پنڈت اتفاقیہ طور پر گاؤں میں آ نکلتا ہے۔ اور بھگوت گیتا اور رامائن پڑھ کر سناتا ہے۔ لیکن اب تین سال سے کوئی نہیں آیا

ہے۔ لڑکیوں کو مذہبی تعلیم بالکل نہیں دیجاتی۔

ڈاکٹر اور دائیاں:۔ گاؤں کا فائدہ اس میں ہے۔ کہ یہ کرنال جیسے شہر کے جہاں کی آبادی ۲۳۰۰۰ ہے۔ اُن اثرات پر روشنی ڈالتا ہے۔ جو یہ اپنے گردو نواح میں پھیلاتا ہے۔ پس لوگ آزادانہ کرنال کے ہسپتال میں جاتے ہیں۔ جہاں ایک اچھا ڈاکٹر ہے۔ اور اُسے حکیم پر اس لئے ترجیح دیتے ہیں۔ کہ حکیم اُن سے قیمت وصول کرتا ہے۔ پہلے پہل وہ جادو پر اعتقاد رکھتے تھے۔ اور جب کسی کو بخار ہوتا تھا۔ تو وہ اس خیال سے کہ ان کے آبا و اجداد نے بھوکے ہونے کی وجہ سے بخار بھیجا ہے۔ بیس ہانڈیاں غلّے سے بھر دیتے تھے۔ اب یہ گئی گذری باتیں ہیں۔ لیکن غیر تربیت یافتہ دائیوں کے رکھنے کا پرانا ظالمانہ رواج ابھی تک باقی ہے۔ گاؤں میں دو دائیاں ہیں۔ ایک تیلی کی بیوی ہے۔ اور دوسری بھنگی کی۔ میں نے دریافت کیا۔ کیا وہ کچھ اچھی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ فقط اتنا جانتی ہیں۔ کہ بچّے کو گردن سے پکڑ لیتی ہیں۔ صرف اس کام کیلئے وہ لڑکی کیلئے ایک روپیہ اور لڑکے کیلئے کچھ زیادہ لیتی ہیں۔ ممکن ہے غلّے کا پیشکش بھی ساتھ ہوتا ہو۔

ٹوکریاں بنانا:۔ گھریلو صنعتوں کے متعلق ذکر کرتے ہوئے میں نے دریافت کیا۔ "کیا کوئی ٹوکریاں بناتا ہے"؟ انہوں نے ایک کاشتکار کی طرف اشارہ کیا جو انہیں میں سر سے پاؤں تک کھدر کی چادر اوڑھے بیٹھا تھا۔ وہ شرمیلے انداز سے مسکرایا گویا اس پر کوئی بچوں کی سی بیوقوفی کا جرم عائد کر دیا گیا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ہُنر اس نے پوربیوں سے سیکھا تھا۔ جو تمام گاؤں کے باقی ماندہ لوگوں کو ٹوکریاں مہیا کرتے تھے۔ میں دوسروں کی طرف مخاطب ہوا اور کہا کہ تم اپنے پڑوسی سے کیوں نہیں سیکھتے۔ اور وہ روپیہ نہیں بچاتے جو تم پوربیوں کو دیتے ہو؟ انہوں نے تسلیم کیا کہ ہم میں سے اکثر تین یا چار روپے سالانہ خرچ کرتے ہیں۔ اور ایک روپیہ سے کم کوئی نہیں خرچ کرتا۔ اب شرمانے کی باری اُن کی تھی۔ انہوں نے یہ بہانہ کیا کہ وہ سکھانے کیلئے ایک روپیہ مانگتا ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے کوئی حیرانی نہ ہوئی کہ اس شخص پر کسی کا قرض نہ تھا۔ اور گاؤں کے بینک میں بھی اس نے ۴۴ روپے دینے تھے۔ ہندوستان اور نیز دوسری جگہوں میں انسان کفایت شعاری سے ہی قرض ادا کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔

بعد از دوپہر میں پٹول فارم گوڑگاؤں کیلئے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ہم ساڑھے چار بجے وہاں پہونچے ڈاک بنگلے تک صاف فضا اور ٹھنڈی چاندنی میں دو میل پیدل چلے۔

باب پنجم۔ گوڑگاؤں

اصلاح دیہات۔ (آدمی عورتیں اور مویشی)

۳۱ دسمبر۔ پلول۔

اب ہم ضلع گوڑگاؤں میں ہیں۔ جو دہلی اور متھرا کے نصف میں واقع ہے۔ اور اُس جگہ کے قریب ہے۔ جہاں سری کرشن جی گوپیوں سے کھیلا کرتے تھے۔ یہ کہانی لوگوں کو یاد ہے۔ اور حفظ کی ہوئی ہے۔ اور شاید یہ کوئی اتفاقیہ واقع نہیں ہے۔ کہ جس کا منظر ایک ایسے علاقے سے لیا گیا ہو۔ جہاں لوگ اب بھی روپیہ کمانے اور کام کرنے کی نسبت کھیل کود اور راگ کے بہت مشتاق ہیں۔ راگ۔ رنگ اور بھنگ اُن کے تعیش کے سامان ہیں۔ زندگی کے دیگر مشاغل کی نسبت وہ تفریح کی طرف بہت جلد متوجہ ہوتے ہیں۔ انہیں آمدنی کی کچھ خبر نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ پرواہ کرتے ہیں۔ اگر کرنال کے لوگ وسطی پنجاب کی نسبت کم کفایت شعار ہیں۔ تو گوڑگاؤں کے لوگ سوائے ابیر کے باقی تمام کرنال والوں سے زیادہ فضول خرچ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ تمام صوبے کے سب سے زیادہ میلے۔ گندے اور مریض لوگوں میں سے ہیں۔ اور پرلے درجے کے غریب ہیں۔ دس بارہ سال ہوئے ان میں امداد باہمی کی روح پھونکی گئی تھی۔ جس نے ان کے دلوں میں زیادہ اچھے کاموں کی امنگیں پیدا کر دیں۔ اگرچہ دیہاتی بینک سینکڑوں کی تعداد میں کھولے گئے ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر چیونٹی کی چال بڑھے اس لئے کہ وہ ترقی کرنے کے ارادہ کی بجائے سود پر روپیہ حاصل کرنے کی خواہش سے معرضِ وجود میں آئے تھے۔ اچھے چلن کے بغیر معقول آمدنی ناممکن ہے۔ اور یہاں اچھے چلن کی بہت کمی ہے۔ اگر تعلیم اور عمل سے اسے احتیاط سے بنایا جاتا اور ترقی اس لازمی سست عمل کو پیچھے نہ چھوڑ دیتی۔ تو اس وقت تک کچھ نہ کچھ ٹھوس فائدہ ضرور حاصل ہو جاتا۔ موجودہ حالات میں اُن کی بنیادیں دوبارہ رکھنی پڑی ہیں۔ ۹۰۰ انجمنوں کی بالائی تعمیر کے ساتھ جن میں سے اکثر نے اس رقم

سے زیادہ قرضہ لیا ہے۔ جتنا کہ انہیں لینا چاہیئے۔ یہ کام مشکل ہے۔
اُن لوگوں کے لئے جو ایسی جگہوں میں زبردستی قدم آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ جہاں صرف مادی ترقی کی بجائے کسی اور چیز کی زیادہ ضرورت ہے۔ یہ واقعہ سراسر نصیحت ہے۔ نیز اس سے کسی قدر یہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ کہ تجربہ گوڑگاؤں سے کیا مراد ہے۔ جس نے نہ صرف تمام ہندوستان بلکہ بیرونجات کی توجہ بھی اپنی جانب کھینچ لی ہے۔

گوڑگاؤں کا تجربہ:- ۱۹۲۰ء کے اختتام پر مسٹر ایف۔ ایل۔ برین ایم بی آئی۔ سی۔ ایس۔ اس ضلع میں ڈپٹی کمشنر بن کر آئے۔ اور ان کی عورتوں کی مایوس کن حالت۔ گھروں اور گاؤں کی غلاظت۔ بہت سی فضول خرچ رسموں کاشتکاری کے نہایت پرانے طریقوں اور بیماری و عزبت کی وجہ سے لوگوں کی درماندہ حالت کو دیکھ کر اس قدر اثر پذیر ہوئے کہ انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ان برائیوں کو دور کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کام وسیع پیمانہ پر کرنا چاہئیے۔ اس کا نتیجہ ہُوا کہ ایک باقاعدہ لائحہ عمل تیار ہُوا۔ جو تمام ضلعے اور اس کے ۰۰۰۰۰۰۰ (ستر لاکھ) باشندوں پر حاوی تھا۔ اس لائحہ عمل کا نام تجربہ گوڑگاؤں رکھا گیا۔ اس تجربہ کے اعزاض بہ الفاظ مسٹر برین یہ تھے۔ کہ دیہاتی کو قعرِ مذلت سے باہر نکالا جائے۔ اُسے یقین دلایا جائے۔ کہ ترقی کرنا ممکنات سے ہے۔ اور اس امر کی تشریح کر کے کہ آب و ہوا۔ بیماری اور جراثیم کا نہایت کامیابی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے تقدیر پر شاکر رہنے کے عقیدے کا خاتمہ کیا جائے۔ مزید برآں یہ کہ اس کی مسرفانہ اور مضر صحت رسومات کا تمسخر اڑا کر اُسے اُن سے باز رکھا جائے۔ اور اُسے زندگی گذارنے اور کاشتکاری کرنے کے بہتر طریقے سکھائے جائیں۔ زیادہ جامع الفاظ میں اس کے فوائد یہ تھے۔ کہ پہلے زمین کی پیداوار کو ترقی دی جائے۔ کیونکہ جب لوگوں کے پیٹ خالی ہوں یا پاؤں ٹھنڈے ہوں۔ تو اُن کی جانیں نہیں بچائی جا سکتیں۔ دوسرے یہ کہ فضول خرچی بند کی جائے۔ کیونکہ دیہاتی کی پیداوار میں اضافہ کرنے کا نتیجہ اگر محض یہ ہو کہ چاندی کے کڑوں کی بجائے سونے کے کڑے اور ضلع کی عدالت کی بجائے۔ عدالت عالیہ اور میلوں اور براتوں میں پہنچانے کیلئے بیل گاڑیوں کی بجائے موٹریں بدل لی جائیں۔ تو یہ فضول ہے تیسرے یہ کہ اس کی صحت اچھی ہو۔ اور بعد ازاں یہ کہ اس کی زندگی کا معیار بلند کیا جائے

ذرائع کے متعلق یہ الفاظ مسٹر برین یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ کاشتکاری کو ترقی دینا
آسان ہے۔ یہ بہتر بیج۔ بہتر آلات اور زیادہ کھاد سے ہو سکتی ہے۔ یہ تمام چیزیں پہلے
کام میں لائی جا چکی ہیں۔ اور دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ان کے لئے صرف اس امر کی ضرورت
ہے۔ کہ لوگوں کی بڑی تعداد کو اُن سے آشنا کر دیا جائے۔ اسراف میں کمی کرنا بھی
ایسا ہی آسان ہے۔ یہ بہتر آمدنی یعنی انجمن امداد باہمی سے قرض لینے۔ مقدمہ بازی کی
نسبت ثالثی فیصلوں کو ترجیح دینے۔ معاشرتی رسومات کے اخراجات پر حد بندی
کرنے۔ مردوں اور بچوں کی زینت موقوف کرنے اور عورتوں کے زیورات کی تعداد
میں معقول کمی کرنے سے عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ خوش قسمتی سے دیہاتیوں کی
صحت اچھی کاشتکاری کے ساتھ وابستہ ہے۔ جو چیز اب دیہات کی آب و ہوا
کو زہر آلود بناتی ہے۔ اگر اُسے کھیتوں میں استعمال کرنے کے لئے جمع کیا جائے۔ تو
عمدہ فصلیں پیدا ہونگی۔ ہر ایک کسان لازمی طور پر چھ فٹ گہرا گڑھا کھودے۔ اور اس
میں ہر وہ چیز جو فصل کو فائدہ دیتی ہے۔ جمع کرے۔

زندگی کا معیار بلند کرنے کی کنجی عورت ہے۔ کیونکہ وہی بچوں کی پرورش کرتی ہے۔
اور وہ ہی گھر چلاتی ہے۔ اس لئے چھوٹی لڑکیوں کو پہلے پہل اپنے بھائیوں کے
ساتھ مدرسے بھیجا جائے۔ جس کی دیہاتی عورت کو ضرورت ہے۔ تاکہ وہ اپنے کنبے
کو صحت مند۔ خوش و خرم اور آسودہ حال رکھ سکے۔ اور وہ مرتبہ و ناموس پھر حاصل
کرلے۔ جو اس کی جہالت نے کسی قدر ضبط کر لیا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے
لئے گوڑگاؤں میں دیہاتی عورتوں کو تربیت دینے کیلئے ایک سکول کھولا گیا تھا۔ تاکہ
ممکن ہے۔ وہ چھوٹی لڑکیوں کو سکولوں میں اور بڑی لڑکیوں کو گھروں پر تعلیم دینے
کی طرف واپس آجائیں۔ اصلاحی کام کی اس شاخ میں مسٹر برین نے روح رواں
کا کام کیا ہے۔

اصلاح دیہات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہونے کیلئے اس کے مقاصد و
ذرائع اس طرح وضع کئے گئے تھے۔ لیکن ایسے لوگوں میں جو سراسر اَن پڑھ تھے۔ اور
اتنے بڑے علاقے میں جتنا کہ یہ ضلع اسے عملی جامہ پہنانے کی کیا تدبیر ہو سکتی تھی۔
اور ڈپٹی کمشنری کے مختصر قیام میں اسے کس طرح کیا جا سکتا تھا۔ (اگرچہ ان حالات
میں یہ مدت دوگنی کر دی گئی تھی۔ لیکن پھر بھی سات سال سے زیادہ نہ تھی) بہ الفاظ
مسٹر برین یہ طریقہ عمل میں لایا جاسکے۔ کہ تمام ضلع کو میدانِ عمل بنایا جائے۔ اور تمام

علاقے میں ہر قسم کے چرچے اور تشہیر کا جسے ہم اختیار کر سکیں اور استطاعت رکھتے ہوں۔ طوفان برپا کر دیا جائے۔ جادو کی لالٹین ہماری بڑی معاون ہو گی۔ اس کے بعد گوتوں کی دورہ کرنے والی جماعتیں اور خوش الحان راگی پکڑ لئے جائیں۔ اور انہیں ہمارا راگ گانے کے لئے روپیہ کا لالچ دیا جائے۔ ان پر بہت کم خرچ آتا ہے۔ اور سینکڑوں دیہاتی گھنٹوں دوزانو بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ گا گا کر انہیں یہ بتاتے رہیں کہ بچے کو کس طرح نہلایا جائے یا کس قسم کی گیہوں بوئی جائے۔ انجام کار ہم دیواروں پر کارٹون اور بڑے بڑے اشتہارات چسپاں کر دیں۔ نقلیں۔ اشتہارات اور مختلف پرچہ جات تقسیم کریں اور مقابلہ جات و تشریحات و تماشہ جات کا انتظام کریں مضامین اور نقلوں کے لئے انعامات دیئے جائیں۔ مجملاً یہ کہ وہ طریقہ تبلیغ۔ تبلیغ اور سراسر تبلیغ تھا۔ اگرچہ مسٹر برین یہ کہتے ہیں۔ کہ تبلیغ سے کوہسار کو بھی جنبش میں لا سکتے ہیں۔ لیکن انہوں نے یہ صرف اسی بھروسہ پر نہیں کیا۔ بلکہ بحیثیت ڈپٹی کمشنر اپنے تحکم سے اسے پورا پورا سہارا دیا۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ میں نے دیہاتی رہنماؤں کے ساتھ ہمیشہ دست بدست ہو کر کام کیا۔ لیکن جب میں کسی نئے کام میں ایک بار انہیں ساتھ لے لیتا تھا۔ تو میں اُسے قبول کرانے اور دیہات میں رواج دینے کے لئے اپنے تمام افسرانہ اختیارات استعمال کرنے میں نہیں جھجکتا تھا۔ ہم دانستہ پرزور طریق سے اقدام کرتے تھے۔ ضلع سے باہر اور اندر ہمیں بتایا گیا تھا۔ کہ گاؤں کی غلاظت لاعلاج ہے۔ اور اگر اس کے انسداد کا کوئی طریقہ ہو بھی تو اس کا استعمال کرنا ناممکن ہے۔ ہمیں یہ کبھی معلوم نہیں ہوا کہ وہ وقت کتنا طویل یا کتنا کم ہو گا۔ تاہم جتنا وقت ہماری مرضی پر چھوڑا ہوا تھا۔ اسی میں ہم نے دونوں بیانات کو غلط ثابت کرنا تھا۔ اور ضلع و بیرونی دنیا کی دلچسپی کے لئے کام کو تکمیل تک پہنچا کر رائے زنی کیلئے چھوڑ دینا تھا۔

یہ ہے تجربۂ گوڑگاؤں کا مختصر ذکر۔ اب پہلا سوال یہ ہے۔ کہ یہ کہاں تک ایک نیا تجربہ تھا۔ ایک بات میں تو یہ بالکل انوکھی تھی۔ اس سے پہلے ہندوستان کے کسی حصّے میں دیہات کی ترقی کے لئے اس قدر زیادہ اور اس قدر بڑے رقبے کے لئے تبلیغ کا طریقہ استعمال میں نہیں لایا گیا تھا۔ اور نہ ہی کبھی اس سے پہلے اسے ڈپٹی کمشنرانہ تحکم کے ساتھ وابستہ کیا گیا تھا۔ جس سے بڑھ کر دیہاتی کی نظر میں کوئی حکومت نہیں ہے۔ بعض ذرائع بھی یا تو نئے تھے۔ یا ان میں اس قدر جان ڈال دی گئی تھی۔ کہ کم از کم کچھ عرصے کے لئے انہوں نے نئی صورت اختیار کر لی۔ مثلاً کھاد کا گڑھا۔ بیسیوں گاؤں

کی باقاعدہ صفائی۔ چھپرے کی بجائے بہت سے کوئیں پر رہٹ تبدیل کرانا۔ اور مقامی مویشیوں کی نسل کو ترقی دینے کے لئے ڈسٹرکٹ بورڈ کا حصار گورنمنٹ مویشی خانہ سے ۱۰۰ (چھ سو) بیل خریدنا اور ایک خاص عملے کو لڑکیوں کی تعلیم کے لئے تربیت دینا۔ اور لوگوں کی ایک ایسی جماعت کا وجود میں لانا جو دیہاتی رہنما کہلائیں۔ اور دیہات میں تبلیغ کا کام کریں۔ اور دیہاتی حالات کو بہتر بنانے والے محکمہ جات گورنمنٹ اور دیہات کے درمیان کڑی کا کام دیں۔ اس کے مقاصد میں کوئی نئی بات نہ تھی محکمہ جات زراعت بیماری۔ تعلیم۔ امداد باہمی و حفظانِ صحت سب کوشش کرتے رہے ہیں۔ (اور اکثر تو کئی سال تک) تاکہ وہ ان امور کو اپنی اپنی جگہ عملی جامہ پہنائیں لیکن اگر مقاصد پرانے تھے۔ تو مسٹر برین اور اُن کی رفیقۂ حیات نے انہیں نئی نظر سے دیکھا اور اس طرح پیدا شدہ قوت و سرگرمی سے اس مسئلے پر متفقہ حملہ کرنے کیلئے اطراف کے تمام لوگوں میں نئی بجلی کی لہر دوڑا دی۔

دوسرا سوال یہ ہے۔ کہ کیا یہ تجربہ کامیاب رہا۔ اس سوال کا جواب دینا ذرا مشکل ہے۔ اور نہ ہی ابھی تک اس کے جواب دینے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ اس دورے سے اختیار کردہ طریق کے مطابق اس کے متعلق دیہاتی سے ہی اسکی رائے لی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے اسی ہفتہ کیا جائے۔

اس وقت اس دورے میں متذکرہ تجربہ سے تعلق رکھنے والوں نے جو کچھ مجھے یہاں اور اور کہیں بتایا ہے۔ اس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:۔

کھاد کا گڑھا:۔ کھاد کا گڑھا نہایت کامیاب ایجاد ہے۔ گوڑگاؤں میں بہت سے دوسرے اضلاع کی طرح کھاد کو گاؤں کے اندر اور چاروں طرف ڈھیر لگانے کا رواج چلا آیا ہے۔ یہاں یہ دھوپ ہوا اور بارش کے تلف کن اثرات برداشت کرنے کے لئے کھلا پڑا رہتا تھا۔ نیز کوڑا اور غلاظت گلیوں میں بکھری پڑی رہتی تھی۔ اور اُسے دور کرنے یا اُسے کھاد میں ہی تبدیل کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جاتی تھی۔ اس کی بربادی کا نتیجہ عیاں تھا۔ اور ایک ایسے ملک میں جہاں لوگ کھاد کے بھوکے ہوں اور بھی قابلِ افسوس تھا۔ اور نہ ہی اس صحت سے یا شائستگی کو کوئی تقویت بہم پہنچتی تھی۔ اس لئے تمام کوڑے اور غلاظت کو جمع کرنے کے لئے کھاد کے گڑھے کو رواج دیا گیا۔ تاکہ جو کھاد ہر روز اکٹھا کیا جائے۔ اسے ان میں پھینکا جائے۔ مقررہ معیار یہ تھا۔ کہ ہر ایک کنبے کے لئے دو گڑھے ہوں۔ تاکہ ایک

میں کھاد استعمال کے لئے تیار ہو اور دوسرے میں تازہ کوڑا ڈالا جا سکے۔ اور اس کے ایک سرے پر دیہاتی پاخانے بنے ہوئے ہوں۔ تمام ضلع میں بیشمار گڑھے گردے گئے ہیں۔ اگرچہ ان کے فوائد صریح ہیں۔ لیکن تمام اس امر پر متفق ہیں۔ کہ وہ بغیر افسرانہ حکم کے کبھی نہ کھودے جاتے۔ ایک افسر نے جو اس ضلع میں کچھ عرصے تک رہا تھا۔ یہ کہا کہ یہ تمام سدھار جیسا کہ کسی نے ایک بار بھی خوشی سے اس تجربہ کو نہیں کیا۔ کسی ہمدردانہ جذبے کے ماتحت عمل میں نہیں لایا گیا۔ بلکہ حکم اور ڈر کی وجہ سے اور اگر یہ بات لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دی جاتی۔ کہ جو چاہیں وہ اپنے لئے پسند کریں۔ تو وہ اُن میں سے کوئی بات بھی اختیار نہ کرتے۔ لیکن وہ اتنے فرمانبردار تھے۔ کہ ایسی بات نہ کہتے تھے۔ ایک دوسرا نقاد جس کا بیان کسی طرح بھی خصومت پر مبنی نہیں ہے۔ یہ کہتا ہے۔ کہ ایک مرتبہ جبکہ ایک افسرِ مال گڑھے کھودنے کا حکم دے رہا تھا۔ میں بھی موجود تھا۔ افسرِ مال مقررہ پیمائش کے مطابق یہ بتا رہا تھا۔ کہ گڑھا اتنے فٹ لمبا اتنے فٹ چوڑا اور اتنے فٹ گہرا ہونا چاہیئے۔ گڑھوں کیلئے دیہاتی بہت جلد تیار ہو گئے۔ لیکن اُن کی آلائش دور کرنے میں آسانی پیدا کرنے کے خیال سے انہوں نے التجا کی کہ ہمیں گڑھوں کو ڈھلوان بنانے کی اجازت دی جائے۔ افسر نے کہا " یہ ناممکن ہے۔ حکم یہ ہے۔ کہ گڑھوں کا اتنے حجم کا ہونا لازمی ہے۔ اس واقعہ سے حیرانی نہ ہوگی۔ کیونکہ ایسا کون ہے۔ جس نے اپنے بے حد سرگرم ماتحتوں کے ہاتھ تکلیف نہ اُٹھائی ہو۔ اسی نقاد نے یہ تسلیم کیا کہ لوگوں کو انتہائی تبلیغ سے دبا کر انہیں جگایا گیا ہے۔ اور ان میں سے اکثر نے اس بات کو محسوس کر لیا ہے۔ کہ جو کچھ کیا گیا ہے۔ اُن کے فائدے کے لئے ہے۔ لیکن وہ اتنے سست ہیں کہ اپنی مدد آپ نہیں کر سکتے۔ بہت کم لوگ گڑھوں کو کوڑا جمع کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اور پاخانے کے طور پر تو کوئی بھی استعمال نہیں کرتا۔ یہی حال ریواڑی میں ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ دوسری جگہوں میں بھی یہی حال ہوگا۔ کہیں کہیں چند گاؤں مثلاً پلول کے پانچ یا چھ گاؤں اور بلب گڑھ کے دس یا بارہ گاؤں کچھ نہ کچھ صاف رکھے جاتے ہیں۔ لیکن اکثر اس وقت صاف کئے جاتے ہیں۔ جب کسی افسر کے دورے پر آنے کی امید ہو۔ یہ بات بھی ہر اُس شخص کو جو ہندوستان کی دیہاتی زندگی سے واقف ہے۔ حیران نہیں کرے گی۔ یہ خیال کیا گیا کہ اگر دیہاتیوں کو اپنا تمام کوڑا کرکٹ خود اُٹھانے کیلئے مجبور نہ کیا جاتا۔ بلکہ گاؤں کے بھنگیوں کو اُن کی فصلی

واجبات بڑھاکر یا روزانہ روٹی مقرر کرکے اس کی طرف رغبت دلانے کی کوشش کی جاتی تو شاید اس سے کچھ زیادہ فائدہ حاصل ہو جاتا۔ لیکن مسٹر برین نے اس خیال سے کہ گاؤں کی بہبودی کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ لوگ نہایت ہیچ لوگوں سے قطع تعلق کرنا سیکھیں۔ ان کے پروگرام کا یہ ایک جزو بنا دیا کہ ہر کنبہ اپنی صفائی خود کرے

رہٹ :۔ کاشتکاری کے لئے ماسوا اُن کھاد کے گڑھوں کے جن کا تعلق صحت اور کاشتکاری دونو سے ہے۔ زیادہ تر کوشش چرس کو رہٹ سے اور دیسی لکڑی کے ہل کو۔ گوڑ گاؤں کے لوہے کے ہل سے اور حصاری نسل کے بیلوں کو مقامی دیسی بیلوں سے بدلنے میں صرف کی گئی ہے۔ رہٹ کے متعلق آرا میں اختلاف ہے۔ کم گہرے کنوؤں والے علاقے میں جہاں پانی کی سطح زمین سے بیس یا پچیس فٹ کے فاصلے پر ہے۔ یہ طریقہ مقبول ہے۔ کیونکہ بمقابلہ چار آدمیوں اور دو بیلوں کی جوڑیوں کے جو چرس کیلئے درکار ہوتی ہیں۔ ایک آدمی اور ایک لڑکا بیلوں کی ایک جوڑی کے ساتھ اس سے کام لے سکتے ہیں۔ لیکن بہت زیادہ گہرے کنوؤں کے لئے اسے پسند نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ کاشتکار یہ کہتے ہیں۔ کہ واسی سے کر ۱۰۰ گھومتی ہوئی ٹینڈوں کا بوجھ اس ضلع کے کمزور بیلوں کے لئے اتنا زیادہ ہے۔ کہ وہ اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس کی مرمت کرانی بھی مشکل ہے۔ کیونکہ اس کی صنعت کو کوئی نہیں سمجھتا۔ اس تکلیف کو دور کرنے کے لئے ایک اور ضلع سے دو لوہار یہاں بھیجے گئے ہیں۔ اس وقت بہت سے رہٹ بیکار پڑے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس جگہ کے قریب ہی ایک گاؤں میں سات رہٹوں میں سے تین پھر چرسے سے بدل لئے گئے ہیں۔ اس کے برعکس جمنا کے دریائی علاقے میں جہاں پانی مقابلتاً سطح زمین کے زیادہ نزدیک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کی قدر کی گئی ہے۔ دوسرے علاقوں میں جہاں رہٹ بالکل نہیں ہیں۔ انہیں ایسے پرانے کنوؤں میں لگایا جا رہا ہے۔ جو غیر مستعمل ہو گئے تھے۔ اور یہ عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ کہ جہاں اسے فائدہ مند طریق سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسے چرس پر ترجیح دی جاتی ہے۔

ہل اور بیل :۔ تمام لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ گوڑ گاؤں کا ہل مقبول نہیں ہے۔ اس کی قیمت ۲۵ روپے ہے۔ سینکڑوں خریدے گئے ہیں۔ اور بیسیوں بیکار

پڑے ہیں۔ تحصیل پلول میں ۴۰۰ میں سے صرف ۱۰۰ استعمال کئے جا رہے ہیں۔ اور ریواڑی میں جہاں ۲۰۰ سے زیادہ خریدے گئے تھے۔ تناسب اس سے بھی کم بتایا جاتا ہے۔ اور بہت سی موجودہ اشیا کی طرح جو بظاہر مفید ہیں یہ بھی مقامی حالات کیلئے موزوں نہیں ہے۔ اکثر لوگوں کے لئے یہ بہت قیمتی ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ اس سے آسانی سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ بعض اس کے لوہے کی شکایت کرتے ہیں۔ بھاری ہل کے متعلق بھی رائیں مختلف ہیں۔ اس کے لئے سب سے زیادہ روپیہ صرف کیا گیا ہے۔ کیونکہ ڈسٹرکٹ بورڈ نے ۱۹۴۲ میں ۲۵۰ روپے فی کے حساب سے خریدے۔ اور چونکہ گورنمنٹ نے اُن کو بہت گر کر ۵۰ روپے میں فروخت کر دیا ہے۔ ان کی خرید سے دو لاکھ (۵۰۰۰ پونڈ) خرچ آ گیا ہے۔ افسروں میں سے ایک نے بتایا کہ ہم نے بہت سی شکایتیں سنی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ کام کرنے میں بہت سست ہیں۔ اور گایوں کے لئے اتنے بڑے اور بھاری ہیں کہ وہ انہیں سنبھال نہیں سکتیں۔

دیہاتی رہنما:۔ آزمائش کے انوکھے رخوں میں سے ایک دیہاتی رہنما کا وجود ہے۔ ان کی تعداد اب ۴۲ ہے۔ تمام اس بات پر متفق ہیں کہ وہ اب کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ دیہاتیوں کی پست ہمتی کے وقت اُن کی امداد کرنے کے لئے انہیں رہنما، فلسفی اور دوست کی حیثیت سے مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن انہیں نہایت عجلت میں منتخب کیا گیا تھا۔ اور ان کی تربیت ناکافی تھی۔ اور اُس وقت کے بعد بھی ان کی کافی نگرانی نہیں ہوئی ہے۔ اُن میں سے اکثر مڈل پاس یا مڈل فیل ہیں۔ اور تقریباً تمام چھوکرے ہیں۔ ان کی خوردہ سالی کی وجہ سے دیہاتی اِن کی بات نہ سنے گا۔ اور وہ تحکّم کی کمی کی وجہ سے اسے ایسا کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ اُن کا اہم فرض تبلیغ ہے۔ لیکن چونکہ اسمیں ایک رسمی تقریر اور حُقّے پر بیٹھے ہوئے گفتگو سب کچھ شامل کی جا سکتی ہے۔ اس لئے یہ معلوم کرنا مشکل ہے۔ کہ آیا کوئی حقیقی کام ہو رہا ہے۔ یا نہیں۔ میرے نہایت قابل اعتبار خبر رسانوں میں سے ایک نے جو متواتر دورہ کر رہا ہے۔ گول مول الفاظ میں یہ بات کہی کہ میں نے کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جو کسی رہبر کی وجہ سے وجود میں آئی ہو۔ اور اس دوران میں ۵۰ روپیہ فی رہبر کے حساب سے اُن پر ۲۰۰۰۰ روپیہ سالانہ خرچ ہو رہا ہے۔

مشترکہ تعلیم:۔ دیہاتی رہبر سے زیادہ انوکھی شے لڑکے اور لڑکی کی مشترکہ تعلیم ہے۔ مسٹر برین کہتے ہیں۔ کہ عورت کو تربیت دے دو گاؤں خود بخود ترقی کر جائے گا۔ چونکہ دیہاتی لڑکیوں کے لئے سکول نہیں ہیں۔ اور اُستانیوں کا ملنا مشکل ہے۔ اس

لئے اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ لڑکیوں کو لڑکوں کے ساتھ پرائمری سکول میں بھیجا جائے۔ میرے خبر رسانوں کی متفقہ رائے یہ تھی۔ کہ اس تجربہ کو اب تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ تحصیل بھر میں اسے پانچ یا چھ سکولوں میں آزمایا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں بھی لڑکیوں کو لڑکوں سے علیحدہ پڑھایا جاتا ہے۔ یہ بھی محض اس صورت میں ممکن ہے کہ سکول ماسٹر کی بیوی انہیں پڑھانے کے لئے تیار ہے۔ اِن آراء کو سُن کر مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی۔ کہ نقادوں میں سے اکثر متذکرہ تجربہ کے ساتھ پوری پوری ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور تنقید صرف اس لئے کرتے ہیں۔ کہ اس کے نتائج انہیں بادلِ ناخواستہ ایسا کرنے کیلئے مجبور کرتے ہیں۔ کم از کم دو آدمیوں نے یہ کہا کہ اگر مسٹر برین دو سال کے لئے اس ضلع میں اور ٹھہرتے تو اُن کا کام جڑ پکڑ لیتا۔ ان کے اس احساس کی بنا پر ان کی رو سے انہوں نے اس کام میں روح پھونکدی بہت تعریف کی گئی۔

تجربہ:۔ آج راستے کے کچھ حصے تک اس تحصیل کا نہایت ہوشیار رکن امداد باہمی میرے ساتھ رہا۔ وہ ایک عمدہ سڈول جسم کا انسان ہے۔ اور جوانی کو حال ہی میں خیرباد کہہ چکا ہے۔ وہ بڑی جائداد کا مالک ہے۔ اصلاح دیہات کا ذکر کرتے ہوئے اُس نے بتایا کہ اُس نے لوگوں کی درماندہ حالت اُن پر ہویدا کر دی ہے۔ اور اگرچہ وہ کسی ایسی کوشش کے لئے رضامند تھے۔ جس سے اُن کے حالات درست ہو جائیں لیکن پھر بھی انہوں نے جان لیا کہ ہمیں ضرور ایسا کرنا چاہئیے۔ میں نے دریافت کیا۔ کہ جب سے برین صاحب گئے ہیں۔ کتنے فیصدی ایسے ہیں کہ جنہوں نے اپنی آنکھوں پر پھر پٹی باندھ لی ہے؟ کیا وہ پچاس فیصدی ہوں گے؟ اس نے جواب دیا۔ اس سے زیادہ صاحب۔ ساٹھ یا ستر اور بلکہ اس سے بھی زیادہ تقریباً اسّی فیصدی تک۔ میں نے کہا اُن تمام چیزوں میں سے جو جاری کی گئی ہیں۔ لوگ کس چیز کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس نے جواب دیا "رہٹ کو" میں نے کہا کیوں؟ اس لئے کہ اسمیں صرف دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور چرسے میں چار کی۔ اور اس سے پانی بھی جلدی دیا جا سکتا ہے۔ تو پھر میں نے پوچھا وہ اسے اس لئے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کہ اسمیں کام بہت کرنا پڑتا ہے۔ وہ ہنسا اور کہا کہ بات یہی ہے۔ میں نے پوچھا اور سب سے کم کس چیز کو پسند کرتے ہیں۔ اُس نے جواب دیا کہ "ہل کو" کیونکہ اسے خریدا بہت لوگوں نے اور استعمال کسی نے نہیں کیا۔

گاؤں کی صفائی:- اس نے کہا کہ گاؤں کو صاف کرنے اور کھاد کو گڑھوں میں ڈالنے کا کام کیا تو جاتا ہے۔ لیکن عام طور پر اُس وقت جبکہ کسی افسر کے دورے پر آنے کی توقع ہو۔ اس وقت کوڑا جمع کیا جاتا ہے اور گڑھوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔

"کیا لوگ اپنے دیہات کو صاف کرنا پسند کرتے ہیں؟"

چند ایک کرتے ہیں۔ لیکن اکثر نہیں کرتے۔ میرا اپنا گاؤں صاف ہے۔ کیونکہ میں مار و مار کرتا رہتا ہوں۔

اس سے وہ مثل یاد آتی ہے کہ "جٹ منتر تاں ہتھ چھنتر"۔ میں نے پوچھا کیا وہ آج میرے آنے کے لئے تمام چیزوں کو صاف کرنے میں سخت محنت سے کام کرتے رہے ہیں؟ وہ پھر ہنسا۔ یہ گاؤں جس کا میں نے معائنہ کیا اُن تمام گاؤں سے جو میں نے اپنے دورے میں دیکھے مقابلتاً اچھا تھا۔ مجبوری کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔؟ کیا لوگوں کو صاف رہنے کے لئے مجبور کرنا چاہیئے۔ یا محض رضا جوئی سے کام لینا چاہیئے۔

اس نے جواب دیا کہ مجبوری لازمی ہے۔ لیکن ابتدا میں مجبوری برادری کی طرف سے ہونی چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہ بہت سے لوگ اپنے گاؤں کو صاف کرنا اور کوڑے کو باہر لیجانا تکلیف دہ سمجھتے ہیں۔ میرے گاؤں میں یہ انتظام ہے کہ بھنگی ہر گھر سے ایک چپاتی کی بجائے ہر روز دو چپاتیاں لیتے ہیں۔ لیکن یہ ایک غیر مقبول ٹیکس ہے۔ بعض گاؤں میں اس کی بجائے فصلی واجبات میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ دوسرے گاؤں میں جہاں لوگ بہت کفایت شعار ہیں۔ اپنا کوڑا خود لیجا کر اپنے آپ کو زائد خرچ سے بچا لیتے ہیں۔

ایک مندر کا پروہت:- گاؤں میں ایک مندر ہے۔ ایک پروہت اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ جب میں بلنک کا معائنہ کر رہا تھا۔ تو معہ اپنی موٹی سیاہ مونچھوں و دہقانی شکل و صورت نارنجی کمبل لئے وہاں موجود تھا۔ اس کا اصل گھر بنگال میں تھا۔ لیکن اس کا گرو جو اس سے پہلے وہاں ہوا کرتا تھا۔ اُسے یہاں لے آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اجودھیا واقع اضلاع متحدہ میں ملے ہوں گے۔ ہندوستان میں شاید خدایان مذہب ہی حقیقی قوم پرور ہیں ——— کیونکہ وہ صوبجاتی حدود کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دور دور سفر کرتے ہیں۔ یہ پروہت ہر شام کو دس یا بیس دیہاتیوں کو جو مندر میں آجاتے ہیں۔ بلند آواز سے رامائن پڑھ کر سناتا ہے۔ دو گھنٹہ روزکے

حساب سے وہ تمام کہانی دو یا تین ماہ میں ختم کر دے گا۔ اُس نے بتایا کہ وہ سننے والوں کو اس کے ارتھ بھی بتاتا ہے۔ بہرکیف ذیلدار نے یہ بتایا کہ گاؤں میں کسی کو بھی حقیقی مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی۔ اور یہ امر یقینی ہے کہ نہ لڑکے کو تعلیم دی جاتی نہ لڑکی کو۔ تمام عورتیں جاہل ہیں۔ اور کچھ نہیں پڑھا سکتیں۔ پروہت کو آٹھ یا نو ایکڑ زمین گذارے کے لئے دی ہوئی ہے۔ لیکن وہ اُسے خود نہیں کاشت کرتا۔ اس کے علاوہ تین یا چار خاندانی پروہت ہیں۔ جو لوگوں کی شادی یا غمی کی رسومات بجالاتے ہیں۔ اور انہیں بتاتے ہیں۔ کہ کس تاریخ اور کس ساعت میں کوئی ضروری کام کرنا چاہیئے۔ ان میں سے ایک نے ذیلدار کے گھر کی تعمیر شروع کرنے کیلئے منٹ تک مقرر کر دیئے تھے۔ اور موقع پر مناسب منتر جپے تھے۔

پیپل کی پوجا:۔ یہاں پیپل کے درخت کی پوجا جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے ابھی تک مروج ہے۔ اس حقیقت سے یہ امر کافی واضح ہو جاتا ہے۔ کہ ہم اور بھی ہندوستان کے وسط میں آگئے ہیں۔ ہر ہفتہ کے روز عورتیں اس کے گرد پانی چھڑکتی ہیں۔ اور لوگ ابھی تک اس بات پر یقین رکھتے ہیں۔ کہ دیوتا آتے ہیں اور اس کے پتوں کی راگنیاں سننے کے لئے اس کی شاخوں پر بیٹھتے ہیں۔ جب ہم نے یہ بات کہی تو ایک برہمن کھڑا ہو گیا۔ اور مندرجہ ذیل دلچسپ اشلوک پڑھ سنایا۔

"جڑ برا ہما ہے۔ تنہ وشنو اور شاخیں مہا دیو

ہر پتے پر دیوتا ہیں۔ اے درختوں کے بادشاہ تمام مبارکباد تیرے لئے ہے۔

وہ قسم جو خدا کے نام سچ بولنے کے لئے پیپل کے درخت کے نیچے کھائی جائی کبھی نہیں توڑی جاتی۔ میں نے پوچھا آیا سلیمان کے زمانے میں بھی تم دانستہ بدکاری اور تنگیٔ رزق کو ایک دوسرے سے مربوط کرتے تھے۔" بظاہر نہیں۔ لیکن صرف اُن کے عام گناہوں کے ساتھ۔ جیسا کہ ایک شخص نے کہا۔ ہماری موجودہ زندگی ہمارے گذشتہ اعمال کا نتیجہ ہے۔ وہ الفاظ جو اُس نے استعمال کئے یہ تھے "کرما کرم" یہ ظاہر کرتے ہیں۔ کہ اُس کا ایما گذشتہ و موجودہ دونو زندگیوں کی طرف ہے۔

مویشی اور مذہب:۔ پہننے کی پہلی تاریخ کو اب بھی گایوں کو خوراک پیش کی جاتی ہے۔ لیکن آٹے کی صورت میں نہیں بلکہ چارے کی شکل میں۔ ہر ایک اپنی اپنی رسد لے کر اس جگہ پہنچ جاتا ہے۔ جہاں مویشی چرنے کے لئے ہانکے جانے سے پہلے جمع ہوتے ہیں۔ وہ تمام رسدیں مل کر پندرہ یا بیس من تک ہو جاتی ہیں۔

بہت کم اور صرف بوڑھے لوگ ہی روزانہ پیشکش دیتے ہیں۔ پبلک سے سوئے ٹیکہ لگانے پر کوئی معترض نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ دو یا تین سال ہوئے مسٹر برین کی شمال پیش کرنے پر ہر ایک کو ٹیکہ لگا دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ عورتوں کو بھی۔ اس سے پہلے وہ ڈاکٹر کے آنے پر ہی ہوا ہو جایا کرتے تھے۔ اب بہت سے لوگ اپنے مویشیوں کو بھی لگوا لیتے ہیں۔ لیکن اکثر لوگ سلامتی اس میں سمجھتے ہیں۔ کہ انہیں گاؤں کی گذرگاہ میں آر پار لٹکے ہوئے جادو کے نیچے سے گذار دیا جائے۔ یہاں دو حصاری بیل ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کی قیمت ۲۵۰ روپیہ ہے۔ ہر حالت میں گاؤں والوں نے ۵۰ روپے ادا کئے اور ڈسٹرکٹ بورڈ نے دو سو۔ دیہاتی پرانے ناکارہ بیلوں کی نسبت جو پہلے ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ ان کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ لیکن وہ اچھے مقامی بیلوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ حصاری بیل بھاری اور سست ہیں۔ اور ان کے بچھڑوں کو مقامی مویشیوں کی نسبت خوراک زیادہ درکار ہوتی ہے۔ اور دودھ کم دیتے ہیں۔ اس پر یہ کہ چار سالہ مقامی بیل کی قیمت ۱۵۰ روپیہ سے ۱۷۵ تک ہوتی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں حصاری بیل کی قیمت ۲۰۰ سے لے کر ۲۵۰ روپیہ تک۔ لوگوں نے بتایا کہ ہم اپنے مویشیوں کو فروخت نہیں کرتے خواہ وہ کتنے ہی بوڑھے اور ناکارہ کیوں نہ ہوں۔ بلکہ یا تو گھر پر رکھتے ہیں۔ یا گئوشالہ میں بھیج دیتے ہیں۔ لیکن جب میں نے دریافت کیا کہ موجودہ لوگوں (تقریباً ۱۰ آدمی) میں سے کیا کسی نے آخرالذکر بات پر عمل کیا ہے۔ تو کسی نے حامی نہ بھری۔ ذیلدار نے جو میرے پہلو میں بیٹھا تھا۔ دبی زبان سے کہا۔ کہ وہ لوگ جو ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ فروخت کر دیتے ہیں۔ صرف شکّی لوگ ایسا نہیں کرتے۔ ایک اور ہندو راجپوت ذیلدار نے بھی جو وہیں موجود تھا۔ یہی بات کہی اور ایک معالج مویشیان نے جسے میں دن کے وقت ملا تھا۔ صاف طور پر یہ کہا کہ چارے کی قلت جاٹوں کو ہزاروں کی تعداد میں مویشی فروخت کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ مذہبی جذبات کو کے لئے وہ قصائی جو انہیں خریدتا ہے۔ جاٹ سے سودا کرنے کے لئے جاٹ اور گوجر سے سودا کرنے کے لئے گوجر سے کام لے لیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ جہاں کہیں عوام کی رائے قوی ہوتی ہے۔ فروخت کا کام اندھیرے میں کیا جاتا ہے۔ اور اگلی صبح گائے کی عدم موجودگی ایک ایسے چور کے ذمّہ تھوپ دی جاتی ہے۔ جس کا پتہ نہیں مل سکتا۔ یا کبھی گائے کو باہر لیجاتے ہیں۔ اور بظاہر یہ دکھاتے ہیں۔ کہ کسی سفر پر جا رہے ہیں۔ اور اسے اس دلّال کے پاس فروخت کر دیتے ہیں۔ جو ان کے انتظار

میں جنگل میں پڑا ہوتا ہے۔ اس حالت میں یہ کہا جاتا ہے۔ کہ گائے کھو گئی ہے۔ جہاں کہیں پنچایت ہوتی ہے۔ اور لوگوں کی رائے منظم شکل میں ہوتی ہے۔ تو فروخت شاذ ہوتی ہے۔ بعض اوقات پنچایتیں صریحاً اس لئے بنائی جاتی ہیں۔ کہ فروخت کو روکا جائے۔ چند سال ہوئے ہوڈل میں ایک اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ پانچ چھ سو جاٹ جو گرد و نواح کے دیہات سے ایک غمی کی دعوت میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے۔ اس بات پر رضا مند ہو گئے۔ کہ مویشیوں کی فروخت ضرور بند ہو جانی چاہیئے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ سب مل کر ایک ہو گئے۔ جہاں کہیں پنچایت نہیں ہے۔ وہاں بھی احساسات اسی قدر قوی ہو سکتے ہیں۔ کہ بغاوت کی نوبت پہنچے۔ اس کی ایک مثال وہ بے چینی اور ابتری ہے۔ جو گذشتہ ماہ مئی میں پلول کے قریب سونتہ نامی ایک گاؤں میں پھیلی۔ جبکہ مسلمان باشندوں نے بقرعید کے موقع پر ایک بالکل ناکارہ گائے کو ذبح کر کے اپنا تہوار منایا تھا۔ سرکاری رپورٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ سونتہ گاؤں کی ایک گائے بالکل بانجھ اور ناکارہ تھی۔ یہ گائے تمام گاؤں کے لئے کسی کام کی نہ تھی۔ اور سوائے ذبح کرنے کے اور کسی کام نہ آ سکتی تھی۔ لیکن گرد و نواح کے جاٹوں نے اُسے زندہ رکھنے کیلئے اُسے اپنی چراگاہوں میں چرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ یہ تھی وہ گائے جسے سونتہ کے باشندوں نے نہایت کفایت شعارانہ طریق پر قربانی کرنے کا فیصلہ کیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ چودہ جانیں ضائع ہو گئیں۔

چمار اور چھوت چھات :- چماروں کو یہاں نیچ نہیں خیال کیا جاتا۔ ان کی لاچاری محض یہ ہے۔ کہ ایک ایسے اجتماع میں جیسا کہ آج تھا۔ ان کے لئے لازم ہے کہ وہ علیحدہ بیٹھیں اور زمین پر بیٹھیں۔ ذیلدار نے نہایت ملائم الفاظ میں بتایا کہ وہ ان میں سے کسی بات کے کرنے کی خواہش نہیں رکھتے۔ بلکہ صرف اپنے اور ان کے درمیان فرق دکھانا چاہتے ہیں۔ دوسری باتوں میں وہ آزاد ہیں۔ وہ کنوئیں سے پانی بھرتے ہیں۔ وہ لوگوں کے گھروں میں داخل ہوتے ہیں (بھنگی صرف ایک ہی کام کیلئے ایسا کر سکتا ہے) لوگ اُن کے ساتھ چھُو جانے سے بھرشٹ نہیں ہوتے۔ ہم ان کے کام کو اپنا کام سمجھتے ہیں۔ اور اس قدر غلط ملط ہوتے ہیں۔ کہ ہم اُسے بُرا نہیں سمجھتے۔ میں نے پوچھا کیا وہ مردہ جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ زمینداروں کو اس کی کچھ خبر نہ تھی۔ اور

مجھے یہی بات چماروں سے دریافت کرنی پڑی۔ جن میں سے بہت سے میرے پیچھے فاصلے پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم نے چار یا پانچ سال سے چھوڑ دیا ہے۔ اور اب ہم دباغت کا کام بھی نہیں کرتے۔ بلکہ رنگی رنگائی کھالیں خرید لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہم میں سے اکثر کاشتکار ہیں۔ اور اپنے ہل رکھتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ ہماری معاشرتی حالت پست ہے۔ باقی ماندہ لوگوں میں اور ہم میں اور کوئی فرق نہیں ہے۔ غالباً ان کی تعداد ضرور اس پر کچھ نہ کچھ اثر ڈالتی ہے۔ کیونکہ اس تحقیق میں ان کی تعداد جاٹوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ۱۲۰۰۰ جاٹوں کے مقابلے میں ان کی تعداد ۲۲۰۰۰ ہے۔ اس کے برعکس بھنگی نیچ شمار کئے جاتے ہیں۔ شاید اس خیال سے کہ وہ رات کی گندگی اٹھاتے ہیں۔ ان کو کنوؤں سے پانی نہیں بھرنے دیا جاتا۔ اور جو کوئی انہیں چھو لیتا ہے۔ ضرور نہاتا ہے۔ اس کے باوجود ان تینوں گاؤں میں جن کے نمائندے میرے معائنے کے وقت موجود تھے۔ دائیاں انہیں میں سے ہیں۔ اس بیہودگی سے انکار کرنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔

خوراک:۔ گیہوں زیادہ نہیں کھائی جاتی۔ یہ بہت قیمتی فصل ہے۔ جب تیار ہو جاتی ہے۔ تو یا تو فروخت کر دی جاتی ہے۔ یا بنیئے کو دے دی جاتی ہے۔ گرمیوں میں بڑی فصلیں جَو اور چنے کی ہیں۔ اور سردی میں باجرے اور جوار کی چونکہ ہندو جاٹ نہ گوشت کھاتے ہیں۔ اور نہ انڈے۔ اس لئے مرغیاں نہیں پالی جاتیں۔ اور نہ ہی سبزیاں کاشت کی جاتی ہیں۔ پٹواری نے بتایا کہ اُن پانچ گاؤں میں جو میرے حلقے میں ہیں۔ صرف ایک (ٹولی) سبزیاں اُگاتا ہے۔ لیکن یہ امر کہ ایک ذیلدار نے اپنے گھر میں استعمال کرنے کے لئے اس سال گاجریں بونی شروع کی ہیں۔ ان کے معیارِ زندگی کے بلند ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس گرد و نواح میں سبزیاں بونے میں یہ دقت ہے۔ کہ کنوؤں کا پانی کھاری ہے۔ ۹۰ سال ہوئے جب سلیمان اس علاقے میں سے گذرا۔ تو اس نے بھی یہی دیکھا کہ یہ پانی کسی فصل کیلئے موزوں نہیں ہے۔

امداد باہمی:۔ گاؤں میں تین چھوٹے بینک ہیں۔ تین چار ممبروں کو اس بات کا کافی اچھا خیال تھا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں۔ اور انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ لیکن دوسرے لوگ اس معاملے میں بہت سست تھے۔ سود کی اوسط شرح ۲۴ فی

صدی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بنئے کے ساتھ غلہ لینے دینے کے تعلقات تقریباً اتنے ہی عام ہیں۔ جتنے کہ پہلے زمانے میں۔ بنیا کاشتکار کا مہاجن ہے۔ اور فصل کے موقع پر سوائے موسم کے گذارنے کے باقی تمام غلہ اس سے لے لیتا ہے۔ جب کاشتکار کا اناج ختم ہو جاتا ہے۔ تو وہ وقتاً فوقتاً اُسے اور ادھار دیتا رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کاشتکار اس کے حسابات کا خیال نہیں رکھتا۔ اور اسی لئے پورے طور پر اس کے قابو میں ہوتا ہے۔ حسب معمول ویسی امداد باہمی کی مختلف صورتیں یہاں بھی ہیں۔ دو یا تین لڑکے مویشی چرانے کیلئے۔ ایک محافظ فصلوں کے پکنے پر ان کی دیکھ بھال کے لئے اور چند بڑے برتن شادیوں میں استعمال کیلئے ہیں۔ چونکہ یہاں بندر نہیں ہیں۔ اس لئے فصل پکنے سے پہلے کوئی محافظ نہیں رکھا جاتا۔ تالاب اور پانی پینے کے کنوؤں کی مرمت کے لئے ہر ایک گھر باری باری محنت کرنے کیلئے آدمی مہیا کرتا ہے۔ فصلوں کو بوتے اور کاٹتے وقت پڑوسی کھیتوں میں ایک دوسرے کی امداد کرتے ہیں۔ سڑکیں کبھی مشترکہ طور پر مرمت نہیں کی جاتیں۔ لیکن ایک ۸۲ برس کے جاٹ نے جو موجودہ آدمیوں میں سب سے بڑھا تھا۔ یہ بتایا کہ ۵۰ سال ہوئے۔ ان کی مرمت مشترکہ کی جاتی تھی۔

جب ہم گاؤں سے روانہ ہوئے۔ تو غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی شعاعیں پہاڑی پر گاؤں کے بنے ہوئے مربع گھروں اور پرانی اینٹوں کی عمارتوں پر پڑ رہی تھیں۔ ہماری روانگی کو دیکھنے کیلئے عورتوں کے گروہ کے گروہ چھتوں پر کھڑے تھے۔ اور ان کی پوشاک کے نیلے اور سرخ رنگ مغربی آسمان کے بالمقابل اپنی دمک دکھا رہے تھے۔ باقیین کے نزدیک ہم ایک پرانے مقبرے کے پاس پہنچے۔ جس میں ایک پیر صاحب مدفون تھے۔ لیکن یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ کہ وہ کب دفن کئے گئے تھے۔ اس کے نزدیک ہی ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں سالانہ میلہ مناتے ہیں۔ اور پوجا کرتے ہیں۔ اچھے تعلقات کی یہ ایک اور مثال ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جب دو قوموں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ تو وہ گاؤں میں کس طرح آپس میں ملتی ہیں۔

(۹ میل)

۲ جنوری - ہاتھین سے سکرادا

ہاتھین ایک قصبہ ہے۔ جس کی آبادی ۲۵۰۰ باشندوں پر مشتمل ہے۔ یہاں ایک مڈل سکول۔ ایک مویشیوں کا ہسپتال اور ایک مشنری شفاخانہ بھی ہے۔ پلول اور اس ضلع کی دوسری بستیوں کی طرح یہ بھی ایک سنگ ریزہ دار پہاڑی پر آباد ہے جس میں صدیوں تک ہر ایک نسل اپنا حصہ شامل کرتی رہی ہے۔ کسی زمانے میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ ہاتھیوں کا شہر تھا۔ لیکن اب بالکل بے رونق ہے۔ تاہم اس میں دو ایک عمارتیں ایسی ہیں۔ جو گذشتہ شان و شوکت کی یاد دلاتی ہیں۔

تجربہ:- گردونواح کے علاقہ کا ذیلدار مجھے ملنے کیلئے آیا۔ اور تجربہ کوڑ گاؤں کے متعلق باتیں کرنے لگا۔ اس کی ذیل کے تیس عجیب گاؤں میں سے دس یا بارہ اپنے آپ کو صاف رکھتے تھے۔ خواہ کوئی افسر آرہا ہو یا نہ۔ یہ کام بھنگیوں کو زائد مزدوری دیکر کرایا جاتا ہے۔ چونکہ ذیل کے بہت سے حصے میں نہر سے آبپاشی کی جاتی ہے۔ کھاد کی بہت مانگ ہے۔ اس کی وجہ سے گڑھے بہت مقبول ہو گئے ہیں۔ اور وہ انہیں حد سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ لیکن لوہے کے ہل اور رہٹ کو اس قدر پسندیدگی سے نہیں دیکھتے۔ اس کی ذیل میں ۱۷ ہلوں میں سے صرف پانچ اور دس رہٹوں میں سے صرف تین استعمال کئے جاتے ہیں۔ رہٹ میں کئی ایک خرابیاں ہیں۔ گاؤں کا بڑھئی انہیں مرمت کرنا نہیں جانتا۔ اور ایسے کوئیں جن میں پانی تیس فیٹ کی گہرائی پر ہے۔ رہٹ کیلئے بہت گہرے ہیں۔ دو چرسے اکٹھے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اور اتنی گہرائی سے وہ رہٹ کی نسبت زیادہ پانی کھینچتے ہیں۔ اکثر لوگ اس بات پر رضامند ہو جائیں کہ وہ رہٹ کو رات کو بھی چلائیں اور دن کو بھی تو یہ بہت مفید ثابت ہو۔ لیکن وہ ایسا نہیں کریں گے۔ کیونکہ اس کا رواج نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ اتنی گہرائی پر رہٹ کے لئے ۱۰۰ ٹنڈیں درکار ہوتی ہیں۔ اور اُن سے رہٹ اتنا بھاری ہو جاتا ہے۔ کہ بیل مشکل سے کھینچتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس علاقے میں پانی کی تہ بہت جلد نیچے چلی جاتی ہے۔ اور رہٹ اتنی آسانی سے نہیں لگایا جا سکتا جتنی سے کہ چرس۔

تجربہ:- سکرادا جاتے ہوئے میں ایک بڑے گاؤں میں جس میں قریباً ۲۵۰ گھر تھے۔ پانچ بینکوں کا معائنہ کرنے کے لئے ٹھہرا۔ تمام بُری حالت میں تھے۔ میں نے

تجربہ کے متعلق دریافت کیا۔ لوگوں نے بتایا کہ ہم اپنے گھر اور گاؤں کو ہر روز صاف کرتے ہیں۔ اور کوڑے کو گڑھوں میں ڈالتے ہیں۔ لیکن پٹواری نے مجھے پوشیدہ طور پر بتایا کہ یہ کام وہ صرف اُسی وقت کرتے ہیں۔ جبکہ انہیں کہا جاتا ہے۔ اس کام کے لئے گاؤں کا نامی ایک یا دو مرتبہ تمام گاؤں میں چکر لگاتا ہے۔ مشترکہ تعلیم صریحاً ناپسند تھی۔ یہ بھی تسلیم کیا گیا کہ گوڑگاؤں کا ہل استعمال نہیں کیا جاتا۔ دور تیچھے سے کوئی شخص بول اٹھا اُسے دکھلاوے کے لئے باہر نکالا جاتا ہے۔ اور پھر چین سے رکھ دیا جاتا ہے۔

پردہ اور کام :۔ ہوتے ہوتے ہم پردے کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ایک بڑے مُلاّ نے بتایا کہ قرآن شریف کی رو سے مسلمان عورت اپنے ہاتھ۔ پاؤں اور چہرہ پردے سے باہر نکال سکتی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ میو لوگوں نے جو پردہ نہیں کرتے تاسف آمیز لہجے میں کہا کہ مُلاّ ہمیں متواتر یہ کہتا رہتا ہے۔ کہ تم غلطی پہ ہو۔ لیکن ہم مجبور ہیں۔ کیونکہ ہماری عورتوں کو کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ اتنا ہی سخت کام کرتی ہیں۔ جتنا کہ جاٹوں کی عورتیں جن کا کل ذکر آیا تھا۔ بلاشبہ وہ آدمیوں سے زیادہ سخت کام کرتی ہیں۔ یہ تسلیم کیا گیا کہ یہ اچھی بات نہ تھی۔ اگر چارے کی کمی نہ ہو تو سال کے اس حصّے میں آدمیوں کو کچھ کام نہ کرنا پڑے۔ یہ چیز انہیں درختوں کو چارے کے لئے کاٹتے چھانٹتے رہنے میں مشغول رکھتی ہیں۔ کاشتکاری کے علاوہ اور کوئی کسی قسم کا کام نہیں کرتا۔ تمام ٹوکریاں بھنگی بناتے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے ہر ایک گھر پر ایک روپیہ بارہ آنے فی سال خرچ پڑتا ہے۔ انہیں یہ نہیں سوجھتا کہ اگر وہ یہ معمولی سا آسان کام اپنے آپ کریں۔ تو وہ بینک کا ایک ششماہی چندہ ادا کرنے کیلئے کافی رقم بچا سکتے ہیں۔

پنچایتیں :۔ میو قوم کو کفایت شعاری کا دھندلا سا خیال بھی نہیں ہے۔ لیکن اسے امداد باہمی کا اچھا دھیان ہے۔ سوائے مشترکہ مولیشی چرانے کے دیسی امداد باہمی کی باقی تمام صورتیں جن کا کل ذکر کیا گیا تھا۔ اس گاؤں میں موجود ہیں۔ ان کے چار آبپاشی کے کنوئیں مشترکہ ملکیت ہیں۔ اور اسی طرح کام میں لائے جاتے ہیں۔ ایک کنوئیں میں ۴۲ کنبے شامل ہیں۔ اور دوسروں میں سے پانچ سے لے کر پندرہ تک شامل ہیں۔ وہ صرف خشک سالی کے وقت کام میں لائے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کا پانی کھاری ہے۔ اور زمین کو خراب کر دیتا ہے۔ یہاں ایک دیہہ پنچایت ہے۔

جو گرد و نواح کے میو قوم کے ۱۲ دیہات کے تمام امور کا فیصلہ کرتی ہے۔ آخر الذکر نے آخری اجلاس ماہ مئی میں کیا تھا۔ تاکہ وہ پولیس کو ایک خاص قاتل کا سراغ لگانے میں اور یہ فیصلہ کرنے میں مدد دے کہ مقدمہ کس پر چلانا چاہیئے۔

جب ہم نے اپنا سفر شروع کیا تو سورخ ارولی پہاڑ سے جو پنجاب کے میدان کی آخری حد اور راجپوتانہ کی ابتدا کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک نیزہ اوپر تھا۔ اس کی چوٹی چپٹی تھی۔ اور غروب ہوتے ہوئے آفتاب کے مقابل اور نیچے سائے میں ڈوبی ہوئی ہونے کی وجہ سے زرد زرد سرسوں کے لہراتے ہوئے آتش زیر میدان کے لئے خوبصورت آڑ کا کام دے رہی تھی۔

۳ جنوری قیام

میو اور ساہوکارہ۔ گزشتہ رات انتہائی سردی تھی۔ میرے پانچ ساتھیوں میں سے دو کو بخار نے گھیر لیا ہے۔ اب ہم میوؤں کے ملک میں دور آگئے ہیں۔ یہ لوگ مسلمان ہیں۔ اور راجپوت النسل ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ لیکن قیاس غالب ہے۔ کہ وہ ابتدائی لوگوں کی نسل سے ہوں گے۔ کاشتکار کی حیثیت سے وہ بڑے اور مالی لحاظ سے بہت ہی بڑے ہیں۔ لیکن ایک خفیہ مجلس کے ارتباط کی طرح وہ متحد رہتے ہیں۔ ان میں سے تقریباً ۱۰۰ آدمی انتقال اراضی کی تصدیق کے لئے خیمے میں جمع تھے۔ ان میں کچھ بنئے بھی شامل تھے۔ ان میں سے ایک نے تسلیم کیا کہ سود کی عام شرح ۲۴ فیصدی ہے۔ اور روپیہ وصول کرنے میں کوئی زیادہ دقت نہیں پیش آئی۔ کیونکہ ہم فصل کے موقع پر بہت سا غلہ لے لیتے ہیں۔ قرضہ پانچ سال میں اصل رقم کا دوگنا ہو جاتا ہے۔ رسیدیں بہت کم طلب کی جاتی ہیں۔ اور صرف اس وقت دیجاتی ہیں۔ جب تمام قرضہ بیباق ہو جاتا ہے۔ میوؤں نے بتایا کہ قرضے میں سے ۵ فیصدی پہلے ہی کاٹ لیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص جو سو روپیہ قرض لیتا ہے۔ ۹۵ روپے وصول کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی سود بھی لیا جاتا ہے۔ گیہوں جب ان کے پاس فروخت کی جاتی ہے۔ تو بازاری نرخ سے سستی خریدتے ہیں۔ اور جب ان سے خریدی جاتی ہیں۔ تو مہنگی دیتے ہیں۔ ستلج کے جنوبی علاقوں میں یہ شکایت عام ہے۔ اس علاقے میں روپیہ ادھار دینے میں ایک غیر معمولی خصوصیت

ہے۔ بڑے جاگیردار چھوٹے جاگیرداروں کے لئے ضمانت کا کام دیتے ہیں۔ ایک بوڑھے میو نے جس سے میں ایک دوسرے گاؤں میں ملا تھا۔ بتایا کہ گذشتہ ایام میں بنیا میوؤں کو ان کے بزرگوں کی وساطت سے روپیہ اُدھار دیا کرتا تھا۔ اور روپیہ تقسیم کرنے کا کام بھی اُسی پر چھوڑ دیتا تھا۔ وہ بزرگ اس قرضے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اور چونکہ اس پر اعتبار کیا جاتا تھا۔ اس لئے اس کا انگوٹھا نہیں لگوایا جاتا تھا۔ رسید کے طور پر انگوٹھا لگوانے کا کام صرف بیس سال سے شروع ہوا ہے۔ بنئے کو اس سے یہ فائدہ تھا۔ کہ اُسے اپنے قرضے کیلئے بہتر ضمانت مل جاتی تھی۔ اور میو کو یہ کہ روپیہ اچھی شرائط پر مل جاتا تھا۔ ضمانت طلبی اس رواج کا باقی ماندہ نشان ہے۔ اور میو کو ضمانت دینے پر اب بھی اچھی شرائط پر روپیہ مل جاتا ہے۔

خوراک:۔ میں نے لوگوں سے اُن کی خوراک کے متعلق دریافت کیا۔ وہ عام طور پر دن میں تین مرتبہ کھاتے ہیں۔ جب وہ اٹھتے ہیں۔ تو وہ ایک قسم کی کڑھی کھاتے ہیں۔ جو لسّی اور آٹے سے بنا ہوا ہوتا ہے۔ جسے تمام رات اُبالا جاتا ہے۔ اور صبح کو اور لسّی ڈال کر ٹھنڈا کر لیا جاتا ہے۔ دوپہر کو وہ مصالحہ دار دال اور ساگ روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ اور شام کو وہی کڑھی اور روٹی۔ خشک سالی کی وجہ سے انہوں نے دوپہر کی خوراک چھوڑ دی ہے۔ اور اس کی بجائے گوشت زیادہ کھاتے ہیں۔ عام طور پر وہ اُسے ہفتہ وار کھاتے ہیں۔ لیکن اب وہ تیسرے یا چوتھے دن کھاتے ہیں۔ کیونکہ مویشیوں کو چارہ نہ ملنے اور قصائی کے نہایت تن دہی سے کام کرنے کی وجہ سے یہ معمول کی نسبت زیادہ سستا ہے۔ جیتقانہ جیسے کم ترقی یافتہ گاؤں میں جس کا ہم نے کل معائنہ کیا تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ سردیوں میں چونکہ دن چھوٹے ہوتے ہیں۔ ہم دن میں صرف دوبار کھانا کھاتے ہیں۔ قحط سالی میں ہم صرف اتنی تبدیلی کر سکتے ہیں۔ کہ دونو وقت تھوڑا تھوڑا کھائیں۔ آج کل وہ ایسا کر رہے ہیں۔ چونکہ جوار اور باجرے کی فصلیں نہیں ہوئی ہیں۔ اس لئے وہ حسب معمول ان دونو کی روٹی پکانے کی بجائے اب چنے اور جو کی روٹی پکاتے ہیں۔ سردی کے موسم میں وہ جوار اور باجرے کو اس لئے ترجیح دیتے ہیں۔ کہ ان کی تاثیر گرم ہے۔ اور جو اور چنے کی سرد۔ اس علاقے کی غربت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے۔ کہ سوائے خوشی کے موقعوں کے بظاہر گیہوں

نہیں کھائی جاتی۔ اٹھارھویں صدی میں جاپان میں بھی یہی حال تھا۔ عام حالات میں بھی دیہاتی کے پاس گزارہ کرنے کیلئے کافی غلہ نہ ہوتا تھا۔ وہ سستے اناج اور آلو کھاتے تھے۔ کیونکہ یہ اُن سے لے لئے جاتے تھے۔ اور تھوڑے بہت جو اُن کے پاس بچ جاتے تھے۔ وہ ضروریات کیلئے روپیہ حاصل کرنے کی خاطر فروخت کر دیئے جاتے تھے۔

سبزیاں اور مرغیاں:۔ جیتھانا میں چونکہ تمام کوئیں کھاری ہیں۔ اس لئے سبزیاں کوئی کاشت نہیں کرتا۔ لوگ اُن کو پھیری والوں سے خرید لیتے ہیں۔ جو ہفتے میں ایک مرتبہ پانچ چھ میل پرے ایک گاؤں سے۔ جہاں کا پانی میٹھا ہے۔ لے کر وہاں آجاتے ہیں۔ سیکراوا میں دس یا پندرہ میو سبزیاں کاشت کرتے ہیں۔ اور انہیں فروخت بھی کرتے ہیں۔ آج شام شکار کرتے کرتے میں ایک کھیت کے پاس پہنچا۔ جس میں خوبصورت ڈنڈوں والی کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔ اس میں دو میو پہلی مرتبہ پیاز لگا رہے تھے۔ سکراوا کے سو آدمیوں میں سے جو وہاں موجود تھے۔ صرف دو آدمی مرغیاں پالتے ہیں۔ ایک کے پاس تیس ہیں۔ اور دوسرے کے پاس ایک درجن۔ دونوں صورتوں میں فروخت کے لئے نہیں ہیں۔ لیکن جیتھانا میں ایک نوجوان اُٹھا اور کہا "چھ ماہ گذرے میں نے مرغیاں پالنی شروع کی تھیں۔ اور ابھی کل ہی ان میں سے ۲۵ ایک تاجر کے پاس گیارہ روپے آٹھ آنے میں فروخت کی ہیں۔ اب میرے پاس آٹھ یا نو باقی ہیں۔ چونکہ ابتدائی نسل حاصل کرنے کے لئے اس کے صرف تین روپے انڈوں پر خرچ ہوئے تھے۔ اس لئے وہ خوب کام کر رہا تھا۔ اس کی تقلید کرتے ہوئے ایک اور میو نے ابھی ابھی ایک مرغا اور ایک مرغی خریدی ہے۔ اس سے ذرا پہلے کسی نے دیہاتیوں کی غربت کے متعلق بھاری آواز میں یہ کہا تھا۔ کہ وہ تمام دن کام کرتے ہیں اور شام کو روٹی میسر نہیں آتی"۔ میں نے نصیحتاً کے طور پر کہا کہ ایسے بارانی علاقے میں جیسا کہ یہ ہے دیہاتی کے افلاس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ سوائے کھیت میں ہل چلانے کے اور کچھ نہیں کرتا۔ اور زمین سے اُسے اس قدر پیداوار نہیں حاصل ہوتی کہ وہ آرام سے گزارہ کر سکے۔ سیکراوا میں ایک بوڑھے آدمی نے کہا کہ ہم صرف کھیتی کرتے ہیں۔ ہمیں دوسری چیزوں سے کیا تعلق ہے۔ اگر لوگ کرنا چاہیں تو دوسرے کاموں کے لئے کافی وقت ملتا ہے۔ جو لوگ

موجود تھے۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ ہم اتنی محنت سے کام نہیں کرتے جتنی سے کہ عورتیں۔ اگر قحط سالی نہ ہوتی اور درختوں کو چارے کے لئے نہ چھانٹنا پڑتا تو انہیں اس وقت بھی کوئی زیادہ کام نہ کرنا پڑتا۔ اس کے باوجود وہ اپنی ٹوکریاں تک نہیں بناتے۔ اور کپڑے تو بالکل ہی نہیں بناتے۔

مذہب :۔ گاؤں میں دو مُلّا ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک ملّا بھی سوائے عربی میں قرآن شریف تلاوت کرنے کے اور کچھ نہیں کرسکتا۔ سیکرا دا کے ایک مُلّا نے جو میو ہے۔ یہ بتایا کہ میں نے تلاوت سیکھنے کے لئے تین سال دہلی میں گذارے ہیں۔ لیکن یہ بات اُس نے بھی تسلیم کرلی کہ جو کچھ وہ پڑھتا تھا۔ سمجھ نہیں سکتا تھا۔ وہ اب بھی بلا معنی تعلیم بیس لڑکوں اور دو لڑکیوں کو دے رہا ہے۔ جیتھانا کا مُلّا کچھ نہیں پڑھاتا۔ بلکہ ہر دو یا تین ماہ بعد دہلی سے ایک مولوی صاحب آتے ہیں۔ اور لوگوں کو وعظ سناتے ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ پکّے نمازی بن گئے ہیں۔ پہلے وہ ہندوؤں کے ساتھ ہولی منانے میں شامل ہوجایا کرتے تھے۔ لیکن ۲۵ سال ہوئے جب سے انہیں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ یہ بڑی بات ہے۔ انہوں نے شامل ہونا چھوڑ دیا ہے۔ چماروں اور بھنگیوں کو نیچ خیال کرنے میں وہ ہندوؤں کی تقلید کرتے ہیں۔ اور جب ضرورت ہوتی ہے۔ تو اپنے آپ پر پانی چھڑکتے ہیں۔ پٹواری کا بیان ہے کہ جو زیادہ نمازی ہیں۔ وہ نہاتے بھی ہیں۔ اور کپڑے بھی دھوتے ہیں۔ بعض چماروں نے حال ہی میں مردہ جانوروں کا گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن بھنگیوں نے ابھی نہیں کیا۔ جیتھانہ میں چار جوگی پیشہ ور فقیر ہیں۔ اور بہت سے باہر سے آجاتے ہیں۔ لیکن بھیک کے ذریعہ روپیہ بٹورنے کی جتنی قابلیت ان میں پہلے تھی۔ اب نہیں رہی۔ ایک نے کہا کہ اگر ہم انہیں نہ دیں۔ تو وہ بد دعا دیتے ہیں۔ ہم اُن سے اس لئے ڈرا کرتے تھے۔ لیکن اب ہم جانتے ہیں۔ کہ خدا کے سوا اور کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ دونوں گاؤں میں ایک چمار عورت دایہ کا کام کرتی ہے۔

حصاری بیل :۔ دونوں گاؤں میں جن امور پر بحث کی گئی اُن میں سے حصاری بیل کی بحث سب سے زیادہ غصّہ دلانے والی تھی۔ پہلے پہل اس کے خلاف کچھ کہنے کے لئے صاف طور پر مجبوری ظاہر کی جارہی تھی۔ لیکن سیکرا دا میں جب لوگوں کو یہ معلوم ہوگیا۔ کہ ان کی اصلی رائے درکار تھی۔ تو آوازوں

کی وہ گڑبڑ ہوئی گویا کوئی پھاٹک دفعتہً ٹوٹ گیا تھا۔ اور وہ ایک دوسرے
کو ناپسند کرنے کے وجوہات بتانے لگے۔" وہ گایوں کے لئے اتنا بڑا ہے کہ وہ
اسے سہار نہیں سکتیں۔ دس یا پندرہ برس بعد ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ وہ بہت ملنسار ہے
اور گردونواح سے۔ بیلوں کے ساتھ مل جل جاتا ہے۔ آٹھ یا نو اکٹھے ہو جاتے ہیں۔
اور یہ تعداد ایک گاؤں کو بہت سا نقصان پہنچا دیتی ہے۔" میں نے پوچھا ان کے
بچھڑوں کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ کسی نے کہا وہ بھلے نہیں ہوتے۔ دوسرں
نے کہا" وہ خوبصورت نہیں ہوتے۔ (اس ضلع میں خوبصورتی کے متعلق کوئی
نہ کوئی لفظ متواتر سننے میں آرہا ہے) ان کی پیشانیاں بہت کشادہ اور میان کی
ہنسلیاں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ اور خوراک بہت زیادہ۔ جیتھانہ میں یہ بھی کہا گیا تھا
(میرے خیال میں یہ بات اڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔) کہ مقامی نسل کا چارسالہ
بیل حصاری نسل کے بیل سے ۵۰ روپیہ زیادہ قیمت پائے گا۔ ایک فراخ
حوصلہ نقاد نے کہا" یہ بہت بڑے ہیں۔ لیکن چونکہ ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ اس لئے
ہم انہیں رکھتے ہیں۔" دونوں گاؤں میں جن احساسات کا اظہار کیا گیا وہ ہر اس چیز
سے جس سے میں اپنے دورے میں دوچار ہوا قوی تر تھے۔ متفقہ رائے مقامی
نسل کا ایک اچھا بیل رکھنے کے حق میں تھی۔ جلیتھا کے مسلمان تمام بوڑھے
مویشیوں کو قصابوں کے پاس فروخت کر رہے ہیں۔ اور ان سے پانچ یا چھ روپیہ
سے شاذ ہی زیادہ وصول ہوتے ہیں۔ اور دس یا بارہ سے زیادہ تو کبھی نہیں ہوتے۔

۴ جنوری سکراوا سے پنہوانہ

آج رات سردی پھر شدت کی تھی۔ میرے خدمتگار نے ہندوستانی
نوکروں کی سخت قوت برداشت کے باوجود رات میرے خیمے کے ایک
کھلے پہلو میں گزاری اور اس طرح مؤدبانہ لیکن پرزور طریق سے میرے غسل خانہ
کا پردہ روک لیا۔

دیہاتی اشتہارات:۔ اس صبح سیکروا میں سے گزرتے ہوئے ہم
نے گھروالوں کی دیواروں پر دیہات پرچار کے اشتہارات لگے ہوئے دیکھے۔
وہ اتنے ... کہ ظاہر طور پر یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ ہمارے فائدے کے
لئے لگائے گئے تھے۔ لیکن اونچے اتنے تھے کہ کوئی گھوڑے پر بیٹھے ہوئے

بھی انہیں پڑھ نہ سکتا تھا۔ کسی نے معذرت کے طور پر کہا کہ اگر ہم انہیں نیچے لگائیں تو بچے پھاڑ دیتے ہیں۔

دیہاتی باجہ :۔ میں راہ میں بسرو میں ٹھہرا۔ اس میں ۲۵۴ گھر تھے۔ وہ ایک معمولی اونچی سطح پر آباد تھا۔ اس کا نصف حصہ پہاڑی تھا۔ اور نصف میں سنگریزے پائے جاتے تھے۔ میرا استقبال باجے کے ساتھ کیا گیا۔ جسمیں چھ شخص شامل تھے۔ ان میں سے چار آدمی تھے۔ اور دو لڑکے وہ دو طنبور دو ڈھول (جن میں سے ایک فرانسیسی اصل سے تھا۔ جسے طنبور کہتے ہیں) اور ایک چھوٹی جھانجھ بجا رہے تھے۔ یہ لوگ بسرو کے رہنے والے ہیں۔ اور جب دن رات کی شمع خراشی سے اکتا جاتے ہیں۔ تو درباں بنتے ہیں۔ سال میں دو مرتبہ گاؤں کے جھنڈے کو تزک واحتشام سے چوپال تک لے جاتے ہیں۔ یہ کوئی نہ بتا سکا کہ ایسا کیوں کیا جاتا تھا۔

حفظان صحت :۔ وہ گلی جس میں سے ہوکر ہمارا چھوٹا سا قافلہ سارے گاؤں سے گذرا نہایت صاف تھی۔ اور ایسی ہی جگہ وہ تھی۔ جہاں میو اور دوسرے لوگ بینک کے معائینے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ لیکن بعدازاں مسجد کو دیکھنے کے خیال سے ہم اتفاقیہ ایک اور راستے سے گذرے۔ جو خس وخاشاک سے اٹا پڑا تھا۔ سب سے گندی شے چاروں چوپالوں میں سے ایک چوپال تھی۔ سُرخ اینٹوں کے برجوں کے ساتھ یہ باہر سے ایک قلعہ معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اندر سے ایسی تھی۔ جیسے کوئی غیر مستعملہ گودام۔ ہفتوں وہاں کوئی بھنگی نہ آسکا ہوگا۔ گاؤں صاف رکھنے میں بڑی تکلیف یہ ہے۔ کہ بھنگیوں کی تعداد تھوڑی ہے۔ کسی نہ کسی وجہ سے صرف دو کنبے رہتے ہیں۔ اور وہ پرانی اُجرت پر نئے طرز کا تمام کام کرنے سے لازمی طور پر انکار کر دیتے ہیں۔ پہلے ہر ایک کہتا تھا۔ کہ تمام گاؤں ہر روز صاف کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ بالکل واہیات بات تھی۔ اور ایک بھنگی نے یہ کہکر اسے رد کردیا کہ تین محلوں میں سے صرف ایک صاف رکھا جاتا ہے۔ اس محلے میں سے ہر ایک ان کو حسب معمول آدھی روٹی دینے کی بجائے ایک روٹی دیتا تھا۔ اور دوسرے لوگوں نے کسی قسم کا مزید معاوضہ دینے سے انکار کردیا تھا۔

کھاد کے گڑھے :۔ اس بات پر سب متفق تھے۔ کہ صفائی اچھی چیز ہے۔ اور کھاد قابل قدر شے ہے۔ اور گردونواح کی صفائی صحت کے لئے عمدہ ہے۔ لیکن کھاد کے گڑھے کے فوائد کے متعلق آرا میں سخت اختلاف تھا۔ بسرو کے

لوگوں میں سے جن کی زمین اونچی اور خشک ہے۔ ایک ایک نے اُسے پسند کیا لیکن مبارک پور کے میوؤں نے جن میں سے کچھ وہاں حاضر تھے۔ اُسے ناقابلِ استعمال قرار دیا۔ انہوں نے بتایا کہ ہماری زمین نیچی ہے۔ اور پانی کی سطح اونچی۔ اس لئے بارش کے دنوں میں نیچے سے پانی پھوٹ پڑتا ہے۔ اور کھاد خراب کر دیتا ہے۔ لوگوں کو اجتماعی طور پر ترقی دینے کے خطرے کی یہ ایک اچھی مثال ہے۔ جو شے ایک آدمی کے لئے گوشت کا حکم رکھتی ہے۔ دوسرے کے لئے زہر بن جاتی ہے۔

حصاری بیل:۔ دونوں گاؤں اس امر پر متفق تھے۔ کہ وہ حصاری بیل ہمارے لئے موزون نہیں ہیں۔ کل کے اعتراضات پھر دہرائے گئے۔ اور ایک نے مبالغہ آمیز طور پر کہا کہ ہمارے بیل نے ۱۰۰۰ روپیہ کا نقصان کر دیا ہے۔ بسرو کے لوگ خاص طور پر ترش رو تھے۔ کیونکہ اُن کا بیل جنگل میں چلا گیا تھا۔ اور پھر کہیں نہیں دیکھا گیا تھا۔

مشترکہ تعلیم:۔ میں نے سرسری طور پر ایک لوئر مڈل سکول کو دیکھا۔ میں نے اس سے زیادہ نامعقول عمارت بہت کم دیکھی ہے۔ اس کی سجاوٹ صرف یہ تھی کہ اس پر کبوتروں کی پنجال پڑی تھی۔ اس وقت سکول میں ۱۴۰ طالب علم تھے۔ نئی نسل کو ایسے ماحول میں تعلیم دینے کا مطلب صاف طور پر یہ ہے۔ کہ وہ یقینی طور پر عمارت سے زیادہ گندی ہوگی۔ لیکن ضلع کے اس حصے میں یہ خصوصیت صرف اسی سکول میں دکھائی دیتی ہے۔ چند لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ کچھ کام کر رہی تھیں گیارہ کے نام درج ہیں۔ اور سات یا آٹھ ہر روز آجاتی ہیں۔ انہیں پڑھانے کے لئے کوئی اُستانی نہیں ہے۔ میوؤں نے بتایا کہ ہم اپنی لڑکیوں کو تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کے لئے علیحدہ سکول ہونا چاہیئے۔ اور اگر یہ ناممکن ہو تو کم از کم ایک استانی ضرور ہونی چاہیئے۔ اور اگر یہ بھی ناممکن ہو تو پھر انہیں لڑکوں کے ساتھ ہی پڑھنے دیا جائے۔ لیکن صرف دس برس کی عمر تک اور اس کے بعد نہیں۔

اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح یہ میو بھی نہایت غریبانہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ نہایت فرمانبردار اور تقریباً بالکل ان پڑھ تھے۔ تاہم جیسا کہ پہلے اکثر دیکھنے میں آیا ہے۔ بوڑھے آدمیوں میں سے ایک یا دو نہایت آزادی۔ صفائی اور موثر طریق سے گفتگو کر سکتے تھے۔ ان میں سے ایک نے بصد شدومد یہ کہا کہ گذشتہ

بیس سالوں میں میو قوم بہت گر گئی ہے۔ اور اس کی نیت خراب ہو گئی ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ اخراجات بڑھ گئے ہیں۔ اور کنبوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ زمین کا لگان جو کبھی ۵ آنے ہوا کرتا تھا۔ اب ۴ گنا ہے۔ پہلے وقتوں میں لڑکے ایک دھوتی اور ایک چادر پر قناعت کر لیتے تھے۔ لیکن اب ۵ روپیہ کی پگڑی سر پر باندھتے ہیں۔ دس روپے کا کوٹ پہنتے ہیں۔ اور دھوتی کی بجائے نہایت قیمتی پتلون پہنتے ہیں۔ جن شادیوں پر ۱۰۰ روپیہ خرچ ہوا کرتا تھا۔ اب ان پر دس یا بیس گنا زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ اور فصلیں بھی اتنی اچھی نہیں ہیں۔ جتنی کہ ہوا کرتی تھیں۔ اس پر ایک نئی نسل کا تیز فہم مگر باتونی ممبر اٹھا اور کہا رسمیں نہیں بدلی ہیں۔ پہلے کی طرح اچھی اور بڑی دعوتیں ہیں۔ اس کے ذرا دیر بعد ایک شخص نے ماتمی دعوت (کاج) کا ذکر کیا۔ جو تیس برس گذرے اجرت پور میں کی گئی تھی۔ اور جس میں تمام قوم شامل تھی۔ ہزاروں لوگ وہاں موجود تھے۔ اور کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس پر کیا لاگت آئی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ پرانے اچھے دنوں میں بھی روپیہ آزادی سے خرچ کیا جاتا ہے۔

تعمیر مسجد:۔ میوؤں کا مذہب۔ ہندو دھرم اور اسلام کی ایک مضحکہ خیز آمیزش ہے۔ اس کی بیرونی اور نمایاں نشانی یہ ہے۔ کہ وہ اسی قسم کی دھوتی پہنتے ہیں۔ دوسری کڑی یہ ہے۔ کہ مٹی کے برتن کھانے کے لئے دوبارہ نہیں استعمال کئے جا سکتے۔ اور سب سے عجیب یہ ہے کہ دلہا کے گھر شادی کی تاریخ لے جانے کے لئے بجائے نائی کے برہمن کو مقرر کیا جاتا ہے۔ اور اس کام کے لئے اسے ایک روپیہ ملتا ہے۔ اچھوتوں کی طرف ان کا رویہ وہی ہے۔ جس کا ذکر کل کیا گیا تھا۔ تاہم اسلامی احساس قوی ہے۔ دس سال گذرے تین محلوں میں سے ایک نے یہ فیصلہ کیا کہ مسجد ہمارے مطلب کے مطابق نہیں ہے۔ اسے بہتر بنانا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی کام شروع ہو گیا۔ اور اس وقت سے کبھی بند اور کبھی جاری چلا آیا ہے۔ جتنی ضرورت ہوتی ہے۔ اتنا ہی روپیہ فراہم کر لیا جاتا ہے۔ اندازہ لگا کر محلے کے سو گھروں میں سے ہر ایک سے اس کا حصہ لے لیا جاتا ہے۔ اس طرح دو روپیہ سے لے کر ۵ روپیہ تک دس مرتبہ لے چکے ہیں۔ ہر کنبہ برابر کی رقم ادا کرتا اور اپنی باری پر کام بھی کرتا ہے۔ چونکہ کام فی سبیل اللہ کیا جاتا ہے۔ اس لئے مزدوری کی کوئی اجرت نہیں لی جاتی۔ نئی عمارت ابھی تک نامکمل

حالت میں ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ تجویز کی گئی ہے۔ کہ سرخ اینٹوں والے رُخ
کے مقابل خمدار لوہے کا برآمدہ ڈالا جائے۔ میں نے اس کی سختی سے تردید کی۔ اور
اُن کی توجہ خوبصورتی کے اُس احساس کی طرف مبذول کی جس کی علامات میں
جگہ جگہ دیکھتا آیا تھا۔ مثال کے طور پر اس گاؤں میں زمیندار کے گھر کا بڑا دروازہ
نہایت عمدہ تھا۔ اور اس کے ذرا باہر ایک سرائے تھی۔ جو اپنے تناسب
اور سادگی کے لحاظ سے جو دیہاتی ماحول کے بالکل مطابق تھی۔ تقریباً مکمل تھی
کوئیں اُتارنا۔ مسجد اور سرائے دونوں گاؤں کی مذہبی طاقت کا مظاہرہ کرتی
ہیں۔ اس کے باوجود کوئی مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی۔ چھ مسجدوں کے مُلاّنوں میں
سے ایک بھی قرآن شریف نہیں سمجھتا۔ وہ گاؤں کے لڑکوں کو صرف عربی عبارت
پڑھنی سکھاتے ہیں۔ بہت شاذ ایک سال۔ دو سال اور کبھی تین سال کے
بعد باہر سے کوئی مولوی آجاتا ہے۔ اور وعظ کہتا ہے۔ تاہم پڑوسی کے حقوق
خوب پہچانتے جاتے ہیں۔ جب کوئی شخص کوئی ایسا کام کرتا ہے۔ جو اس کی
طاقت سے باہر ہوتا ہے۔ تو اس کا طریقہ عمل میں لایا جاتا ہے۔ اور پڑوسی اس
کی امداد کے لئے آتے ہیں۔ سامنے ایک کھیت میں ایک آدھے اُتارے ہوئے
کوئیں کا اینٹوں کا گھیرا صاف طور پر نظر آرہا ہے۔ یہ اسی طریق سے بنایا جا رہا
تھا۔ جب کام جاری ہوتا ہے۔ ۵۰ سے لے کر ۱۰۰ آدمیوں تک کے گروہ بیل
لے کر باہر آجاتے ہیں۔ اور کنواں اُتارنے میں مدد دیتے ہیں۔ گذشتہ موسم گرما میں
یہ کام بیس دن تک ہوتا رہا۔ اور اس وقت چھوڑا گیا جب دوسرا کام کرنا باقی رہ
گیا۔ آئندہ گرمی میں جب کام ذرا ہلکا پڑ جائے گا۔ تو اسے پھر شروع کیا جائے
گا۔ لوگوں کو امداد دینے میں سہولت بہم پہنچنے کے لئے خالی دنوں کا ہونا ضروری
ہے۔ سردی کی نسبت گرمی کا موسم بہتر ہے۔ کیونکہ سردیوں میں دن چھوٹے۔ پانی
ٹھنڈا اور بیل کمزور ہوتے ہیں۔ امداد کرنے والوں کو اس کے صلے میں صرف دوپہر
کے وقت کھانے کیلئے چاول ملتے ہیں۔ جن میں مصالحہ اور گڑ ڈالا ہوا ہوتا ہے۔
(میٹھے چاول) اس پر بھی اگر پانی صرف ۲۲ فٹ نیچے ہے۔ تو کوئیں پر ایک
ہزار سے زیادہ روپیہ خرچ ہو جائے گا۔ جو لوگ امداد کے لئے آتے ہیں۔ انہیں
کھلانے کا بھی کافی خرچ پڑتا ہے۔ اور اس رسم سے جس کا پہلے بھی ذکر
آچکا ہے۔ یعنی مٹی کے برتنوں کو دوبارہ نہ استعمال کرنے سے خرچ اور بھی

بڑھ جاتا ہے۔ ہر شخص ایک رکابی (دامری) لیتا ہے۔ اور اُن پر ۵ روپے فی سینکڑہ خرچ آتا ہے۔ یہ صرف نمائشی خرچ ہے۔ ایک مٹی کا برتن بارِ دیگر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایک اچھوت کو بطور دایہ بلایا جا سکتا ہے۔ نامناسب کی اس سے زیادہ اور کیا حد ہو سکتی ہے۔ کہ دایہ مبارک پور میں ایک چماری اور بسرو میں داد لوہڑوں کی بیویاں ہیں۔

پنچایتیں:۔ جیسا کہ مسجد اور کوئیں کی مثال سے ہر شخص توقع کر سکتا ہے۔ متفقہ زندگی میوؤں میں نہایت قوی ہے۔ مشترکہ امور کے تنازعات کا فیصلہ پنچائت کرتی ہے۔ قوم کا مقامی چودھری یا سردار اجلاس منعقد کرتا ہے۔ اور پورے مباحثے کے بعد اس کا فیصلہ قطعی ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک چودھری حاضر تھا۔ اس نے بتایا کہ میرا خطاب خاندانی ہے۔ اور یہ ہمیں کسی بادشاہ نے عطا کیا تھا۔ جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا"۔ اس کا حکم تیرہ گاؤں پر چلتا ہے۔ ابھی صرف دو ہی دن ہوئے مویشیوں کے بھٹک کر کسی کے کھیت میں چلے جانے کے جھگڑے پر غور کرنے کیلئے پنچایت کا ایک اجلاس منعقد ہوا تھا۔ (۹ میل)

۵ جنوری پنہوانہ سے ہوڈل

گوڑگاؤں کا تجربہ:۔ اس ضلع سے رخصت ہونے سے پہلے مجھے اُس سوال کا ضرور جواب دینا چاہیئے۔ جو اس میں داخل ہوتے وقت کیا گیا تھا۔ خواہ وہ کتنا ہی ناکافی کیوں نہ ہو۔ جو تجربہ گوڑگاؤں میں کیا گیا۔ وہ کامیاب ہوا یا ناکامیاب رہا؟ اس کے مقاصد۔ ذرائع اور قواعد کے درمیان مجھے تمیز کرنی ضرور ہے۔ جن لوگوں نے سر ہوریس پلنکیٹ کے مشہور مقولے (بہتر زراعت برتر کاروبار۔ خوشتر حیات کو اپنا نظریہ بنایا ہوا ہے۔ وہ سب اس کے مقاصد کی تعریف کرینگے۔ کیونکہ اسمیں انہی تین مطالب کو ہندوستانی دیہاتی جامہ میں دوبارہ بیان کیا ہوا ہے۔ اس تکرار بیان کو قوت دی ہے۔ اور یہ ایک ایسی وحدانیت ہے۔ جس کے متعلق یہ خطرہ تھا۔ کہ لوگ اپنے اپنے محکموں کے خیالات میں محو ہوکر بھول جائیں گے۔ یہ کام اس قدر پرزور اور مستعد طریق سے کیا گیا۔ کہ اس نے بہت سے ایسے لوگوں کی توجہ بھی جذب کر لی جنہوں نے اتنک اس مضمون میں بالکل دلچسپی نہیں لی تھی۔

ذرائع میں سے بھی بہت سے اچھے تھے۔ مثال کے طور پر بہتر زراعت کے فائدے کے لئے پانی اور کھاد کے ذخیرے کو بڑھانے کی کوشش بالکل بجا تھی۔ کیونکہ یہ زراعتی ترقی کی بنیادیں ہیں۔ اور کام کاج کے فوائد کے لئے بھی یہ بالکل صحیح تھا۔ کہ چیز کی بنیاد امداد باہمی پر رکھی جائے۔ کیونکہ تمام موجودہ دنیا اس امر کو تسلیم کرتی ہے۔ کہ دیہاتی کی بہبود کے لئے اس کا وجود ضروری ہے۔ خوشتر حیات کے سلسلے میں مسٹر برین نے دیہات کی صفائی اور عورت کی تعلیم کو اپنے ملک کی ابتدا و انتہا قرار دے کر نہایت دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ کیونکہ موجودہ حالات میں دونو صورتیں قابل افسوس ہیں مسٹر گاندھی کہتے ہیں۔ کہ ہمارے دیہات گوبر کے ڈھیر ہیں۔ اور گلیاں باوجود اس کے کہ ہر لاکھوں ننگے پاؤں پھرتے ہیں۔ ناقابل گذر ہیں لؔ صرف موسوی آیات کا استعمال جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے اکثر کی کایا پلٹ سکتا ہے۔ عورتوں کے متعلق کہنے کی بات یہ ہے۔ کہ بہت سے اضلاع میں ہزاروں لوگ انہیں خریدتے اور فروخت کرتے ہیں۔ متذکرہ تجربہ کا بیش قیمت پہلو یہ تھا۔ کہ ان دو باتوں پر خاص زور دیا گیا تھا۔ اور تمام ذرائع میں سے کامیاب ذریعہ کھاد کا گڑھا تھا۔ جس کے ذریعے سے صاف گاؤں اور بہتر کاشتکاری کو ربط دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ عورتوں کو تعلیم دینے کی کوشش کم کامیاب رہی ہے۔ دیہاتی عورتوں کو استانیاں بنانے کی تربیت دینے کے لئے سکول کا اجرا ایک صحیح اقدام تھا۔ اور اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا۔ لیکن مشترکہ تعلیم فوری قبولیت کے لئے بہت انوکھی ثابت ہوئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ دس یا گیارہ برس کی عمر تک تعلیم مشترکہ رہے۔ لیکن یہ بھی صرف اس صورت میں جبکہ سکول ماسٹر پر پورا بھروسہ ہو۔

دوسرے ذرائع کے متعلق یہ ہے۔ کہ ان میں سے رہٹ کو کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اگرچہ اسمیں بھی بہت سے پہلے لگائے گئے اور بعد میں برطرف کر دیئے گئے۔ حصاری بیل بھی اپنا نشان ضلع چھوڑتا جاتا ہے۔ لیکن اس پر نہایت تلخ تنقید بھی کی جاتی ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے۔ گویا یہ ایسے علاقوں کے لئے موزوں ہے۔ جہاں آبپاشی کی جاتی ہے۔ جہاں بیل سے سخت محنت کی توقع کی جاتی ہے۔ اور جہاں باقی چارہ بہم پہنچ سکتا ہے۔ باقی حصوں میں زمین اتنی

ضرورت ہے۔ کہ اس کے لئے کام مہیا نہیں کر سکتی۔ اور لوگ اتنے غریب ہیں کہ
ے مویشیوں کے لئے کافی خوراک نہیں بچا سکتے۔ گوڑگاؤں کا ہل اور دیہاتی
رہبر دونو ناکامیاب ذرائع میں سے ہیں۔ ہل مقامی حالات کے لحاظ سے موزوں
نہیں ہے۔ اور بالکل غیر معروف ہے۔ اور ایسے غریب لوگوں کے لئے جیسے کہ
گوڑگاؤں میں اکثر ہیں۔ یہ ہل ۲۵ روپے میں اتنا قیمتی ہے۔ کہ وہ خرید نہیں سکتے
دیہاتی رہبر بھی ایک زائد خرچ ہے۔ اور اس وقت تقریباً فضول ہے۔ اسے بنانے
کا مقصد یہ تھا۔ کہ دیہاتیوں کے پاس انہی جیسے لوگ بھیجے جائیں۔ تاکہ وہ دیہاتی
زندگی کو مجموعی حیثیت سے مدنظر رکھیں۔ اور انہیں عام طور پر زندگی کے مختلف
مسائل کے متعلق نصیحت کریں۔ اور اس طرح انہیں محکمہ جات کے ماہرین سے
تعلقات رکھنے کی ضرورت سے بچائیں۔ اس لئے نتیجہ یہ ہے کہ اس طرح دیہاتی
کی امداد اور بعض اوقات حیرانی کے لئے سابقہ محکمہ جات میں ایک محکمہ کا اضافہ کرنا
ہے۔ اور نہ مڈل پاس یا مڈل فیل جیسے کہ اکثر رہبر ہیں۔ اس قدر قابل معلوم ہوتے
ہیں۔ کہ وہ کبھی فائدہ مند طریق سے دیہاتی کو زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق
نصیحت کر سکیں۔

کیا یہ تجربہ کامیاب رہا؟ مسٹر برین کا دعوے ہے۔ کہ تجربہ کامیاب رہا
اور گوڑگاؤں سکیم مکمل ہے۔ اور منطق پر مبنی ہے۔ اور موجودہ حالات کے لئے
عملی اور تسلی بخش علاج ہے۔ اگر ہم اس کے فوری نتائج کو مدنظر رکھ کر فیصلہ
کریں۔ تو وہ درست معلوم ہوتے ہیں۔ گڑھے ہزاروں کھودے گئے۔ حصاری بیل
اور گوڑگاؤں کے سینکڑوں ہل خریدے گئے۔ اور بیسیوں رہٹ لگائے گئے
گاؤں صاف کئے گئے اور پھر صاف کئے گئے۔ پلول کے سالانہ میلے میں لوگ
جوق در جوق شامل ہوئے۔ ہائی سکولوں کے لئے بڑی بڑی رقمیں جمع کی گئیں
اور بہت سی لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ سکول جاتی رہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا
ہے۔ کہ حصاری بیل سے کتنے تیز جذبات ابھارے جا سکتے ہیں۔ اور بعض
اوقات کھاد کے گڑھے کا خیال بھی کس غفلت سے رکھا جاتا ہے۔ اس
تبدیلی کی وجہ کیا ہے؟

غالباً کچھ تو اس وجہ سے کہ مسٹر برین نے اپنی کھوئی ہوئی طاقت اور سرگرمی
واپس کھینچ لی ہے۔ اور کچھ روپیہ کی کمی سے بھی۔ گوڑگاؤں کی سکیم ایک قیمتی

کاروبار ثابت ہوئی ہے۔ صرف گذشتہ پلول کے میلے پر ۴۰۰۰۰ روپیہ خرچ آیا ہے۔ اور ڈسٹرکٹ بورڈ دیوالیہ بن گئی ہے۔ اگرچہ افسرانہ امداد اب بھی نہایت فراخ حوصلگی سے دی جا رہی ہے۔ لیکن زیادہ تر اس قدر خرچ کی وجہ یہ ہے۔ کہ اب افسرانہ اثر سے کام نہیں لیا جاتا۔ یہ ایک اہم نقطہ ہے۔

طریقے :۔ یہ طریقے پرزور تبلیغ اور افسرانہ تحکّم کے آزادانہ استعمال پر مشتمل تھے۔ جیساکہ پہلے بھی دیکھا جا چکا ہے۔ افسرانہ تحکّم سے کام لینے کی وجہ یہ تھی۔ کہ مسٹر برین کے پاس وقت غیر یقینی تھا۔ اور جانے سے پہلے کام مکمل کر کے تنقید کے لئے چھوڑنے کی خواہش بہت۔ اگرچہ تحکّم کا استعمال آزمائش کی فوری کامیابی کا ذمہ دار ہے۔ لیکن اس کامیابی کی مختصر عمر کی وجہ بھی دراصل زیادہ تر یہی ہے۔ دیہاتی پر ایسے ذرائع اختیار کرنے کے لئے دباؤ دیا گیا۔ جن کے لئے وہ کسی قسم کی رغبت یا طاقت نہ رکھتا تھا۔ انتہائی فرمانبردار ہونے کی وجہ سے جو کچھ اسے کہا گیا۔ اس نے کر دیا۔ جب تک دباؤ رہا وہ اُسے کرتا رہا۔ اگرچہ اس تمام کام کرنے کے بوجھ سے وہ دبا رہا۔ لیکن جونہی کہ دباؤ ڈھیلا پڑا اس نے نہایت خوشی سے بوجھ کو اپنی کمر پر سے پھسل جانے دیا۔ اس ملک میں جہاں دیہاتی دیر سے اس بات کے عادی ہیں۔ کہ ہر ایک بات کو جو اوپر سے اُس کے پاس پہنچے حکم سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ اور جہاں ماتحت افسروں کی ایک ایسی جماعت ساتھ ہو۔ جو بجائے رغبت دلانے کے حکومت کرنے کے زیادہ عادی ہیں۔ افسرانہ اثر کی سعی سے تقریباً ہر چیز حاصل کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ اسے بغیر کسی روک کے استعمال کیا جائے۔ لیکن ایسی مہمات بے بنیاد ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کو مضبوط کرنے والی شے صرف ذاتی اختیار ہوتا ہے۔ جو اپنے دباؤ میں غیر یقینی اور رہنمائی میں تغیر پذیر ہوتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کا اثر اگر زیادہ سعی کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ تو دیہاتی تک پہنچتے پہنچتے حکم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پس اگر حکم کے ذریعے آگے بڑھنے کی خواہش ہو تو قانون ہی اس کا صرف ایک تسلی بخش طریقہ ہے۔ کیونکہ پھر فوراً احکام نافذ کئے جا سکتے ہیں۔ اور مستقل طور پر جاری رکھے جا سکتے ہیں۔ اور نہ ہی وہ احکام ایک ایسے افسر کی مرضی پر منحصر ہوتے ہیں۔ جو آج یہاں ہے۔ تو کل وہاں۔ لیکن اگر ایک خاص علاج یا اصلاح قانون کی زد میں نہیں آتے۔ تو اُسے مستقل

طور پر اختیار کرانے کا طریقہ صرف یہی ہے۔ کہ لوگوں کو پختہ یقین دلایا جائے۔ کہ یہ اُن کے فائدے کے لئے ہے۔ اور انہیں اس کا احساس قدر قوی طور پر کرایا جائے۔ کہ وہ اُسے خود بخود کام میں لانے لگیں۔ اس صورت میں انفرادی مرضی یا دیہاتی قوم یا یوں کہئے۔ کہ انجمن امداد باہمی کی وساطت سے ظاہر کی ہوئی عام رائے کی اجتماعی طاقت کی تصدیق اس کے ساتھ ہوگی۔ یہی بات ہر اس شخص کی جو حقیقی طور پر امداد باہمی کا کام کرتا ہے۔ رگ رگ میں سرایت کی ہوئی ہے۔ اور وہ رضا جوئی کی بجائے افسرانہ اثر سے کام لینے کو ہمیشہ ایک غلطی تصور کرتا ہے۔

تبلیغ:۔ لیکن صرف رضا جوئی ہی کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی ہونی چاہیئے۔ گوڑگاؤں میں تعلیم کافی طور پر نہیں دی گئی تھی۔ اس کے بجائے پروپاگنڈا کو بہت زیادہ استعمال میں لایا گیا تھا۔ یہ لفظ جواب ہر سیاست دان۔ نامہ نگار اور مصلح کی زبان پر ہے۔ اس قدر مبہم طریق پر استعمال کیا جاتا ہے۔ کہ یہ تعلیم سے لے کر اشتہار بازی تک سب چیزوں پر حاوی ہے۔ جنگ عظیم کے اخلاق پست کرنے والے اثرات میں پیدا ہونے کی وجہ سے یہ تعلیم اور سیاسی مصلحت کے ناپاک اتحاد کا نتیجہ ہے۔ اور ہمیشہ بہتر سے بہتر حالت میں بھی اپنی کمینہ اصلیت کا کچھ نشان باقی رکھتا ہے۔ یعنی کچھ جھوٹ کی لذت کچھ رذالت پر آوازہ۔ بعض لوگ اسے تعلیم کے ساتھ اُلجھا لیتے ہیں۔ لیکن دونوں کے درمیان ایک حد ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی باریک کیوں نہ ہو۔ تعلیم کی نظر حقیقت پر ہوتی ہے۔ اور تبلیغ کی انجام پر۔ تعلیم اقرار سے تعلق رکھتی ہے۔ اور تبلیغ اجتماع سے۔ انفرادی طور پر تعلق رکھنے کی وجہ سے تعلیم سب سے کمزور ترین شخص کی طاقت سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اور اس وجہ سے تبلیغ کرنے والا اس خیال سے مطمئن ہوتا ہے۔ کہ جو اُس نے بویا ہے۔ دوسرے کاٹیں گے۔ لیکن مبلغ جونہی کہ کچھ یہ کوشش کرتا ہے۔ کہ لوگ اپنے لئے خود تجاویز سوچیں۔ لیکن مبلغ اپنی غرض کے علاوہ باقی سب سے آنکھیں بند کر کے لوگوں کو سوچنے کی بات خود ہی بتا کر انہیں سوچنے کی تکلیف سے کلی طور پر بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے۔ وہ سینما کے آتشیں بندھ۔ آلۂ جہیر الصوت نقاریہ۔ بیانات۔ نغمہ جات۔ ناٹکوں۔ مضحکہ خیز تصویروں۔ پوسٹروں اور

اشتہاروں کی مدد سے اپنے شکاریوں کو اپنے گرد کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ سوچ بچار بالکل ناممکن ہو جاتی ہے۔ اشتہار بازی کے تمام فنون کو اختیار کر کے وہ یہ کام کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ذہنی قوے مخمور و مسحور ہو جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات اس قدر مشتعل ہو جاتے ہیں کہ صدمہ اٹھاتے ہیں۔ تعلیم سے ہمیں زیادہ سے زیادہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن تبلیغ سے ہمیں بہت بھی شکل سے ملتا ہے۔ پروپیگنڈا کو اگر تعلیم کے لئے بطور خادم نہ کہ برنگ حاکم استعمال کیا جائے۔ تو ممکن ہے کہ اس جگہ کارآمد ثابت ہو۔ جہاں مادی فوائد کا تعلق ہے۔ وحدت عمل بداہتاً معقول بھی ہے اور مرغوب بھی کھاد کے گڑھے ایسے گاؤں میں کھودے گئے ہیں۔ جن کو ان کی ضرورت نہیں بھاری بیل ایسے علاقوں کو دیئے گئے ہیں۔ جو ان کو پسند نہیں کرتے۔ اور گوڑگاؤں کا ہل اور رہٹ ایسے لوگوں نے خریدے ہیں۔ جو انہیں استعمال نہیں کرتے اس لئے مجھے اس خیال کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ کہ افسرانہ تحکم کا آزادانہ استعمال بہ نسبت تبلیغ کے آزادانہ استعمال کے زیادہ بڑی غلطی تھی۔ کیونکہ جس طرح افسرانہ تحکم کو رضا جوئی کا بدل بنا لیا گیا۔ اسی طرح اجتماعی تبلیغ نے بڑی حد تک انفرادی جگہ کی تعلیم لے لی۔ یہ ظاہر ہے کہ اس تعلیم کی وجہ سے اور اس لئے کہ ترقی کی رفتار بہت سست تھی۔ اس ضلع میں امداد باہمی کی تحریک ابتدائی کوشش میں ناکامیاب رہی۔

گوڑگاؤں کی سکیم میں استعمال کردہ طریقوں کی تنقید کرنے کی ضرورت مجھے اس لئے محسوس ہوئی کہ دوسری جگہوں میں ان کے استعمال میں لائے جانے کے آثار نظر آتے ہیں۔ اور میرا خیال یہ ہے۔ کہ اس طرح ترقی حاصل نہیں ہو سکتی۔ گوڑگاؤں میں ان کا استعمال اس وجہ سے جائز قرار دیا جاتا ہے۔ کہ اس قدر محدود وقت میں یہ ضروری تھا۔ کہ پہلے خاص حقائق کی تشریح کی جائے۔ اور دوسرے یہ کہ ہندوستان کی توجہ دیہاتی بہبود کے مسئلے پر قائم کر دی جائے۔ اگر کسی کو پہلی بات کی کامیابی پر شبہ ہو۔ تو دوسری کی ترقی پر تو کوئی شک ہی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ گوڑگاؤں میں اگر متذکرہ سکیم کو جزوی پامالی کا صدمہ پہنچا ہے۔ تو باہر تو اس کا اثر دور دور تک پھیلا ہے۔ جہاں تک اس ضلع کا تعلق ہے۔ ایک ناسور اکالی نے میرے ایک ہندوستانی دوست

کو بتایا کہ اگر گوڑگاؤں کی بجائے مسٹر برین کو وسطی پنجاب میں بھیج دیا جاتا۔ تو وہاں کوئی اکالی تحریک نہ ہوتی۔ خواہ یہ سچ ہو یا نہ ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ گزشتہ کئی سال سے بہت سے لوگوں نے دیہاتی مسئلے کی طوالت کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ اس امر کو محسوس کیا ہے۔ کہ گورنمنٹ دیہاتی حالات کو ترقی دینے کے لئے کافی کام نہیں کر رہی ہے۔ عین گوڑگاؤں میں میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے۔ کہ جو کچھ غلطیاں کی گئی ہیں۔ وہ اس طریق کار کی شکرگزاری میں بھلائی جا چکی ہیں۔ جس پر کار بند ہو کر مسٹر اور مسنر برین ہماری خدمات بجا لاتی رہیں۔ دوسروں کو بھی اس تمثیل کے لئے شکرگزار ہونا چاہیئے جسے ہم سب کو دیہاتی کی خدمت پر مائل و راغب کرنا چاہیئے۔

باب ششم جالندھر

گھر۔ نقل مکانی۔ کام

۱۸ جنوری۔ پھلور سے بندالہ

ہندوستان کی شمالی سرحد :- ایک ہی رات کے سفر میں ہم پھلور پہنچ گئے۔ اور ستلج کے کناروں پر واپس آ گئے۔ ان پانچ دریاؤں میں سے جو پنجاب کے نام کی وجہ تسمیہ ہیں۔ دریائے ستلج سب سے جنوبی ہے۔ یہ اپنی چھال اور دریائی علاقے کے ساتھ جسمیں کچھ انبالہ کا اور زیادہ تر فیروزپور اور لدھیانہ کا علاقہ شامل ہے۔ پنجاب اور ہندوستان کی اصلی حد قائم کرتا ہے۔ ہندوستان دراصل ہندو دھرم اور ہندوؤں کی زمین ہے۔ لیکن اُن میدانوں میں جو پانچوں دریاؤں میں سے سب سے شمالی دریا یعنی جہلم تک پھیلے ہوئے ہیں۔ سکھ اور مسلمان غالب ہیں۔ اور دیہاتیوں میں سوائے پہاڑی دامنوں کے ہندو کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ نسلی طور پر یہ دیہاتی دکن کے دراوڑوں کی نسبت وسط ایشیا کی جفاکش قوموں سے زیادہ گہرا رشتہ رکھتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کی نسبت قد لمبا۔ رنگ ہلکا اور خط و خال اُبھرے ہوئے رکھتے ہیں۔ فہم و فراست میں اُن سے سست ہیں۔ لیکن جنگجوئی دلیری اور جوانمردی میں اُن سے سراسر زیادہ ہیں۔ دریائے ستلج کو بلاشبہ شمالی ہندوستان کی حد سمجھا جا سکتا ہے۔

جالندھر :- ضلع جالندھر جسمیں مَیں آج داخل ہُوا۔ اس حد کے عین شمال میں واقع ہے۔ اور صوبہ کا سب سے چھوٹا ضلع ہے۔ ہوشیارپور سے چل کر یہ گراہ شنکر کی تحصیل سے بہت ملتا جلتا ہے۔ لیکن پہاڑوں سے دور واقع

ہونے کی وجہ سے اسمیں وسطی پنجاب اور اس کے لامتناہی میدانوں کی علامات زیادہ پائی جاتی ہیں۔ یہاں ایک اصلی پنجابی اپنی سادہ عادات اور وجیہہ شکل و شباہت کے ساتھ بہتر سے بہتر کوشش کرتا ہوا دیکھا جاتا ہے۔ وہ نہایت قوی دور اندیش اور پرلے درجے کا محنتی ہے۔ ہندوستان میں اس سے بہتر کاشتکار یا بہتر کوارپریٹر ملنا مشکل ہے۔ پہلی بات کی وجہ یہ ہے کہ اسکی کاشتکاری کی بنیاد کوئیں پر ہے۔ جو نہر پر منحصر ہونے کی نسبت اُسے یقینی طور پر پانی کی زیادہ بہم پہنچاتا ہے۔ اور اس پر اس کی بہت زیادہ طاقت کا مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن جائدادیں اتنی قلیل ہیں۔ جتنی کہ گڑھ شنکر میں اور آئے دن کی بڑھتی ہوئی آبادی کو زندہ رکھنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ اس لئے گڑھ شنکر کی طرح بیشمار لوگ روزی کی تلاش میں اور کہیں مثلاً ملازمت۔ نہری بستیوں اور کئی ایک غیر ملکوں میں دھکیل دئیے گئے ہیں۔ لوگوں نے ہزاروں کی تعداد میں نقل مکانی کی ہے۔ اور ۱۹۲۵ء میں ۲۴۲۶ پاسپورٹ جاری کئے گئے تھے۔ جن میں سے زیادہ تر کینیا اور فجی کے لئے تھی۔ یہ حقیقت تمام ضلع میں غالب ہے۔ اور اس کے اثرات نہایت گہرے ہیں۔

صفائی:۔ انبالہ اور گوڑگاؤں کی طرح اس ضلع میں بھی دیہات کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کے متعلق جب ہم نے ایک اراعیوں کے گاؤں میں دریافت کیا تو ایک بڑے مجمع میں کئی اشخاص نے جواب دیا" ہم اس کی قدر کرتے ہیں" اور ساتھ ہی نمبردار نے کہا" احکام کی تعمیل ہو رہی ہے۔ اور کھاد کو گاؤں سے چالیس یا پچاس گز پرے ڈھیر کیا جاتا ہے۔ اُس نے مجھے ایک خاص سمت میں لیجانے کی کوشش کی۔ لیکن جب میں نے دوسری طرف جانے کی تجویز کی تو وہ لیس و پیش کرنے لگا۔ میں نے کہا" میں کہیں نہ جاؤں گا۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ احکام کی تعمیل نہیں ہو رہی ہے۔ ایک عام ہنسی سے یہ منکشف ہو گیا کہ یہ بات اس طرح تھی۔

دیہاتی استقبال:۔ جس مستعدی سے یہاں کے لوگ سلام کرتے ہیں۔ مجھے گڑھ شنکر کی یاد دلاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہمیں گذرتے ہوئے دیکھنے کے بظاہر بہت شائق ہیں۔ ایک جگہ نصف درجن راجپوت جو سڑک

سے سو گز کے فاصلے پر اپنے کنوئیں پر کام کر رہے تھے۔ ہمیں آتا ہوا دیکھ کر ہمیں روکنے کیلئے کھیتوں میں وار پار بھاگنے لگے۔ ان میں ایک دبلا پتلا سفید ریش بوڑھا بھی تھا دوسرے گاؤں میں جہاں ایک بینک تھا۔ انجمن کے تیس یا چالیس ممبر ایک کھتری وائس پریذیڈنٹ کی سرکردگی میں ہمارے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے انتظار کر رہے تھے۔ لیکن یہ انتظار پاسلہ گاؤں کے مقابلے میں جہاں باجے کے ساتھ استقبال کیا گیا تھا۔ کوئی حقیقت نہ رکھتا تھا۔ مقامی بینڈ نے جو امداد باہمی کے چھ ارکان پر مشتمل تھا۔ قومی گیت بجایا۔ اور ایک بہت بڑا اجتماع ہمیں چاروں طرف سے طوفان کی طرح گھیر کر مقامی ڈاک خانے کے صحن میں لے گیا۔ جہاں ایک خوبصورت شامیانہ لگا ہوا تھا۔ چونکہ آج اتوار کا دن تھا۔ اور کسی اجلاس کے ہونے کا خیال نہ تھا۔ اس لئے سب ہمیں دیکھ کر بہت متحیر ہوئے۔ حاضرین میں سے ایک آلات موسیقی کا تاجر تھا۔ ان آلات میں سے اکثر وہ پیرس سے منگاتا تھا۔ اس نے بینڈ کو ایک قرنائی۔ ایک طنبورہ اور دو نرسنگے منگا کر دیئے تھے۔ قرنائی پر ۷۵ روپے نرسنگوں پر ۵۰ روپے اور طنبورہ پر ۱۵ روپے صرف ہوئے تھے۔ آخر الذکر باوجود فرانسیسی نام رکھنے کے انگلستان سے منگایا گیا تھا۔ اس گاؤں میں تین بینک ہیں۔ ان میں سے دو اوّل درجے کے ہیں۔ جسکا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ خاص طور پر اچھے ہیں۔ ان میں سے ایک بینک کے سکھ صدر نے کہا۔ کہ میری قوم نے شادیوں کے اخراجات کم کرنے کے لئے ایک کمیٹی مرتب کی ہے۔ اس قسم کی منظم جماعتیں خود بخود پیدا ہو رہی ہیں۔ اور جن میں سے کئی ایک سے اس دورے میں سابقہ پڑا ہے۔ یہ ظاہر کرتی ہیں۔ کہ ہوا اس سمت میں کس قدر تیز چل رہی ہے۔ لیکن یہ ایسی ہوا نہیں ہے۔ جو آلات موسیقی کے تاجر کے لئے موزوں ہو۔ کیونکہ اس نے اس کی تجارت پر بھاری اثر ڈالا ہے۔ جب ہم رخصت ہوئے تو باجہ پھر بجایا گیا۔ اور ہمارے چاروں طرف گولے چھوڑے گئے۔

چھوت چھات:۔ اس ضلع میں جہاں لوگ ترقی کر رہے ہیں۔ کسی طرح بھی چھوت چھات کا خاتمہ نہیں ہوا ہے۔ سکھوں کے ایک گاؤں میں۔ جو ہماری سڑک کے پہلو میں واقع تھا۔ ہمیں بتایا گیا۔ کہ چماروں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جاتا ہے۔ لیکن جب میں نے لوگوں سے فرداً فرداً

دریافت کیا۔"جب تم چمار سے چھو لیتے ہو تو کیا اپنے آپ پر پانی چھڑکتے ہو۔" سب نے جواب دیا جی ہاں" وہ ایک نے یہ بھی کہا کہ اگر ہم بالکل ساتھ لگ جائیں تو ہم اپنے کپڑے دھوتے ہیں۔ اور نہاتے ہیں۔ ہمارے ہمراہی سکھ نے بتایا کہ سکھوں کے لئے چمار اور بھنگی ایسے ہی اچھوت ہیں۔ جیسے کہ ہندوؤں کیلئے جاٹوں کی موجودگی میں ان کیلئے ننگی زمین پر بیٹھنا ضروری ہے۔ اور ان کے ساتھ اتفاقیہ چھو جانے کے بعد پاکیزگی کی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ مگر یہ بات غالباً معقول ہے۔ کیونکہ سکھ نیم ہندو ہیں۔ اس سے زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے۔ کہ اس سے پہلے گاؤں کے مسلمان ارائیں بھی بالکل اسی طرح کرتے تھے۔

نقل مکانی :- اس ضلع میں نقل مکانی کی ہر دلعزیزی کو مدِ نظر ہوئے میں نے وہی تفتیش جو گرد و نواح شنکر میں شروع کی تھی۔ پھر جاری کردی۔ اور بہت سے لوگوں سے دریافت کیا کہ تمہارا نقل مکانی کے متعلق کیا خیال ہے۔؟ کیا اس کے نتائج اچھے ہیں۔ یا بُرے ؟ دیہاتی کے دماغ میں لفظ اچھا کا مفہوم مادی فوائد کے ساتھ اس قدر مرلوط ہے۔ کہ دیہاتی کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ نتائج کا اندازہ دولت اور اخلاق دونوں پر اُن کے اثرات سے کرنا چاہیئے۔ دولت پر عام طور پر اچھے اثرات ہیں۔ اگرچہ ارائیوں کے ایک گاؤں میں یہ بتایا گیا کہ بعض لوگ نقل مکانی کرنے کے لئے اپنی زمینیں رہن رکھ دیتے ہیں۔ اور روپیہ پیدا کرنے میں ناکامیاب رہنے کی صورت میں روانگی سے زیادہ بُری حالت میں واپس آتے ہیں۔ اخلاق کے متعلق دو لوگاؤں میں عام رائے یہ تھی۔ کہ مجموعی حیثیت سے کوئی بگاڑ نہیں ہے۔ نقل مکانی کر کے واپس آیا ہُوا شخص پس ماندگان سے نہ بھلا ہوتا ہے نہ بُرا۔ اور بعض اوقات وہ زیادہ محنت اور ذہانت سے کام لیتا ہے لیکن سب نے اس امر پر اتفاق کیا کہ خواہ کتنی ہی زیادہ دولت کیوں نہ واپس لائی جائے جلد غائب ہو جاتی ہے عام طور پر پختہ مکان تعمیر پر صرف ہو جاتی ہے۔

دیہات اور اس کے باشندے :- اس ضلع میں سے سواری کرنی نہایت خوشگوار ہے۔ کیونکہ یہ پنجاب کا باغ ہے۔ اور شاید تمام صوبے میں یہی ایک ضلع ہے۔ جہاں انسان نے قدرت پر اتنا ہی مکمل قابو پا لیا ہے۔ جتنا کہ

انگلستان اور فرانس میں متصل سے کوئی ایکڑ زمین ایسی ہوگی جو نہ صرف کاشت بلکہ نہایت عمدگی سے کاشت نہ کی گئی ہو۔ اس علاقہ کی بناوٹ ایسی گرد آلود اور گندی نہیں ہے۔ جس سے پنجاب کا اکثر حصہ کسی بڑے لیکن ناتجربہ کار مصور کا کام معلوم ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ دَولہ دھار معہ اپنی برفانی چوٹیوں کے پھر نظر آنے لگ گیا ہے۔ سال کے اس حصے میں گوڑ گاؤں میں دیہاتی کو سوائے مویشیوں کے لئے چارہ حاصل کرنے کے اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ لیکن یہاں گنا نہایت اہم فصل ہے۔ اور کسان اُسے کاٹنے اور رس نکالنے میں نہایت محنت سے مصروف ہے۔ زیادہ محنت کرنے کی وجہ سے وہ فارغ البال ہے۔ خاص طور پر قرضے کے معاملے میں۔ آج کل وہ مکی اور سرسوں کا ساگ کھاتا ہے۔ لیکن یہ کھانا وہ صرف سردی کے تین چار مہینوں میں کھاتا ہے۔ سال کے باقی حصے میں وہ گیہوں کھاتا ہے۔ گوڑگاؤں کے دیہاتی کو شاذ ہی گیہوں میسر آتی ہے۔

۸ر جنوری بنڈالہ سے سرگندی اور واپسی

لوگوں کا اپنے آپ پر ٹیکس لگانا:۔ ہم نے دن میں سب سے پہلا کام بنڈالہ دیکھنے کا کیا۔ یہ ایک بڑا قصبہ ہے۔ اور آبادی ۴۰۰۰ باشندوں پر مشتمل ہے۔ چند سو سال گذرے ایک جاٹ نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ اور چار پانچ سو سکھ کنبے جو یہاں آباد ہیں۔ اپنے آپ کو اُسی کی نسل سے بتاتے ہیں۔ اس کی شہادت میں ایک ذیلدار نے جو تقریباً پادریوں کی سی وضع رکھتا تھا۔ اپنی جد کے بائیس نام گن دیئے۔ یہ گاؤں دو باتوں کے لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ پختہ مکانات کی تعداد و تنوع کے لحاظ سے اور رفاہِ عام کے کاموں کے لئے چندوں سے جمع کئے ہوئے روپیہ کی وجہ سے۔ تمام قصبہ چھ پتیوں میں منقسم ہے۔ دس سال ہوئے آخرالذکر کام کی ابتدا ان میں سے ایک کی فرش بندی سے ہوئی۔ اور اس پر ۸۰۰۰ روپیہ لاگت آئی جسمیں سے ۲۵۰۰ روپیہ یہاں کے باشندوں نے چندہ دیا۔ کچھ نقدی کیصورت میں اور کچھ مزدوری کی شکل میں۔ اس وقت سے اب تک چار اور پتیوں کی فرش بندی ہو چکی ہے۔ اور اُن پر ۶۰۰۰ سے ۷۰۰۰ روپیہ تک فی پتی خرچ آیا ہے۔ یہ تمام مقامی روپیہ سے تعمیر کی گئی

ہیں۔ بھنگیوں نے بھی دامن شہر میں اپنے سو گھروں کے لئے سو روپیہ اسی کام کیلئے خرچ کر دیا ہے۔ اس دان کے بدلے جس کے لئے وہ ہاتھ پھیلانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اب اُن کو ہر شادی کے موقع پر دو روپے بطور بخشیش دیئے جاتے ہیں۔ انہوں نے انہیں بجا بجا کر اُن سے یہ کام انجام دیا ہے۔ فرش بندی نہایت عمدگی و ایمانداری سے کی گئی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے انہیں اچھی طرح ایمانداری سے صاف نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ کام ہر تیسرے دن کیا جاتا ہے۔ یہ امر شاید تعجب خیز ہو کہ یہ اس قدر جلد جلد کیوں صاف کی جاتی ہیں جبکہ بھنگیوں کو تمام تر محنت کا معاوضہ ہر ایک گھر سے ۲ر فی ششماہی دیا جاتا ہے۔ اس ادائیگی کے لئے کوئی ایکٹ یا قانون نہیں ہے۔ بلکہ صرف باہمی انتظام سے کیا جاتا ہے۔ ان فرش بندیوں کے علاوہ جنہیں جگہ جگہ گندے پانی کی نالیاں بنی ہوئی ہیں۔ گلی کا ایک بدنما گڑھا چھت کر اس پر گوردوارہ بنایا گیا ہے۔ چھت ڈالنے پر ۵۰۰ روپے خرچ آئے۔ اور گوردوارہ کے لئے ہندو اور سکھوں نے ۵ (ایک روپیہ پانچ آنے) فی گھر دینے منظور کئے۔ سوائے دو فرشوں کے باقی تمام کام گذشتہ پانچ سال میں ہوا ہے۔ جسکے یہ معنی ہیں کہ لوگ کسی ایسی چیز کیلئے جن کی واقعی انہیں ضرورت ہو اپنے آپ پر ٹیکس لگانے کیلئے تیار ہیں۔

ڈاکٹر:۔ ایک دوسری مثال ایک ہسپتال تھا۔ جو اُن میں سے ایک پتّی نے ۱۳۰۰ روپیہ خرچ کر کے تعمیر کیا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک نوجوان اس کا ذمہ دار تھا۔ حکیم کسی مریض کو دیکھنے گیا ہوا تھا۔ اُسکی دکان کے اندر پیٹنٹ دوائیوں اور سگرٹ کے کے پرانے ڈبوں کی۔ جن میں نہ معلوم کیا تھا۔ قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ اور دیوار کے ساتھ چھوٹی ٹہنیوں کے گٹھے لٹک رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ جڑی بوٹیاں ہیں۔ لوگ اس دوا فروش پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ اُس نے کوئی خاص تربیت نہیں حاصل کی ہے۔ جب میں نے اس کا ذکر کیا تو کسی نے کہا اس کے پاس سندیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ دستاویزات ہیں۔ جو شکر گزار مریضوں سے اُسے ملی ہیں۔ اس قصبے میں اور حکیم بھی ہیں۔ اور دس یا بارہ نیم حکیم ہیں۔ جو منتر اور گنڈے تعویذ کا کام کرتے ہیں۔ لیکن لوگ ان پر پہلے جیسا عقیدہ نہیں رکھتے۔ اگرچہ اب بھی بعض لوگ ایسے ہیں۔ جو اپنے بچے پر مسجد سے باہر نکلتے ہوئے شخص سے دم کرانا پسند کرتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ یہ ایک قصبہ ہے۔ بچوں کو عدم سے وجود میں لانے کے لئے ایک نیچ ذات کی

غیر تربیت یافتہ دایہ کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تین دائیاں ہیں۔ ایک نقرئی ایک چمار کی بیوی اور ایک حسب معمول بھنگن ہے۔ ابھی مویشیوں کی بیماری کیلئے گلی کے وار پار لٹکے ہوئے جادو کو ڈاکٹر اور ٹیکے پر ترجیح دیجاتی ہے۔

باولے کتے کے کاٹے کے علاج کا ماہر:۔ بنڈالہ میں اس بیماری کو شفا دینے والا نہایت مشہور شخص ایک بھنگی ہے۔ جس کی ایک ٹانگ گھٹنے کے اوپر سے کٹی ہوئی ہے۔ اور جو مقامی ہائی سکول میں کام کرکے اور باولے کتے کے کاٹے کا علاج کرکے روزی کماتا ہے یہ علاج اسے اپنے سالے سے معلوم ہوا تھا۔ جو بھگواڑہ میں ایک ساد ہو تھا۔ اور اُسے یہ ایک سادھو سے ملا تھا۔ جسکا وہ چیلا تھا۔ اس لئے اس علاج کو وقت اور استعمال دونوں نے پاک بنا دیا ہے۔ اور اپنی کامیابی کی وجہ سے ایسا ہی یہ معلوم بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ دعوےٰ کیا جاتا ہے۔ کہ موجودہ ہاتھوں میں یہ علاج انسان یا جانور کسی پر بھی خطا نہیں جاتا۔ حاضرین میں سے بہت سے آدمیوں نے کہا کہ ہم نے شفا پائی ہے۔ ان میں سے ایک ایسا بھی تھا۔ جس کو اسی کتے نے کاٹا تھا۔ جس نے بارہ مویشیوں کو بھی کاٹا تھا۔ ان میں سے آٹھ کا علاج کیا گیا وہ بچ گئے اور چار کا علاج نہ کیا گیا۔ وہ مر گئے۔ تمام حاضرین نے اس کی تائید کی۔ اور یہاں تک دعوےٰ کیا گیا۔ کہ ایک سنہری فروش اور ایک بھنگی کا نہایت کامیابی سے علاج کیا گیا۔ جبکہ دہن پر کف تھی۔ اگرچہ بہت سے لوگ علاج کرانے آتے ہیں۔ کوئی قیمت نہیں وصول کیجاتی۔ اور ہر مریض کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جو وہ چاہے دے جائے۔ ایسے علاجوں کے متعلق خواہ کوئی کچھ بھی خیال کرے۔ لیکن یہ فرض کر لینا کہ یہ صرف ہندوستان کیلئے مخصوص ہیں غلطی ہے۔ جب میں ان الفاظ کو دہراتا ہوں۔ تو ایک فرانسیسی امیر مجھے یہ بتاتا ہے۔ کہ وہ ایک دعا کو بار بار پڑھ کر جلے ہوئے کا علاج کر سکتا ہے۔ یہ دعا اسے اس کی بوڑھی دایہ نے مرنے سے پہلے بتائی تھی۔ اور اس کے خاندان کو یہ دعا کئی نسلوں سے معلوم تھی۔ بھنگی کیطرح وہ یہ بھی دعوےٰ کرتا ہے۔ کہ بڑے سے بڑے بے شمار مریضوں کا علاج کیا ہے۔ مثال کے طور پر اُس نے ایک چھوٹے بچے کا علاج کیا جس نے آگ میں گر کر اپنا منہ جلا لیا تھا۔ اور وہ شخص کسی طرح بھی مخبوط الحواس یا بیوقوف نہیں۔

جادو۔ ایک سیاح نے سو سال گذرے اپنی سیاحت کے حالات میں لکھا ہے۔ کہ ایشیائے کوچک فلسطین اور مصر میں گھاس اور غلے کی تاثیرات کے متعلق تم اسی طرح جھگڑ سکتے ہو جسطرح کہ جادو کے متعلق۔ ہندوستانی دیہات میں اب بھی یہی حال ہے۔ مندرجہ ذیل واقعہ اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ ایک سال گذرا بنڈالہ میں ایک شخص آیا اُس نے بتایا کہ میں وہی نتھو جلاہا ہوں جو چند سال گذرے غائب ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنی طویل عدم موجودگی کی تفسیر یہ بیان کی کہ وہ عرب کی زیارت گاہوں سے ہو کر آیا تھا۔ جہاں اللہ کے فضل سے اُس نے بہت سی کرامات سیکھی تھیں۔ ان میں سب سے بڑی کرامت یہ تھی۔ کہ وہ نقدی کی ہر قسم کو جو کافی دیر کے لئے اس کے سپرد کر دی جائے۔ دوگنا کر سکتا تھا۔ شوق بھڑک اٹھا اور جلاہوں نے اس کی قوت کا جائزہ لینے کے لئے ایک آنہ یا دو آنہ کی قلیل رقوم دے دیں۔ اُس نے اُن سب کو دوگنا کر دیا۔ اس سے زیادہ بڑے تجربے شروع ہو گئے۔ اور نتائج ویسے ہی مسرت خیز رہے۔ آخر کار انہوں نے اتنی بڑی بڑی رقمیں دے دیں۔ کہ پہلے کبھی نہ دی تھیں۔ چند ایک نے اُسے جواہرات بھی دیدیئے۔ کیونکہ اس کا دعوٰے تھا۔ کہ وہ اُن کو اپنی معجزنما طاقت سے دوگنا کر سکتا ہے۔ ہر شخص نے اپنا خزانہ ایک مقفل صندوق میں بند کر کے اُسے دیدیا۔ ان کی کنجیاں بھی اسی کے سپرد کر دیں۔ جب صندوقوں کو کھولنے کا مقررہ وقت آیا تو نتھو نے کہا کہ کامیابی کو یقینی بنانے کے لئے میں دریا پر نہانے اور عبادت کرنے ضرور جاؤں گا۔ واپسی پر صندوق کھولے جائینگے اور نتیجہ یقینی ہوگا۔ وہ اپنے مقدس کام کے لئے روانہ ہو گیا۔ اور صندوق پیچھے چھوڑ گیا۔ وہ توقع سے زیادہ دیر باہر رہا۔ اور نہ صرف فکر بلکہ بے چینی محسوس ہونے لگی۔ کیونکہ صندوق کافی سے زیادہ وزنی تھے۔ کافی دن گذر گئے۔ اور جلاہے زیادہ انتظار نہ کر سکے۔ صندوق کھولے گئے۔ لیکن ان میں جواہرات یا سکے نہ تھے۔ بلکہ مٹی تھی۔ اب یہ کہنا فضول ہے کہ نتھو پھر کبھی نظر نہ آیا۔ نقصان کا اندازہ کئی سو روپے کا تھا۔ یہ واقعہ تعجب خیز جیسا کہ یہ ہے اپنی قسم کا انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ کیونکہ اضلاع متحدہ میں اس قسم کے دھوکے کیلئے دو گرفتاریاں حال ہی میں ہوئی ہیں۔

فقرا۔ پیشہ ور فقیر نتھو سے ملتا جلتا لیکن کم جاذب توجہ ہے۔ کیونکہ انکا رواج زیادہ

ہے جسطرح شہد مکھی کو کھینچتا ہے۔ اسی طرح جالندھر کی فارغ البالی اسے کشش کرتی ہے۔ اور تقریباً بیس فقیر کبھی کم کبھی بیش بنڈالہ آتے ہیں۔ ان کے حق میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے۔ کہ گوڑ گاؤں کی طرح ان کی بد دعاؤں سے پہلے کی نسبت کم خوف کھایا جاتا ہے۔ اور اب وہ اپنے کچکول جھانسے یا تقاضے یا دولو سے بھرتے ہیں۔ بنڈالہ میں چودہ کنبے اور بھی ہیں۔ جو خیرات پر گذارہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی روزی کیلئے کچھ نہ کچھ کام بھی کرتے ہیں۔ مثلاً دھرم سالہ تکیہ یا مسجد کی نگہداشت کرنا۔ لیکن دراصل یہ بھی گاؤں کے مفت خور ہی ہیں۔ اسمیں کوئی بات قابل استثنےٰ نہیں ہے۔ امرتسر کے قریب ایک گاؤں میں جسکی حال ہی میں پیمائش کیگئی تھی۔ یہ دیکھا گیا کہ ۱۷۵۵ آدمیوں کی کل آبادی میں سے ۱۲۴۴ اشخاص (۲۶ کنبے) کسی روزی کمانے کے طریق پر کاربند نہیں ہیں۔ اور خیرات۔ بھیک اور مذہب پر گذارہ کرتے ہیں۔ اور بہت سے منتوں کی حیثیت سے دور دور بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ان تمام باتوں کو دیکھ کر گوڑ گاؤں کے چوہے یاد آتے ہیں۔ اگر آخر الذکر کھیتوں میں فصلوں کو نگل جاتے ہیں۔ تو یہ انسانی چوہے کوٹھیوں میں بھرے ہوئے غلّے کے لالچی ہیں۔ اور ان سب کا خرچ کسان پر پڑتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں کے بھی رحم پر ہے جو خیر خواہی عالم کے متمنّی ہیں۔ کیونکہ آج ایک قریب کے گاؤں میں ہم نے ایک نوجوان برہمن کو امرتسر کی گئو شالہ کیلئے روپیہ جمع کرتے دیکھا۔

جدید پکے گھر:۔ میں نے بنڈالہ کے بے شمار پختہ مکانات کا اشارۃً ذکر کیا ہے۔ صرف لائل پور کو چھوڑ کر اس ضلع میں یہ امر تمثیلی ہے۔ کہ اسمیں صوبے کے کسی اور ضلع سے زیادہ پختہ مکانات ہیں۔ بیس سال گذرے بنڈالہ میں چار یا پانچ سے زیادہ پختہ مکانات نہ تھے۔ لیکن مجھے بتایا گیا ہے۔ کہ اب ۴۰ ہیں۔ میرے ہمراہیوں نے مجھے بتایا کہ ان پر اوسطاً ۳۰۰۰ روپیہ فی گھر ضرور خرچ ہوا ہے۔ غالباً ہندوستان جیسے غریب ملک میں دیہاتیوں کے ہر گروہ کے لئے یہ بہت بڑی رقم ہے۔ تقریباً یہ تمام روپیہ سکھوں نے صرف کیا ہے۔ اور اسمیں سے زیادہ حصّہ سمندر پار نقل مکانی کا ثمرہ ہے۔ نقل مکانی اس قدر بہر دلعزیز ہے۔ کہ اس وقت بھی یہ کہا جاتا ہے۔ کہ چار یا پانچ آدمی بیرونجات میں ہیں۔

سبزیاں:۔ ایک شخص کو سبزیوں اور سنگترہ دل سے بھری ہوئی

وستی گاڑی دھکیلتے ہوئے دیکھ کر میں نے دریافت کیا کہ تم انہیں کہاں سے لائے ہو
اُس نے بتایا کہ میں ذات کا فقیر ہوں۔ ہر صبح چار بجے اٹھتا ہوں۔ اور سوار ہو کر سات
میل کے فاصلے پر پھگواڑہ جاتا ہوں۔ پھل اور سبزیاں خرید تا ہوں۔ اور نو بجے تک
بنڈالہ واپس آجاتا ہوں۔ بلاشبہ وہ دوپہر کے کھانے کے لئے انہیں بروقت بیچنے
کے لئے پہنچ جاتا ہے۔ پٹواری نے بتایا کہ تقریباً چالیس کاشتکاروں نے ایک
دو مرلے سبزی اپنی ضروریات کے لئے بوئی ہوئی ہے۔ اور اس طرح تمام
زمین ۱۵ ایکڑ ہوتی ہے۔ یہ رقبہ زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ سطح زمین سے پانی کا فاصلہ
جو ۵۰ فٹ سے زیادہ ہے سبزیوں کی کاشت مشکل بنا دیتا ہے۔ تاہم مانگ بڑھ رہی
ہے۔ اور اب اُن دو آدمیوں کے مقابلے میں جو تین سال ہوئے سبزی بیچتے تھے۔ پانچ ہیں۔
ذیلدار نے خود بھی ابھی ابھی پھول گوبھی کی کاشت شروع کر دی ہے۔ پرانے زمانے میں صرف
پیاز اور ٹینڈے بویا کرتے تھے۔ لیکن اب سب عام اقسام بوئی جاتی ہیں۔

مرغیاں پالنا:- میں نے پوچھا کیا کوئی مرغیاں پالتا ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ
ایک شخص نے بڑے پیمانے پر کوشش کی تھی۔ اور ایک ہی سال میں ۱۵۰۰ انڈے
نکلوائے تھے۔ لیکن وہ جوؤں کا شکار ہو گئے۔ اور ۲۰۰ کے علاوہ باقی سب مر گئے۔
اب اس کے پاس صرف ۵۰ مرغیاں ہیں۔ مجھے ایک اور شخص کے متعلق بھی
بتایا گیا۔ جس نے دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد گورداسپور میں ماہر پرورش
مرغیاں سے تربیت حاصل کر کے قریب کے ایک شہر سے باہر مرغی خانہ جاری
کیا ہوا ہے۔ وہ ذات کا نائی ہے۔ لیکن اس ملک کے دستور کے مطابق جس سے سب
ترقی کر سکتے ہیں۔ وہ اب کُلین برہمن ہونے کا دعوے رکھتا ہے۔ اس کے بعد دن میں
مَیں ایک چمار سے ملا جو ایک بہت بڑا ٹوکرا اٹھائے لئے جا رہا تھا۔ اس نے ابھی ایک
مرغ اور مرغی پر سرمایہ لگایا تھا۔ اور یہ ٹوکرا اُن کی رہنے کی جگہ بننے والا تھا۔ گاؤں میں ایک
اور چمار نے بھی اسی طرح کیا ہوا تھا۔ چونکہ گاؤں میں اور کوئی مرغیاں نہ رکھتا تھا۔ اس
لئے پیشین گوئی وہی تھے۔

کنوئیں:- میں نے ابھی ابھی ذکر کیا کہ بنڈالہ میں سطح زمین سے پانی کا
فاصلہ سبزیوں کی کاشت کو مشکل بنا دیتا ہے۔ گڑھ شنکر کی طرح جالندھر کے

بعض حصوں میں کنوؤں سے آبپاشی کرنا بھی ایک اہم مسئلہ بنتا جاتا ہے۔ کیونکہ نہر کی موجودگی اور صرف ۲۷ انچ (گڑھ شنکر میں ۲۵ انچ) بارش ہونے کی وجہ سے ضلع کی نصف کاشت کنوؤں پر منحصر ہے۔ اور پانی کی سطح آہستہ آہستہ نیچے جا رہی ہے۔ اور کسی وقت کنوؤں کو بیکار کرنے کی دھمکی دیتی ہے۔ بنڈالہ میں یہ پہلے ہی ۵۲ فٹ ہے۔ موسمی ہواؤں کی کمی نے حالت اور بھی نازک بنا دی ہے۔ اور اگر بارش بہت کم ہوئی تو ۱۴۹ کوئیں چھوڑ دینے پڑیں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ زیادہ گہرائی سے بیلوں پر زیادہ بوجھ پڑتا ہے کیونکہ رہٹ عام طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اور ایک رہٹ میں ۱۰۰ سے لے کر ۱۴۰ تک ٹینڈیں درکار ہوتی ہیں۔ گوڑ گاؤں میں ۸۰ سے لے کر ٹینڈوں تک کو بھی زیادہ خیال کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے جالندھر میں انسان اور حیوان دونوں اچھی نسل سے ہیں۔ اور زیادہ کام کر سکتے ہیں۔ آدمی جہاں تک اس کے کام کا تعلق ہے۔ رات اور دن میں تقریباً یکساں مستعدی سے کام کرتا ہے۔ گڑھ شنکر کی طرح وہ نئے کوئیں کھود کر تلافیٔ نقصانات کرنے کو تیار ہے۔ ہم نے کل کئی کوئیں اترتے ہوئے دیکھے۔ اور ایک گاؤں جس کے قریب سے ہم گذرے اشتمال اراضی کی وجہ سے ۱۸ کوئیں اتارے گئے تھے۔

مقامی امداد باہمی:- اگرچہ موجودہ رجحان یہ ہے۔ کہ کوئیں بجائے مشترکہ رکھنے کے علیحدہ علیحدہ ہوں۔ لیکن پھر بھی پڑوسیوں کی امداد کے بغیر کوئی کنواں اتارنے کا خیال دل میں نہیں لاتا۔ گوڑ گاؤں میں ہم نے اس کی ایک علیحدہ مثال دیکھی تھی۔ اور وہی طریقہ جسے آبت کہتے ہیں۔ یہاں بھی استعمال کیا جاتا ہے جب کوئیں کے گھیرے کو نیچے اتارنے کا وقت آتا ہے۔ تو دس یا پندرہ بیلوں اور چالیس یا پچاس آدمیوں کی امداد حاصل کی جاتی ہے۔ وہ تمام دن کام کرتے ہیں۔ اور اس کے عوض انہیں دو وقت حلوا دیا جاتا ہے۔ گوڑ گاؤں میں ایک وقت کا کھانا دینا اس کے معیار زندگی کے پست ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ دوسرے ضلعوں میں جن میں سے ہم گذرے یہی طریقہ فصل کاٹنے میں امداد دینے۔ نیشکر بونے۔ نئے گھر کے لئے اینٹیں ڈھونے اور چھت پر مٹی ڈالنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ امداد باہمی کی دوسری قسمیں

بھی یہاں ہیں۔ دھرم سالاؤں تکیوں اور کنووں کا انتظام بھی مشترکہ طور پر کیا جاتا ہے۔ اور فصل۔ بہ فصل ان کی نگہداشت کی خاطر تمام سال کے لئے چوکیدار ملازم رکھے جاتے ہیں۔ جب سڑکیں ناقابل گذر ہو جاتی ہیں۔ تو اُن کی مرمت بھی کی جاتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے نہیں۔ سرگوندھی بینکنگ یونین کے ایک اجلاس میں جس میں مَیں آج شامل ہوا۔ اس امر پر رضامندی ظاہر کی گئی کہ ایک نئے رواج کو رائج کرنا۔ اور سال میں ایک مرتبہ سڑکوں کی باقاعدہ مرمت کرنا ایک اچھی تجویز ہوگی۔

دیہاتی موسیقی:۔ یونین کے اجلاس کے لئے ایک بہت بڑا اجتماع تھا۔ اور وہاں پہنچ کر ہمیں خیر مقدم کرنے والے بینڈ کے ذریعے گھوڑوں پر سے اُتارا گیا۔ یہ اعلےٰ درجے کی چیز تھی۔ کیونکہ نہ صرف وہ ایک ہی مکان میں کھڑے تھے۔ بلکہ اُن کے پاس بیشمار نرسنگے تھے۔ جو انہوں نے لندن سے ۱۲۰روپے (۹ پونڈ) میں خریدے تھے۔ جب بینڈ ماسٹر نے یکے بعد دیگرے نہایت سرعت سے قومی گیت بجائے تو میں نے اس سے دریافت کیا۔ آج کل تمہارا کیا حال ہے؟ اُس نے جواب دیا "اچھا نہیں ہے" کیونکہ سکھوں کے پاس اب اپنے بینڈ ہیں۔ چونکہ اس ملک میں باجہ بجانا کمینہ لوگوں کا پیشہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس لئے سکھوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے پرزور قہقہہ لگا۔ یونین کا اجلاس ایک بڑے صحن میں ہوا جو تمام کا تمام منقش کپڑے سے ڈھکا ہُوا تھا۔ تمام پھول گھر بنائے ہوئے تھے۔ اور بعض نے بہت سے امور پر بحث کی اور گفتگو جو تین ۲ گھنٹے تک جاری رہی ایک لمحہ کیلئے کمزور پڑی۔ ہمارے چاروں طرف گلکاری ہونے کی وجہ سے بحث کا رُخ قدرتی طور پر عورتوں کے کام کی طرف پلٹ گیا۔

بیاس کے شمال اور جنوب میں عورتوں کا کام:۔ وہ جاٹ جو دریائے بیاس کے شمال میں مانجھا میں رہتے ہیں۔ اپنی لڑکیوں کی شادی اُن جاٹوں سے نہیں کرتے جو بیاس کے جنوب میں دوآبہ اور مالوہ میں رہتے ہیں۔ کیونکہ آخرالذکر کی بیویوں کو گوبر اکٹھا کرنا پڑتا ہے۔ اور اُسے ٹوکری میں اٹھا کر وہاں لے جانا پڑتا ہے۔ جہاں اُسے ڈھیر کیا جاتا ہے۔ مانجھا میں اگر عورت یہ کام کرے تو اس کی شان نہیں رہتی۔ یہ کام عام طور پر بھنگی کرتے ہیں۔ پھر بھی دو لو

رقبوں میں (اگرچہ مانجھا میں ہمیشہ نہیں) عورتیں گوبر سے اُپلے بناتی ہیں۔ لیکن اس سے صرف ہاتھ گندے ہوتے ہیں۔ اور یہ آسانی سے دھوئے جا سکتے ہیں۔ جبکہ گوبر اٹھانے سے جسم اور لباس دونو خراب ہوتے ہیں۔ آخرالذکر میں پردہ بھی بہت کم ہے۔ شمالی علاقے میں جہاں مسلمانوں کا اثر زیادہ قوی ہے۔ اس کی طرف سے نفرت دلائی جاتی ہے۔ رسومات میں اور بھی اختلاف ہیں۔ دوآبہ میں جاٹوں کی عورتیں مویشیوں کا دودھ دوہتی ہیں۔ پانی بھرنے میں امداد دیتی ہیں۔ چھوریاں ہمیشہ ایسا نہیں کرتیں۔ اور بونے میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ لیکن مانجھا میں عورتیں کھیتوں میں سے صرف کپاس چننے کا کام کرتی ہیں۔ اور اپنے خاوندوں کا کھانا لے جاتی ہیں۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ کاہل ہیں۔ گذشتہ دس ایام میں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں سوزن کاری کی مختلف اقسام تعلیم یافتہ اور زیادہ خوشحال لوگوں کی عورتوں میں پھیلتی جا رہی ہیں۔ مثلاً ضلع امرتسر میں ترنتارن کے نواح میں بہت سی عورتیں نہ صرف اب اپنی چارپائیوں کے لیے نواڑ اور فرشوں کے لیے دریاں بُنتی ہیں۔ بلکہ میزپوش تکئے کے غلاف اور پلنگ پوش جیسی صاف اور ایک کام کی چیزیں بھی بناتی ہیں۔ آخری تینوں چیزیں شاندار مواقع کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ جبکہ مہمانوں کی تواضع کی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے بچوں کے لئے جرابیں اور واسکٹیں بُننی بھی سیکھ لی ہیں۔ اور پہلے کی نسبت کشیدے کا کام بھی بہت زیادہ کرتی ہیں۔ میں نے ترنتارن کا ذکر اس لئے کیا ہے۔ کہ اگلے دن ہی مجھے ایک ایسے شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اس تحصیل سے متعلق خوب واقف تھا۔ لیکن میرے عملے کے اراکین کہتے ہیں۔ کہ لدھیانہ اور سیالکوٹ میں بھی یہی حقیقت ہے۔ اور لدھیانے میں تو خاص طور پر۔ کیونکہ اس ضلع میں جاٹ قوم تعلیم کی طرف مائل ہو گئی ہے۔ اور بہت سے لوگ فوجی و دیوانی محکموں میں ملازم ہو گئے ہیں۔ ان تمام نئے کاروبار کے ساتھ جو بہرکیف بہت سی عورتوں کا نہیں بلکہ صرف چند ایک کا وصف ہے۔ مانجھا کی جٹنی بلاشبہ یہ دعوے کر سکتی ہے۔ کہ وہ کافی مصروف ہے۔ لیکن یقیناً وہ اتنی محنت نہیں کرتی۔ جتنی کہ اس کی خالہ زاد بہن دوآبے میں یا صرف رہتک میں وہ زیادہ محنت کرتی ہے۔ اس پر بھی حاضرین تسلیم نہیں کرتے کہ دوآبے میں اس سے بہت زیادہ

سخت کام کرنا پڑتا ہے۔ غالباً اس وجہ سے کہ وہ خود بہت سخت کام کرتے ہیں۔

جالندھر میں آج کا کام :- میرے عملے کا ایک نہایت تجربہ کار ممبر، جو صوبے کے وسطی اضلاع اور کرنال و انبالہ سے بھی واقف ہے۔ یہ کہتا ہے۔ کہ لوگ کہیں بھی جالندھر جتنی محنت سے کام نہیں کرتے۔ آج جب میں نے کاتنے کے متعلق مسٹر گاندھی کا نظریہ پیش کیا۔ تو تمام نے متفقہ طور پر کہا کہ یہ بالکل ناممکن ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس بہت زیادہ کام ہوتا ہے۔ اس کا جائزہ لینے کے لئے ہم نے بلا تمیز ۵ آدمی منتخب کر لئے جن میں سے تین سکھ اور دو مسلمان تھے۔ اور انہیں پوچھا کہ تم نے کل کیا کیا تھا۔ پہلے نے کہا میں نے طلوع آفتاب سے پہلے مٹی کے دو گھڑے رس سے بھرے تھے۔ اس کے بعد میں رس سے گڑ بناتا رہا۔ اس نے ساتھ ہی کہا کہ یہ سلسلہ ایک مہینہ اور جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ تمام گنوں کا رس نکال کر گڑ نہ بنا لیا جائے۔ دوسرے آدمی نے جو سفید ریش اور تقریباً ۶۰ سال کا تھا۔ کہا کہ میرے پاس چرس والا ایک کنواں ہے۔ میں نے اور میرے کنبے نے صبح کے ۵ بجے سے کھیتوں کو پانی دینا شروع کر دیا تھا۔ اور غروب آفتاب تک دیتے رہے تھے۔ تیسرے نے تقریباً یہی بات کہی۔ چوتھے نے بھی جو ایک مسلمان راجپوت تھا۔ صبح ۵ بجے سے غروب آفتاب تک گنوں کا رس نکال کر نو گھڑے رس سے بھرے تھے۔ پانچویں نے جو ایک شیخ تھا۔ اپنی چارہ کی فصل (سینجی) کو پو پھٹنے سے چھٹنے تک پانی دیا تھا۔ ممکن ہے ان میں سے بعض بیانات میں مبالغے کی چاشنی ہو۔ لیکن کل صبح جالندھر جاتے ہوئے جبکہ گھپ اندھیرا اور شدت کی سردی تھی۔ میں بے شمار کسانوں کے پاس سے گذرا جو مویشی لئے جا رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر بلجیم کے باغبانوں کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ جو ایام مشغولیت میں بعض اوقات صبح تین یا چار بجے سے کام شروع کر دیتے ہیں۔ اور مختصر لمحات توقف کے ساتھ رات کے آٹھ یا نو بجے تک جاری رکھتے ہیں۔ اُن لوگوں نے جو آج حاضر تھے یہ کہا کہ ہمارا کام صرف فروری سے لے کر وسط مارچ تک ہلکا پڑ جاتا ہے۔ اور وہ بھی اس وقت جبکہ بارش کافی ہوئی ہو۔ اگر سردی میں بارش نہ ہو۔ تو ہم گیہوں کو پانی دیئے جاتے ہیں۔ مارچ کے وسط میں

نے کماد کی کاشت شروع ہوتی ہے۔ اور اُسے بیس سے پچیس مرتبہ تک پانی دینا پڑتا ہے۔ برسات کے دنوں میں ہمیں میںنڈھوں کی مرمت کرنی پڑتی ہے کماد کو باندھنا پڑتا ہے۔ (اگر یہ گر پڑے تو اسے چوہے کھا جاتے ہیں۔) اور چارہ لیجانے کے لئے جال (تنگر) بنانے پڑتے ہیں۔ ایک سکھ نے کہا کہ ہمارے پاس اتنا کام ہوتا ہے کہ ہم اپنے کیس بنانے بھول جاتے ہیں۔ یہ کوئی نیا مظاہرہ نہیں ہے۔ ۱۸۹۲ء میں مسٹر ڈبیوا ی پر سٹر افسر بندوبست نے لکھا :-

جو نہی کے لوگ بچپن کی حدود سے باہر آتے ہیں۔ ان کی زندگی کام کا ایک پیہم چکر ہوتی ہے۔ کسی دوسرے ضلع میں کام اس قدر کٹھن نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی میں اتنا ہی ہے۔ کاشتکار صبح سویرے اٹھتا ہے اور فوراً کام پر چلا جاتا ہے۔ اس کے دو گھنٹے بعد اس کا ناشتہ کھیت میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ جب وہ ناشتہ ختم کر لیتا ہے۔ وہ پھر دوپہر تک کام کرتا ہے۔ پھر وہ دوپہر کے کھانے کے لئے گھر واپس جاتا ہے۔ اس کھانے سے پہلے وہ عام طور پر گاؤں کے کسی تالاب یا کنوئیں پر نہاتا ہے۔ کبھی وہ اپنے کھیت کے کوئیں پر ناشتہ کے وقت ہی نہا لیتا ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ سورج غروب ہونے تک پھر کام کرتا ہے۔ پھر شام کا کھانا۔ گھر سے باہر کچھ گپ شپ اور پھر بستر۔

اگرچہ کسان اپنے جالے خود بناتا ہے۔ لیکن وہ اپنی ٹوکریاں نہیں بناتا۔ البتہ جھیور یا تو غلے کے بدلے یا استعمال شدہ شہتوت کی دو گنی شاخوں کے بدلے اس کے لئے ٹوکریاں بنا دیتے ہیں۔ آخرالذکر صورت میں وہ اتنی ہی ٹوکریاں فروخت کیلئے بنا سکتے ہیں۔ گاؤں کی اقتصادی زندگی میں ابھی تک تبادلہ نہایت اہمیت رکھتا ہے۔

نقل مکانی :- نقل مکانی کے متعلق ہم نے نہایت دلچسپ گفتگو کی۔ انہوں نے بتایا کہ نقل مکانی لازمی ہے۔ اس لئے نہیں کہ زمین ہمارے لئے کام نہیں مہیا کرتی بلکہ اس لئے کہ اس سے پیداوار بہت کم ہے۔ تقریباً تمام نقل مکانی کرنے والے لوگ جانے سے پہلے اپنی زمینوں کو رہن رکھ جاتے ہیں۔ اور واپسی پر چھڑا لیتے ہیں۔ دس یا زیادہ سے زیادہ بیس فیصدی لوگ

واپس نہیں آتے اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو برائی کی طرف چلے جاتے ہیں۔ لوگوں کا خیال یہ تھا کہ جو لوگ واپس آئے۔ وہ باہر رہنے کی وجہ سے اخلاقی و مالی دونوں حیثیتوں سے پہلے سے زیادہ اچھے تھے۔ وہ کم جھگڑالو تھے۔ اور دغا نہیں کھاتے تھے۔ صاف گردو نواح کو عزیز جانتے تھے۔ سچ بولنے کے فائدے سمجھتے تھے۔ اور تعلیم کی قدر کرتے تھے۔ بہت سے لوگ جو جاہل تھے۔ جب وہ سمندر پار گئے تو واپسی پر لکھ پڑھ سکتے تھے۔ امریکہ میں سکھوں پر تعلیم کی خوبیوں کا اس قدر اثر پڑا کہ انہوں نے حال ہی میں ایک لاکھ روپے (۷۵۰۰ پونڈ) اپنی قوم کی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ارسال کئے ہیں۔ بہ حیثیت کاشتکار انہوں نے ہمیشہ اپنے پڑوسیوں سے بہتر کام کیا۔ کیونکہ وہ اچھے بیل خرید سکتے تھے۔ لیکن زیادہ نکتہ چینی کرنے والوں نے کہا کہ وہ کام نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے چھ ماہ تک وہ اس پر لگے رہیں۔ لیکن پھر کسی اور سے کام کرائیں گے۔ اور خود محض نگہداشت پر اکتفا کریں گے۔ اس پر بھی وہ اتوار کے دن آرام کی اور ساتھ ہی چائے کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ اور اس سے اس قدر رغبت رکھتے ہیں۔ کہ نہ پینے کی نسبت بغیر دودھ والی شوق سے پی لیتے ہیں۔

پختہ مکانات:- ہر نقل مکان کرنے والا شخص جو اپنے گاؤں میں واپس آتا ہے۔ اگر روپیہ بچا سکتا ہے تو اپنے لئے پختہ مکان بنواتا ہے۔ اور تمام دیہاتی اگر ان کے امکان میں ہو تو ایسا ہی کریں۔ زمین اور کوئیں کا درجہ اس سے پہلے ہے۔ لیکن پختہ مکان کی بھی تقریباً اسی قدر چاہ ہے۔ کیونکہ اسے بہت کم مرمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور آسانی سے صاف رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اب یہ رواج دیہات میں لفظ فیشن کے مترادف ہوتا جاتا ہے۔ کہ اگر ممکن ہو تو ایک پختہ مکان بنوایا جائے۔ اسمیں شک نہیں کہ کچے گھر پر کم خرچ ہوتا ہے۔ اور سردیوں میں زیادہ گرم اور گرمیوں میں زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ لیکن ان کی قیمتوں کا فرق پہلے کی نسبت بہت کم ہے۔ پہلے زمانے میں لوگ کیکر اور شیشم کی لکڑی سے جس کے درخت ان کے چاروں طرف میدانوں میں اُگتے ہیں۔ مطمئن ہو جاتے تھے۔ لیکن اب دیودار اور نیلے کو جو دور دراز کے پہاڑی درخت ہیں۔ اُن پر ترجیح دیتے ہیں۔ آخرالذکر استعمال

کے لیئے تیار خریدی جا سکتی ہے۔ جبکہ شیشم اور کیکر کی لکڑی آرے سے چروانی اور تیار کرانی پڑتی ہے۔ سہولت کی یہ ایک پرانی دلیل ہے۔ جو ہمیں اس دورے میں بنے بنائے کپڑوں کے حق میں بار بار بتائی گئی ہے۔ دیوار کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ گھن کی تباہ کاریوں کا شکار بہت کم بنتی ہے۔ ایک ملازمت سے سبکدوش شدہ سپاہی نے بتایا کہ جب ۱۹۰۵ء میں میں نے فوج میں بھرتی ہونے کے لیۓ اپنا گاؤں چھوڑا تو اسمیں صرف ایک پختہ مکان تھا۔ اب بیس یا پچیس ہیں۔ بنڈالہ کی طرف واپس آتے ہوئے راستے میں ہر ایک دو میل پر ہم ایک گاؤں کے پاس سے گذرے سب اس قسم کے گھروں سے پُر تھے۔ ہندوستان نہیں تو کم از کم صوبے کے دور دراز حصّوں کے مقابلے میں یہاں یہ اثرات بہت نمایاں ہیں۔ اور یہ ظاہر کرتے ہیں۔ کہ زندگی کا معیار اب بالکل نیا ہو گیا ہے۔

تعلیم:۔ شام کو جب ہم گھوڑوں پر سوار گھر جا رہے تھے۔ تو گڑ کی اشتہا خیز خوشبو آرہی تھی۔ ایک جگہ ایک لوئر مڈل سکول کے لڑکے فوجی ترتیب سے ہمارے راستے کے وارپار ایک سرگرم ہیڈ ماسٹر کی سرگردگی میں کھڑے ہوئے ملے۔ ہیڈ ماسٹر جرابیں اور نیکر پہنے ہوئے تھا۔ گردو نواح کے سینکڑوں لڑکے سکول جاتے ہیں۔ بہت سے بائیسکلوں پر جاتے ہیں۔ لیکن جب اُن کی تعلیم پوری ہو جاتی ہے۔ تو ملازمت تلاش کرنے کی مشکل شروع ہو جاتی ہے۔ بنڈالہ میں چودہ یا پندرہ دسویں پاس ہیں۔ جن کو کام نہیں ملتا۔ اور اگرچہ اُن میں سے نصف کسانوں کے بیٹے ہیں۔ لیکن صرف کا شتکاری کرتا ہے۔ ہوشیار پور کی طرح یہاں بھی اتفاق رائے اسی امر پر ہے۔ کہ ایک مڈل پاس لڑکا بوقت ضرورت کھیتوں کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ لیکن انٹرنس پاس شدہ شاذ ہی اس طرف آتا ہے۔

پیپل کا درخت:۔ ذرا آگے میں نے ایک کسان کو اپنی بکریوں کے لیئے پیپل کے درخت کو چھانٹتے ہوئے دیکھا۔ پیپل کے درخت کے متعلق اُونہ اور گوڑ گانوں کی سنی ہوئی باتوں کو یاد کرکے میں نے پوچھا کیا تمہیں اسکی اجازت ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ یہ مسلمان ہے۔ ایک ہندو یا سکھ یہ کام نہیں کرے گا۔ بلا شبہ گردو نواح کے علاقوں میں یہی حقیقت ہے۔ لیکن وسطی

پنجاب میں یہ بات مجموعی حیثیت سے چسپاں نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہاں لوگوں نے اسے فروخت کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور زیادہ غریب لوگ اسے آزادانہ طور پر تعمیر کے کام میں لاتے ہیں۔ میرے عملے کے ایک ممبر کو بٹالہ کے ایک ہیزم فروش نے بتایا کہ پرانی اور نئی تہذیب اس قدر آپس میں اُلجھی ہوئی ہے۔ کہ میں نے ایک مرتبہ ایک کاشتکار کو تین سوکھے درختوں کے لئے ۲۰۰ روپے پیش کئے۔ اگرچہ رقم اس قدر کافی تھی کہ وہ اس سے ایک جوڑی مضبوط بیلوں کی یا ایک دو ڈھیل بھینس لے سکتا تھا۔ لیکن اُس نے اس سے انکار کر دیا۔ یہ ایک اچھی مثال ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اقتصادیت کس طرح مذہب کو جگہ دے رہی ہے۔ (۱۴ اپریل)

۹ جنوری چوہیکی اور وہاں سے واپسی

نقل مکانی :- ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر چوہیکی میں بینکنگ یونین دیکھنے گئے۔ حسب معمول بینڈ وہاں موجود تھا۔ اور ایک مرتبہ پھر ہمارا استقبال قومی ترانے کے ساتھ کیا گیا۔ دس سال پہلے میں چوہیکی میں یونین کا اجرا کرنے آیا تھا۔ اب یہ معہ ۴۸ ممبر انجمنوں کے صوبے کی بہترین یونینوں میں سے ہے۔ حسب معمول معائنہ کو بحث کی چاشنی سے زیادہ خوش ذائقہ بنایا گیا پہلے تمام موضوعات میں سے ایک نقل مکانی کا موضوع تھا۔ اگرچہ ۸۰ کسان حاضر تھے۔ لیکن کسی ایک نے بھی نقل مکانی کرنے والے کے خلاف آواز نہیں اُٹھائی۔ زیادہ واضح طور پر اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ انہوں نے وہ سب کچھ تسلیم کر لیا جو کچھ کہا گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ ۵ فیصدی آنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اور چھ یا سات فیصدی خالی ہاتھ واپس آتے ہیں۔ نقل مکانی کرنے والا باہر نہ جانے والے کی نسبت زیادہ محنت اور ہوشیاری سے کام کرتا ہے۔ اور زیادہ کفایت شعار ہوتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ شادیوں پر اس قدر خرچ مت کرو۔ اور خود بھی کم فضول خرچ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ عام طور پر اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔ وہ جھگڑوں کو ناپسند کرتا ہے۔ لیکن اکثر دوسرے لوگ اسے مجبور کر کے ان میں پھنسا دیتے ہیں۔ وہ اکثر نئے طریقوں کے مطابق کاشتکاری کرتا ہے۔ یہ بتایا گیا کہ گذشتہ

سال ایک شخص نے صرف ایک لڑکے کی مدد سے ۲۵ ایکڑ زمین سے جس میں وہ کاشت کرتا تھا۔ ۱۵۰۰ روپیہ حاصل کیا۔ انجام کار یہ کہ وہ لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے لئے تعلیم کا خواہاں ہے۔ کم سے کم تین مثالیں ایسی ہیں۔ کہ لوگ اسٹریلین بیویاں اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔ ایک شادی کا خاتمہ طویل اور سخت جھگڑا اور فساد کے بعد مفارقت پر ہوا۔ اور دوسرا اس بات پر کہ میاں بیوی ہمیشہ کے لئے اسٹریلیا میں رہائش اختیار کریں۔ اور تیسری بیوی وہ ہے۔ جس نے اپنے مسلمان خاوند کا مذہب قبول کر لیا ہے۔ اور پہناوا ہندوستانی ہے۔ اس کی بہت عزت کی جاتی ہے۔ اور اس کے خاوند کے انتقال پر اس کے اپنے بیٹے کو باپ کی جائیداد میں سے بہت سا حصہ ملا ہے۔

شادی کی عمر اور پردہ :- کسی ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر نے صبح کے وقت مجھے بتایا تھا۔ کہ اوپر کی چار جماعتوں میں ۱۰۸ لڑکے ہیں۔ ان میں سے ۴۶ شادی شدہ ہیں۔ اور ۲۶ نے اپنی بیویوں کے ساتھ رہنا شروع کر دیا ہے۔ آخرالذکر میں سب سے چھوٹی پندرہ برس کی تھی۔ یہ اعداد ہر لحاظ سے بڑے ہیں لیکن کم از کم کھرڑ کے سکول سے بہتر ہیں۔ چوہیکی میں یہ امر مسلمہ تھا کہ زیادہ ترقی یافتہ لوگوں میں لڑکا اگر وہ ارائیں ہے۔ تو ۱۶ سے ۱۸ تک اور اگر سکھ ہے تو ۱۸ سے ۲۱ برس کی عمر تک شادی کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں لڑکی کی عمر یں ارائیں کے لئے ۱۳ سے ۱۴ اور جاٹ کے لئے ۱۶ ہے۔ لیکن عام طور پر لڑکا ۱۳ سے ۱۴ اور لڑکی ۱۲ سے ۱۳ برس میں شادی کر لیتی ہے۔ راجپوت اس سے بہت دیر بعد شادی کرتا ہے۔ اگر لڑکا ہو تو ۱۸ یا ۱۹ برس میں اور اگر لڑکی ہو تو ۱۶ برس کی عمر میں ایک راجپوت نے جو وہیں موجود تھا۔ غمگین صورت بنا کر کہا "ہمیں بیویاں نہیں ملتیں "۔ میں نے دریافت کیا کیوں ؟ اس نے جواب دیا کہ چونکہ راجپوت کام نہیں کرتے اس لئے وہ کمزور ہو گئے ہیں۔ اس بات سے ہم پردے کے موضوع پر پہنچ گئے۔ یونین کے پریذیڈنٹ نے جو ایک ارائیں ہے۔ یہ کہا کہ صرف تعلیم یافتہ ارائیں پردہ کرتے ہیں۔ لیکن قرآن شریف نے چار دیواری کے پردہ کا حکم نہیں دیا۔ عورت اپنا چہرہ چادر سے چھپا لے اور اگر کوئی شخص قریب ہو تو اپنی پیٹھ پھیرا لے یہ کافی ہے۔ اگر اس طرح کیا جائے تو قانون کی شرط پوری ہو جاتی ہے۔ راجپوتوں نے کہا کہ ہمارے ہاں پردہ مذہبی

معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک رواجی بات ہے۔ یہ ہمارے آباو اجداد سے ہم تک پہنچا ہے۔ پھر ہم اسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ درحقیقت ہم میں سے زیادہ لوگوں کو مجبوراً اسے چھوڑنا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے پوری پابندی کے ساتھ نہیں کر سکتے اور نہ ہی خوشحال لوگ اتنے سخت ہیں۔ جتنے کہ انبالہ میں۔ وہاں عورت پاس کے گاؤں میں گاڑی پر جاتی ہے۔ لیکن یہاں اگر فاصلہ زیادہ نہ ہو تو وہ پیدل ہی چلی جاتی ہے۔

مذہب اور اقتصادیت مویشی:- اس امر کے متعلق کہ حال ہی کے قحط سالی کے دنوں میں مویشیوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا رہا ہے۔ پُرجوش گفتگو ہوئی۔ اکثر لوگوں نے خواہ وہ سکھ تھے یا مسلمان اپنے زائد مویشی اُن مسلمان دلالوں کے پاس بیچ دیئے جو قصابوں کے قائم مقام تھے۔ اُن میں سے بعض دلال ممکن ہے۔ مذہبی شکوک کی روک تھام کے لئے ہندوؤں کا بھیس لیتے تھے۔ اور بھیس کو مکمل کرنے کے لئے زنار تک پہن لیتے تھے۔ ایک سکھ نے کہا۔ ہم گلے ہوئے ہیں۔ حاضرین میں سے بعض نے کہا ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ جو جانور چار سال ہمارے پاس رہ چکا ہو۔ اس سے علیحدگی نہیں اختیار کریں گے۔ دوسروں نے جو اس کے کم مشتاق تھے۔ لیکن باعمل تھے۔ بیان کیا کہ ہمیں اچھا چارہ اچھے مویشیوں کیلئے رکھنا چاہیئے۔ مذہب اور اقتصادیت دونو کی کھلی بحث تھی۔ یہ حقیقت حال میں وسطی پنجاب کی خاص خصوصیت ہے۔ دوسری جگہوں میں جیسا کہ ان صفحات سے اور کہیں بھی ظاہر ہے۔ بحث اسی طرح ہے۔ لیکن جہاں کہیں ہندو مذہب کا اثر غالب ہے۔ جیسا کہ دامان کوہسار اور ستلج کے جنوب میں یہ جھگڑا پوشیدہ طور پر کیا جاتا ہے۔ اور اس کا اجرا ابھی تک مشکوک ہے۔ وسطی پنجاب میں مذاہب اس قدر مخلوط۔ آبادی اس قدر گنجان اور زندگی کا معیار بلند کرنے کی خواہش اس قدر قوی ہے۔ کہ اقتصادی تصورات و افکار لازمی طور پر مذہب پر غالب آجاتے ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں دس گاؤں ہیں۔ جو برہمن۔ راجپوت۔ جاٹ۔ سینی اور لابانہ وغیرہ تمام ہندوؤں سے متعلق تھے۔ تحقیق کی گئی۔ تاکہ لاچار اور فضول مویشیوں کی جنکو مذہبی بنا پر رکھا جاتا ہے۔ کل تعداد معلوم کی جائے۔ معلوم ہوا کہ ایک بیل بھی ایسا نہیں

رکھا جاتا جو کام کرنے کے لئے موزوں نہ ہو۔ اور یہ کہ جب جانور اپنا جُوا اتار پھینکتا ہے۔ تو سب سے پہلے موقعہ ہاتھ آتے ہی اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ واقفِ حال نے لکھا کہ اسے دور کرنے کے لئے دلّال ہمیشہ پاس ہی ہوتا ہے۔ اُس نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جانور کی زندگی بغیر قوت جوانی یا کام کرنے کی قابلیت کے زمیندار کیلئے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ خواہ وہ برہمن ہو یا نیچ ذات کا ہندو ہو۔ گائے کا لحاظ رکھنے کے متعلق حالات کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ اگرچہ ان دس گاؤں میں ۵۰۰ سے زیادہ گائیں تھیں۔ لیکن صرف دو ایسی تھیں۔ جنہوں نے ۱۸ ماہ سے دودھ نہ دیا تھا۔ اور نہ ہی دوبارہ بچھڑا دینے کی کوئی علامت ظاہر کی تھی۔ اور دونوں میں سے ایک مسلمان کے پاس تھی۔ تقریباً ایسا معلوم ہوا کہ اس علاقے میں گائے کا تقدس اس کے دودھ دینے اور نسل بڑھانے کی نسبت سے ہے۔ ضلع گورداسپور کے اکیلے گؤ شالہ میں تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ گذشتہ چار سال میں دیہات سے صرف ۱۴ مویشی آئے تھے۔ مینجر نے بتایا کہ پرانے زمانے میں یہ بات نہ تھی۔ جاٹ اب لوچڑ بن گئے ہیں۔ اور دیہاتی بلاواسطہ مذبح والوں سے لین دین کرتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ ایک اندھیری رات گؤ شالہ کا ایک ہندو نوکر دو گایوں کو مذبح کی طرف ہانک کر لے گیا۔ اور اگلی صبح ان کی عدم موجودگی کی تشریح ان الفاظ میں کی کہ وہ احاطے سے چرا لی گئی تھیں۔ محکمہ علاج مویشیان کی طرف اُن کا رجحان اسی معاملے کی ایک اور نظیر ہے۔ ایک نسل پہلے کوئی ہندو اس محکمے میں نہ آتا تھا۔ کیونکہ اس میں مقدس گائے کے جسم کو چیرنے پھاڑنے کا کام کرنا پڑتا تھا۔ جو لوگ اس محکمے میں آئے اُن میں سے ایک نے یہ بتایا کہ میری قوم نے دس برس تک مجھ سے قطع تعلق کر رکھا۔ کہ میں اپنی لڑکی کی شادی اس وقت تک نہ کر سکا جبکہ مجھے ایک اور ہندو اسی حالت میں ملا جس میں میں خود تھا۔ اور جس کا لڑکا مناسب عمر کا تھا۔ اب اس تحصیل کے چھ ہندو اسی مکروہ محکمہ میں کام کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ایک اور معمولی تبدیلی یہ ہوئی ہے۔ کہ تیس سال گزرے کوئی ہندو ایسا نہ تھا۔ جو کھانے پر بیٹھنے سے پہلے اپنی گایوں کے لئے ایک حصہ نہ رکھ لیتا تھا۔ لیکن اب دسطی پنجاب۔ کانگڑہ۔ اور انّو نہ جیسی ٹھیٹھ ہندو آبادیوں

ہیں خواہ کتنی بھی تحقیق کیجائے۔ مشکل سے ایک فیصدی لوگ ایسا کرتے ہیں۔
تمباکو:۔ مذہب اور اقتصادیت کی بحث صرف مویشیوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ اور نہ ہی صرف ایک قوم پر ختم ہو جاتی ہے۔ سکھوں میں تمباکو کی کاشت کے متعلق پیدا ہوتی ہے۔ اور مسلمانوں میں سود لینے کے متعلق سکھوں کی عاقلانہ عملی زندگی کی خصوصیت ہے۔ کہ اُن کا مذہب تمباکو کے استعمال کو قطعی طور پر ممنوع قرار دیتا ہے۔ اس سلسلے میں بعض لوگ معلم اخلاق برائی سے روکنے والی دانش کی نسبت مذہبی انتہا پسندوں کے ذوق شوق کی طرف زیادہ راغب ہو گئے ہیں لیکن پنجاب کے بعض حصوں میں حقّے کا استعمال تقریباً ایک عیب ہو گیا ہے۔ دو سال گذرے گورداسپور کے ایک راجپوت گاؤں میں تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ۴۲۸ باشندوں کی آبادی ۱۲۰۰ روپیہ سالانہ تمباکو پر صرف کرتی ہے۔ یہ اندازہ کیا گیا کہ اگر بیس سال کے لئے حقّہ نوشی بند کر دی جائے تو اتنا روپیہ بچ جائے گا۔ جس سے ایک چھوٹا دارالشفا مویشیوں کا ایک ہسپتال اور ایک مڈل سکول کھولا جا سکے گا۔ اور گاؤں کی گلیاں بھی پختہ بنوائی جا سکیں گی۔ یہ اندازہ بہت سے راجپوت گاؤں پر راست آتا ہے۔ حال ہی میں جالندھر کے ایک مسلمان راجپوت نے مجھے بتایا کہ جو روپیہ میرا گاؤں تمباکو پر صرف کرتا ہے (دس یا بارہ روپیہ فی گھر) اس کی میزان زرِ لگان کے برابر ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک نیک منصف اندازہ لگاتا ہے۔ کہ زرِ لگان ادا کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی وقت بھی بچ جاتا ہے۔ کیونکہ جو لوگ حقّہ پیتے ہیں۔ وہ عام طور پر اسے کھیتوں میں ساتھ لیجاتے ہیں۔ جبکہ وہ کام کرنے جاتے ہیں۔ ایک دور اندیش مسلمان ٹھیکیدار جب مزدور رکھتا ہے۔ تو اس سے پوچھتا ہے۔ کیا تم حقّہ پیتے ہو۔ اگر جواب اثبات میں ہو تو وہ اُسے حقّہ نہ پینے والے کی نسبت کم مزدوری بتاتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے۔ کہ اس کا مجموعی کام اس سے کم ہوگا۔ اس لئے سکھوں کے امتناع کی بنیاد صحیح الدماغی پر ہے۔ اس کے برعکس اسمیں ساتھ ہی ساتھ بہت بڑی مجبوری بھی ہے۔ کیونکہ اگر کوئی تمباکو نہیں پیتا تو وہ اسے کاشت بھی نہیں کر سکتا۔ پرانے زمانے میں جب زمین کافی تھی۔ لیکن اب یہ معیار بلند ہو رہا ہے۔ بہت سی جائدادیں اتنی چھوٹی ہوتی جا رہی ہیں۔

کہ اپنے مالکوں کی معقول آرام سے پرورش نہیں کر سکتیں۔ تا وقتیکہ اُن کو نہایت پرزور طریق سے کاشت نہ کیا جائے۔ اور اس کام کے لئے بہترین فصلوں میں سے ایک تمباکو ہے۔ سکھ اپنے سرگرم تجارتی ذوق اور آگے بڑھنے کی خواہش کی وجہ سے اس کے متعلق حد سے زیادہ ہوشیار ہوتا جاتا ہے۔ اور کہیں کہیں — میں پانچ مختلف اضلاع سے مثالیں دے سکتا ہوں۔ وہ اسے کاشت بھی کرنے لگا ہے۔ جاٹ عام طور پر یہ کام مزدوروں سے کراتا ہے۔ شاید ممنوعہ پتے کو فروخت کے وقت تک غیر سکھ کے پاس جمع رکھتا ہے۔ لیکن بعض گاؤں میں وہ تمام کام خود کرتا ہے۔ یہاں تک کہ تمباکو کے پودوں کو مروڑ کر بھی وہی رکھتا ہے۔

سود:۔ مسلمانوں کی سود خوری ایک اور بھی بڑا سوال پیدا کرتی ہے جس پر مولویوں میں بہت تنازعہ رہا ہے۔ موسوی قوانین کی پیروی کرتے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت زیادہ سود (ربا) لینا ممنوع قرار دے دیا۔ سوال یہ ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ چند لوگ اس امتناع کی تفسیر اس سختی سے کرتے ہیں۔ کہ وہ کواپریٹو بینک میں کسی قسم کا حصہ لینے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ بہت سے ممبروں کی مثالیں موجود ہیں۔ جنہوں نے یہ دیکھ کر کہ بینک اپنے قرضے پر سود لیتا ہے۔ اس سے علیحدہ ہو گئے۔ دوسرے لوگ جو زیادہ تعداد میں ہیں۔ امداد باہمی میں تو شامل ہو جائیں گے۔ لیکن پیشہ وروں کی طرح روپیہ سود پر دینے کو پسند نہیں کریں گے۔ البتہ یہ وہ لوگ ہیں۔ جن کے پاس قرض دینے کے لئے روپیہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو زیادہ خوش قسمت ہیں۔ اکثر روپیہ میں کوئی دلچسپی نہیں لیں گے۔ لیکن خدمت یا اور اسی قسم کے کاموں میں اپنا پورا حصہ زبردستی لے لینگے۔ کسی دوسری طرح کی خدمت کرنے کا سادہ طریقہ یہ ہے۔ کہ بیع شدہ زمینیں حاصل کر لی جائیں اور یہ کام نہایت آزادانہ کیا جا رہا ہے۔ اگر خدمت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مقروض اپنے قرض خواہ کا چارہ کاٹتا ہے۔ مویشیوں کا دودھ نکالتا ہے۔ اسے فصلیں کاٹنے میں اور بعض اوقات زمین جوتنے میں بھی امداد دیتا ہے۔ ایسی خدمات کا معاوضہ یا تو بہت کم دیا جاتا ہے۔ یا مفت انجام دی جاتی ہیں۔ دوسرے ساہوکار جو قدرے زیادہ وسواسی ہیں۔ ہندو اور مسلمان میں تفریق کرتے

ہیں۔ اور اول الذکر سے سود لیتے ہیں۔ اور آخر الذکر سے نہیں۔ ستلج کے
جنوبی حصے میں جہاں مسلمان دیہاتی عام طور پر ہندوؤں سے مسلمان بنے ہوئے
ہیں۔ آزادی سے روپیہ لیا جاتا ہے۔ مثلاً گوڑگاؤں میں ایک ریٹائرڈ فوجی افسر
نے اپنی آمدنی کے ایک حصے سے مسجد بنواکر اپنے کام کو جائز ٹھہرا لیا ہے۔
مغربی پنجاب میں بھی جہاں اسلام زوروں پر ہے۔ اور جہاں اب تک لوگ
سود پر روپیہ دینے کو گناہ سمجھتے ہیں۔ جو مسلمان جاگیردار روپیہ قرض دیتا ہے۔
جب اس کا جی چاہے کسی نہ کسی گول مول طریق سے سود لینے کی تجاویز سوچتا
ہے۔ میانوالی میں اُن میں سے ایک کو جب آڑے ہاتھوں لیا گیا۔ تو اُس نے کہا
کہ کیا میں ۱۸½ فیصدی (پیسہ روپیہ) سود پر روپیہ دے کر اپنے ہم مذہبوں
کی خدمت نہیں کر رہا ہوں۔ جبکہ ہندو ساہوکار دوگنا سود لیتا ہے۔ شہروں
اور قصبوں میں مسلمان فوجی جو ہندوؤں سے مسلمان ہوئے ہیں۔ سودی روپیہ
کے لین دین میں بہت بدنام ہیں۔ اور حال ہی کی تحقیقات سے معلوم ہوا
ہے۔ کہ .... مسلمان کاشتکار ایسے ہیں۔ جو ہر چیز پر ۱۵ سے ۵۰ فیصدی تک
سود لیتے ہیں۔ ایک مسلمان سب جج کا بیان ہے۔ کہ وسطی پنجاب میں اُن
کی تعداد نہایت سرعت سے بڑھ رہی ہے۔ اور سکھوں یا بنیوں اور ان کے
طریق کار میں کوئی تمیز نہیں ہو سکتی۔ اس کی ایک کھلی دلیل یہ ہے۔ کہ دیہاتی
بینکوں میں جہاں مسلمانوں کا اثر غالب ہے۔ عام طور پر منافع کو تقسیم نہیں کرتے
تھے۔ لیکن کچھ عرصہ سے وسطی پنجاب میں بہت سے بینکوں نے اپنے مقامی
قوانین میں تبدیلیاں کر لی ہیں۔ اور اسے قابلِ تقسیم بنا لیا ہے۔ اور بعض نے اس
بات پر بھی اصرار کیا ہے۔ کہ گذشتہ منافع بھی تقسیم کیا جائے۔ ایک بار پھر
اقتصادیت مذہب پر غالب ہوتی نظر آتی ہے۔

اراضی پر رہائش :- ایک اور اہم تغیر جس کی ابتدا معلوم کی جا سکتی ہے۔
اور جس کی مثال ہوشیارپور میں بھی دیکھی گئی تھی۔ یہ ہے کہ کاشتکار اپنا گھر
اور مویشیوں کا چھپر اپنی اراضی میں بنانے اور مویشیوں کو رات دن رکھنے کی
طرف راغب ہوتا جاتا ہے۔ عام طور پر گھر کا ایک رکن رات کو وہاں سوتا ہے
لیکن چند صورتوں میں تمام کنبہ گاؤں سے نقل مکانی کر کے وہاں چلا گیا ہے۔ اس
قسم کے دس گھر بنڈالہ میں موجود ہیں۔ اس میں بہت سے فائدے ہیں۔ اس

سے بہت سی محنت بچ جاتی ہے۔ کیونکہ ہر روز کھیت سے گاؤں میں چارہ نہیں لانا پڑتا۔ اور نہ ہی گاؤں میں سے کھاد کھیتوں میں لے جانا پڑتا ہے۔ کام اور کمانے کے لئے میں جو ہر وقت صرف ہوتا ہے۔ سب بچ جاتا ہے۔ ینڈالہ جیسی بڑی جگہ میں سب سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ بعض لوگوں کو ۱½ ۲ میل (دا کوس) پیدل چلنا پڑتا ہے۔ کھاد بچ جاتا ہے۔ کیونکہ اسمیں سے ذرا بھی کھیتوں اور گاؤں کے درمیان مویشیوں کی روزانہ آمدورفت سے ضائع نہیں ہوتا۔ فصلوں کی نگہداشت کے لئے محافظ نہیں رکھنا پڑتا۔ جو جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے۔ دیہاتی زندگی کا کافی حد تک عام پہلو ہے۔ سب سے آخری فائدہ یہ ہے۔ کہ صحت برقرار رہتی ہے۔ اور یہ فائدہ یقیناً کسی سے کم نہیں ہے۔ اپنی اراضی میں ہر شخص نہایت آسانی سے ہوادار گھر بنوا سکتا ہے۔ جس کی خواہش ہم نے ہوشیارپور میں بے حد پائی۔ لیکن ایک گنجان آباد گاؤں میں یہ بات تقریباً ناممکن ہے۔ مویشیوں کو باہر رکھنے کی وجہ سے گاؤں بذات خود زیادہ صاف رہے گا۔ بلاشبہ مجھے اسمیں شک ہے۔ کہ دنیا میں کوئی ملک ایسا ہے۔ جہاں دیہات صاف ہیں۔ اور مویشی ان میں رہتے ہیں۔ ینڈالہ میں ان فوائد کو اس قدر پسندیدہ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کہ جہاں دس سال پہلے سو آدمی گھر کے باہر سوتے تھے۔ وہاں اب دوسو بنائے جاتے ہیں۔ ذیلدار حسب معمول کسی قدر مبالغہ آمیز الفاظ میں صاف طور پر بتاتا ہے۔ کہ وہ لوگ جو باہر رہتے ہیں۔ دوگنی فصل حاصل کرتے ہیں۔ چوہیکی سے واپسی پر ہم ایک پست قدر سکھ سے ملے جو اپنے کنبے اور مویشیوں سمیت اپنی اراضی میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ میرے ہمراہی ایک سکھ نے جب اسے پوچھا کہ تم کتنے عرصے سے اس طرح رہتے ہو۔ تو اس نے معذرتاً اور تقریباً بھرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ صرف چند مہینے اور معاً یہ بھی کہا کہ ہم بہار میں پھر گاؤں واپس چلے جاوینگے ظاہر ہے کہ اس نے یہ خیال کہ ہم اس کے بغیر اجازت گاؤں چھوڑ دینے پر ناراض ہوں گے۔ اگرچہ گاؤں صرف ۳۰۰ گز کے فاصلے پر ہی تھا۔ اور شاید اس کے کام کی جدت نے اس موضوع کے متعلق اس کی بے چینی میں اضافہ کر دیا یہ واقعہ گو بذات خود معمولی ہے۔ لیکن زمانۂ ماضی کی وحشتوں کی داستان بالکل اسی طرح بیان کرتا ہے۔ جس طرح کہ مستقبل کے امکان کی۔ زمانہ

حال کے دغدغے بھی اسی معاملے سے متعلق ہیں۔ کیونکہ ڈاکوؤں اور مویشیوں کے چوروں کی وحشت سے بہت سے لوگ گاؤں کی مقابلۃً کسی قدر محافظت کو چھوڑنے سے باز رہتے ہیں۔ اسی طرح بلا شبہ مغرب میں بھی ایک مرتبہ جبکہ لوگوں نے فصیل والے شہروں یا حفاظت کرنے والے قلعوں کے مناشے سے نکل کر اپنی اراضیات پر رہنا شروع کیا تو اسی طرح محسوس کیا تمام ملکوں میں اور ہر زمانے میں زراعت کی ترقی کے لئے تحفظ اور قابل پولیس کی ضرورت ہے۔

ملکیت اشتمال بذریعہ تبادلہ:۔ آگے بڑھ کر ہم ایک کچے مکان کے پاس پہنچے جو ایک کوئیں کے نزدیک تھا۔ جس کے چاروں طرف صاف زمین تھی۔ اور تمام گوبر نہایت احتیاط سے ایک کونے میں ڈھیر کیا ہوا تھا۔ اس قدر انتہائی احتیاط سے مغرب میں بھی کوئی کھیت صاف نہ کیا ہوا ہوگا۔ جتنا کہ یہ۔ اسمیں دو سکھ بھائی کام کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم اپنے مویشی دن رات یہیں رکھتے ہیں۔ لیکن رات کو صرف ہم میں سے ایک یہاں سوتا ہے۔ کیونکہ ہمارے کنبے گاؤں میں رہتے ہیں۔ تبادلوں کے تسلسل سے جو انہوں نے اپنے طور پر ترتیب دئیے تھے۔ انہوں نے بجائے گاؤں کے چاروں طرف بکھری ہوئی زمین کے تمام اس کوئیں کے گرد حاصل کرنے کا انتظام کرلیا تھا۔ وسطی پنجاب میں عام طور پر زمین بکھری ہوئی ہے۔ اور جب تک یہ حالت اسی طرح ہے۔ اکثر لوگ گاؤں میں رہنے کو ترجیح دیں گے۔ جو تقریباً مرکز کا کام دیتا ہے۔ جہاں سے اُن تمام ٹکڑوں پر جنہیں ملکیت عام طور پر تقسیم ہوتی ہے۔ کچھ نہ کچھ آرام سے پہنچایا جاسکتا ہے۔ جہاں جائیدادیں زیادہ ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہیں۔ اور کنواں اُتارنے اور اراضی پر رہنے کی خواہش بہت زیادہ ہے۔ تبادلے سے بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کا یہ طریقہ جالندھر میں زیادہ ہی زیادہ مقبول ہوتا جارہا ہے۔ آج دو افسران مال نے مجھے بتایا کہ بہت سے لوگ اپنے حلقوں میں اسی طریق سے اشتمال اراضی کر رہے ہیں۔ اور بجائے گاؤں میں رہنے کے وہیں رہتے ہیں۔

اشتمال اراضی بذریعہ امداد باہمی:۔ جہاں زمین بہت ہی زیادہ ٹکڑوں

میں منقسم ہے۔ اس قسم کی خرابی کا انسداد کرنے کے لئے کسی قسم کی تنظیم لازمی ہے۔ یہ تنظیم امداد باہمی کی ان انجمنوں سے بہم پہنچتی ہے۔ جو خاص طور پر اشتمال اراضی کے لئے بنائی گئی ہیں۔ ان میں سے ۱۵۰ صرف جالندھر میں ہیں۔ اور تمام صوبے میں گذشتہ سات سال میں مجموعی حیثیت سے ۳۴۱۰۰۰ ایکڑ زمین کا اشتمال ہو چکا ہے۔ اشتمال اراضی کی نعمتیں بے اندازہ ہیں۔ نئے کنوئیں اتارے جاتے ہیں۔ پرانوں کی مرمت کی جاتی ہے۔ سڑکوں تک پہنچنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ اور چھوڑی ہوئی زمین زیر کاشت لائی جاتی ہے۔ کاشتکاری زوروں پر ہو جاتی ہے۔ پھل دار درخت لگائے جاتے ہیں۔ اور مقدمہ بازی غائب ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ اصل زراعتی ترقی شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن اس قدر نعمتیں انجمن کے ہر ممبر کی رضا جوئی۔ اور اشتمال اراضی کے عملے کے انتہائی صبر کے بغیر حاصل نہیں کی جا سکتیں۔ کیونکہ اس سے پہلے کہ زمین کی دوبارہ تقسیم کیجائے۔ انجمن کے ہر ممبر کی رضامندی حاصل کرنی پڑتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ صرف ایک انکاری ممبر اپنی رضامندی روک کر مہینوں کی محنت کو فضول ثابت کر سکتا ہے۔ بعض اوقات معترض لوگوں کی زمینیں چھوڑنے سے دقت پیش آتی ہے۔ یہ عمل جالندھر میں صرف ایک حالت میں کیا گیا۔ اور اس وقت جبکہ اُسے عملی جامہ پہنایا جا رہا تھا۔ دو متعلقہ ممبر یہ محسوس کر کے کہ ہماری رکاوٹ فضول ہو گی۔ اور یہ کہ ہمارے گاؤں کو ایک ایسا فائدہ پہنچنے والا ہے۔ جسمیں ہمارا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ اپنے گاؤں سے ۱۷ میل کا سفر کر کے جالندھر پہنچے۔ بلکہ ایک نے تو اس پر بھی سر تسلیم خم کر لیا کہ اس کی بیوی تمام گاؤں کی موجودگی میں اُسے جوتوں سے سزا دے۔ اس درخواست کو بھی قبول نہ کیا گیا۔ لیکن آخر کار عرضی اس شرط پر منظور کر لی گئی۔ کہ وہ نئی سکیم بنانے کی لاگت جمع کرائیں۔ چنانچہ دونوں پشیمان شدہ شخصوں نے اس کے مطابق ۱۸۰ روپے ایک بینک میں جمع کرائے۔ یہ واقعہ اشتمال اراضی کے فوائد اور مشکلات پر گہری روشنی ڈالتا ہے۔

۱۰ جنوری بنڈالہ سے جالندھر

کھاد :۔ آج صبح جب ہم بنڈالہ میں سے گذر رہے تھے۔ تو ذیلدار نے اپنی
جیب میں سے چلی کے شورے کا ایک پیکٹ نکالا۔ اُس نے بتایا کہ یہ میں اپنے
بیٹے کے کہنے سے پہلی مرتبہ استعمال کر رہا ہوں۔ میرے بیٹے نے تعلیم کا کچھ
حصہ لائل پور زراعتی کالج میں حاصل کیا ہے۔ وہ اُسے اپنے گیہوں کے ایک
کھیت میں استعمال کر رہا تھا۔ جسمیں کھاد کی کمی کے آثار ظاہر ہو گئے تھے۔ اس
دورے میں ایسے کاشتکاروں سے ملاقات کرنے کا جو اس زرخیز بنانے
والی شے کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ پہلا ہی موقع نہیں ہے۔ لیکن پانچ سال
پہلے دیہاتی کو اس قسم کی کوئی چیز استعمال کرتے دیکھنا مشکل تھا۔ اس
قسم کی دوسری تبدیلی یہ ہے۔ کہ مویشیوں کا گوبر اب ایندھن کے طور پر
کم استعمال کیا جاتا ہے۔ جتنا کہ ممکن ہے۔ اور کھیتوں کے لئے اس کی زیادہ
قدر کی جاتی ہے۔ اب اس کی جگہ روئی کی چھڑیاں لیتی جاتی ہیں۔ اور گنے
کی ایک نئی بھٹی کے ذریعے گڑ بنانے کے طفیل بہت کم ایندھن درکار ہوتا ہے
ان لوگوں میں سے جنہوں نے کل چوہیکی کے اجلاس میں حصہ لیا۔ اکثر نے یہ بتایا
اُپلے اب صرف دودھ کاڑھنے کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ اور اس
کے لئے بھی وہ ہمیشہ نہیں استعمال کئے جاتے۔

باغبان :۔ جس علاقے میں سے ہم گذرے نہایت ہی عمدگی سے
کاشت کیا ہوا تھا۔ اور ہر جگہ گنے یا آلو کاٹے جا رہے تھے۔ یا رس نکالا جا رہا
تھا۔ جب ہم جالندھر کے نزدیک پہنچے۔ تو ہم درحقیقت باغبان کی جنت
میں داخل ہو گئے۔ جہاں زمین کا ٹھیکہ ۸۰ روپیہ فی ایکڑ ہے۔ اور فروخت ۱۰۰۰ روپیہ
فی کنال ہے۔ جہاں ایک ارائیں کی کاشتکاری اپنے لئے یا کسی پٹھان کے
کے ماتحت تقریباً اتنی ہی پرزور ہے۔ جتنی کہ نیپلز کے نواح میں رہنے
والے دیہاتیوں کی۔ جہاں نرم و نازک سبزیوں کو دھند سے بچانے کے
لئے نہایت عمدہ پردے بنا کر ہی احتیاط مدِ نظر رکھی جاتی ہے۔ اور جہاں
ہالینڈ کی طرح ارائیں کنبے چار یا پانچ افراد کے ساتھ ۲ ½ ایکڑ زمین پر

گزارہ کر سکتا ہے۔ مرد اور عورتیں پو پھٹنے سے منہ اندھیرے تک کام کرتی ہیں۔ نہایت کفایت شعاری سے رہتے ہیں۔ اور کوئی چیز جو کھیت میں ڈالی جا سکتی ہے۔ ضائع نہیں کرتے۔ جب کوئی ان نتائج پر غور کرتا ہے۔ تو وہ یہ محسوس کرتا ہے۔ کہ کم از کم یہاں دیہاتی ایسے ہیں۔ کہ انہیں کسی ہوشیار کاشتکار سے کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ جالندھر سے میں مشرقی پنجاب کا دورہ ختم کرکے لاہور جانے کیلئے ریل میں بیٹھ گیا۔

باب ہفتم لائل پور

زندگی کا نیا معیار

۱۷ جنوری۔ لائل پور سے ٹھیکرانوالہ

لاہور میں چھ دن قیام کرنے کے بعد میں گذشتہ شب ریل سے لائل پور پہنچا
آج بعداز دوپہر میں پھر دریائے سندھ کے کناروں اور ملتان کا عزم کر کے اپنی
گھوڑی پر بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ ہم لائل پور کی نہری آبادی کے سب سے زیادہ
سرسبز علاقے میں سے گذرے جو اس قدر مشہور ہے۔ کہ اس کا بیان کسی تشریح
کا محتاج نہیں ہے۔ آج سے تیس سال قبل یہ اس ویران علاقے کا ایک حصہ تھا
جو تقریباً لاہور سے شروع ہوکر دریائے سندھ کے کنارے تک پھیلا ہوا تھا۔
اور جو چرواہوں۔ گوالوں اور اونٹوں کا گھر تھا۔ اب یہ پنجاب میں سب سے زیادہ
سرسبز اور ہندوستان میں سب سے زیادہ خوشحال علاقہ ہے۔ بدقسمتی سے
ہماری سڑک نئے طرز کی بجائے پرانے طرز کی تھی۔ اور اسمیں جگہ جگہ پشتے۔
لکیریں اور گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ اور کہیں کہیں دور دور تک گہری ریت آجاتی
تھی۔ چند میل باہر جاکر ایک تازہ ہل چلائے ہوئے کھیت میں پگڑیاں پہنے
ہوئے دیہاتیوں کا ایک گروہ گاؤں کے ایک سکھ اور مسلمان کی کشتی دیکھنے
کے لئے یہاں آنکلا۔ جب ہم وہاں سے گذرے تو دونو پہلوان ایک سرخ اور دوسرا
زرد لنگوٹ پہنے میدان میں اُتر آئے۔ ان کے جسموں پر لنگوٹوں کے سوا اور کچھ
نہ تھا۔ انہوں نے حسب معمول مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلوں میں کشتی لڑنی
شروع کردی۔ اس سے آگے ہم لدھیانہ کے سکھوں کے ایک بڑے گاؤں میں
پہنچے۔ جسمیں نہری آبادی کے تمام گاؤں کی طرح دو سڑکیں گاؤں کے عین وسط
میں ایک کنوئیں پر ایک دوسرے کو کاٹتی تھیں۔ سڑکیں بے حد صاف تھیں۔
اس میں شک نہیں کہ وہ اس لئے صاف تھیں۔ کہ بھنگیوں کو ایسا کرنے کے

لیے زمین دی ہوئی تھی۔ کنواں اتنا گہرا ہے۔ (پانی سطح زمین سے ۵۴ فٹ کے فاصلے پر ہے۔) کہ دیہاتیوں نے چار سقے ملازم رکھے ہوئے ہیں۔ جو پانی بھرتے ہیں۔ اور صبح و شام اپنی پانی کی گاڑی کو ایک ایک دروازے پر لے جاتے ہیں۔

عورتوں کا کام :- سب سے پہلا گھر جو ہمارے دیکھنے میں آیا پانچ بھائیوں کا تھا۔ جن کے پاس دو مربعے تھے۔ (۵۶ ایکڑ) اس آبادی کے ابتدائی ایام میں ان کا دادا لدھیانہ سے یہاں آیا تھا۔ اور اُسے ۱½ مربع ملا تھا۔ باقی نصف مربع انہوں نے اپنی بچت سے خریدا ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اکٹھے رہ کر ہم محض گزارہ کر سکتے ہیں۔ ہم سب کو روٹی مل جاتی ہے۔ اور بس۔ انہوں نے ساتھ ہی کہا کہ ہم اپنے کپڑے خود بناتے ہیں۔ ورنہ یہ بات بھی ناممکن ہو جائے۔ میں نے مسٹر گاندھی کا خیال ظاہر کیا۔ کہ آدمی اور عورتیں سب کاتیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اب بھی ہمیں کھیتوں میں سے گھاس پات نکالنا ہے۔ ایک خوش شکل ادھیڑ عمر کی عورت جس کے سامنے کے تمام دانت ٹوٹے ہوئے تھے بان کی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اس کے قریب ہی دو جوان عورتیں کات رہی تھیں۔ جب ہم پہنچے تو جوان عورتوں نے اپنی اوڑھنیوں سے پردہ کر لیا۔ اور پھر کاتتی رہیں۔ البتہ دوسری خوشی سے مسکراتی ہوئی گفتگو کرنے لگی۔ میں نے دریافت کیا۔ آدمی یا عورت دونوں میں سے کون زیادہ محنت کرتا ہے؟ پاس کھڑے ہوئے آدمیوں نے کہا کہ ہم کرتے ہیں۔ عورت نے اس بات پر کوئی جھگڑا نہ کیا۔ وہ کب اٹھتی ہیں؟ پانچ یا ساڑھے پانچ بجے جبکہ ابھی اندھیرا ہوتا ہے۔ پیسنے کے لئے نہیں۔ کیونکہ اب کوئی پیستا نہیں۔ بلکہ دودھ بلونے کے لئے۔ میں اتنی صبح نہ اٹھوں۔ لیکن اس نے دونو کاتنے والیوں کی طرف سر سے اشارہ کیا۔ نئی بیاہی ہوئی ہیں۔ اور میں کچھ عرصے تک انہیں سویرے نہ جگاؤں گی۔ اور تم سوتی کب ہو؟ آدمیوں میں سے ایک نے کہا عورتیں دس یا گیارہ بجے لیٹ جاتی ہیں۔ لیکن عورت نے اس کی اصلاح کی اور کہا۔ تم دس یا گیارہ بجے لیٹتے ہو۔ اور ہم تم سے پہلے آٹھ یا نو بجے سو جاتی ہیں۔ لیکن ہم تمام دن مشغول رہتی ہیں۔ اور ایک گھنٹہ بھی آرام نہیں ملتا۔ سب نے اس بات کو تسلیم کیا۔ کہ یہ بہت زیادہ ہے۔ اور اس طرح بچوں کی نگہداشت نہیں

ہو سکتی۔ لیکن ہم کیا کریں۔ فصلیں خراب ہوتی ہیں۔ اور ہمیں سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ دگذشتہ گیہوں کی فصل خراب ہو گئی تھی اور موجودہ روئی کی فصل بھی تقریباً اتنی ہی خراب تھی) یہاں گاؤں میں عورتیں بالکل وہی کام کرتی ہیں۔ جولدھیانہ میں۔ گھر اور مویشی خانہ جو سب ایک ہی احاطے میں ہوتے ہیں۔ ہر روز صاف کرنے پڑتے ہیں۔ اور کوڑا کم گہری چوڑی ٹوکریوں میں بھر کر سر پر رکھ کر گاؤں سے باہر لیجایا جاتا ہے۔ عملی طور پر کھیت کا کام صرف اتنا ہے۔ کہ وہ روئی چُنتی ہیں۔ اور اب جبکہ سینے کی مشین کا رواج ہوتا جاتا ہے۔ لڑکیاں سینا سیکھ رہی ہیں۔ اس گاؤں میں پانچ یا چھ مشینیں ہیں۔ اور تمام گذشتہ چند سالوں میں منگائی ہوئی ہیں۔ جب میں نے پوچھا کہ تم سوتے کہاں ہو تو عورت نے کھلے برآمدے میں اس چارپائی کی طرف اشارہ کیا جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی اور کہا اگر ہماری حالت اگر اچھی ہوتی تو ہم اور کمرے بنوالیتے کیونکہ یہاں سونے سے سردی لگتی ہے۔

املاک:- وہ گھر جو بالکل پختہ تھا۔ دس سال گذرے جنگ عظیم کے بعد کی گراں قیمتوں کے منافع سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اور اس پر ۲۰۰۰ روپے خرچ آئے تھے۔ اس لئے کہ پانچوں بھائیوں نے مزدوری کا تمام کام خود کیا تھا۔ یہ نہایت کشادہ بنا ہوا تھا۔ صحرا میں چوڑی اور چھت اونچی تھی۔ یہ ایک دیہاتی مکان تھا۔ لیکن نہایت شاندار جائے رہائش تھی۔ ایک درازوں والا بڑا خاندانی صندوق ان کی سب سے قیمتی ملکیت تھا۔ اس کی قیمت ۴۰ روپے تھی۔ یہ اُسی طرح کا تھا۔ جیسے زمانۂ وسطیٰ میں یورپ میں بنائے جاتے تھے۔ یہ ایک کی دلہن کے جہیز میں ملا تھا۔ وہاں ایک لوہے کا صندوق بھی تھا۔ اور چرخوں میں سے ایک نہایت خوبصورتی سے آراستہ کیا ہوا تھا۔ اور اس پر دس یا بارہ روپے خرچ آئے تھے۔ ان چند چیزوں کے علاوہ زندگی کے اعلےٰ معیار کو ظاہر کرنے والی سوائے مختلف قسم کے برتنوں کی بڑی تعداد کے اور کوئی چیز نہ تھی۔ ایک کمرے میں مکّی کے آٹے کا ایک ڈھیر تھا۔ اس کا رنگ گہرا نارنجی تھا۔ گویا اسے غروب ہوتے ہوئے آفتاب کے وقت پیسا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے مکّی کی فصل اچھی ہوئی تھی۔ اور جالندھر کی طرح تین ماہ تک وہ اسے ساگ کے ساتھ کھائیں گے۔ سال کے باقی حصّے میں

وہ گیہوں کھاتے ہیں۔ ۳۵ روپے کی ایک ٹوکا کاٹنے کی مشین سے ڈیوڑھی میں
گنّے کے آگے نہایت تیزی سے کترے جا رہے تھے۔ اور نزدیک ہی صحن
میں کڑی کی ایک بہت بڑی کھرلی تھی۔ جس کے گرد کھڑے ہوئے مویشی اپنی
شام کی خوراک چبا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ چیز ہمیں لدھیانہ میں حاصل
نہ ہوئی۔ لیکن میں نے جالندھر میں بہت دیکھی ہیں۔ صحن میں کھڑے ہوئے تمام
مویشی مضبوط جسم کے تھے۔ اور انہیں دیکھ کر حصار کی بیلوں کی تعریف نکلتی
تھی۔ جو ڈسٹرکٹ بورڈ نے اس گردونواح میں لوگوں کو دئیے ہوئے تھے۔ حال
ہی میں انہوں نے کھاد کو گڑھوں میں ڈالنا شروع کیا ہے۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو
انہوں نے کہا کہ ذیلدار کا حکم ہے۔ اور یہ ایک اچھا حکم ہے۔ کیونکہ اب نہ ہوا اسے خراب
کر سکتی ہے۔ اور نہ بارش۔

ایک چیز جو میں نے پہلے کبھی گاؤں میں نہیں دیکھی ایک سائن بورڈ تھا۔ جو
تمام دنیا کو مطلع کر رہا تھا۔ کہ فلاں شخص ایک وید ہے۔ اور ویدک علاج میں بہت
ماہر ہے۔ وہ ضلع فیروزپور سے یہاں آیا تھا۔ اس کے پاس عام طور پر دیہاتیوں
کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ مگر اس پر بھی وہ جراحی کیلئے چند میل کے فاصلے پر ایک
ہسپتال میں جاتے تھے۔ میں نے دریافت کیا کیا تم ہسپتال زیادہ پسند کرتے
ہو یا وید؟ انہوں نے کہا جب ڈاکٹر اچھا ہوتا ہے تو ہم اسے پسند کرتے ہیں۔ آج
کل بے شک ڈاکٹر بہت اچھا ہے۔ میں نے پوچھا کیا تم کبھی ایسے لوگوں کے پاس
بھی جاتے ہو۔ جو تعویذوں سے علاج کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا اب یہ علاج بہت
کم ہے۔ صرف بوڑھے آدمی ان پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود جب ان سے
دریافت کیا گیا۔ تم اب بھی مویشیوں کی بیماری دور کرنے کیلئے سڑک کے آر
پار تعویذ لٹکاتے ہو۔ تو وہ کچھ کھسیانے ہوئے اور کہا کہ ہم ایسا کرتے ہیں۔
میں نے کہا تمہارے پاس جسموں کی حفاظت کے لئے کوئی نہ کوئی ہے۔ کیا کوئی
تمہاری روحوں کی حفاظت کیلئے بھی کوئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس
گردوارہ ہے۔ لیکن گرنتھی کوئی نہیں۔ وہی وید گرنتھ صاحب پڑھ دیتا
ہے۔ اور جو لڑکے پڑھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کے پاس جاتے ہیں۔ تاہم یہ تسلیم کیا
گیا کہ کوئی حقیقی مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی۔

ایک سادھو :- اس سے آگے ہم نے ایک ڈاڑھی والے سادھو کو سڑک
سے ذرا پیچھے بنے ہوئے ایک کمرے والے گھر کے پیچھے لاٹھی سے راستہ ٹٹولتے
ہوئے دیکھا قریب کے ایک کنوئیں سے جو بظاہر مسافروں کے آرام کے لئے
لگایا ہوا تھا۔ یہ ظاہر ہوتا تھا۔ کہ یہاں خیراتی کام بھی ہوتا رہا ہے۔ سادھو جو کہ
ایک کھتری تھا۔ اور نیم کور تھا۔ کئی سال جموں میں رہ چکا تھا۔ سادھوؤں کی طرح
گھومتے گھومتے وہ اس نواح میں آ پہنچ گیا تھا۔ اور چار بھائیوں نے جن کی
زمین ہمارے اردگرد تھی۔ اُسے یہیں رہنے پر راضی کر لیا تھا۔ ایک کمرہ والا گھر
اور کنواں اُسی کے لئے تعمیر کئے گئے تھے۔ ڈھول بجایا گیا تھا۔ اور تمام لوگ
امداد کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ اور تیرھویں دن پانی کی تہ پر پہنچ گئے تھے۔
لیکن اس کی آنکھیں جموں کی پہاڑیوں کی سردی کے بعد میدانی علاقے کی
گرمی برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ جب اس کی نظر جاتی رہی تھی۔ تو وہ آنکھوں
کے مشہور ڈاکٹر سے ملنے کے لئے موگا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اُسے ایک عینک
دی تھی۔ اس نے کہا کہ اب میں اس کی مدد سے آپ کا چہرہ دیکھ سکتا ہوں۔
لیکن اگر اسے اتار دوں یہ کہتے ہی اس نے عینک اتار دی تو آپ کا چہرہ
نظر نہیں آتا۔

لاری کا ڈرائیور جو میرا سامان یہاں لایا۔ کہتا ہے۔ کہ میں عام طور پر لائل پور
اور لاہور کے درمیان چلتا ہوں۔ اور ۹۵ میل کے لئے صرف ۱/۸/- کرایہ لیتا ہوں
یعنی ایک پیسہ فی میل دن میں سفر کرتے ہوئے میں نے ایک گاؤں دیکھا جو
امرتسر کے سکھ جاٹوں نے بسایا ہوا تھا۔

فوجی ملازمت :- لدھیانہ کے سکھوں کے پاس کوآپریٹو بنک نہیں۔ کیونکہ مقروض
ان میں سے کوئی بھی مقروض نہیں ہے۔ لیکن یہاں دو تین ہیں تیس سے زیادہ
ممبر حاضر تھے۔ اور انہیں لین دین کے قوانین میں جرح کرنے کے متعلق
خوب واقفیت تھی۔ تمام اچھے نو آباد لوگوں کی طرح انہیں بھی نہری پانی
کی قلت اور لگان کی رقم کی زیادتی کے متعلق بہت سی شکایتیں تھیں۔ انہوں
نے مسرت سے یہ کہا کہ ہم آخرالذکر کو منسوخ کرانا نہیں چاہتے۔ لیکن یہ کم ضرور
ہو جانا چاہیئے۔ انہوں نے حال ہی کی فصلوں کی کمی کی سخت شکایت کی
انہوں نے بتایا کہ گیہوں کی فصل بالکل نہ ہوئی تھی۔ اور روئی کی فصل بھی اتنی

بھی خراب تھی۔ ایک ہوشیار مگر باتونی شخص نے جو پہلے کبھی سپاہی تھا۔ فوجی ملازمت کے متعلق شکایت کرکے اس میں اور اضافہ کیا۔ اس نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ بھتّہ ہمیشہ مفت ملتا تھا۔ لیکن اسمیں دودھ شامل نہ ہوتا تھا۔ ان لوگوں کو جو ہر روز گھر پر لسّی پیتے ہیں۔ دودھ ضرور ملنا چاہیئے۔ اور اس پر زیادہ خرچ آتا ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ ہمیں وردی کے لئے کچھ ادا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ لیکن جب ہمیں اپنے کپڑے اچھے رکھنے پڑتے تھے۔ تو ہمیں مصیبت پڑجاتی تھی۔ ہماری تنخواہ صرف ۱۱/۱۰ روپیہ ہوتی تھی۔ اور تمام ضروریات پوری کرنے کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ گھر بھیجنے کے لئے کیا بچتا ہوگا۔ کام بھی بڑھ گیا تھا۔ ہر روز تین بار صف آرائی ہوتی تھی۔ اور ہم ہر وقت وردی بدلتے رہتے تھے۔ اس بڑبڑاہٹ میں زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اردلے کی ماہواری تنخواہ اور ساتھ سب کچھ جیسے دوسری جگہوں میں کافی خیال کیا جاتا ہے۔ نوآبادکار کی نظروں میں نہیں سماتی۔

تعلیم:۔ جہاں ہم بیٹھے تھے۔ اس کے قریب ہی تیس چالیس لڑکوں کو کھلی جگہ میں تعلیم دی جارہی تھی۔ اُن کا ماسٹر انجمنوں میں سے ایک کا سیکرٹری تھا۔ اس لئے ہم نے تعلیم کے متعلق دریافت کیا۔ صرف ایک دسویں پاس کھیتوں میں کام کر رہا ہے۔ اور وہ خوب کام کرتا ہے۔ ہم زمینداروں سے زیادہ بہتر۔ کیونکہ وہ صرف کاشت کرنا ہی نہیں جانتا۔ بلکہ پڑھنا بھی جانتا ہے۔ جب یہ دونوں باتیں مشترکہ طور پر سکول میں سکھائی جاتی ہیں۔ تو سکول لڑکے کو اس قابل نہیں بناتا کہ وہ کھیتوں میں کام نہ کر سکے۔ لیکن جہاں صرف پڑھائی ہی پڑھائی ہوتی ہے۔ لڑکا کاشتکاری کے قابل نہیں رہتا۔ ایک دیہاتی نے مجھے پنسل سے لکھتے ہوئے دیکھ کر کہا کہ آپ اس سے لکھتے ہیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ آپ ہمارے لڑکوں کو نوکری حاصل کرنے سے منع کریں۔ بظاہر وہ اس بات سے ڈرا کہ ایسا نہ ہو کہ اس نظامِ تعلیم میں کوئی تبدیلی واقع ہو جائے۔ جس کی وجہ سے ان کے بیٹوں کے لئے ملازمت کرنا اور بھی مشکل ہوجائے۔

معیارِ زندگی:۔ وہ ملازمت کیوں چاہتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے آباؤاجداد جب یہاں آئے تو ان میں سے ہرایک کو ایک مربع زمین دی گئی۔ یہ ہمارے لئے کافی نہیں ہے۔ اور ہمارے بیٹوں کے لئے اور بھی ناکافی ہوگی۔

کیونکہ یہ ان کے کھانے کے لئے بھی کفایت نہ کرے گی۔ ۱۹۱۱ء میں ضلع کی آبادی ......۲ تھی تیس سال بعد تقریباً دس لاکھ تھی۔ اگرچہ زمین زرخیز ہے۔ لیکن پھر بھی بوجھ محسوس ہوتا جا رہا ہے۔ اور اگر آدمی بڑھتے رہے۔ تو صرف وقت آنے کی دیر ہے۔ کہ کشمکش معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے نہیں بلکہ اسے قائم رکھنے کے لئے ہوگی۔ اور لائل پور وسطی پنجاب کے دوسرے گنجان آباد اضلاع سے کچھ زیادہ آسودہ حالت میں نہ ہوگا۔ سابق سپاہی نے کہا اگر پانی کافی ہوتا۔ ان کے لئے ایک بڑا اگر ــــــ تو پانچ آدمیوں کا کنبہ مربعہ کے تیسرے حصے پر گذارہ کر سکتا تھا۔

کسی نے اس کی مخالفت نہ کی۔ خوراک تقریباً وہی ہے۔ جو جالندھر میں تھی۔ لیکن کام کم ہے۔ کنوئیں پر باری لینے کے لئے پو پھٹنے سے پہلے نہیں اٹھنا پڑتا۔ اس وقت اگر کوئی اہم کام ہے۔ تو وہ گنے پیڑنے اور گیہوں گوڈنے کا ہے۔

دو سال گذرے کسی رسالے کی رجمنٹ کے سابق دفعدار نے پھول گوبھی پیدا کرنی شروع کی ہے۔ اور اس سال ایک اور جاٹ نے آلو بونے شروع کئے ہیں۔ اکثر لوگ چند سبزیاں اپنے لئے کاشت کرتے ہیں۔ لیکن سب نے پرزور طریق سے کہا کہ ہم مہینے میں ایک یا دو بار سے زیادہ گوشت کھانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ حسب معمول وجوہات کی بناء پر کوئی مرغیاں نہیں پالتا اُپلوں اور چارے کو سڑا لیتے ہیں۔ جالندھر کی طرح ایندھن کے لئے بہت کم اپلے استعمال کئے جاتے ہیں۔

یہ کچھ تو اس لئے کہ کھاد کی قدر زیادہ کی جاتی ہے۔ لیکن زیادہ تر اس لئے کہ نو آبادی میں کپاس کے پھیل جانے سے کپاس کی چھڑیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ اور اس کی بجائے انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔ پنجاب کے اکثر حصوں میں جہاں دیہاتی ایندھن کی کمی کی وجہ سے کھاد جلانے پر مجبور نہیں ہوتا وہ اسے زمین کے لئے بچانے میں کافی دور اندیشی سے کام لیتا ہے۔ یہاں پانی پینے کے پانچ کنوئیں ہیں۔ دو جاٹوں کے ساتھ گھروں کے لئے ہیں۔ دو نیچ لوگوں کے لئے جنکی تعداد بھی اتنی ہی ہے۔ اور ایک ہندو دکانداروں کے لئے جن کی تعداد تقریباً ایک درجن ہے۔ مشترکہ انتظام سے جاٹ اپنا

پانی مقرر سے بھروا تے ہیں۔ جو ہر ایک کا گھڑا باری باری سے بھر دیتے ہیں۔ چھوت چھات پہلے کی نسبت کم زوروں پر ہے۔ اس میں سے اب صرف اس قدر باقی رہ گیا ہے۔ کہ چمار اور بھنگی جاٹ کے ساتھ ایک ہی چٹائی پر نہیں بیٹھ سکتے۔ بلکہ ذرا پرے زمین پر بیٹھتے ہیں۔ گذشتہ ایام میں انہیں کافی پرے بیٹھنا پڑتا تھا۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ نزدیک کھسکتے چلے آئے ہیں۔

گوردوارے :۔ جاٹوں کے ساتھ ہماری گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا تھا۔ کہ ان کی حالت حد درجہ زبوں ہے۔ لیکن گاؤں گیہوں اور سرسوں کے سمندر سے جس میں کہیں کہیں گنّے کے چھوٹے چھوٹے جزیرے بکھرے ہوئے تھے۔ گھرا ہوا تھا۔ جیٹ کی جانے گن۔ پون چولہ کی جانے واہ لون۔ یہ مثل نہری آبادی میں ہی بنی ہوگی۔ ہر جگہ کسی نہ کسی چیز کے لئے لوگ گورمنٹ کے شکر گذار ہیں۔ لیکن یہ بات نہری آبادی میں بہت کم ہے۔ لوگ وہ دن بھول جاتے ہیں۔ جبکہ کچھ عرصہ پہلے وہ اس زمین میں جو اب افراط سے غلہ بہم پہنچاتی ہے۔ ایک بھی ہل نہ چلتا تھا۔ انہیں اس بات کا بھی بہت کم احساس ہے۔ کہ سرکار نے نہر کے انجنیروں کے دماغوں اور مزدوروں کی تعداد سے جو کام سرانجام دیا ہے۔ اس کے بغیر تمام ان لوگوں میں سے جو ۲۵ برس سے کم ہیں۔ اکثر بالکل زندہ نہ رہتے۔ اب یہ حال ہے۔ کہ دو خوبصورت گوردوارے گاؤں کی پارسائی اور تموّل کی تصدیق کرتے ہیں۔ دونو حال ہی میں بنائے گئے ہیں۔ ایک پر ۰۰۰، روپیہ خرچ آیا ہے۔ اور دوسرے پر ۵۰۰، روپیہ یہاں دو ہی کی ضرورت تھی۔ کیونکہ گاؤں دو حصوں میں (پتیوں) منقسم ہے۔ اور دونو میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتا۔ میں جوتا اتار کر اور سگرٹ کیس ایک نوکر کو دے کر ان میں سے ایک میں گیا۔ یہ ایک فراخ کمرے پر مشتمل تھا۔ شاید چالیس فٹ لمبا۔ جسکے وسط میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اونچے شامیانے کے نیچے بیٹھا گرنتھ صاحب پڑھ رہا تھا۔ وہ ایک معمولی کمہار کا لڑکا تھا۔ اور اپنے کام میں اس قدر محو تھا۔ کہ اسے ہمارے داخل ہونے کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ ان تمام لوگوں نے جو میرے ساتھ داخل ہوئے تھے۔ اپنے سروں سے اسے چھوتے ہوئے اپنے آپ کو زمین پر جھکایا۔ لیکن شامیانے اور گرنتھ صاحب کے علاوہ تقدس کو ظاہر کرنے والی اور کوئی

چیز کمرے میں نہ تھی۔ کڑیاں سرخ، نیلی اور زرد رنگی ہوئی تھیں۔ اور سفیدی کی ہوئی دیواروں کے نچلے حصے کو منقش کر کے آراستہ کیا ہوا تھا۔ صبح و شام جاٹ یہاں پانچ یا دس منٹ کی عبادت کے لئے آتے ہیں۔ اور کمہار کا لڑکا ان کے لڑکوں میں سے بعض کو اگر سمجھتا نہیں تو پڑھنا ضرور سکھاتا ہے۔ یہ حقیقت کہ ساٹھ گھرانوں نے تقریباً ۱۵۰۰ روپیہ گذشتہ دو یا تین سال میں مذہب کے لئے خرچ کر دیا ہے۔ اور اس میں وہ مزدوری شامل نہیں ہے۔ جو بغیر اجرت کے کی گئی۔ ظاہر کرتی ہے۔ کہ یہاں کم از کم مذہب میں جان ہے۔ اگرچہ اس میں اس قدر کافی جان نہ تھی۔ کہ دونو حصوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ایک عمارت کی اجازت دیتا۔ اور واقعہ یہ ہے۔ کہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہاں عزت نام کو نہیں ہے۔ ایک بات جس کا مجھے بہت افسوس ہوا یہ تھی کہ اس قدر روپیہ صرف کرنے کے باوجود کسی عمارت کے نقشے میں کوئی خوبصورتی نہ تھی۔ ہندو دکانداروں نے جس میں برہمن کھتری اور اروڑے شامل ہیں۔ اس سے کہیں اوسط درجے کا مندر بنایا ہے۔ لیکن اسے امتیازی شان دینے کے لئے۔ ایک باغ میں تعمیر کیا ہے۔ اور گاؤں میں صرف یہی ایک باغ ہے۔

دائیاں :- اگرچہ گاؤں نے اینٹوں اور گارے پر اس قدر خرچ کیا ہے اور سکول و فیکٹری (جسمیں روڑی نکالنے کی چھ کلیں) دونو رکھتا ہے۔ لیکن اس میں کسی دوسرے گاؤں سے بہتر دائیاں نہیں ہیں۔ یہاں دو دائیاں ہیں ایک فقیر کی بیوی ہے اور دوسری چمار کی۔ دونو غیر تربیت یافتہ ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے۔ کہ گاؤں میں سکھوں اور ہندوؤں کا غلبہ ہونے کے باوجود دونو مسلمان ہیں

۹ جنوری تھیکری والہ سے چیرانوالہ

فقرا :- آج راستے میں چلتے ہوئے ہم نے پیشہ فقیروں کے متعلق باتیں کیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے۔ جس کا ذکر اس ڈائری میں کئی بار آ چکا ہے۔ کسی نے پیغمبر کی یہ حدیث بیان کی کہ جو شخص اس دنیا میں بھیک مانگتا ہے۔ وہ جب قیامت کے دن دوبارہ پیدا ہو گا۔ تو اس کے چہرے

پر گوشت کا ایک ذرہ نہ ہوگا۔ اگر یہی بات ہے تو پنجاب کے ...... فقیروں
کا یہ انتخاب بہت برا ہے۔ ان کی تعداد ۱۹۲۱ء میں صوبے کے پبلک و سرکاری
تمام ملازموں سے تقریباً چار گنا تھی۔ نو آبادی کے بعض گاؤں نے ان کو اس
قدر وبال جان سمجھا ہے۔ کہ انہوں نے یہ قانون بنادیا ہے کہ ایک فقیر ایک وقت
وقت مانگے۔ اور یہ کہ وہ پیسے ایک آنہ سے لے کر چار آنہ تک فیس ادا کرے۔
اس کا بھیک مانگنے کا حق اُسے ایک جھنڈا دے کر محفوظ کردیا جاتا ہے۔ یہ
جھنڈا اسے مقامی انجمن اصلاح رسومات کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ اور جب
تک جھنڈا واپس نہیں لیا جاتا۔ کسی کو بھیک مانگنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔
اور نہ ہی کوئی جھنڈے والے فقیر کے بغیر کسی کو بھیک دیتا ہے۔ اسکا اثر نہایت اچھا پڑا ہے۔
کیونکہ جھنڈا اس وقت تک رکھا جاتا ہے۔ جب تک اس دن کی تمام خیرات حاصل
کرکے گاؤں کو خالی نہ کردیا جائے۔ اور دوسرے فقیر دوسرے کی کاٹی ہوئی جگہ پر
خوشہ چینی کو ناپسند کرتے ہوئے اور اس خیال سے کہ نہ جانے کتنا عرصہ انتظار
کرنا پڑے۔ اور کہیں چلے جاتے ہیں۔ جس وقت سے یہ تجویز عمل میں لائی گئی ہے۔
فصلیں خراب ہوتی رہی ہیں۔ پہلے روئی کی فصل اچھی نہ تھی۔ پھر گیہوں کی فصل
خراب ہوگئی۔ اور اب پھر روئی کی فصل تقریباً ایسی ہی خراب ہے۔ لوگوں نے
جو تمام جالندھر اور ہوشیارپور کے ارائیں ہیں۔ یہ کہا کہ خیرات کو محدود کرنے سے خدا
ہم سے ناراض ہوگیا ہے۔ گاؤں کے پڑھے لکھے لوگ بہت مشکل سے انہیں اس
کے برعکس سمجھا سکے۔

نہری آبادی کے نہایت ترقی یافتہ حصے میں یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی
ہے۔ کیسی کی مفروضہ رفتارِ تغیر کی نسبت پنجاب زیادہ آہستہ تبدیل ہوتا ہے۔

تقدیر کی تعلیم :۔ ایک نہایت اہم لحاظ سے نوآبادی ایک خاص تبدیلی پیدا
کرتی معلوم ہوتی ہے۔ وسطی پنجاب کی مانند یہاں بھی پہلے کی نسبت بہت
کم باتوں کو تقدیر کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ لوگ یہ دیکھتے ہیں۔ کہ اچھے بیج
ترقی یافتہ آلات اور کاشت در کاشت سے اچھی فصل پیدا کی جا سکتی ہے۔
اور یہ کہ زندگی کی کشمکش میں انسانی سعی ہی اصل جز ہے۔ زندگی کے حالات کو
بہتر بنانے کی خواہش بھی بڑھ رہی ہے۔ آباد کار محض زندگی کی ضروریات حاصل
کرکے مطمئن نہیں ہے۔ جیسا کہ متذکرہ بالا دو مضمونوں میں بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ بہتر

گھر، بہتر لباس اور اپنے بچوں کے لئے بہتر تعلیم چاہتا ہے۔ اور اس پر یہ کہ وہ ان کیلئے کام کرنے کو تیار ہے۔ میرے عملے کے ممبر جو دوسری نہری بستیوں سے واقف ہیں۔ کہتے ہیں کہ تقریباً یہی حقیقت ان کی ہے۔ مثال کے طور پر چونیاں واقعہ ضلع لاہور کی بستی کے مسلمان گردو نواح کے گاؤں کی نسبت جہاں کاشتکاری صرف بارش پر منحصر ہے۔ اپنے آپ پر زیادہ بھروسہ رکھتے ہیں۔ اور پاک پٹن جیسے دور دراز حصے میں بھی جو حال ہی کی نئی بستی ہے۔ نہر کے اجرا کے وقت سے تغیر نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اسمیں خامی یہ ہے۔ کہ فوائد حاصل کرنے کا شوق بھی بڑھ رہا ہے۔

عدم موجود جاگیرداروں کا ایک گاؤں:۔ راہ چلتے چلتے اتفاقیہ طور پر ایک گاؤں میں داخل ہونے سے غیر حاضر جاگیرداروں کی عدم موجودگی ہم پر ہویدا ہوگئی۔ شکستہ و نیم پلستر شدہ دیواروں کے ساتھ اس کی ناپسندیدہ بناوٹ انبالہ و کرنال کے بدترین راجپوت دیہات کے مشابہ تھی۔ ہمارے لئے سوتی پلنگ مہیا کئے ہوئے تھے۔ اور ہم گاؤں کے وسط میں کنوئیں کے پاس بیٹھ گئے۔ پٹواری نمودار ہؤا۔ اور اس کے ساتھ شوقین دیہاتیوں کا ایک انبوہ تھا۔ جو ایک یا دو اروڑا دکانداروں اور ایک ادھیڑ عمر سنار اور اس کے بیٹے پر مشتمل تھا۔ گاؤں کے ۶۵ مربعے ۱۱ جاگیرداروں کی ملکیت تھے۔ جن میں سے صرف تین ایک سیال ایک سکھ جاٹ اور ایک اروڑا گاؤں میں رہتے ہیں۔ باقی ماندہ آٹھ ۳ سیال ۴ سکھ اور ایک جالندھر کا برہمن سب عدم موجود ہیں۔ باشندوں میں سے اکثر مزارعین ہیں۔ جو پنجاب کے مختلف حصوں مثلاً جھنگ لاہور۔ امرتسر۔ جالندھر اور ہوشیار پور سے یہاں پہنچ آئے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایک مربعے سے زیادہ رقبے میں کاشت نہیں کرتا۔ ۵۰ فیصدی کے پاس صرف نصف مربعہ ہے۔ اور سب کو اپنی اپنی مرضی پر چھوڑا ہؤا ہے۔ سال بہ سال اجارے کا ازسر نو اجرا کیا جاتا ہے۔ گرچہ تبدیلی کوئی نہیں کیجاتی۔ لیکن پھر بھی بدامنی کی حس پھیل جاتی ہے۔ چونکہ پیداوار کا نصف حصہ جاگیردار کے پاس چلا جاتا ہے۔ اس لئے کوئی بھی فارغ البال نہیں ہے اور نہ ہی کوئی جاگیردار کسی مزارع کو امداد بہم پہنچاتا ہے۔ قرض لینے کے لئے انہیں تین اروڑا ساہوکاروں میں سے۔ جو گاؤں میں رہتے ہیں۔ کسی ایک کے پاس جانا پڑتا ہے۔ اور انہیں ۱۸ یا ۲۵ فیصدی سود ضرور ادا

کرنا پڑتا ہے۔ د عام طور پر یہی شرح ہے، کوئی جاگیردار ان کے لئے عمدہ بیج مہیا کرنے کی سعی نہیں کرتا۔ ان میں سے صرف دو کے پاس چارہ کترنے کی مشینیں ہیں۔ اور ایک کے پاس سراون کل اور پرسوں کے معائنہ کئے ہوئے دیہاتی جاگیرداروں کے گاؤں کا اس گاؤں سے واضح طور پر مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہاں کے مزارعین میں اُن کی کوئی بھی خصوصیت نہیں ہے۔ یہ ہر قسم کی ترقی یافتہ زراعت سے ناآشنا ہیں۔ اور یہی حال اصلاح یافتہ آمدنی کا ہے۔ چھ ماہ گذرے کوئی ان سے دیہاتی بنک کے متعلق بات چیت کرنے آیا تھا۔ لیکن محض اس ڈر سے کہ بنک کا محض مزارعین پر کوئی تصرف نہ ہوگا یہ ارادہ ترک کر دیا۔ مجھے ایک امریکن پروفیسر کا قول یاد آیا "قحط وبا اور لڑائی کے بعد دیہاتی مخلوق کے لئے سب سے بڑی چیز جو وقوع میں آ سکتی ہے۔ وہ جاگیردار کی غیر حاضر رہنے کی عادت ہے۔ پٹواری نے کہا کہ میرے حلقے کے پانچ گاؤں میں سے ایک اور بھی ایسا ہی ہے۔ میرے عملے نے کہا کہ یہ ایک تمثیلی گاؤں ہے۔ اور یہاں کے باشندوں کی حالت بدترین ہے۔

سودی روپیہ چلانا:- اروڑوں کی موجودگی کی وجہ سے روپیہ چلانے کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ ساہوکار و کاشتکار دونوں نے اس امر پر اتفاق کیا کہ زیادتی اور بیگار کے دن گذر چکے ہیں۔ اور ساہوکار کی خوش نصیبی زمیندار کی خوش بختی سے وابستہ ہے۔ ایک اروڑے نے کہا کہ زمیندار مشکلات میں ہے۔ اور اسی لئے ہمیں بھی دقت ہے۔ وہ صرف فصل میں سے ادا کر سکتا ہے۔ اور اگر فصل نہ ہو تو وہ بالکل ادا نہیں کر سکتا۔ اس بات پر زور دیا گیا۔ کہ گذشتہ ایک دو سال سے جب سے فصلیں متواتر نکمی ہوتی رہی ہیں۔ یہی حال رہا ہے۔ دونوں سناروں میں سے ایک نے اسکی تصدیق کی۔

تجارت کا ایسا برا حال رہا تھا۔ کہ اس نے ۲۱۰۰ روپیہ موٹر لاری پر لگا دیا تھا۔ اور اس میں بھی کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔ کیونکہ وہ بھی خراب ہو گئی تھی۔ اور وہ اس وقت کنوئیں کے پاس متروک حالت میں پڑی تھی۔ ساہوکار زراعت پیشہ ساہوکاروں کی برابری کا بھی شکار تھا۔ میرے عملے کے ایک ممبر کا بیان ہے۔ کہ صرف لائل پور تحصیل میں غالباً ۱۰۰۰ زراعت پیشہ لوگ روپیہ قرض دینے والے ہیں۔

زیورات :- چونکہ دو سنار وہاں موجود تھے۔ ہم نے زیورات کے متعلق گفتگو کی انہوں نے بتایا کہ اب زیورات نہیں خریدے جاتے۔ کیونکہ خراب فصلوں کے تواتر نے ہر ایک کی جیب خالی کر دی ہے۔ اور سب جگہ عورتیں بہت کم پہنتی ہیں۔ دو سال گزرے تمام ضلع کے کمبو سکھوں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ کہ اسے بالکل ترک کر دیا جائے۔ بہت سے لوگوں نے جتنا کچھ ان کے پاس تھا۔ بیچ دیا تھا۔ اور اس کی بجائے زمین خرید لی تھی۔ اور یہ آئے دن کی بات ہے۔ کمبو عورتیں بغیر زیورات پہنے شادی پر جاتی ہیں۔ نو آبادی کے ہر گاؤں میں ایک سنار ہے۔ اور وہ جو کمبوؤں کے گاؤں میں ہیں۔ نقل مکانی کر کے شہروں میں جا رہے ہیں۔ نوجوان سنار نے کہا کہ میں بھی ایسا کرنے کے لئے غور کر رہا ہوں۔ تحصیل کی تحصیل (ٹوبہ ٹیک سنگھ) میں۔ پچاس انجمن ہائے اصلاح رسومات ہیں۔ اور جاٹ اور ارائیں دونو قومیں جنکی وہاں اکثریت ہے۔ یہ چاہتی ہیں کہ وہاں ہر ایک گاؤں میں ایک ایسی انجمن ہو تاکہ شادیوں اور دیگر رسومات کفایت شعارانہ طریق پر انجام دینا ان کے لئے آسان ہو جائے۔

ارائیں عورتیں :- نو آبادی میں ارائیں ایک نہایت اہم اور قابل ذکر قوم ہے۔ جالندھر میں ہم نے انہیں کسان اور سبزی بونے والوں کی حیثیت میں دیکھا تھا۔ بحیثیت کاشتکار صرف سکھ جاٹ ان پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اور وہ بھی ہمیشہ نہیں اور سبزی کاشت کرنے کی حیثیت وہ صوبے بھر میں اول نمبر پر ہیں۔ یہ فضیلت انہیں تکالیف اٹھانے کی لا محدود قوت کی وجہ سے حاصل ہے۔ اس مثل میں اُسے مجملاً ظاہر کیا گیا ہے۔ ؎ رائیں کمان تائیں پچھوں شائیں مائیں۔ مطلب یہ کہ جب کام ہوتا ہے۔ تو رائی وہاں موجود ہوتا ہے۔ اور جب نہیں ہوتا تو وہ غائب ہو جاتا ہے۔ ایک افسر بندوبست انہیں کنوئیں کا غلام کہکر پکارتا ہے اور ایک اور یہ کہتا ہے۔ کہ وہ اُس جگہ کامیاب ہوں گے۔ جہاں محنت نہ کرنے والی دوسری قومیں فاقہ کشی کرینگی۔ آدمی تقریباً ہر جگہ محنت سے کام کرتے ہیں۔ لیکن عورتیں ہمیشہ ایسا نہیں کرتیں۔ آخر الذکر سے وہی توقع رکھی جاتی ہے۔ جڑانوالہ کے گرد و نواح میں رہنے والے جاٹ اپنی عورتوں سے رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ارائیں جاٹ سے کم مرتبہ رکھتا ہے۔ اور جب عورتوں کا معاملہ سامنے آتا ہے۔ تو کم درجے والے عام طور پر اپنے آپ کو بلند مرتبے والے کے سانچے

میں ڈھال لیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ اپنی عورتوں سے کھیتوں میں کام کرانے کے متعلق جاٹوں کی یہ روش بیاس کے شمال اور جنوب میں مختلف ہے۔ یہی فرق ارائیوں میں بھی ہے۔ امرتسر میں ارائیں عورت کپاس چننے کے سوا کچھ نہیں کرتی۔ لیکن جالندھر اور ہوشیارپور میں وہ فرانس اور آسٹریا کے دیہاتیوں کی بیویوں کی طرح ہل چلانے کے علاوہ باقی سب کام کرتی ہے۔ اور بونے کاٹنے گوڈائی کرنے اور کنواں چلانے میں بھی امداد دیتی ہے۔

ایک تعلیم یافتہ ارائیں نے جو کبھی فوج میں تھا۔ اور اب نوآبادی میں رہتا ہے یہ کہا کہ یہ ظلم ہے۔ چونکہ آدمی انہیں اپنے تابع رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ انہیں محنت کرنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ میں نے اکثر دیکھا ہے۔ کہ بچے روتے ہوئے اپنی ماؤں کے پیچھے جا رہے ہیں۔ اور وہ انہیں آرام دینے کے لئے اٹھا بھی نہیں سکتیں۔ کیونکہ ان کے سروں پر گوبر کی ٹوکری ہے۔ ایک اور ارائیں نے جو کہ تعلیم یافتہ بھی تھا۔ اس سے زیادہ کام کرنے والوں پر رحم کھانے کی طرف راغب نہ تھا۔ اس نے کہا کہ اسمیں شک نہیں۔ کہ انہیں بچوں کی نگہداشت کے لئے وقت نہیں ملتا۔ لیکن یہ احتیاج کی صورت میں ہے۔ اور یہ بہتر ہے۔ کہ وہ کام کریں بہ نسبت اس کے کہ ان کے خاوند قرض کا شکار ہو جائیں۔ اگر احتیاج نہ ہوتی تو پھر یقیناً ان کے لئے کم محنت کرنا بہتر ہوتا۔ اسمیں غلامی کی کوئی بات نہیں۔ اس کے برعکس عورت بھی ہمیشہ یہی کہتی ہے۔ مگر اُس نے تسلیم کیا اور ایک اور ارائیں نے جو موجود تھا۔ اس پر رضامندی ظاہر کی کہ ۵۰ فیصدی سے زیادہ عورتوں کو کبھی کبھی اور ۵ یا ۱۰ فیصدی کو ہمیشہ ان کے خاوندوں سے مار پڑتی ہے۔ ایک مرتبہ اس نے آبادکاروں کو معاشرتی رسومات کے اخراجات کم کرنے کے لئے ایک انجمن کا اجرا کرنے کی ترغیب دی تھی۔ اس پر اُسے یہ جواب ملا تھا۔ کہ اگر ہم ایسا کریں۔ تو ہماری روٹی پکانے اور لانے کا کام کون کرے گا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ عورتیں ہڑتال کر دیں گی۔ اور ایک مرتبہ ایک دوسرے ضلع میں انہوں نے زیورات کی رسمی واجبات کو چھوڑنے سے انکار کر کے تقریباً ہڑتال کر دی۔ تاوقتیکہ آدمیوں نے جو کہ سکھ جاٹ اور بہت زیادہ شرابی تھے۔ رواجی شراب پینی چھوڑ دی۔ اگرچہ اس سے آدمیوں کے جذبات کو بہت ٹھیس لگی۔ لیکن انجام کار سر تسلیم خم کر دیا۔ اور اس طرح انجمن اصلاح رسومات نے جو وہاں بنائی گئی تھی۔

منڈی جانے پر کھانے کیلئے غلہ مل جاتا تھا۔ لیکن جوبار میں رہتے تھے۔ ان کے پاس سوائے دودھ کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ خشک سالی میں وہ دور دور بکھر جاتے تھے۔ ایک نحیف بوڑھے آدمی نے جسکے بازو پوست اور بالوں کا مجموعہ تھے۔ اور جسم اب بھی تیس سے بے بہرہ تھا۔ یہ کہا کہ چودہ برس کی عمر میں میں نے اپنے باپ کے اونٹوں کے ساتھ احمد آباد تک سفر کیا تھا۔ جو سمندر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس نے جزیروں کے محل وقوع کے متعلق تفصیل سے بتایا۔ کئی مرتبہ وہ دہلی ہو آیا تھا۔ جو یہاں سے تیس منزل کے فاصلے پر ہے۔ اس نے رائنہ سرسہ حصار اور بھوانی کا نام لے کر راستہ بتایا۔ مجھے بہر حال یہ شبہ تھا کہ آیا یہ بوڑھا بڑھاپے کے تخیل کے سوا اور کہیں گیا بھی تھا۔ یا نہیں کیونکہ اُسے اجمیر یاد نہ آتا تھا۔ لیکن چند غیر معروف جگہوں کے نام لینے کے بعد اس نے دفعتہً کوہ آبو کا ذکر کیا۔ وہ کسی تاجر کی سوداگری کا سامان مثلاً باجرہ۔ کھانڈ وغیرہ لے گیا تھا۔ اور اسے تیس منڈیوں کے لئے ۱۴ روپیہ فی اونٹ دئے گئے تھے۔ بیس یا بائیس سال کی عمر میں وہ فوج کے ساتھ قندھار گیا تھا۔ گمان یہ ہے۔ کہ ۱۸۳۸ء میں گیا ہوگا۔ اس طرح اس کی عمر ۷۰ برس کی ہوتی ہے۔ وہ خود کہتا ہے۔ کہ ۸۰ سال کی ہے۔ اور وہ ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ اسے گزشتہ زندگی کے بہتر ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ اس نے بتایا کہ اس وقت نہ لگان تھا نہ آبیانہ یعنی پیداوار لیا جاتا تھا۔ اور نہ نقد دیا جاتا تھا۔ اب زمین کا لگان ہی سب کچھ نکل جاتا تھا۔ اور سب مقروض ہیں۔ (درحقیقت پنچایت کے پندرہ ممبروں میں سے ۹ مقروض تھے) پہلے دودھ کی افراط ہوتی تھی۔ اب پانی بھی نہیں ہے۔ اس لئے مویشیوں کے لئے چارہ نہیں۔ ضروریات بھی بہت کم تھیں اور کوئی فکر نہ تھا۔ اب لوگ زیادہ ہوگئے ہیں۔ اور زمین پرانی ہوگئی ہے۔ اس کی باتوں کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھی۔ لوگ خراب فصلوں کے تواتر سے دبے ہوئے تھے۔ اور کسان محض ہونے کی وجہ سے وہ اس زندگی کی تکالیف سے حیران تھے۔ جس کے لئے صدیوں کے عمل سے ان میں فطری شعور پیدا نہ ہوا تھا۔ جالندھر میں جب لوگوں کے پاس کافی پانی نہیں ہوتا۔ تو وہ اور کنوئیں اُتارتے ہیں۔ یا نقل مکانی کر کے سمندر پار چلے جاتے ہیں۔ یہاں وہ چاہی کاشتکاری سے بالکل ناآشنا ہیں۔ اور شاذ ہی نقل مکانی کرتے ہیں۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ بغیر کسی توقف کے محکمہ نہر نے گزشتہ پانچ سال کے

پر یہ کہ تعلیم یافتہ طبقہ کی رائے بختہ طور پر ایک ہی بیوی کے حق میں ہوتی جاتی ہے۔

ایک نیک خاتون:- ارائیں عورتیں عام طور پر پردہ نہیں کرتیں۔ کیونکہ وہ ایسا کرنے کی طاقت نہیں رکھتیں۔ کیونکہ پھر اسی طرح اونچی ذات کی (اس حالت میں راجپوتوں کی) پیروی کرتے ہیں۔ اگر وہ ایسا کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ تو وہ پردہ داری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ سپاہی نے بتایا کہ ہمارے گھر پردہ کیا جاتا ہے۔ کچھ مذہب کے خیال سے اور کچھ ڈر کی وجہ سے۔ گھر سے باہر ہماری عورتوں کی سلامتی نہیں ہے۔ ہم ابھی تک اس قدر تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ کہ ہم عورت کو بغیر کسی رغبت کے دیکھ سکیں۔ بہت سی دوسری عورتوں کی طرح جن کا ذکر میں نے اسی دورے میں سنا ہے۔ اس کی بیوی گذشتہ سالوں سے مختلف قسم کا کوئی کام سیکھتی رہی ہے۔ وہ کروشیا کا کام کرتی ہے۔ میز پوش آزار بند اور دریاں بناتی ہے۔ پانچ سال گذرے اس نے ایک کپڑا سینے کی مشین خریدی تھی۔ اور اب گاؤں میں سات یا آٹھ مشینیں ہیں۔ اس کے متعلق غیر معمولی بات یہ ہے۔ کہ وہ عربی اور اردو دونو زبانوں میں تعلیم یافتہ ہے۔ اور اسے گاؤں کی لڑکیوں کو دونو زبانیں پڑھانے کا شوق ہے۔ وہ ان کو سینا اور کشیدہ کاری بھی سکھاتی ہے۔ گاؤں کی ایک اور عورت لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھنا سکھاتی ہے۔ لیکن اسکی بیوی کی طرح محبت کی وجہ سے نہیں

مذہب:- مسلمان سپاہی کا خیال تھا۔ کہ پہلے کی نسبت اب زیادہ مذہبی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن عمل نہیں۔ بہت کم مُلّا قرآن شریف کو ترجمے کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔ اور لڑکے اور لڑکیوں میں سے ایک تہائی سے زیادہ کو اسی طرح سے پڑھایا جاتا ہے۔ وہ بھی اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتے۔ چونکہ تعلیم تقریباً صرف عربی الفاظ تک ہی محدود ہے۔ اس لئے اسے نہ پڑھانے والا سمجھتا ہے۔ اور نہ ہی پڑھنے والا۔ جمعہ کی نماز میں ہفتہ واری خطبے میں کسی قدر عام تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن غالباً دس فیصدی سے زیادہ مُلّا اصل وعظ نہیں جنتے۔ پیر مُلّا سے کچھ زیادہ پوچھا نہیں ہے۔ اس کا کام محض یہ ہے۔ کہ وہ آخرت کے متعلق دیہاتیوں کی جہالت سے فائدہ اٹھاتا رہے۔ نو آبادی کے ۲۵ سے لے کر ۳۳ فیصدی ارائیوں نے اب اس کے پنجوں سے نجات پالی ہے۔

نمازوں کے متعلق یہ ہے۔ کہ اگر وہ دن میں باقاعدہ وضو سے پڑھی جائیں۔ تو تقریباً ۲ گھنٹے صرف ہوتے ہیں۔ علاوہ منٹ پو پھٹنے کے وقت صبح کی نماز کے لئے بیس منٹ۔ بعد از دوپہر ظہر کے لئے دس شام کے وقت عصر کے لئے ۱۵ مغرب یا غروب آفتاب کی نماز کے لئے اور ۴۵ منٹ رات کو عشا کی نماز کے لئے۔ اگرچہ نمازیں اتنا وقت لگتا ہے۔ لیکن دن بھر کے سخت کام کے دوران میں اسکی وجہ سے تازہ دم ہونے کا وقفہ ملتا رہتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے۔ کہ یہ کاشتکار کو نہانے کے لئے مجبور کرتی ہے۔ خواہ یہ غسل کتنا ہی بیرونی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ہر ایک نماز سے پہلے وضو کرنا پڑتا ہے۔ عورتوں اور آدمیوں میں سے تقریباً ۲۰ فیصدی پوری نمازیں پڑھتے ہیں۔ اور اسی قدر لوگ رمضان کے روزے رکھتے ہیں۔ تاوقتیکہ وہ گرمی کے موسم میں آئیں۔

اس صورت میں ان میں سے صرف نصف روزے رکھتے ہیں۔ نماز پڑھنے والوں کا اندازہ بہت کچھ وہی ہے۔ جو مجھے اور کہیں بتایا گیا تھا۔ لیکن ان لوگوں کا جو روزے رکھتے ہیں۔ بہت کم ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ نو آبادی میں دیہاتی اپنی قوتِ برداشت ضائع کر رہا ہے۔

فرقہ داری اور سیاست:۔ دوسرے دیہاتوں کی طرح۔ یہاں بھی فرقہ داری بہت کم ہے۔ انتخاب کے موقعہ پر اس کا احساس تیز ہو جاتا ہے۔ اور جاٹ جاٹ کے لئے۔ ارائیں ارائیں کے لئے اور جانگلی جانگلی کے لئے رائے دیتا ہے لیکن پھر جلدی مردہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دیہاتیوں کی زندگی ایک دوسرے پر اس قدر منحصر ہے۔ کہ وہ ایسے بکھیڑوں کو زیادہ دیر تک سرسبز نہیں ہونے دے سکتے۔ البتہ تنازعات بہت کافی ہیں۔ لیکن یہ ذاتی رقابتوں اور پڑوس کو نقصان پہنچا کر اپنے آپ کو اٹھانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ میرے سپاہی دوست نے بتایا کہ سیاسی دلچسپی ان لوگوں تک محدود ہے۔ جو اخبار پڑھتے ہیں۔ اور باقی نہ اسے جانتے ہیں۔ اور نہ بیرونی دنیا کی پرواہ کرتے ہیں۔ الیکشن کو وبالِ جان سمجھا جاتا ہے۔ دیہاتی اپنی قوم کو امداد پہنچانے کیلئے یا دوست کی امداد کرنے کیلئے رائے دیتا ہے۔ لیکن وہ خیال یہ کرتا ہے۔ کہ یہ ایک دن کا کام ضائع کرتا ہے۔ کیونکہ اسے اس سے کیا نفع ان کیلئے سیاست سے کہیں زیادہ ضروری گذارہ ہے۔ اس کا جسم و دماغ اسی میں لگا رہتا ہے۔ اس وقت میرے گاؤں میں ایک یا دو اخبار آتے ہیں۔ لیکن جوں جوں تعلیم کی اشاعت ہوگی۔

زیادہ اخبار آئینگے۔ اور فرقہ داری بھی پھیلے گی۔کیونکہ اخبارات اسکی متواتر تحریک کرتے ہیں چونکہ اس کے کہنے کا ایک رکن پنجاب کونسل میں ہو آیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تم اسے کہاں تک پسند کرتے ہو۔ اس نے کہا کہ یہ مسلسل پریشانی کی زندگی ہے۔کیونکہ جس کسی نے اپنے کسی رشتہ دار کو آگے بڑھانا ہوتا ہے یا کسی کو ٹنے کی چکی لگوانی ہوتی ہے۔ وہ اس پر امداد یا سفارش کیلئے دباؤ ڈالتا ہے۔ الیکشن بذات خود بھی بہت گراں ہے۔ فلاں وفلاں نے اور اس نے ایک امیدوار کا نام بتایا۔ پچھلی مرتبہ انتخاب میں کھڑے ہونے پر ۱۰۰۰۰ روپیہ خرچ کیا تھا۔ میں اسے مبالغہ سمجھ لیتا اگر ایک اور امیدوار جسے میں کسی اور جگہ ملا یہ نہ مان لیتا کہ اس نے ایک ناکامیاب مقابلے کے لئے ۱۵۰۰۰ روپیہ د۔ ۱۱۲۵ پونڈ) صرف کیا تھا۔

مغربی پنجاب:۔ اب ہم جھنگ میں ہیں۔ یہ حقیقت ایک نہایت عمدہ پکی سڑک کے جس پر ہم چل رہے تھے۔ دفعتاً افق تک سمندر کی طرح پھیلی ہوئی ریتلی پہاڑیوں کے پیچھے غائب ہوجانے سے ناخوشگوار طریق پر منکشف ہوئی۔ ایک لمحے میں ہم انسانی قوت ارادی کی قمر دار دنیا سے تقدیر کی بنجر دنیا میں پہنچ گئے۔ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ یہ دنیا ضلع میں غالب تھی۔ لیکن اب اسمیں کہیں کہیں جان باقی ہے۔ اور چند میلوں کے بعد ہم پھر انسان کی مسرت خیز کارگذاریوں میں آ گئے۔ اور ایک بار پھر اپنے گرد ننھی گیہوں کی زمردین سبزی اور نیشکر کے سنہری جزیرے دیکھے۔ چمرالوالہ میں ایک نئی وضع کے لوگ مجھے ملنے آئے۔ لمبے دبلے اور کانسی جیسے رنگ والے نمایاں اور تقریباً عقابی ناک اونچی رخساروں کی ہڈیاں اور سیاہ چمکدار اور آدھی لٹکی ہوئی زلفیں لئے ہوئے تھے۔ اگر ان کی مردانہ صورت نہ ہوتی تو وہ زنانے نظر آتے یہ مغربی پنجاب کے لوگ تھے۔ انکے اطوار وگفتگو لاہور اور اسکے پانچ دریاؤں کی نسبت ملتان اور سندھ سے بہت اثر لیتی ہے۔

باب ہشتم جھنگ

جاگیردار۔ ساہوکار اور پیر

۲۰ جنوری چمرالوالہ سے بلوانہ۔

ضلع :- اب ہم ٹھیک مغربی پنجاب میں ہیں۔ اس علاقے میں چوڑی خالی جگہیں تیز ٹھٹھراتی سردی اور جھلسنے والی گرمی ہے۔ اس کی صورت اتنی مکروہ ہے۔ جتنی کہ شیطان کی تاہم صبح و شام طلوع و غروب آفتاب کی خوبصورتی سے مکمل تغیر رونما ہو جاتا ہے۔ دیہاتیوں میں سے ایک ایک فرد اپنے آپ کو خدا اور اس کے پیغمبر محمد صلعم کا سچا خادم تسلیم کرتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ جاگیرداروں۔ ساہوکاروں اور پیروں کے غلام ہیں۔ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ شمال میں ہزارہ سے لے کر جنوب میں سندھ تک انسانی مقدر پر ان تینوں کی حکومت ہے۔ اگرچہ یہ لوگ کم و بیش تمام صوبے میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن کہیں اس قدر قوی نہیں ہیں۔ اس وقت ہم ابھی ایسے رقبے میں ہیں۔ جہاں لائل پور کی نہروں سے آبپاشی کی جاتی ہے۔ لیکن ہم نے اس کا وہ حصہ چھوڑ دیا ہے۔ جہاں وسطی پنجاب کے گاؤں میں پرورش پائے ہوئے دیہاتی جاگیردار آباد ہیں۔ اور یہ اُس علاقے کے ابتدائی باشندوں میں سے ہیں۔ جو نہری پانی کے آجانے سے خانہ بدوشیوں سے دیہاتیوں اور چرواہوں سے کاشتکاروں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

نئی ویرانی زندگی :- اس علاقے کا نام بار ہے۔ یہاں کی سابقہ زندگی کل بنک کے اجلاس میں واضح طور پر بیان کی گئی تھی۔ اس کے ممبر کالیا جاٹ تھے۔ وہ گذشتہ ایام میں عرب کے بدوؤں کی طرح سردی کے موسم میں چراگاہ بہ چراگاہ پھرا کرتے تھے۔ خوب بارش ہونے کے بعد ایک یا دو مہینہ آباد ہو جاتے تھے۔ لیکن گرمی میں حرارت کے خوفناک اثرات ہمیشہ ان کو آگے دھکیل دیتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان دنوں میں کوئی قمیص نہ پہنتا تھا۔ اور نہ ہی دن میں دو مرتبہ سے زیادہ کھاتا تھا جن کے پاس کرائے کے اونٹ ہوتے تھے۔ انہیں ایک منڈی سے دوسری

ایک اور دو کالج گئے۔

شادی اور کثرت ازدواج :- ارائیں اگر کم کثیر الاولاد ہوتے تو انہیں کم کام کرنا پڑتا ہے۔ ان کے بڑے کنبے زیادہ تر بچپن کی شادی کی رسم کا نتیجہ ہیں۔ جس کے متعلق ہم نے جالندھر میں بھی سنا تھا۔ تاہم لڑکے سولہ یا سترہ برس تک شادی نہیں کرتے۔ نوجی ارائیں کے چار بچے ہیں۔ اور چونکہ ان میں سے دو کالج میں ہیں۔ اور -/۱۰۰ ماہوار خرچ پڑتا ہے۔ وہ لازمی طور پر یہ شکایت کرے گا۔ کہ صرف ایک مربع پر کنبے کا گذارہ مشکل ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ تمہیں کبھی پیدائش پر قابو رکھنے کا خیال آیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ ہاں میں نے اس کے متعلق بحث کی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے۔ کہ تمام نیک مسلمان اسے مذہب کے خلاف سمجھیں گے۔ میرے عملے کے ایک ممبر نے کہا کہ اگرچہ شہر اور منڈی میں اس پر بحث ہوتی ہے۔ لیکن گاؤں میں کسی کو خیال بھی نہیں۔ میں نے ذکر کیا کہ میں نے سنا ہے۔ کہ وسطی پنجاب کے سکھ اس پر عمل درآمد کرتے ہیں۔ ایک اور ارائیں نے کہا کہ ان کے ہاں لڑکیوں کی کمی کی وجہ سے شادی اس قدر گراں ہو گئی ہے۔ کہ بہت سے لوگوں نے مل کر ایک ہی بیوی پر اکتفا کیا ہے۔ اس کے برعکس میرے والد کے ہاں کئی بیویاں تھیں۔ اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ کوئی آسان شے نہیں۔ کیونکہ میری والدہ اب اپنے خاوند کے ساتھ نہیں رہتی بلکہ میرے پاس رہتی ہے۔ اس دورے میں میری تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ سوائے نوآبادیوں کے اور مغربی پنجاب کے ایک سے زیادہ بیویاں کرنیکا رواج بہت کم ہے۔ میرے عملے کے ممبر کہتے ہیں۔ کہ لائل پور کی نوآبادی میں یہ رسم مسلمان راجپوتوں کی نسبت ارائیوں میں اور سکھ جاٹوں کی نسبت مسلمانوں میں بہت عام ہے۔ واضح طور پر اسے یوں کہا جا سکتا ہے۔ کہ ارائیوں کے گاؤں میں ایک بیوی سے زیادہ رکھنے والے تین ہونگے تو مسلمان جاٹوں کے گاؤں میں دو اور سکھ جاٹوں کے گاؤں میں صرف ایک۔ جنوب مغربی پنجاب میں یعنی اس علاقے میں۔ جو ہم سے آگے ہے۔ اکثر بڑے بڑے جاگیردار اس مشکوک عیاشی میں پھنس جاتے ہیں۔ لیکن نوآبادیوں میں اور اس سے زیادہ وسطی پنجاب میں عورتوں کی بہت بڑی کمی پہلی بیوی کے ہم پلہ دوسری بیوی حاصل کرنے کو مشکل بنا دیتی ہیں۔ ہوشیارپور اور جالندھر میں اکثر صورتوں میں جائیداد حصوں اس قدر کم ہوں۔ کہ دوسری بیوی کی اجازت نہیں دیتی۔ اس

دوران میں بہم پہنچائے ہوئے پانی کی قلت کی شکایت کی اور اپنی تباہی کا گول مول طریق سے گورنمنٹ پر الزام دھر دیا۔

اپنی امداد آپ کرنا:- اگر نہر کا پانی پہلے کی نسبت کم بہم پہنچتا ہے۔ تو اس کا نعم البدل یہ ہے۔ کہ زمین کے نیچے پانی کی سطح اُبھر رہی ہے۔ اور اب پانی سطح زمین سے صرف ۴۳ فٹ نیچے ہے۔ اس گہرائی پر کنوئیں اتارے جا سکتے ہیں لیکن صرف ایک آدمی نے جو بنک کا پریذیڈنٹ ہے۔ عمل کو شکایت پر ترجیح دی ہے۔ اور ایسا کیا ہے۔ ذاتی سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے اس نے اسے حتی المقدور کفایت شعارانہ طریق پر انجام دیا ہے۔ اینٹوں کو جمانے کیلئے اس نے سیمنٹ کی بجائے گارا استعمال کیا ہے۔ اور پانی کھینچنے کے لئے بجائے لوہے کے ڈولوں کے مٹی کی ٹنڈیں استعمال کی ہیں۔ کیونکہ لوہے کے ڈولوں پر ۱۲۰ روپے اور صرف ہوجاتے کنوئیں کے پہئیوں اور ان کی امدادی چیزوں کے لئے اس نے اپنی زمین میں سے معمولی تراشی ہوئی لکڑی استعمال کی ہے۔ اس پر بھی کنوئیں پر -/۱۰۰۰ روپیہ لاگت آئی ہے۔ تمام چیز بحیثیت مجموعی کسان کو اپنی امداد آپ کرنے کی اور اس امداد کی جو اُسے اس کام کے دوران میں بہم پہنچی ایک اچھی مثال تھی۔ کیونکہ جھنگ کوا پریٹو مارٹگیج بنک نے بھی اسے کافی رقم قرض دی تھی۔ لیکن اُسے اپنے ساتھیوں پر ایک فضیلت حاصل تھی۔ وہ اور اس کے تین بھائی جن کے ساتھ وہ رہتا تھا ۴ مربعوں کے مالک ہیں۔ جبکہ دوسروں میں سے اکثروں کے پاس نصف یا اس سے کم مربعہ ہے۔ جس میں سے سوائے نہایت اچھے کاشتکاروں کے باقیوں کے پاس اس قسم کے حوصلہ افزا کام کرنے کے لئے بہت کم روپیہ بچتا ہے۔ اس نے اس سے کما حقہ فائدہ اٹھایا ہے۔ کیونکہ اس نے کنویں کے پاس ایک چھوٹا سا باغ لگوایا ہے۔ جس میں سنگترے اور آموں کے درخت ہیں۔ اور دو میسٹن ہل ایک چارہ کاٹنے کی مشین اور ایک فصل خریف بونے کی مشین خریدی ہے۔ اس نے کوئمبٹور کے گنے بھی کاشت کئے ہیں۔ اور محکمہ زراعت کو اپنے کھیتوں میں سے ایک کھیت کو بطور تشریحی کھیت استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔ یہ تمام باتیں لائل پور میں مشکل سے دیکھی جا سکیں گی۔ اور ابھی جھنگ باقی ماندہ نوآبادی سے ایک نسل پیچھے ہے۔

۴ بخار :- جب ہم پرائمری سکول کے صحن میں داخل ہوئے ۔ جہاں کہ بنک کا اجلاس کیا گیا تھا۔ تو ایک طرف پانچ فٹ سے لے کر دوسری طرف تین فٹ تک ایک درجن لڑکوں نے قطاروں میں کھڑے ہوتے سلام کیا ۔ تین فٹ والے سرے پر چار سالہ شکستہ حال لڑکے اپنی گردنوں میں تعویذ منڈھی ہوئی چاندی کی دو زنجیریاں پہنے ہوئے تھے ۔ ایک اندھیرے سے ڈرتا تھا ۔ اور چلاتا ہُوا جاگ اٹھتا تھا۔ اس کا ڈر مٹانے کے لئے ایک پیر نے دل کے ساتھ رکھنے کے لئے تعویذ دیا تھا۔ دوسرا بیمار پیدا ہوا تھا۔ اور متواتر علیل رہنے کی وجہ سے اسے تعویذ پر تعویذ دئے گئے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے پاس چھ ہو گئے تھے ۔ اور وہ ان تمام کو پہنے ہوئے تھا۔ ان کے مجموعی اثر نے حسب منشاء نتیجہ پیدا کیا تھا۔ اور وہ اب مضبوط تھا۔ ان میں سے بعض اُسے ایک افسر مال نے دئے تھے ۔ جو وہاں موجود تھا ۔ آخر الذکر نے بتایا کہ یہ تعویذ تین ذرائع سے ہم پہنچائے گئے تھے ۔ ایک قرآن شریف دوسرے تعویذ کی کتابوں اور تیسرے ان تعویذوں سے جو باپ سے بیٹوں کے پاس آئے ہیں ۔ اور وہ اکثر پژمردہ جسموں دق کرنے والی روحوں اور پریشان خیالوں کے علاج کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں ۔ جیسا کہ میرے باپ نے مجھ سے پہلے کیا ہے ۔ میں اسی طرح تینوں طریقے استعمال کرتا ہوں ۔ محبت وجدائی جنون کو دور کرنے اور ان کا اثر مٹانے اور بخار کے لئے بھی عملیات موجود ہیں ۔

۵ پیر :- اس کے اپنے بہت سے مرید تھے ۔ جو ملتان ۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور سندھ جیسی دور دراز جگہوں میں رہتے تھے ۔ لیکن وہ ۱۹۱۲ء سے ان سے نہیں ملا تھا۔ اب یہ کام اُس کا خالہ زاد بھائی کرتا تھا ۔ پیروں میں پرانا عقیدہ ہر جگہ راسخ ہے۔ لیکن سندھ میں سب سے زیادہ قوی ہے ۔ پرانے زمانے میں وہاں لوگ پیروں سے اس قدر عقیدت ظاہر کرتے تھے ۔ کہ مرید اُس آگ کی خاک جمع کر لیتا تھا۔ جو رات بھر پیر کو گرم رکھتی تھی ۔ اور اُسے بیماری کے ایام تک جمع رکھتا تھا۔ اور اُس وقت اُسے دکھتے ہوئے اعضاء کے لئے استعمال کرتا تھا ۔ بینک کے ممبروں نے کہا کہ ہم اب بھی عملیات اور اپنے پیروں کی دعاؤں کے موثر ہونے پر اعتقاد رکھتے ہیں ۔ اور اگر ہم پہلے سے کم خیرات دیتے ہیں ۔ تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ

ہماری نصلیں خراب ہیں۔ ان کا پیر ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ جس کی وہ چھ نسلوں سے خدمت کرتے آئے۔ ہر شخص حسب توفیق اسے پیش کش دیتا تھا۔ اور ایک روپیہ سے کم اور ۵ سے زیادہ کوئی نہ دیتا تھا۔ لڑکے کی پیدائش یا شادی پر پیش کش زیادہ ہوتا ہوگا۔ لیکن لڑکی پر نہیں (پھر وہی میز تفریق ہے) یہ نذرانہ شاید بھینس بیل یا گھوڑی کی صورت میں دیا جاتا ہوگا۔ گذشتہ گلہ بانی کے ایام میں جب ان کے پاس روپے نہ ہوتے تھے۔ وہ ہمیشہ مویشی دیتے تھے۔ کسی نے کہا کہ پیروں کے متعلق صرف اس قدر تغیر ہوا ہے۔ کہ لوگ اب ان کی موجودگی میں چارپائیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ جبکہ پہلے وہ ہمیشہ زمین پر بیٹھتے تھے۔

مرشد:۔ پیروں کے علاوہ بہت سے دیہاتی مرشد یا روحانی رہنما رکھتے ہیں۔ لیکن ایک گاؤں میں تمام لوگ ایک ہی رہبر نہیں رکھتے۔ ان کے مرشدوں میں سے ایک سیالکوٹ دوسرا جہلم تیسرا منٹگمری اور چوتھا ہزارہ کا رہنے والا ہے۔ صرف ایک ممبر کا پیر و مرشد ایک ہی آدمی ہے۔ مرشد اپنے پیروؤں کے پاس پیروں سے کم جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر پانچ یا چھ سال کی عدم موجودگی کے بعد چند ماہ گذرے گاؤں میں آیا تھا۔ وہ گوجرہ سے سوار ہو کر آیا۔ تین یا چار سو آدمیوں میں وعظ کیا ان کو نمازیں پڑھنے روزے رکھنے چوری اور سچ سے بچنے کے لئے حکم دیا۔ اور اگلی صبح چلدیا۔ وہی پیش کش جو پیر کو دئیے گئے تھے۔ اُسے بھی دئیے گئے۔ میں نے پوچھا کیا کوئی زکوٰۃ دیتا ہے۔ ایک زمیندار نے کہا کہ پچھلے سال میں نے جو کچھ دوکان میں سے کمایا تھا۔ اس میں سے ۔/۱۰ روپے خیرات کئے تھے۔ یہ دوکان نصف مزارع زمین کاشت کرنے کے علاوہ تھی۔ پریذیڈنٹ نے ساتھ ہی کہا کہ میں زکوٰۃ دیا کرتا تھا۔ لیکن ان کو اتارنے اور کچھ زمین خریدنے کی وجہ سے میرے پاس سال کے اختتام پر کچھ نہ بچا سکا۔

مسجد میں مشترکہ تعلیم:۔ مرشد اور پیر کے علاوہ دو ملّا ہیں۔ لیکن مسجد صرف ایک ہے۔ ایک صرف عربی پڑھ سکتا ہے۔ دوسرا ارواج کے مطابق اردو بھی پڑھتا ہے۔ اور اس کے پاس قرآن شریف کا اردو ترجمہ بھی ہے۔ گلہ بانی کے زمانے میں جبکہ مسجد جنڈ اور کریر کی شاخوں سے گھری ہوئی خالی جگہ تھی۔ اس کا باپ اس قوم کا ملّا ہوا کرتا تھا۔ وہ خود بھی لڑکے اور لڑکیوں کو قرآن شریف

پڑھنا سکھاتا تھا۔ میں نے پوچھا پھر لڑکے لڑکیوں کو سکول میں کیوں نہ اکٹھا پڑھایا جائے؟ انہوں نے کہا کہ سکول میں لڑکے بڑے ہوتے ہیں۔ اور یہ مناسب نہیں ہے۔ کہ وہ لڑکیوں کے ساتھ پڑھیں۔ مسجد میں سب چھوٹے ہوتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آٹھ یا نو برس کے۔ کیونکہ قران شریف پڑھنا سیکھنے میں عام طور پر دو سال سے زیادہ نہیں لگتے۔ اور مولوی پر ہم اعتبار کرتے ہیں۔ چونکہ ماسٹر ان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ساتھ ہی جلدی سے کہا کہ ہم ماسٹر پر بھی اعتبار کرتے ہیں۔ لیکن ممکن ہے۔ وہ کل دوسری جگہ بھیجا جائے۔ اور اسکی بجائے ایک ایسا شخص جس پر ہم بھروسہ نہیں رکھتے یا کوئی ہندو ہی آجائے۔ اس سے زیادہ کوئی بات نہیں کہی گئی۔ ان علاقوں کے سکول گوڑ گاؤں کے سکولوں سے زیادہ صاف ہیں۔ سکول کیلئے دیہاتی بنک کے پریذیڈنٹ نے علیحدہ گھر دیا ہوا ہے۔ دیہاتی زندگی رفاہِ عام کے بے لوث کاموں سے پُر ہے۔

مویشی صفائی اور کھاد:۔ مویشیوں کو گاؤں سے باہر رکھنے کا رواج یہاں کی زندگی کا ایک ایسا پہلو ہے۔ جسے اگر وسطی پنجاب کا آبادکار نقل کرے تو اس کے لئے بہتر ہوگا۔ ہر شخص اپنی زمین میں ایک چھپر ڈالتا ہے۔ اور مویشیوں کو رات کو وہیں رکھتا ہے۔ اور گھر کا ایک شخص ان کے پاس سوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ گاؤں صاف ستھرا ہے۔ یہاں مصلیوں یا مسلمان بنے ہوئے بھنگیوں کے دو تین گھر ہیں۔ لیکن وہ جھاڑو نہیں دیتے۔ مویشیوں کے زمرے میں ایک بات یہ بھی ہے۔ کہ گوبر سے اُپلے نہیں بنائے جاتے۔ جہلم جیسے زیادہ گنجان آباد ضلعوں میں درخت آبادی سے بہت کم ہیں۔ لیکن یہاں غیر مزروعہ زمین اور درخت بہت کافی ہیں۔ اگرچہ وہ قد کے چھوٹے اور بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن پھر بھی بے شمار ہیں۔ اس لئے لکڑی دودھ کو آہستہ آہستہ ابالنے کے علاوہ ہر چیز کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ حقے کے لئے بھی۔ دودھ کے لئے۔ وہ جنگل میں سے مویشیوں کا دھوپ میں سوکھا ہوا گوبر اٹھا لاتے ہیں۔ ضائع کرنے سے بچنے کی یہ ایک اچھی مثال ہے۔ اس طرح تمام کھاد جو دستیاب ہو سکتا ہے۔ زمین میں ڈالا ہے۔ اور تمام تحصیل میں بظاہر یہی رواج ہے۔ اس کے برعکس زراعتی ترقی کی علامت صرف یہ ہے۔ کہ یہاں چارہ کاٹنے کی مشینیں ہیں۔

سید اور پیری مریدی :۔ اس سے آگے چل کر ہم ایک سیدوں کے گاؤں میں ٹھہرے جہاں ایک بنک کا معائنہ کیا۔ جو ۱۹ ممبروں پر مشتمل تھا۔ اور نہایت زبوں حالت میں تھا۔ انہوں نے تقریباً -/۱۶۰۰ روپیہ دینا تھا۔ تمام کے تمام پیر تھے۔ اور پیری مریدی کرتے تھے۔ ان کا آدھا وقت دور دور بکھرے ہوئے مریدوں سے خیرات جمع کرنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ حسب معمول پانی کی قلت اور فصلوں کی خرابی کی شکایت سننے کے بعد میں نے ان سے کہا کہ جب تک تم پیری مریدی کرنے سے باز نہیں آؤ گے۔ تم کبھی بھی راہ راست پر گامزن نہیں ہو سکتے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ پیری مریدی بڑی بُری ہے۔ لیکن یہ ہمارا دستور ہے۔ اور ہم اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ ان کے اس غیر متوقع اعتراف سے قوت حاصل کر کے میں نے ان میں اور پہلے گاؤں میں جہاں کوئی پیری مریدی نہ کی جاتی تھی۔ اور تمام قرضہ صرف -/۱۶۰۰ روپیہ تھا۔ مقابلہ کر دکھایا۔ انہوں نے مسئلہ قسمت کی پرزور تشریح کرتے ہوئے جواب دیا۔ اور آخرکار اس امر کی تفصیل کی کہ ان کی مفلوک الحالی ان کے علاوہ باقی تمام لوگوں کی خطاؤں کا نتیجہ تھی۔ پہلے بنک میں بھی اس کے مدعا اور کارکردگی کے متعلق کچھ دھندلا سا تصور تھا۔ لیکن یہاں تو مطلقاً کوئی خیال ہی نہ تھا۔ یہاں معاملات لائل پور اور جالندھر سے بالکل مختلف تھے۔ اس گاؤں میں ایک قائم شدہ بیطاری شفاخانہ تھا۔ اس کی موجودگی سے لوگ خوش تھے۔ لیکن انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ جب ان کے مویشی بیمار پڑتے تھے۔ تو وہ انہیں گاؤں کے دروازے میں سے تعویذ کے نیچے سے گذارنے کو ترجیح دیتے تھے۔ البتہ اسسٹنٹ بیطار ٹوٹے ہوئے اعضا کو جوڑنے کے لئے زیادہ اچھا تھا۔

۱۲ جنوری بلوّانا سے جھنگ

آج ہم ایک ایسے گاؤں میں پہنچے۔ جو اُن دیہاتیوں کے قبضے میں تھا۔ جو سرکاری طور پر جرائم پیشہ اقوام کے افراد کہلاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو خاندانی بلوچ کہتے ہیں۔ انہوں نے سرکاری بیان کی سخت شکایت کی اور کہا کہ ہم سات پشتوں سے جھنگ میں رہتے چلے آئے ہیں۔ اور جب لوگ ہمیں جرائم پیشہ کہکر پکارتے ہیں۔ تو ہم شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتے ہیں۔ ایک چالیس سالہ آدمی

نے اور بھی وضاحت سے بتایا اس نے کہا کہ ایک اور ضلع میں مجھے پولیس کے محکمہ میں بطور سپاہی ملازم رکھا گیا۔ اگرچہ میں ۲۵ روپیہ ماہوار پر ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ ایک ۷ روپیہ کے کانسٹیبل نے مجھے اپنا بستر اٹھا کر لے جانے کے لئے اسطرح کہا گویا کہ میں قلی تھا۔ اس نے کہا کہ تم جرائم پیشہ اقوام سے تعلق رکھتے ہو۔ میری سخت بے عزتی ہوئی اور میں نے استعفا دے دیا ہم سانسی یا خانہ بدوش نہیں ہیں۔ جو ہمیں اسطرح پکارا جائے۔ ہماری قوم خاندانی ہے۔ جنگِ عظیم میں ہم نے ۱۰۰ رنگروٹ دئے تھے اور ہم سرکار کے لئے اپنے گلے کٹوانے کے لئے تیار تھے۔ جب ہم واپس آئے تو ہم میں سے بہت سے آدمیوں کو امرتسر کی ریفارمیٹری (وہ جگہ جہاں تہذیب سکھائی جاتی ہے) میں بھیج دیا گیا۔ وہ وہاں چار سال کے لئے لنگر بند تھا۔ اور اب بیس دن کی چھٹی پر اپنے گھر آیا ہوا تھا۔ وہ کچھ اس طرح بول رہا تھا۔ جیسے معصومیت نے ولیسر بنا دیا ہو۔ لیکن جب اس سے ایک سوال پوچھ کر یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ اسے ۱۹۱۵ء میں سات سال کی قید ہوئی تھی۔ تو اس پر لوگوں میں ہنسی کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ بعد میں مجھے نہایت معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ اس گاؤں کے بلوچ اول درجے کے مویشی چرانے والے ہیں۔ اور اپنے کام میں کھلاڑیوں کی سی روح اور کاریگروں کی سی مہارت پیدا کر رہے ہیں۔ میرا مخبر رسالدار اس بات پر شرط لگانے کے لئے تیار تھا۔ کہ میں لاہور کے کسی گھوڑے کا نام لوں اور وہ اسے ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر چرا لیں گے۔ ادائیگی کے لئے پہلی سی دولت نہ ہونے کی صورت میں میں نے اس امر کو منظور نہ کیا۔

تعلیم۔ گاؤں کو دیکھنے سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ یہاں پیشہ ور چور آباد ہیں۔ نہ صرف وہاں بنک ہے۔ بلکہ لڑکے اور لڑکیوں کے لئے ابھی ابھی لازمی تعلیم جاری کی گئی ہے۔ لیکن اس وقت تک کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکلا۔ میں نے پوچھا کیا انہیں تعلیم کی ضرورت تھی۔ سب نے ایک آواز ہو کر اقرار کیا اور جب میں نے پوچھا کیوں تو انہوں نے غیر متوقع فہمیدگی سے جواب دیا۔ اس لئے کہ ہمارے لڑکوں کو ملازمت مل جائے۔ اور وہ ساہوکار کے حسابات اور قرآن شریف پڑھ سکیں سکول کا ہوش مندانہ پہلو یہ تھا کہ نصف کنال زمین لڑکوں نے سبزیاں کاشت کرنے کیلئے تیار کی ہوئی تھی۔

لڑکیوں کا سکول :۔ لڑکیوں کا سکول ہیڈ ماسٹر کی بیوی کے ہاتھ میں تھا۔ لڑکوں کی نسبت لڑکیاں زیادہ درج رجسٹر تھیں ۔ اگرچہ سکول میں ہمارے معائنہ کرنے کی توقع نہ تھی ۔ لیکن پھر بھی ۴۹ میں ۴۲ حاضر تھے ۔ ہیڈ ماسٹر اور اسکی بیوی شہر سے آتے ہیں۔ علامات سے یہ ظاہر ہوتا ہے ۔ کہ لڑکیوں کو ایسی باتیں سکھائی جا رہی ہیں۔ جو گاؤں کی نسبت شہر کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ پکانے سینے اور دھونے کے اسباق نہایت اچھے ہیں ۔ لیکن جبکہ لڑکیاں اپنے کپڑوں پر کشیدہ کاڑھنا۔ چارپائیوں کے لئے نواڑ۔ خاوندوں کے لئے ازار بند اپنے کام کے لئے ٹوکریاں اور اپنے گھروں کے لئے چکیں اور چٹائیاں بنانا سیکھ رہی ہوں۔ تو انہیں میز پوش تب۔ لیس اور نہایت شوخ رنگ کی ساڑھیاں بنانی سکھانا میرے خیال میں کچھ ایسا مفید نہ تھا۔ ماقبل الذکر تمام چیزیں۔ سادہ دیہاتی زندگی کا جزو لاینفک ہیں۔ یا ممکن ہے۔ کہ آئندہ مفید طور پر ایسی ہو جائیں۔

دیہاتی پیر :۔ اگر لڑکیوں کا سکول نئی روشنی کا مظہر تھا۔ تو گاؤں میں بہت سی چیزیں ایسی بھی تھیں ۔ جو پرانی تہذیب کا نمونہ تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ انٹذیل ایک پیر تھا۔ جو ضلع لائل پور سے اس گاؤں اور گرد و نواح کے بلوچ گاؤں سے نذرانے جمع کرنے آیا ہوا تھا۔ وہ ماہِ ستمبر سے یہاں تھا۔ اور اس وقت سے کھانا مفت کھاتا رہا تھا۔ اسمیں تقدس کی لاغری نہ تھی۔ بلکہ مضبوط سانڈ کی طرح ہلکا سا موٹا پا تھا۔ میں نے پوچھا آج کل پیروں کا کیا حال ہے۔ اس کا جواب چوڑے طوفانی دریاؤں کی زمین کا اثر لئے ہوئے تھا۔ اس نے کہا کہ ہر جگہ بڑا اعتقاد (سیدھ) ہے۔ اور بڑی ایمانداری ہے۔ جن لوگوں کا اعتقاد اچھا ہوتا ہے۔ انہی کی کشتیاں سلامتی سے کنارے پر آتی ہیں۔ بلا شبہ اسے زمانے میں کوئی نقص نظر نہ آتا تھا۔ اس گاؤں میں چونکہ ہر ایک نالے میں باری باری نہر کا پانی آتا ہے۔ اس لئے رواج یہ ہے۔ کہ اس زمین کو۔ جو اس کے گذارے کے لئے علیحدہ کی ہوئی ہے۔ چھ گھنٹہ پانی دیا جائے۔ اور چونکہ نالے پانچ ہیں۔ (ہر ایک باری باری چودہ دن تک بہتا ہے) پیداوار کافی ہوتی ہے۔ اور اسے کاشت بھی نہیں کرنی پڑتی ۔ یہ بھی اس کے مرید کر دیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ بیج بھی ڈال دیتے ہیں۔ اور زمین کا لگان بھی دیدیتے ہیں اور وہ فصل خریف کی روئی اور اناج میں سے اپنا حصہ لینے آیا ہوا تھا۔ ہر ایک گاؤں نے ایسا انتظام نہیں کیا تھا

- - - - - - - - - - - - - - بعض غلے کی مقررہ مقدار ادا کر دیتے ہیں۔ اور باقی نقدی کی صورت میں دیدیتے ہیں۔ لیکن ساہوکار کے ساتھ لین دین کرنے میں غلہ دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔

سہل ادھار:۔ کوئی ساہوکار حاضر نہ تھا۔ لیکن اس کا نشان تقریباً ہر ایک دیہاتی پر تھا۔ نہروں کے آنے سے پہلے قرض کا زیادہ بوجھ نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ ہر ایک خانہ بدوش ہر اونٹ کے لئے جو اُس کے گھر پیدا ہوتا تھا۔ سات روپیہ سے زیادہ قرض نہ لے سکتا تھا۔ یہ روپیہ وہ گورنمنٹ کو اونٹ چرانے کی فیس دینے کیلئے ادھار لیتا تھا۔ اس کے بدلے میں وہ ساہوکار کو اونٹ دیدیتا تھا۔ لیکن تین سال تک اور اس وقت تک کہ وہ کام کرنے کے قابل ہو اُسے اپنے پاس رکھتا تھا۔ پھر وہ اُسے قرض کی ادائیگی میں دے دیتا تھا۔ یا اگر بد قسمتی سے یہ مرجاتا یا چوری ہوجاتا تو اس کے نام سات روپے سود در سود کے حساب سے لکھ دئے جاتے۔ اب لین دین ایک آدھ روپیہ کا نہیں ہے۔ بلکہ بیسیوں کا ہے۔ بنک کے ۲۸ ممبروں میں سے ۲۷ کو ۱۰۰۰/- سے زیادہ روپیہ دینا ہے۔ ایک شخص جس کے پاس ایک مربعہ سے کچھ زیادہ ہے۔ ۲۰۰۰/ روپیہ دینا ہے۔ جب میں نے اس قدر زیادہ قرضہ کی وجہ دریافت کی تو صرف یہ جواب ملا کہ یہ سب کچھ پیٹ کے واسطے کیا گیا ہے۔ اور سود در سود سے اس قدر زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ عذر بھی پیش کیا گیا۔ کہ ساہوکار نے دھوکا بازی بھی کی تھی۔ یہ گاؤں روپیہ کو ایسے ہاتھوں میں دینے پر جو اس کا استعمال نہ جانتے ہوں۔ خوب روشنی ڈالتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ زمین اور پانی کے عطیے نے ان کی بیہودہ گردنوں میں چکی کا پاٹ لٹکا دیا ہے۔ اب یہ معلوم کرنا مشکل ہے۔ کہ زیادہ مقروض لوگوں کو کس طرح سیدھی راہ پر لایا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں پانی دو اور ہم سب کچھ ادا کر دینگے۔ لیکن زیادہ پانی حاصل کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ کہ کنوئیں اتارے جائیں اور اس کیلئے انہوں نے تاسف کیا اور کہا کہ ہمارے پاس پیسہ نہیں ہے۔

پانی اور کنوئیں:۔ جہاں کہیں ہم جاتے ہیں۔ بار بار زیادہ پانی کی مانگ ہے۔ اور اس بات کی سخت شکایت ہے۔ کہ پہلے کی نسبت پانی کم آتا ہے۔ جب ہم اس گاؤں سے گذرے دو لمبی عورتیں ہمیں گذرتے ہوئے دیکھ کر بت بن کر کھڑی ہوگئیں اور اپنی شرمیلی آنکھیں زمین میں گاڑ کر بے حجابانہ آواز میں چیخ کر

احتجاج کرتے ہوئے بولیں۔ اگر زیادہ پانی نہ دیا گیا تو ہم اور ہمارے بچے یقیناً مر جائینگے
ان لوگوں کی جو نہروں کے انجام پر رہتے ہیں۔ یہ عام شکایت ہے۔ پانی کی
سطح ۲۰ فٹ نیچے ہونے کی وجہ سے اس کا بظاہر علاج یہی ہے۔ کہ کنوئیں
اتارے جائیں۔ جہاں لوگ حوصلہ مند اور بقول ذیلدار دیہاتی زمیندار ہیں۔
آزادانہ طور پر ایسا کیا جا رہا ہے۔ اور ذیلدار کے اپنے گاؤں میں ۴۰ کنوئیں اُتارے
جا چکے ہیں۔ لیکن آج اور کل جیسے علاقوں میں جہاں لوگ دیہاتیوں کے نہیں
بلکہ خانہ بدوشوں کے سے ہیں۔ کنوؤں کا رواج نہیں ہے۔ تاہم ان میں بھی
زیادہ حوصلہ مند اور دور اندیش لوگ اس علاج کو کام میں لاتے ہیں۔ اور
اس گاؤں میں بھی تیرہ یا چودہ سو روپیہ صرف کر کے چار کنوئیں لگائے گئے ہیں۔
ایک قابل ذکر گھر۔ گاؤں میں اتفاق سے میں نے نہایت ہی قابل ذکر گھر
دیکھا۔ جو اُس شخص کی ملکیت تھا۔ جس کے پاس ڈیڑھ مربع تھا۔ اور کھانے
والے صرف چار تھے۔ اور اسی لئے وہ فارغ البال تھا۔ مکان سارے کا سارا
پختہ تھا۔ اور صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ (درحقیقت ایک مہمان خانہ) جس کے
سامنے ایک گارے سے لپا ہوا چوڑا چبوترہ شیشے کی طرح اتنا صاف تھا۔ کہ
میں ایک لمحے کے لئے اس کے پاس سے گذرتا ہوا رک گیا۔ کمرہ بھی اتنا ہی
صاف تھا۔ اور اسمیں بے شمار اقسام کی چیزیں نہایت قرینے سے لگی ہوئی
تھیں۔ اور بہت سی چیزوں سے خوبصورتی کا احساس ٹپکتا تھا۔ ایک سرے
پر گھڑوں کی دو قطاریں تھیں۔ بیس آگے اور پندرہ پیچھے تمام ایک دوسرے
کے اوپر رکھے ہوئے۔ ان کا گہرا سرخی مائل بھورا رنگ ارغوانی رنگت کی چاشنی
لئے ہوئے تھا۔ اور ان پر خوش نما نقوش بنے ہوئے تھے۔ گھر کے مالک نے
انہیں قریب کے ایک گاؤں میں دیکھا تھا۔ اور ۴ آنے فی گھڑے کے حساب
سے قیمت ادا کی تھی۔ کمرے کے دوسرے سرے پر شیشم جیسی پالش کی ہوئی
لکڑی کا ایک شاندار کجاوہ تھا۔ جس پر پیتل کی گول گول ٹکیاں لگی ہوئی تھیں۔
اسے ایک خوش رنگ غالیچے سے جو کابیہ سے ۱۰ روپے میں خرید اگیا تھا۔ ڈھانپا
ہوا تھا۔ بڑی دیوار کے ساتھ ساتھ سرخ نقوش والے پایوں کی چارپائیوں کی
ایک نادر قطار لکڑی کے دروازوں والے مونڈھے جن میں سے ہر ایک میں
آئینہ لگا ہوا تھا۔ اور آٹھ یا نو ٹرنک تھے۔ ان کے اوپر دو طاق تھے۔ جن

میں ہر قسم کے پیتل کے برتن اتنے چمکدار اور اس قدر با ترتیب رکھے تھے جتنا کہ انگلستان
میں ایک کٹیا میں رہنے والی نہایت محتاط بیوی اپنے برتنوں اور کڑاہی کو رکھتی ہے۔
لیکن ایک میم روغن کے دو خالی ٹین کے ڈبوں کو اس طرح رکھنے کا خیال دل میں نہ
لاتی۔ یہاں یہ قطار کے سرے پر رکھے ہوئے تھے۔ اور نہایت مناسب معلوم ہوتے
تھے۔ کیونکہ ان کی ظاہری شکل کو خوبصورت پھولدار نمونوں سے منقش کر کے بالکل
بدل دیا گیا تھا۔ ایک طرف اور چارپائیاں پڑی تھیں۔ اور ایک طرف لحافوں اور تکیوں
کا ڈھیر پڑا تھا۔ لحاف نیلے اور پیلے رنگ کے تھے۔ اور ملتان سے خرید کئے گئے
تھے۔ اُوپر ایک نہایت ہی سجی ہوئی چھت تھی۔ جسے کراچی کے سبز رنگ کئے
ہوئے گارڈر سے سہارا دیا ہوا تھا۔ اس کے وسط میں ایک بڑا آئینہ لگایا ہؤا تھا۔
لیکن اُس میں کھڑکی کسی قسم کی نہ تھی صرف ایک دروازہ تھا۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی
تو انہوں نے کہا کہ ہمیں ڈر تھا کہ ہوا چلنے سے گرد اندر نہ آئے۔ اور ان چیزوں کو
خراب نہ کردے۔ اس جواب سے مجھے لنڈن کے ان گھروں کی یاد آئی جو قرب وجوار
کی چمنیاں صاف ہوتے وقت ان کے کاجل کو روکنے کے لئے کھڑکیاں بند کردیتے
ہیں۔ اس گھر پر صرف ۸۰۰/- روپے لاگت آئے تھے اور اوسط درجے کی قیمت
کے لحاظ سے اس کی چیزوں کی قیمت اندازہ ۷۰۰/- روپیہ تھا۔ میں نے گھر کے مالک سے
پوچھا۔ کیا تم زکوٰۃ دیتے ہو۔ تو اس نے ذرا پشیمانی سے جواب دیا کہ نہیں لیکن میں نے پیر کو
اس کے واجبات ادا کردئے ہیں۔

مالکانِ اراضیات:۔ جن ضلعوں میں سے ابتک گذر ہؤا ہے۔ ان میں مالکانِ خودکاشت کا عنصر
غالب رہا ہے۔ لیکن جھنگ میں یہ فوقیت صرف زمیندار کو حاصل ہے۔ یہاں ستر
سے زیادہ ایسے تعلقہ دار ہیں۔ جو ۱۰۰۰/- روپیہ سے زیادہ زمین کا لگان دیتے ہیں۔
اور ایک تقریباً ۷۰۰۰/- روپیہ ادا کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں نظر آتا۔
جسے اپنی زمین کی بہتری یا اپنے مزارعین کی بہبودی کا خیال ہو۔ مزارعین کو سب
سے بڑی امداد یہ دی جاتی ہے کہ ان کے مویشیوں کو چوروں سے بچایا جائے کہا
جاتا ہے۔ کہ اس مقصد کے لئے بہت سے زمیندار بڑے بڑے چوروں سے میل
ملاپ رکھتے ہیں۔ تاکہ جب مویشی چرائے جائیں۔ تو معاملات کو سلجھا سکیں یا تو چرائے
ہوئے مویشی کو واپس لے کر یا تاوان دے دیں اس کے مساوی کوئی چیز لے کر میل جول
کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو کاشتکاری کرنے میں نہیں تو کم از کم مالِ غنیمت میں

حصہ لینا بہت آسان ہوتا ہے۔ بلاشبہ مزارع اس امداد کی قدر کرتا ہے۔ لیکن عام طور پر ضرورت کے وقت بغیر سود کے روپیہ کی امداد کی توقع نہیں رکھ سکتا کیونکہ بڑے جاگیرداروں میں سے اکثر مقروض ہیں۔ افسر بندوبست نے لکھا ہے۔ کہ بڑی جائدادوں میں سے صرف چند ایک قابل تعریف جائدادوں کو چھوڑ کر باقی تمام کا صرف ایک اور ایک ہی مطلب ہے۔ اور وہ قرض ہے۔ یہ قرضے مختلف طریقوں سے سرچڑھ جاتے ہیں۔ سب سے بڑا طریقہ یہ ہے۔ کہ شخص کی موت کے چھ ماہ بعد تک جو لوگ ماتم پرسی کیلئے آتے ہیں۔ ان کے لئے کھانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہر مرتبہ بہت بڑے پیمانے پر مہمان نوازی کی جاتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہے۔ کہ وہ بڑے بڑے گلے رکھتے ہیں۔ اور کچھ نہ کچھ فالتو مویشی بھی رکھتے ہیں تاکہ کیسا ہی موقعہ اور کیسی ہی ضرورت کیوں نہ ہو۔ ہمیشہ کافی گوشت۔ دودھ اور مکھن دستیاب ہو سکے۔ گذشتہ گلہ بانی کے ایام میں جب نقد روپیہ کسی کے پاس نہ ہوتا تھا۔ مویشیوں کے ایک بڑے گلے کی وہی قدر کی جاتی تھی۔ جو آج بنک میں جمع کئے ہوئے روپیہ کی ہے اس لئے یہ رواج روایت کا تقدس لئے ہوئے ہے۔ اور یہ خاندانی عزت کا سوال بن گیا ہے۔ کہ گلے کے مویشیوں کی تعداد کم نہ کیجائے۔ حال ہی میں جبکہ ایک بڑے جاگیردار نے جب اپنے فالتو مویشیوں کو نیلام کیا۔ تو اس کے بہت سے پڑوسیوں نے اس سے پوچھا کہ تم یہ کیسے گوارا کر سکتے ہو کہ تمہارے مرحوم باپ کے مویشیوں کو فروخت کیا جائے۔ قرض کا دوسرا عام مخرج لاپروائی سے زندگی بسر کرنیکی عادت ہے۔ یہ بیکار لوگوں میں بہت جلد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور خاص طور پر ایسی آب و ہوا میں جو کوشش کرنے کی بجائے آسائش کی طرف لے جاتی۔ اور جب کوئی اور خاص اوباشی نہیں ہوتی تو عقابوں۔ شکاری کتوں اور شکار کر بہت سا روپیہ احمقانہ طریق سے صرف کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات آخرالذکر پر ہزاروں روپیہ صرف کر دیا جاتا ہے۔ ایک عقلمند زمیندار کو چاہئے کہ وہ اپنی جاگیر کے معاملات میں مشغول رہے۔ لیکن وہ یہ سب کچھ اپنے ایجنٹوں کے بھروسے پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور وہ اکثر اپنے مالکوں کی کھال اتارتے ہیں۔ اور مزارعین پر ظلم کرتے ہیں۔ عجیب بات ہے۔ کہ بہت سے مسلمانوں کے ہاں ہندو ایجنٹ ہیں۔ اور ملک کے رواج کے مطابق یہ عہدہ سب سے بڑے بیٹے کو پہنچ جاتا ہے۔ ایک یا دو تعلقدار حسابات رکھتے ہیں لیکن تقریباً سب اسے ایجنٹوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔

اگر اکثر زمیندار بھی بہت سی غیر ضروری چیزیں نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ان کے برعکس بہت سی نمایاں مثالیں بھی موجود ہیں۔ ان میں سے ایک شخص ایک نہایت عمدہ بینک کا پریذیڈنٹ ہے۔ وہ بھٹی راجپوتوں کا لیڈر ہے۔ اور ترقی یافتہ زراعت و تعلیم کا سرگرم حامی ہے۔ وہ تمام ضلع میں بہترین تعاون کرنے والوں میں سے ایک ہے۔ واضح الفاظ میں یہ کہ وہ ایک ایسا آدمی ہے۔ جو کام سے جی نہیں چُراتا۔ اس مثال سے اثر پذیر ہو کر اس فرقہ کے دس یا بارہ زمینداروں نے قرض کے پنجے سے نجات پالی ہے۔ جس طرح ایک اچھا دیہاتی بنک اپنے ممبروں کی امداد کرتا ہے۔ اسی طرح ایک اچھا زمیندار اپنے مزارعین کی امداد کرتا ہے۔ جبکہ وہ مالی مشکلات میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں تو وہ انہیں بغیر سود کے روپیہ ادھار دیتا ہے۔ اور جب ان کے مویشی مر جاتے ہیں۔ تو وہ ان کے لئے اور مویشی تلاش کرتا ہے۔ وہ ان کے لئے شادی کرنے اور غمی کی رسومات بجا لانے کے لئے ذرائع بہم پہنچاتا ہے۔ ان کے جھگڑوں کے فیصلے کرتا ہے۔ اور انہیں ان لوگوں سے بچاتا ہے۔ جو ان سے زبردستی کچھ چھیننا چاہتے ہیں۔ بھٹی سردار کے رسوخ سے اور امداد باہمی کے پھیل جانے سے اس فرقے کے تیس یا چالیس گاؤں میں کوئی ساہوکار نہیں ہے۔ ایک ایسے علاقے میں جہاں ساہوکار نے اپنی موجودگی لازم بنالی تھی۔ یہ ایک بہت بڑی تبدیلی ہے۔ شادی اور غمی کے گراں بار اخراجات کو روکنے کے لئے۔ انجمن ہائے اصلاح رسومات بنائی جا رہی ہیں۔ مجھے ایک ذیلدار کے متعلق بتادیا گیا کہ اس نے اپنی ماں کی موت کے پانچویں دن سے مہمانوں کی آؤ بھگت بند کر کے صرف چند سو روپیہ خرچ کیا۔ اپنی لڑکی کی شادی میں بھی اس نے برات کو صرف ۵۰ آدمیوں تک اور کپڑوں۔ برتنوں اور زیورات کا جہیز ۲۰۰ روپیہ تک محدود رکھا۔ دلہن کو زیورات کی قلیل مقدار پر مطمئن رکھنے کیلئے اس نے اسے دو گھماؤں زمین دیدی۔ میں نے ایک تعلقہ دار کے متعلق بھی سنا ہے۔ جو اپنے گھر کیلئے کفایت شعاری کا نیا معیار قائم کر رہا ہے۔ رواج پر عمل پیرا ہونے اور نوکروں کو گھر کے خرچ کے گودام میں سے حسب مرضی غلہ لینے کی بجائے اس نے نصف سیر فی کس اور ایک سیر فی مہمان روزانہ اندازہ مقرر کر دیا ہے مختصر یہ کہ اس ضلع کے . . . . تعلقہ داروں میں بیداری کی علامات پائی جاتی ہیں۔

اروڑا زمیندار :- جو کچھ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کا تعلق مسلمان زمیندار سے ہے۔ ہندو زمیندار شمار کے لحاظ سے اس سے بہت کم اہمیت رکھتا ہے لیکن بحیثیت زمیندار اور کسان کہیں زیادہ تسلی بخش ہے۔ تحصیل شورکوٹ کو جہاں ہندوؤں کے پاس ۱۰۰۴ ایکڑ زمین ہے۔ افسر بندوبست نے ہندوانہ ملکیت کے عنصر کی بناء پر خوش قسمت بیان کیا ہے۔ اور تحصیل جھنگ میں جہاں انکی ملکیت ۱۰۰۰۰۰ ایکڑ ہے۔ انہیں تمام زمینداروں سے زیادہ محنتی اور لائق بتایا جاتا ہے۔ اور اس وقت بھی جبکہ وہ اپنے ہاتھ سے کاشت کرتے ہیں۔ وہ اپنے پڑوسی مسلمان زمینداروں کی نسبت زمین سے بہت زیادہ فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ ان زمینداروں میں سے اکثر اروڑے ہیں۔ یہ قوم کسان کی نسبت تاجر اور ساہوکار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے۔ لیکن محنت ولیاقت جسطرح اور جگہ اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اسی طرح کاشتکاری میں بھی پتہ دیتی ہے۔ دوسرا فائدہ انہیں یہ ہے۔ کہ وہ محض کاشتکاری پر ہی انحصار نہیں رکھتے بلکہ ساہوکاری یا دوکانداری یا دونوں سے اسمیں اضافہ کرتے ہیں۔ بحیثیت دیہاتی ساہوکار ان کی شہرت اچھی نہیں۔ کل مجھے بہترین ذرائع سے اطلاع ملی تھی کہ حال ہی میں پولیس نے ان کی بہیوں میں خالی صفحات پر قرض داروں کے انگوٹھوں کے نشان پکڑے تھے یہ امر کسی حد تک ان باتوں کی تصدیق کرتا ہے۔ جو کل ان کے خلاف کہی گئی تھیں۔ اس کے برعکس افسر بندوبست لکھتا ہے۔ کہ اسمیں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک روپیہ کا تعلق ہے۔ بے اندازہ سود لینے کے باوجود بنئے کا وجود ان میں سے بعض لوگوں کیلئے ایک حقیقی نعمت ہے۔

دوسرا حصّہ

بیپیر

۲۳ جنوری جھنگ سے حویلی بہادر شاہ !

علاقہ :۔ وہ سڑک جس کے ساتھ ساتھ ہم آج چلے نہری آبادی کی مغربی حد ہے ۔ اور یہی سڑک گاؤں اور ان چھوٹی بستیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتی ہے جنمیں ہر ایک آدمی اپنے کوئیں پر رہتا ہے۔ یہاں کوئیں کے بغیر اگر کاشتکاری ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے ۔ کیونکہ بارش صرف ۱۰ انچ ہے۔ اس قدر کم بارش کی وجہ سے مد نظر زمین نہایت بھدی نظر آتی ہے۔ نخلستان اور بیابان کے بین بین سنسان اور ویران نظر آتی ہے۔ نہ اسمیں اوّل الذکر کی کوئی جاذبیت ہے ۔ اور نہ دوسری کوئی علامت ۔ یہاں گھاس کی نسبت روئیدگی ۔ کھیتوں کی نسبت قطعے ۔ جھاڑیوں کی نسبت چھوٹے پودے اور درختوں کی نسبت ٹُنڈ زیادہ ہیں۔ زمین ننگی نہیں ہے۔ لیکن وہ ملبوس بھی نہیں ہے۔ نہ اسمیں زمانۂ برہنگی کی قدامت ہے ۔ اور نہ مہذّب دنیا کی خوبصورتی ۔ نہریں نظر آتی ہیں ۔ لیکن کھیتوں کے نشان کہیں نہیں ہیں۔ یہی پہاڑیاں معہ ان جگہوں کے جہاں از یاد رفتہ دیہات آباد تھے ۔ زندوں کی نہیں بلکہ مردوں کی یاد دلاتی ہیں۔ اور ان کی بلند سطوح جن پر سابقہ ایام کی نصف کے قریب اینٹیں بکھری ہوئی ہیں۔ فوراً فطرت کے بانجھ اور انسان کے بے بنیاد ہونے کا خیال پیدا کرتی ہیں۔ سڑک دورویہ درختوں کی قطاروں میں سے شروع ہوئی تھی لیکن شیشم کے ٹُنڈ منڈ درختوں نے جلد ہی اپنی جگہ ریت اور چکنی مٹی کو دیدی اس کے بعد گیہوں کے پریشان قطعات اور سرکنڈہ گھاس کے کہیں کہیں پھیلے ہوئے ٹکڑوں کی زمردین سبزی ہی نظر کو تازگی بخشنے کے لئے رہ گئی تھی۔ جو دریائے جہلم اور چناب کے سنگھم کی نزدیکی کی یاد دلاتی تھی۔

بیپیر :۔ سڑک پر ہم دو بیپیروں سے ملے ان میں سے ایک ایک بلوچ اور اس کی سیملی نرگسیلے خط و خال والی بیوی کو راہ لگانے کے لئے آیا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے اسہال زدہ بچے کو اس کے پاس اس لئے لائے تھے ۔ تاکہ وہ اس مزار کے پاس اس سے

جس کا وہ مجاور تھا۔ شک کرنے والے مغربی نے پوچھا۔ کیا یہ واقعی مؤثر ثابت ہوگا؟ بچے کی ماں نے بائیبل کے سے الفاظ میں جواب دیا کہ اگر اعتقاد قوی ہے۔ تو ہمارا مقصد بر آئے گا۔ اعتقاد کے شہیر اس بچے کو چالیس میل سے اڑا لائے تھے۔ پیر خود بھی کسی بیماری میں مبتلا تھا۔ لیکن گرو کی نسبت دوائیوں پر زیادہ اعتقاد رکھنے کی وجہ سے کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ کل پھر ہم ایک معتبر لبستہ قد شخص سے ملے جو ایک بوڑھی ٹٹو ی پر سوار تھا۔ جسے ایک قوی ہیکل نہادم آگے آگے لئے جا رہا تھا۔ وہ بھی ایک پیر تھا۔ اور اپنے مریدوں سے ملاقات کر کے واپس جا رہا تھا۔ وہ راول یا منجم ذات کا تھا۔ اس نے خندہ دہنی سے تسلیم کیا کہ میں کبھی کبھی ہاتھ بھی دیکھتا ہوں۔ لیکن میرا اصل کام تعویذ کے ذریعے بچوں کا علاج کرنا ہے۔ اس نے زمانے کے تغیر پر افسوس کیا اور کہا کہ اعتقاد کا جنازہ اٹھ چکا ہے۔ سڑک پر کام کرتے ہوئے قلیوں کے ایک جتھے کے سردار نے ساتھ مل کر غیر متوقع ذہانت سے کام لیتے ہوئے کہا کہ یہ تعلیم پھیلنے کی وجہ سے ہے۔ بعد میں حویلی بہادر شاہ کے قریشیوں نے بھی اس بات کو برقرار رکھا کہ زمانے میں تبدیلی آگئی ہے۔ ان کے نمائندے نے جسے ہم شاہ صاحب کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ یہ کہا کہ میری جوانی کے ایام میں (اب اس کی عمر ۷۰ برس کی ہے) لوگ پیروں کی موجودگی میں اپنے سر خم کر دیا کرتے تھے۔ اور پیر کو خواہش صرف ظاہر کرنی پڑتی تھی۔ اور وہ اس کی خاطر داری کے لئے فوراً پوری کر دی جاتی تھی۔ لیکن اب تحکم کے ایام ختم ہو چکے ہیں۔ اور پیروں کو ان فقیروں کی طرح جن کے متعلق ہم نے جالندھر میں سنا تھا۔ اپنی ضروریات کے لئے لوگوں کی چاپلوسی کرنی پڑتی ہے۔ اس پر بھی اس کا کام برا نہیں ہے۔ یہاں قریشیوں کے پندرہ یا بیس گھر اپنے پیر کر جو منٹگمری رہتا ہے۔ اس کے آنے پر چار یا پانچ سو روپیہ دیتے ہیں۔ اور وہ ہر چوتھے یا پانچویں سال آجاتا ہے۔ اور ۱۰۰ روپیہ سے لے کر ۱۵۰ روپیہ تک اس کے بھتیجے کو دیتے ہیں۔ جو ہر سال آتا ہے۔ شاہ صاحب نے بتایا کہ تعلیم کی وجہ سے گنڈے تعویذوں میں پہلے کی نسبت بہت کم اعتقاد ہے۔ اس پیر کی یہاں ایک برہمن ہے۔ جو منتروں کی تجارت کرتا ہے۔ جب مویشیوں میں بیماری پھیلتی آتی ہے۔ تو مویشیوں کا ہسپتال ہونے کے باوجود کوئی ہوا [illegible] مویشیوں کو گاؤں کی راہ سے آر پار باندھتے ہوئے تعویذ کے نیچے سے گزارتے

اور کچھ نہیں کرتا۔

ایک تعلیم یافتہ کسان :- شاہ صاحب قابل ذکر ہستی ہے۔ وہ ایک ایسا زمیندار ہے۔ جو انیسویں سال میں کالج میں تھا۔ اور اس وقت سے اب تک اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا رہا ہے۔ ۹ مربعوں (۲۰۰ ایکڑ زمین) سے ہی وہ اب تک ایک دولتمند اور ضلع کے چند اچھے تعلقہ داروں میں سے ہے۔ وہ ایک ایسے فرقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کا وجود صوبہ میں نہایت ہی کمیاب ہے۔ یعنی تعلیم یافتہ تعلقدار جو گاؤں میں ہی رہتا ہو۔ اس قسم کے جن لوگوں سے میں اپنے دوروں میں ملا ہوں۔ وہ صرف دوسرا آدمی ہے۔ وہ ہر ایک کو اچھے خصائل کا آدمی نظر آتا ہے۔ اس کی نظر اتنی ہی سیدھی ہے۔ جتنا کہ اس کا قد اس کے سرخی مائل بھورے چہرے سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ انتظام کرنے کا عادی ہے۔ اسے ایک انجمن اصلاح رسومات کا جو قریشیوں نے اپنے شادی و غمی کے اخراجات کو کم کرنے کے لئے جاری کی ہے۔ پریذیڈنٹ منتخب کیا گیا ہے۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ تمہارے خیال میں دیہاتیوں کو سب سے زیادہ کس چیز کی ضرورت ہے۔ اس نے کہا کہ تعلیم انہیں یہ وہ سب کچھ سکھا دیتی ہے۔ حفظان صحت، بہتر کاشتکاری۔ وغیرہ وغیرہ اس کے بعد خود بخود آجاتی ہیں۔

ایک قصبہ :- حویلی بہادر شاہ معہ ۲۰۰۰ باشندوں کے اگرچہ پختہ مکانوں سے بھرپور ہے۔ لیکن فرحت بخش چیزوں سے عاری ہے۔ گلیوں میں بھی ان تمام دوسرے قصبوں کی طرح جن میں سے میں اس دورے میں گذرا ہوں۔ خس و خاشاک بکھری پڑی تھی۔ اور ہر جگہ بوسیدگی کی بو تھی۔ ان سب سے بچاؤ کا خوش کن پہلو صرف یہ تھا۔ کہ بعض دروازوں پر منبت کاری کی ہوئی تھی۔ سب سے بہتر کام چنیوٹ کے کاریگروں نے کیا ہوا تھا۔ دوکاندار سب کے سب اروڑے ہیں۔ اگرچہ وہ سب سکھ مذہب کے بانی گورونانک کے پیرو ہیں۔ لیکن انہوں نے بتایا کہ ہم سکھ نہیں ہیں۔

گورودوارہ کے پاس سے گذرتے ہوئے جہاں وہ عبادت کرتے ہیں۔ میں نے گرنتھی سے جو کچھ لڑکیوں کو پڑھا رہا تھا۔ دریافت کیا کیا ان میں سے کوئی گرنتھ صاحب کو پڑھ اور سمجھ سکتی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ ان میں

سے بعض ایسا کر سکتی ہیں۔ لیکن جب ہماری التجا پر انہوں نے اس میں سے ایک خبر پڑھ کر سنایا۔ تو ان میں سے کوئی بھی اس کی تشریح نہ کر سکی۔ اسی طرح کی پڑھائی جمعہ مسجد میں ہوتی ہے۔ جو ایک مولوی کے ذمہ ہے جس نے دھلی میں دینیات کی تعلیم حاصل کی ہے۔ اس نے دیسی ادویات کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ اس لئے جسمانی امراض کے لئے بھی اس کی اتنی ہی تلاش کی جاتی ہے۔ جتنی کہ روحانی ضروریات کے لئے۔ ۸۰۰۰ روپیہ لگا کر جمعہ مسجد کی مرمت کی جا رہی ہے۔ اس میں سے ۶۰۰۰ روپیہ قریشی دے رہے ہیں۔ اور بقایا رقم قصبے کے غریب لوگ دینگے۔ جس طرح ہم نے ایک یا دو دوسری جگہوں میں دیکھا ہے۔ یہاں بھی نئے ایکٹ کے ماتحت ایک پنچائت قائم ہے۔ جس نے تقریباً ۵۰ مقدمات کا فیصلہ کیا ہے۔ اب تک جرمانہ نہیں کیا گیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہمیں سختی سے نہیں شروع کرنا چاہیئے۔ اس وقت مدعا یہ ہے۔ کہ ہر بات کا فیصلہ دوستانہ طریق پر ہو جائے۔

۴ جنوری حویلی بہادر شاہ سے محمد

اب ہم فریدکوٹ تحصیل میں ہیں۔ سڑک آج بھی کل جیسی تھی۔ سواری کے لئے اچھی تھی۔ لیکن دور خاکستر آسمان کی بے پایاں حدود تک اس یکسانیت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔ کہ دیکھ کر تھکن پیدا ہوتی تھی۔ اس بے پایانی میں سے کبھی کبھی گرد کا ایک بادل کسی لاری کے آنے کی خبر دیتا تھا۔ اور کبھی اونٹوں کی سایہ دار قطار اور وقتاً فوقتاً ایک سیاہ دھبہ نظر آتا جس سے ظاہر ہوتا کہ کوئی شخص بوجھ اٹھائے آرہا ہے۔ گاڑی کبھی نظر نہیں آتی کیونکہ تحصیل میں مشکل سے بیس ہیں۔ اور جھنگ میں بیس سے کم۔

سفر کے اختتام پر یہ دیکھ کر نہایت تسکین ہوئی۔ کہ نہر کا بنگلہ درختوں کے جھنڈ میں تھا۔

ایک معبد کا سردار:۔ ایک افسر بندوبست کا بیان ہے۔ کہ شورکوٹ مزاروں اور مفلس دیہاتیوں کی زمین ہے۔ گاؤں یقیناً دیہاتیوں کی مفلسی کی مثال ہے۔ اور نزدیک ہی ایک خانقاہ خوشحالی کا نمونہ ہے۔ ۵۷۲ برس گذرے یہ خانقاہ لوگوں کو زندگی بسر کرنا سکھانے کے لئے قائم کی گئی تھی۔ ضلع بھر میں اس کی زیادہ تعظیم کی جاتی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ سجادہ نشین کبھی شادی نہیں کرتا۔ بلکہ ہمیشہ اپنا جانشین کسی برابر کی جماعت میں سے بنا لیتا ہے۔ موجودہ سجادہ نشین جو آج مجھے ملنے کے لئے آیا۔ معزز وضع کا شخص ہے۔ جب میں نے اس سے دریافت کیا کیا تم پیری مریدی کرتے ہو۔ تو وہ حقارت آمیز طریق سے ہنسا۔ خانقاہ کی خوشحالی کی بنا اس کی بڑی جائدادیں ہیں۔ جن کے لئے وہ ۴۰۰۰ روپیہ بطور لگان ادا کرتا ہے۔ بہ حیثیت تعلقہ دار اس نے بتایا کہ میں اپنے مزارعین کو ان کی ضروریات میں امداد دیتا ہوں۔ اور انہیں بغیر سود کے روپیہ قرض دیتا ہوں۔ گذشتہ نومبر میں اس نے گیہوں کا بیج پیشگی دیا تھا۔ جس پر اس کے چھ روپیہ فی من سے زیادہ ملنے کی توقع نہ تھی۔ واپس دینے کے وقت اُ لیکن وہ دئے ہوئے غلے سے زیادہ طلب نہ کرے گا۔ جب وہ جانے لگا۔ تو اس نے کہا۔ بلا شبہ لوگ پہلے سے زیادہ خوشحال ہیں۔ اور بنکوں وغیرہ سے ان کے لئے بہت کچھ کیا گیا ہے۔ لیکن میں صرف اتنی عرض کروں گا۔ کہ پہلے زمانے میں ہم تینوں باروں کے مالک تھے۔ لیکن اب ان لوگوں نے جو پنجاب کے دوسرے حصوں سے آ گئے

ہیں۔ انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ یہاں کا پرانا باشندہ آبادکار کو مداخلت بیجا کرنے والا اور فریب سے اکھاڑنے والا خیال کرتا ہے۔ اور جب وہ پہلے پہل یہاں آیا تو اس نے مویشی چرا کر اُسے باہر نکال دینے کی پوری کوشش کی۔

(۱۲ میل)

ایک نمونہ کا کھیت:۔ میں نے ایک مختصر سا گھر گیہوں سے گھرا ہوا دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دو قابل ذکر جاٹ بھائیوں کا کھیت ہے۔ ۲۶ برس گذرے یہ محسوس کر کے کہ یہاں ان کے باپ کے نصف مربعہ پر گذارہ کرنے والے بہت سے لوگ تھے۔ وہ اپنی روزی لائل پور میں تلاش کرنے کے لئے پیدل چلے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے اراعیوں کے ایک گاؤں میں کسی قدر کاشت شدہ زمین کے پانچ مربعے اجارے پر حاصل کر لئے۔ پہلے پہل انہیں اپنی محنت کا کچھ معاوضہ نہ ملا لیکن ٹھیکہ کم تھا۔ اور وہ اراعیوں اور ان کے قابل تعریف کاشتکاری کے طریقوں کی نقل کرنے میں بڑی عقلمندی سے کام لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ زمین پر قابو پالیا گیا۔ اور روپیہ جمع کر لیا گیا۔ ایک ایک ہزار روپے کی رقم سے انہوں نے اپنے باپ کی جائداد کے پاس زمین خریدی۔ اور بیس برس کے بعد جب ان کا باپ مرا تو وہ دو مربعوں کے مالک بن گئے تھے۔ ۱۲۰۰۰ روپیہ انہوں نے ایک کے لئے دیا اور ۸۰۰۰ دوسرے کے لئے۔ انہوں نے اس قدر روپیہ کس طرح بچایا تھا۔ بہادر نام بھائی نے جو ہمارے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ کہا میں اس طرح رہتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے گھر کے سوت سے بنے ہوئے قمیص اور نصف ننگی چھاتی کی طرف اشارہ کیا۔

اب ان کے پاس اپنے والد کی زمین شامل کر کے ۲½ مربع (۱۲۱ ایکڑ) زمین کاشت

کے لئے ہے۔ پہلا کام جو انہوں نے کیا یہ تھا۔ کہ نئی زمین سے درخت اکھاڑنے کا اہتمام کیا۔ کیکر کے سو درخت اکھاڑے گئے۔ اور ہر درخت گرانے کے لئے آٹھ آنے ادا کئے گئے۔ پھر گھر اور زمین کو تر ہوا اور بیرونی دنیا سے پردے میں رکھنے کے لئے شیشم کے بیش قیمت درخت قطاروں میں لگائے گئے۔ شمالی فرانس کے کاشتکار نے بھی بہت کچھ اسی طرح کیا ہوا ہے۔ ایک باغ میں سنگترے۔ لیموں۔ انار کھجور اور آم کے ننھے پھلدار درختوں کے پودے بھی لگائے گئے تھے۔ لیکن جب تک روپیہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ کچھ نہیں کیا گیا تھا۔ سب سے تازہ کام یہ تھا۔ کہ ایک کنواں مکمل طور پر اتارا ہوا تھا۔ لیکن ابھی پوری طرح تیار نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ زیادہ تر منتشر حیات بسر کرنے کے باعث یہاں پڑوسی بہ نسبت اور جنوبی علاقے کے ایک دوسرے کی امداد کرنے کے کم عادی ہیں۔ تمام مزدوروں کو ۹ر آنے یومیہ کے حساب سے دینے پڑتے ہیں۔ اختتام کے بعد کنوئیں کی قیمت ۹۰۰ روپیہ ہوگی۔ پانی تک گہرائی ۲۰ فٹ ہے۔

کاشتکاری کے طریقے:۔ میں نے بہادر سے پوچھا کہ جھنگ اور لائل پور کے کاشتکاروں میں جو زیادہ تر وسطی پنجاب سے آتے ہیں۔ کیا فرق ہے۔ اس نے کہا کہ آپ دانا ہیں۔ اور میری بات سمجھ جائیں گے۔ یہاں کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ نہ گنّا ہوتا ہے۔ نہ مکئی خربوزے۔ میں نے پہلے سال یہاں خربوزے لگائے۔ لیکن لوگ انہیں اپنے پاؤں سے ٹھکرا کر دیکھتے تھے۔ کہ یہ کیا ہیں۔ اور وہ سارے خربوزے کھا گئے۔ میرے پاس فروخت کرنے کے لئے کچھ بھی باقی نہ بچا۔ اگر میں چنے بوؤں تو آنے جانے والے کچے بھٹے توڑ لیتے ہیں۔ اور شورکوٹ تک کھاتے چلے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سب کچھ خدا کی مہربانی پر منحصر ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ خدا دیتا ہے۔ اور لیتا ہے۔ لیکن یہ ہر ایک شخص کے اختیار میں ہے۔ کہ وہ خوب کام کرے۔ میں ہر شخص کو ایک رکلہ زمین میں سے ڈنٹھل دور کرنے کے لئے ایک روپیہ دیتا ہوں۔ اب یہ اس کے اختیار میں ہے۔ کہ وہ روپیہ کمائے یا نہ۔ میں منہ اندھیرے اٹھتا ہوں۔ لیکن وہ جب تک روشنی نہ ہو جائے نہیں اٹھتے۔ میں بھی اپنے کھیتوں کی گڈائی کرتا ہوں۔ اور اس بات کا خیال رکھتا ہوں کہ مویشی فصلوں میں منہ نہ ماریں میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب زمین کمزور ہو جاتی ہے۔ تو دوبارہ گیہوں بوئے جانے سے پہلے چنوں کی دو فصلیں ہونی چاہئیں۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں۔

میرے پاس سو بھیڑیں بھی ہیں۔ اور مارچ کے مہینے میں جب سردی گذر جاتی ہے۔ میں دن اور رات انہیں باہر زمین پر چھوڑ دیتا ہوں۔ کیونکہ ان کی کھاد زمین کے لئے اچھی ہے۔ وہ ہر کِلّے میں ایک مہینہ ٹھہرتی ہیں۔ پھر وہ دوسرے میں چلی جاتی ہیں۔ اور ہر رات ایک علیحدہ زمین میں رکھی جاتی ہیں۔ پھر یہ کہ لوگ اپنے نالوں کو صاف نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے کھیتوں میں مینڈھیں بناتے ہیں۔ جب میں آیا تو اپنے نالوں میں سے مٹی اٹھائی اور زمین پر بچھا دی۔ میں اپنے کھیتوں میں پانچ یا چھ مرتبہ ہل چلاتا ہوں۔ لیکن وہ صرف ایک یا دوبار ایسا کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ شاید یہ بہتر ہی تھا۔ جو اُسکے پڑوسیوں میں سے کوئی یہ بات نہیں سن رہا تھا کہ اس کا ان کے متعلق کیا خیال تھا۔ لیکن ان پر تنقید کرنے والا صرف وہی نہیں ہے۔ افسر بندوبست کا بیان ہے کہ کسی کام کے شروع کرنے یا حوصلہ رکھنے کا ذکر کرنا تقریباً طنز معلوم ہوتا ہے۔ وہ بہترین کاشتکاری سے بالکل نابلد ہیں۔ وہ خالی زمین کے فوائد بھی نہیں جانتے۔ اور تین سالوں میں دو اچھی فصلیں لینے پر ہر سال ایک ناکارہ فصل حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس طرح سے لگان۔ آبیانہ۔ بیج اور ہر تین سال میں ایک بار کی محنت بچاتے ہیں۔ ان سب امور کے مقابلے میں لوگوں کی دلفریبی کو لایا جا سکتا ہے۔ اور یہ ایک ایسی صفت ہے۔ جو دولت جیسی ٹھوس اور اکثر کے نزدیک نہایت ضروری شے کے مقابلے اتنی ہلکی ہے۔ کہ اسے اس کا ہم پلہ قرار دینا بعید از فہم ہے۔ لیکن بعض کے نزدیک یہی دولت اتنی فریفتہ کرنے والی ہے۔ کہ بیشمار گناہوں پر پردہ ڈالدیتی ہے۔ بہادر کو محکمہ ہائے مفادِ عامہ کی کارگذاریوں کے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہ تھیں۔ میں نے اپنے سب انسپکٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ کیا تم جانتے ہو کہ یہ کون صاحب ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ زمینداروں کو سرکاری بنکوں میں سے روپیہ لیکر دیتے ہیں۔ اور انہیں بتلاتے ہیں کہ واپس کب دینا ہے۔ یہ بالکل وہی جواب نہ تھا۔ جو میں چاہتا تھا۔ کیونکہ بنک گورنمنٹ کے بنک نہیں ہیں۔ اور بلاشبہ امدادِ باہمی کا شتکار کے لئے روپیہ لینے اور اسے ادائیگی کا وقت بتانے سے بہت کچھ زیادہ ہے۔ لیکن امداد باہمی کے متعلق بہادر کی ناواقفیت اس قدر زیادہ تھی کہ اس کی آزادی اس کی تلافی نہ کر سکتی تھی کیونکہ جب میں نے یہ دریافت کیا۔ کہ تم بنک میں حصہ کیوں نہیں لیتے تو اس نے جواب دیا کہ میں نہ بنک میں جاتا ہوں۔ اور نہ ساہوکار کے پاس۔ میں روپیہ صرف اس وقت خرچ کرتا ہوں جب میرے پاس ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ آدمی بھی عقلمند ہے۔

جو اپنی ضرورت کے مطابق بنک سے روپیہ لیتا ہے۔ اور وقت پر واپس کر دیتا ہے۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے۔ انہیں بہت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ اسے لوہے کے کا کوئی خاص خیال نہ تھا۔ وہ یہ کہتا تھا۔ کہ اگر دیسی ہل کو کئی بار چلایا جائے۔ تو یہ بھی اتنا ہی مفید ہے۔ اس نے صاحب کے مربعے (اس نے ایک بڑے جاگیردار کا نام لیا۔ جو جدید طریقوں کے لئے مشہور تھا۔) اور وہاں کے بڑے ہل چلتے ہوئے دیکھے تھے لیکن اسکے خیال میں فصلیں ویسی ہی تھیں جیسی کہ اور کہیں۔

ایک جاٹ کا گھر۔ یہ گھر ایک خاص وضع کا تھا۔ اور ایک بڑے صحن کے گرد بنا ہؤا تھا۔ اس تک اونچی دیوار کے درمیان میں جو مویشی چوروں کے بچاؤ کے لئے بنائی ہوئی تھی۔ ایک محراب دار دروازے میں سے راستہ جاتا تھا۔ سردی کے موسم میں اس کے مویشی جو آٹھ بیلوں دو گائیوں اور دو دودھ دیتی بھینسوں پر مشتمل تھے۔ رات کو برآمدہ میں رہتے تھے۔ اور اس کے نصف حصے کو صاف رکھنے کے لئے ایک پست دیوار کھینچ کر دو حصے کئے ہوئے تھے۔ جو کھرلی کا کام دیتی تھی۔ بھیڑوں کا باڑا علیحدہ تھا۔ اور ہر ایک بھائی کا اپنا اپنا جدا جدا باورچی خانہ تھا۔ کمرے اتنے صاف اور اتنی خوبصورتی سے ترتیب دئے ہوئے تھے۔ جتنے کہ بلوچ کے گھر ہیں۔ اور مقبوضہ اشیاء کو اسی طرح آراستہ کیا ہؤا تھا۔ ملمع کئے ہوئے صندوق۔ پھولدار ٹرنک۔ بچھے ہوئے بستر۔ زنگا رنگ کی ٹوکریاں۔ چمکدار برتن اور خوبصورتی سے اوپر نیچے رکھے ہوئے گھڑے وہاں موجود تھے۔ آخری دو نو چیزیں۔ رنگ اور بناوٹ کے لحاظ سے اتنی خوبصورت تھیں۔ کہ میں نے کبھی نہیں دیکھیں۔ ایک بھائی نے یہ مجموعہ بھینس دیکر حاصل کیا تھا۔ ہر ایک کمرے میں صاحب کیلئے ایک کرسی اونچی لٹکی ہوئی تھی۔ صوبے کے جنوب اور وسط میں اس باقاعدہ انتظام کی محبت تقریباً مفقود ہے۔ لیکن مغرب و شمال میں تقریباً عام ہے۔ یہ کوئی بتا نہ سکا۔ کہ ایسا کیوں ہے۔ کیا یہ اس لئے ہے۔ کہ عورتوں کو گھر سے باہر کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ مثلاً یہاں انہیں گھر سے باہر کوئی کام نہیں ہے۔ نہ پانی لاتی ہیں۔ نہ چارہ کاٹتی ہیں۔ اور نہ اپلے تھاپتی ہیں۔ گئو شالہ کو آدمی صاف کرتے ہیں۔ لیکن کاتنے کا کام بہت کیا جاتا ہے۔ باورچی خانوں میں سے ایک میں دو عورتیں نہایت صاف ستھرے فرش پر دھوئیں سے سیاہ ہوئی ہوئی چھت کے نیچے بیٹھی برف سی سفید روئی کات رہی تھیں۔ وہ دن میں دو مرتبہ کاتتی ہیں۔ اور ہر مرتبہ تین گھنٹہ تک کاتتی ہیں۔

ایک گاؤں کی ابتداء:- یہ سب سے پہلا اصل کھیت ہے۔ جو اس دورے میں میرے دیکھنے میں آیا ہے۔ جس طرح کہ انگلستان میں کوئی کسان لے جاتا ہے۔ آخر میں مجھے یہ بھی بتایا کہ میری زمین یہاں ختم ہوتی ہے۔ لیکن اس ملک میں دیہاتی زمینت پروری کا اس قدر زیادہ طبعی میلان ہے۔ کہ نیچ لوگوں اور کاریگروں کی ایک بستی اس کے گرد نمودار ہوتی جا رہی ہے۔ ایک نائی۔ ایک بہشتی۔ ایک جلاہا۔ اور ایک چمار سب کے سب اس کے پاس کچھ آتے ہیں۔ جب میں نے دریافت کیا۔ کیا تم ان سے کرایہ لیتے ہو۔ تو اس نے کہا توبہ توبہ جب کسی کے پاس کافی روپیہ ہو۔ تو اُسے عزیزوں کی امداد کرنی چاہیئے۔ بلا شبہ نئے گاؤں کی ابتداء اسی طرح ہوئی ہے۔ اور شاید پنجاب کے بہت سے گاؤں کی ابتداء اسی طرح ہوئی ہو گی۔ وہاں ایک مسجد بھی تھی۔ گارے سے لپی ہوئی ایک نہایت صاف ستھری عمارت تھی۔ اور اس پر ایک چھوٹا سا گنبد بھی تھا جو انتہائی صفائی۔ اور کھگل میں ملے ہوئے بھوس کے سنہرے رنگ سے نہایت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ جیسی کہ ہر ایک کو توقع ہو سکتی ہے۔ بہادر دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھتا ہے۔ حاضرین کا خیال تھا کہ ۲۵ فیصدی دیہاتی ایسا کرتے ہیں۔ لیکن عورتوں میں یہ فیصدی تناسب اور بھی کم ہے۔ عورتیں اپنا سر زمین پر جھکا کر بالکل آدمیوں کی طرح نماز پڑھتی ہیں۔ جیسا کہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے۔ بہادر میں گذشتہ اور موجودہ تہذیب دونو پہلو بہ پہلو پائی جاتی ہیں۔ ایک طرف اس نے حسابات رکھنے شروع کر دیئے ہیں۔ چونکہ وہ خود پڑھ لکھ نہیں سکتا۔ اس لئے کوئی دوسرا اس کے لئے یہ کام کر دیتا ہے۔ اور اس کے برعکس وہ اپنے کانوں میں ایک ایک تعویذ پہنتا ہے۔ جو اس کے پیر نے اسے تندرست رہنے کے لئے دیا ہے جب اس کا پیر آتا ہے۔ تو وہ اُسے پانچ روپے دیتا ہے لیکن وہ زکوٰۃ نہیں ادا کرتا کیونکہ سال کے اختتام پر اس کے پاس زائد روپیہ نہیں بچتا۔

ایک ناراضامندہ پیر :- شہر شور کوٹ پیری مریدی کے سلسلے کا مرکز ہے۔ ان میں سے ایک سید نے جو پیروں کے سرکردہ خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ مجھے ایسی کہانیاں سنائیں جو پیری مریدی پر خوب روشنی ڈالتی تھیں۔ دس یا پندرہ برس گذرے جب میں بی۔ اے کی تیاری کر رہا تھا۔ تو تعطیلات میں ہمارے خاندانی مریدوں میں سے ایک شخص آیا۔ اور مجھ سے ایک ایسے تعویذ کی التجا کی جس سے اس کے ہاں ایک بچہ پیدا ہو جائے۔ اسے میرے چچا سے ملنے کی توقع تھی۔ جو ہمارے گھرانے

کا سروار ہے۔ لیکن چونکہ وہ دورے پر گیا ہوا تھا۔ وہ اس کی بجائے میرے پاس آگیا۔ میں نے اپنی طاقت پر فطری وسواس رکھنے کی وجہ سے اور اپنے چچا کے جلد واپس آنے کے خیال سے مرید کو رات بھر ٹھہرنے کے لئے رضامند کر لیا۔ لیکن چچا واپس نہ آئے اور مرید نے پھر التجائیں کرنی شروع کیں۔ اس نے کہا کہ مجھے صرف قران شریف کی ایک آیت درکار ہے۔ ایک ایسی چیز سے جو اس قدر آسانی سے دی جا سکتی تھی۔ انکار کرنا سنگدلی خیال کرتے ہوئے میں نے ایک آیت لکھدی اور مرید خوش خوش چلا گیا۔ ایک سال بعد میں نے دیکھا کہ وہی جانی پہچانی صورت ایک گائے کو لئے آہستہ آہستہ میرے نزدیک آرہی ہے۔ یہ وہی مرید تھا۔ جو مروّجہ شکریہ کے پیش کش کو لئے آرہا تھا کیونکہ تعویذ اپنا کام کر چکا تھا۔ اور خداوند تعالےٰ سے اُسے ایک فرزند عطا فرمایا تھا۔

جُماّ جن :- ایک یا دو سال بعد ایک رشتہ دار بھتیجے کو ایک انوکھی تجویز بتانے آیا یہ تجویز ایک جن کے متعلق تھی۔ جس کا نام جُماّ تھا۔ اس نے اقرار کیا کہ وہ خاندانی خانقاہ سے بھاگ گیا ہے۔ کیونکہ اس کی طرف کافی توجہ نہیں دی گئی۔ اس نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے۔ کہ وہ آنے کے لئے رضامند ہے۔ بشرطیکہ اسے خاندانی روحانی تجارت میں شامل کر لیا جائے۔ جُماّ کی واپسی پر ہمارا کام یقیناً بڑھ جائے گا۔ کیونکہ جُماّ ایک بڑی صاحب قدرت ہستی ہے۔ میں تین کام کر سکتا ہوں۔ ہر خواہش کو فوراً پورا کر سکتا ہوں۔ آگ کھا سکتا ہوں اور غائب کو افشا کر سکتا ہوں۔ تو ی اعتقاد کی ضمانت کے لئے میں یہ سب کچھ عام لوگوں میں کر کے دکھا سکتا ہوں۔ چنانچہ ایک دن مقرر کیا گیا۔ اور بہت سے لوگ نتیجہ دیکھنے کے لئے جمع ہوئے۔ مظاہرہ ایک بڑے صحن میں کیا گیا۔ اور وقت جھٹ پٹے کا تھا۔ تین آدمی گویّوں کو ساتھ لئے ہوئے ظاہر ہوئے۔ اور جب قوالی شروع ہوئی تو وہ اپنے سر ایک طرف سے دوسری طرف ہلانے لگے۔ ان کے تین گھنٹہ بعد کرامتوں کا شروع ہوا۔ سب سے پہلے پیر نے یہ دعوےٰ کیا کہ وہ ہر اُس پھل کو جس کا بھتیجا نام لے اور جو دو میل کے اندر اندر پیدا ہوتا ہو پیدا کر دیگا۔ بھتیجے کے احاطے میں ایک بادام کا درخت تھا۔ اور وہ غالباً وہ اس نواح میں ایک ہی تھا۔ اور بہت کم لوگوں کو اس کے متعلق علم تھا۔ اور اس وقت وہ کچے باداموں سے لدا ہوا تھا۔ پس اس نے ایک کچے بادام کیلئے کہا۔ پیر نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ کہ دو میل کے اندر اندر کوئی ایسا پھل نہیں ہے۔ لیکن اُس نامعلوم درخت کے متعلق سن کر بحث سے دوسری کرامت یعنی آگ کے

کھیل کی طرف متوجہ کیا۔ صحن کے پرلے سرے پر آگ سلگائی گئی۔ اور پتلی پتلی لکڑیاں جلائی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ سرخ ہو گئیں جلانے والا ان کو ان کے منہ تک اٹھاتا تھا اور اندھیرے میں ایک لمحے کے لئے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ آگ کھا رہے ہیں۔ لیکن نزدیک پہنچ کر۔ بھتیجے نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر دہکتی ہوئی لکڑیوں کی روشنی پڑنے سے دھوکا لگتا تھا۔ اور فاصلے پر سے آگ ان کے مونہوں کے اندر جاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ تیسری کرامت یعنی غائب کو افشا کرنے میں پیر کے پاس دلائل قوی تھے۔ کیونکہ اس قسم کے افشاء کو کون ٹھیک یا غلط ثابت کر سکتا ہے۔ غیر معتقد بھتیجے نے ایک اور کرامت کے لئے کہا۔ پیر رضا مند ہو گیا۔ اور کہا کہ اگر ایک بکری ذبح کر کے پکا دی جائے۔ تو جتنا ایک بار تمام کو کھا جائے گا۔ چنانچہ ایک بکری کو ذبح کیا گیا۔ (صحن سے باہر) اور کاٹ کر پکایا گیا۔ اور تمام کی تمام مختاروں میں سے ایک کے سپرد کر دی گئی۔ تاکہ وہ اسے ختم کرے۔ اس مقصد کے لئے وہ جال کے درختوں کے سائے میں چلا گیا۔ جو اتفاق سے برآمدہ ہی میں تھے۔ اس نے خیال کیا کہ یہاں وہ نظر سے اوجھل رہیگا۔ کیونکہ جال کے درختوں پر رات کو بلائیں آتی ہیں۔ اس لئے کوئی معمولی آدمی ان کے پاس نہیں آئے گا۔ لیکن پیر کو نئی تعلیم سے کبھی پالا نہیں پڑا تھا۔ بھتیجا نزدیک پہنچا اور اسی شخص کو چاقو سے زمین میں ایک گڑھا کھودتے اور ذبح کی ہوئی غریب بکری کے علیحدہ علیحدہ ہوئے ہوئے اعضاء کو دفن کرتے دیکھا۔ اس پر پیر کی کاریگری ختم ہو گئی۔ لیکن پیر کی پیری بحال تھی۔ وہ ملتان چلا گیا۔ وہاں اس نے اتنی کامیابی کے ساتھ پاؤں جمائے کہ لوگ جوق در جوق اس کی درگاہ میں آنے لگے۔ اور روپیہ مینہ کی طرح برسنے لگا۔ اس وقت اس نے بھتیجے کو بتایا کہ اس کی آمدنی چار سو روپیہ فی ہفتہ سے کبھی کم نہیں ہوئی۔ اور ایک بار ۱۲۰۰ روپیہ ہوئی تھی۔ لیکن زیادہ بڑے آدمیوں کی طرح اسے کامیابی کا خمار چڑھ گیا۔ اور اس نے اندھوں کو علاج کرنیکا دعوےٰ کیا۔ یہاں [illegible] نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اس کا کاروبار بند ہو گیا۔

ایک ایف۔ اے پاس [illegible] ایک دوسرے ضلع میں [illegible] کیونکہ [illegible] دیہات میں پیروں کے [illegible] سادہ لوحی پر روشنی ڈالتی ہے۔ دس سال گذرے جب [illegible] تو اسے ۱۰۰۲ روپیہ کے

ایک کیمرے کی سخت ضرورت تھی۔ چونکہ دونوں پیروں کے ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے چچازاد بھائی نے یہ تجویز کی کہ وسطی پنجاب کے خاندانی مریدوں میں ایک ہفتہ تک دورہ کیا جائے اور چونکہ افسر کو صرف ایک کیمرہ کی ضرورت تھی۔ اس امر پہ اقرار کر لیا گیا۔ کہ پچھلے دو سو روپیہ وہ لے اور باقی اس کا چچازاد بھائی پس وہ روانہ ہو گئے۔ اور ایک ہفتہ بعد۔ ۱۰۰۰ روپیہ لے کر واپس آ گئے۔ وہ جہاں کہیں گئے۔ انہیں خدا سمجھ لیا گیا۔ اور گائیں بھینسیں۔ بھیڑیں اور بکریاں یا صرار ان کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ چچازاد بھائی جسے پیری مریدی میں کچھ تجربہ تھا۔ تعویذ گنڈے کا کام کرتا تھا۔ لیکن جب اس کے پاس مرید بڑھ جاتے تو وہ ان میں سے کچھ اپنے ساتھی کے پاس بھیج دیتا۔ ان میں سے ایک کسی کی ماں تھی۔ جو اس لئے پریشان تھی۔ کہ اس کا لڑکا قرآن شریف کی قرأت نہیں سیکھ سکتا تھا۔ اس کا دل بہت چاہتا تھا۔ لیکن جب کبھی وہ کوشش کرتا تھا۔ اس نے دیسی کاغذ اور سیاہی منگوائی۔ یہاں کے لوگوں کی خصلت ہے۔ کہ دیسی اشیاء کو ان کے ہم پلہ ولایتی اشیاء سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس نے بے شمار دائرے اور تکونیں بنائیں۔ ان میں سے ہر ایک میں اس نے کچھ نہ کچھ مناسب الفاظ لکھے لیکن اخیر میں وہ یہ نہ سمجھ سکا۔ کہ کیا مناسب بات لکھے۔ ناامید ہو کر اس نے یہ لکھ دیا وہ چیز اچھی ہے۔ جس کا انجام اچھا ہے۔ اور تعویذ ماں کو دے کر کہا کہ اگر اس نے اسے چاندی اور سونے میں منڈھوایا۔ اور لڑکے نے اسے اپنے بازو پر باندھ لیا۔ تو وہ چھ ماہ میں قرآن شریف پڑھنا سیکھ جائے گا۔ اس بات کو دو سال گذر گئے۔ ایک دن جبکہ وہ لاہور میں ٹھنڈی سڑک پر جا رہا تھا۔ تو وہی لڑکا تسلیم بجا لایا اس نے اپنے بازو پر ایک سنہری تعویذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کا پورا پورا اثر ہوا ہے۔ اور میں نے چھ ماہ کے اندر اندر قرآن شریف پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ اس کے چچازاد بھائی نے اس سے بھی بڑے بڑے کام کئے۔

ایک ذیلدار کو بیٹے کی ضرورت تھی۔ اگرچہ وہ بی۔ اے تھا۔ لیکن اس کا خیال تھا۔ کہ تعویذ سے مدد ملے گی۔ ایک تعویذ دیا گیا۔ اور ایک سال کے بعد بچے کے وجود میں آنے کی نشانی کے طور پر ایک بھینس اور چالیس روپے آ گئے۔ دونو بھائیوں سے نہ صرف تعویذات طلب کئے گئے۔ بلکہ ہر قسم کے جھگڑے فیصلے کے لئے ان کے پاس لائے گئے۔ اور ان کے فیصلے ہمیشہ بغیر کسی چون و چرا کے مان لئے گئے۔ اس

نرالے لڑاکے ملک میں قوتِ اعتقاد کیلئے اس سے بڑھ کر اور کیا قابلِ ذکر شہادت مل سکتی ہے۔

ایک پیر کی عنایتیں ۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنا تعویذ دینے یا بیننے میں کوئی رکاوٹ نہیں معلوم ہوتی۔ ایک جوان پیر جس نے ۱۹۲۷ء میں بی۔ اے کیا تھا۔ اگلے دن ایک ملازمت کے متعلق مجھے ملنے آیا۔ اور پیری مریدی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ گذشتہ ماہ مئی میں فارغ ہونے کی وجہ سے میں نے مغربی پنجاب میں اپنے مریدوں سے ملنے کے لئے دورہ کیا۔ وہ چھ ہفتے بعد واپس آیا۔ اور بیس بھیڑیں بکریاں چھ گائیں اور -/۶۰۰ روپیہ نقد لایا۔ یہ چالیس یا پچاس تعویذوں کی قیمت تھی۔ جو روزانہ دئے جاتے تھے۔ یہ زیادہ تر ان لوگوں کو دئے گئے تھے۔ جو اولاد یا دولت چاہتے تھے۔ لیکن وہ نوجوانوں کو بھی دئے گئے تھے۔ تاکہ وہ اپنی عاشقانہ آرزوؤں کو پورا کر لیں۔ دو بیویوں میں سے کم چہیتی بیوی کو تاکہ منظورِ نظر بیوی بے دخل ہوجائے۔ ایسے لوگوں کو جو شادی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جواب مل گیا تھا۔ اسے لوگوں کو جو بدلہ لینے کے لئے بیتاب تھے۔ مقدمہ بازوں کو جو اپنے مقدمے کی کامیابی کے لئے فکر مند تھے۔ ان لوگوں کو جو بیمار رہتے تھے۔ یا ان کو جن کے مویشی بیمار تھے۔ اور ان کو بھی جو دو محبت کرنے والوں میں جدائی کرانی چاہتے تھے۔ اس کے موکلوں میں سے ۷۵ فیصدی عورتیں تھیں۔ میں نے دریافت کیا دشمن مارنے کے لئے تم کیسے جادو بنا سکتے ہو۔ اس نے بتایا۔ کہ ان الفاظ کا مطلب یہ نہیں۔ کہ دشمن کو جان سے مارا جائے۔ بلکہ صرف اسے تکلیف پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ کسی مطلب کے لئے بھی تعویذ دینے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ مرید مجھ پر بہت زور ڈالتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ آپ ہمارے پیر ہیں۔ آپ ضرور ہمارے دشمنوں کے خلاف ہماری مدد فرمائیں۔ کیونکہ اور کون ہے جو ہمارا ساتھ دے۔ اگر آپ ہر ایک بات میں ہماری امداد نہیں کر سکتے۔ تو آپ ہمارے پیر نہیں ہو سکتے۔ ہندوستان میں دوست اور حامی کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ امداد کرے خواہ وہ شخص غلطی پر ہو یا راستی پر۔ اگر وہ غلطی پر ہو تو بلاشبہ اور بھی زیادہ کیونکہ دوستی اور ہمدردی کا تعلق ضروریاتِ حیات سے ہے نہ کہ اصولِ اخلاق سے۔ اس صورت میں نوجوان پیر نے محسوس کیا کہ یا تو اسے ہر مقصد کے لئے پیر بننا چاہئیے۔ یا کسی کے لئے بھی نہیں۔ اس نے کہا کہ پیروں کے لئے تین

نرخ ہیں۔ غریب لوگ صرف ایک روپیہ دیتے ہیں۔ دوسرے اپنی اپنی بساط کے مطابق ۵ یا ۱۰ روپے لیکن جب بچہ پیدا ہوتا ہے۔ یا اس کی شادی ہوتی ہے۔ تو پیش کش اس سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور ۵۰ روپے تک دیا جا سکتا ہے۔ بلوچوں نے جن سے میں چند دن ہوئے ملا تھا یہ کہا کہ ہم اپنے لڑکے کی شادی نہیں کر سکتے تاوقتیکہ ہمارے پیر صاحب موجود نہ ہوں۔ اسکی موجودگی ختنہ کے وقت بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اور کام کرنے سے پہلے اسے بچے کے بال کاٹنے پڑتے ہیں۔

جنوں کو باہر نکالنا:۔ آج راستے میں میرے ہمراہ پیروں کے مشہور خاندان کا ایک شخص تھا۔ اس نے بتایا کہ میرے گھرانے میں سے دو یا تین متواتر دورے پر رہتے ہیں۔ اور تمام اخراجات ادا کرنے کے بعد تیس یا چالیس روپے کما لیتے ہیں۔ اگرچہ وہ خود مسلمان ہیں لیکن بہت سے ہندو بھی ان کے مرید ہیں۔ جب کسی ہندو مرید کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ اسے خانقاہ میں لاتا ہے۔ اور پیر کو ایک رومال اور پانچ پیسے نذرانہ دیتا ہے۔ کیونکہ ہندؤں میں پانچ کا عدد مبارک خیال کیا جاتا ہے۔ ایک سال بعد وہ بچے کے بال کٹوانے پھر آتے ہیں اور ایک روپیہ ۴ یعنی ۵ چونیاں پیش کرتے ہیں۔ بعض مسلمان بھی یہی کرتے ہیں۔ بلا شبہ وہ ان دنوں کے رواج کی پابندی کرتے ہیں۔ جبکہ وہ ہندو تھے بہت سے لوگ خصوصاً عورتیں۔ جن نکلوانے کے لئے شورکوٹ آتی ہیں۔ رسم یہ ہے۔ کہ سیاہ مرچیں آگ میں ڈالی جاتی ہیں۔ اور عورت کا چہرہ اٹھتے ہوئے دھوئیں میں کر دیا جاتا ہے۔ جب اس پر غشی کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ تو اس کے کانوں میں سے ایک کان کے اوپر بالوں میں گرہ دے دی جاتی ہے۔ اور جن کو اسمیں مقید کر لیا جاتا ہے۔ اسے باہر نکلنے کے لئے قسمیں دی جاتی ہیں۔ اگر وہ ضدی ہے۔ اور انکار کرتا ہے۔ تو طاقت استعمال کی جاتی ہے۔ اور عورت کو پیٹا جاتا ہے۔ اگر وہ پھر بھی انکار کرتا ہے۔ تو لوہے کی سیخیں گرم کی جاتی ہیں۔ اور ان سرخ گرم سیخوں کا دیکھنا ہی اسے باہر نکال دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اگر انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔ تو صرف ایک لمحے کے لئے۔ میرے ساتھی کا بیان ہے۔ کہ میں نے ایسا ہوتے دیکھا ہے۔ اور میں نے بھی جن نکالا ہے۔ اگرچہ اس میں انتہائی تدابیر نہیں اختیار کرنی پڑی تھیں۔

سید صاحب نے جو بی۔اے پاس۔اور جن کے متعلق میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ مجھے بتایا کہ جب میں نے دسویں جماعت پاس کی تھی۔ تو میں نے ایک پیر کو چیلنج دیا تھا کہ تم میری موجودگی میں جن نکالو۔ چیلنج منظور کر لیا گیا۔ اور مجھے پیر کے گھر ملتان جانے کا حکم ملا۔ ایک عورت جس پر جن کا اثر تھا۔ لائی گئی۔ اور وہ معہ تین ڈومنیوں کے زمین پر بیٹھ گئی۔ پیر سامنے ایک پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اور ڈومنیوں کو ڈھول بجانے کا حکم دے کر آگے جھکا اور عورت کے سر کے گرد بار بار انگلی پھرانے لگا۔ اور ساتھ ساتھ قرآن شریف کی آیتیں پڑھتا گیا۔ اس نے کئی بار جن کو اپنا نام بتانے کے لئے کہا۔ لیکن ہر بار عورت نے اپنا نام بتایا پھر اس نے اسے سر ہلانے کے لئے کہا۔ اور ایک طرف سے دوسری طرف سر ہلانے کا حکم دیا۔ ڈھول اور آیات پھر شروع ہو گئیں۔ لیکن سب لاحاصل۔ عالم مایوسی میں پیر نے ایک چھڑی اٹھائی اور اسے نہایت سختی سے مارنے کو تھا۔ کہ سید نے جس میں عقلی احساسات کی نسبت انسانی ہمدردی کے جذبات قوی تر تھے۔ بیچ بچاؤ کر دیا اور کہا کہ جو جن اسطرح نکالا جاتا ہے۔ بالکل جن نہیں ہے۔ پیر نے بغیر کسی شرمندگی کے جواب دیا۔ جن تو ہے۔ لیکن کافر ہے۔ مسلمان نہیں ہے۔ اس تمام واقعہ میں پنجاب والوں کے لئے کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ مشہور سیاح ڈاؤنی بیان کرتا ہے۔ کہ اس قسم کے توہمات عرب میں بھی ہیں۔ ملک عرب کی حدود میں مشکل سے کوئی بچہ یا اونٹ ایسا ہوگا۔ جسے تعویذ کے ذریعے بلاؤں سے محفوظ نہ کیا گیا ہو۔ تعویذوں کے لئے وہی لوگ بھاگتے ہیں۔ جو دواؤں کی قیمت ادا نہیں کرتے ان میں سے ہر ایک بو جہل روپے دیکر تعویذ خریدے گا۔ خواہ اس کی قلیل پونجی میں وہ آخری روپے ہی کیوں نہ ہوں۔

۲۶ جنوری شورکوٹ سے کورانگا

سہل طریقہ ادھار:۔ آج راہ چلتے چلتے ہم پٹھانوں کا ایک گاؤں دیکھنے کیلئے ٹھہر گئے۔ جو ایکٹ انتقال اراضی پیدا ہو جانے کی صورت میں آسانی سے روپیہ قرض لینے کے خطرات کو خوب منکشف کرتے ہیں۔ چونکہ اس ایکٹ کی رو سے انہیں کاشتکار نہیں ٹھہرایا گیا۔ ہر شخص ان کی زمین خرید سکتا ہے۔ اور مقامی ساہوکاروں نے اس موقعہ سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے

خوشی سے روپیہ دیا ہے۔ اور پٹھانوں نے خوشی سے ادھار لیا ہے۔ اب ان میں سے ۳۰ پٹھانوں کو ۸۰۰۰ روپیہ دینا ہے۔ اور اب ۲۵ سال کے بعد ان کی ۴۰۰ ایکڑ زمین میں سے صرف ۲۹۰ ایکڑ زمین رہ گئی ہے۔ حاضرین میں سے ایک نے جو ۱۰۰ ایکڑ زمین کا مالک ہے۔ یہ کہا کہ گذشتہ فصل ربیع کے وقت میرا ساہوکار تولنے کے بعد ۱۲۲ من گیہوں میں سے ۹۶ من (باقی ۲۶ من گیہوں میرے اور ۵ دوسرے لوگوں کے لئے جو میرے آسرے پر جیتے ہیں گذارے کیلئے رہ گئی) ۲۵ یا ۲۶ من چنے، ۲۱ من جوار اور ۱۷ یا ۱۸ من گیہوں کا بھوسہ لے گیا۔ اور مزید براں اسے ۴ مرلے سبز گیہوں اس کے مویشیوں کیلئے دی گئی۔ یہ سب کچھ ۸۰۰ روپیہ کے قرض کے بدلے دیا گیا۔ جو دو یا تین سال گذرے ایک دوسرے بنئے کا قرض اتارنے کے لئے لئے گئے تھے۔ منڈیوں کا قطعی طور پر نام و نشان نہ ہونے کی وجہ سے پیشگی نقد روپیہ دینے کی صورت میں ۵ فیصدی وضع کر لیا جاتا ہے۔ دونوں فصلوں کے موقعہ پر چارہ لیا جاتا ہے۔ اور اسے حساب میں شمار نہیں کیا جاتا۔ اور غالباً رسیدیں بھی نہیں دی جاتیں۔ سود کی معمولی شرح دوسری جگہوں کی نسبت کچھ زیادہ نہیں ہے۔ زیادہ تر ۱۸¾ فیصدی ہے۔ لیکن مقروض ہر طرح سے قرض خواہ کے قابو میں ہوتا ہے۔ یہاں روپیہ کی طرف سے عام لاپروائی۔ اس امر سے ظاہر ہے کہ ۱۹۲۲ء میں بنک کے پریذیڈنٹ نے بلا کسی نمایاں بددیانتی کی نیت کے ۱۰۰ روپیہ ادھر ادھر کر دیا تھا۔ اگرچہ ۱۹۲۷ء میں اسے کتاب میں درج کر دیا تھا۔ لیکن ابھی تک ادا نہیں کیا گیا۔ اتنا ہی روپیہ سیکرٹری بھی اپنے ساتھ سندھ لے گیا تھا۔ جہاں اس کی زمین ہے۔ لیکن اس سے اس نے فائدہ اٹھایا تھا۔

عمدہ کاشتکاری اور عمدہ رہائش:- بنک کے ممبروں نے اس امر کا احساس کرتے ہوئے کہ وہ اپنی زمینوں کو ضائع کر دینے کے خطرے میں ہیں۔ انجمن ترقی زراعت و انجمن اصلاح رسومات جاری کی ہیں۔ انجمن ترقی زراعت نے انہیں اچھے بیج میسٹن ہل۔ فصل خریف لونے اور چارہ کاٹنے کی مشینوں سے آشنا کیا ہے۔ بدقسمتی سے آخرالذکر اس قدر خراب ہو گئی تھی۔ کہ کام نہ دے سکتی تھی۔ اور جیسا کہ اس ملک میں اکثر ہوتا ہے۔ گاؤں میں یا شورکوٹ میں کوئی بھی اسکی مرمت نہ کر سکتا تھا۔ انجمن اصلاح رسومات کا مدعا یہ ہے۔ کہ غمی اور خوشی کے اخراجات کو مناسب حدود میں لایا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس انجمن کے قائم ہونے سے پہلے کوئی پٹھان ۱۰۰۰ روپیہ سے کم میں شادی نہیں کرا سکتا تھا۔ لیکن اب ۵۰۰ روپیہ سے زیادہ کوئی خرچ نہیں کر

سکتا۔ دو ممبروں نے حال ہی میں ۹۰۰ روپے میں اپنے لڑکے اور لڑکی کی آپس میں شادی کی ہے۔ ایک کام جو جس قدر نیا ہے۔ اسی قدر عمدہ ترین ہے۔ یہ ہے کہ شورکوٹ کے ہسپتال میں تین دائیوں میں سے ایک تربیت یافتہ ہے۔ اس علاقے میں اکثر دائیاں سقوں کی بیویاں ہیں۔

بار کا علاقہ:۔ نہری آبادی اب بالکل پیچھے رہ گئی تھی۔ اور اب ہم کنوؤں کے جزیروں میں آ گئے تھے۔ جس میں سے ہر ایک چارے اور گیہوں کے چند ایکڑوں سے گھرا ہؤا تھا۔ جلد ہی یہ کنویں ختم ہو گئے اور ہم ایک ایسے علاقے میں داخل ہو گئے جو اتنا چوڑا اور صاف تھا۔ جتنا کہ کھلا سمندر اور سوائے چھوٹی جھاڑیوں کے باقی تمام حصہ بنجر تھا۔ اگرچہ یہ صرف جنوری کا مہینہ تھا۔ لیکن سورج چکنی مٹی کے لمبے چٹیل ٹکڑوں کو ایسی سطحوں میں تبدیل کر رہا تھا۔ جن سے چندھیا نے والی روشنی منعکس ہو رہی تھی۔ ہم تقریباً ۳۰ میل تک کبھی کبھی گھوڑے یا اونٹ پر کبھی راہگیر سے اور ایک یا دو بار لاری سی دوچار ہوتے۔ پانچ افراد کا ایک کنبہ دو ٹٹوؤں پر سوار تھا وہ ایک رشتہ دار کی ماتم پرسی کرنے جا رہے تھے۔ ایک پیادہ فقیر اپنے پیر کے ہاں سے جسے حال ہی میں صدمہ پہنچا تھا۔ ماتم پرسی کر کے واپس آ رہا تھا۔

جب ہم انسانی آبادیوں سے بالکل منقطع محسوس کرنے لگے تو افق کے بالمقابل ایک سیاہ نشان اٹھا پہلے پہل شکل سے اتنا اونچا تھا جتنا کہ پست، قد پودوں والا سمندر پھر خاص شکل اور جسامت اختیار کر کے ایسا دکھائی دینے لگا جیسا کہ جہاز پر سے دور کا ساحل نظر آتا ہے۔ یہ کورانگا کے درخت تھے اور جب ہم ان کے سائے میں سے گذرے تو مجھے ایسا محسوس ہؤا گویا میں نئی دنیا میں داخل ہو رہا ہوں۔ دراصل یہ ملتان کا ضلع تھا۔ لیکن ایک لمحے کے لئے غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی وجہ سے درختوں اور زمینوں کی شکل تبدیل ہو کر یہ علاقہ نہایت موہنا معلوم ہؤا۔ اور یہ سب کچھ ایک معمولی سی نہر کا نتیجہ تھا۔

(۱۴ میل)

باب نہم ۔ ملتان

زمیندار اور مزارع

۲۸ جنوری کو رانگا سے جودھ پور۔

ضلع:۔ ملتان میں داخل ہونے سے دراصل ہم ایک سحر زدہ زمین میں داخل ہو گئے ہیں۔ جھنگ کی طرح یہاں بھی زمینداروں ساہوکاروں اور پیروں کی حکومت ہے لیکن ان کی حکومت کلی طور پر خود مختارانہ نہیں ہے۔ اور دیہاتی ان پر کم انحصار رکھتے ہیں۔ نہروں کے ایک نہایت مکمل طریق سے چناب۔ راوی اور ستلج کا پانی تمام ضلع میں پھیلایا گیا ہے۔ اور انہیں اتنے ہی مکمل کنوؤں کے طریق سے امداد بہم پہنچائی گئی ہے۔ یہ بات بذاتِ خود اختلاف کی وجہ بتانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ کیونکہ نہریں اور کنوئیں جھنگ میں بھی ہیں۔ لیکن جھنگ میں کوئی بات ایسی نہیں ہے۔ جو ملتان شہر کی برابری کر سکے۔ یہ شہر ۸۵۰۰۰ آبادی کے ساتھ تمام ضلع کی پیداوار کے لئے ایک عمدہ منڈی کا کام دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک ایسا مرکز ہے۔ جہاں سے نئی تہذیب بیرونی دنیا کی راہوں سے دیہاتوں اور جھونپڑوں میں پہنچ رہی ہے۔ چونکہ عام طور پر دیہاتی گاؤں میں نہیں رہتے۔ بلکہ تنہا کوئیں پر رہتے ہیں۔ اس لئے اس عمل کی رفتار لازمی طور پر سست ہو گی۔

ایک لکیر کا فقیر:۔ پہلے میل تک ایک ذیلدار ہمارے ساتھ ساتھ چلا اور اپنی ذیل کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ جس میں ۵۳ گاؤں شامل ہیں۔ ان میں سے دس یا بارہ کی مسجدوں میں لڑکے اور لڑکیوں کو اکٹھی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن سکول میں کہیں ایسا نہیں کیا جاتا۔ میں نے دریافت کیا کہ کیوں اس نے جواب دیا۔ کہ ہمارے ہاں اس کا رواج نہیں ہے۔ اس جواب سے اس نے زیر بحث معاملہ کے ساتھ ہی مندرجہ ذیل امر کا بھی تصفیہ کر دیا۔ محکمہ زراعت کے ایک ممبر نے حال ہی میں نئے ہلوں کے متعلق کچھ بھی یاد نہ رکھ سکا۔ اس پر اس نے اس حجت کی تشریح کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ اور کہا لیکن ہمارے ہل بہتر ہیں۔ میں نے پھر پوچھا کیوں؟ کیونکہ اس نے جواب دیا یہ ہمارے رواج کے مطابق ہیں۔ ہم تو لکیر کے فقیر ہیں۔ اس ذیل میں پانچ یا چھ پیر ہیں۔

اور وہ اچھی حالت میں ہیں۔ پہلے سے زیادہ اچھے ہیں۔ کیونکہ لوگ خوشحال ہیں۔ اور ان کے پاس انہیں دینے کے لئے زیادہ مال ہے۔ اسی وجہ سے زیورات بھی بڑھتے جاتے ہیں۔

زمین :- ایک عمدہ بنے ہوئے دیہاتی گھر کو دیکھ کر جس کی چوٹی گیہوں کے کھلیان میں ایستادہ معلوم ہوتی تھی۔ ہم نے اس کو دیکھنے کی غرض سے اپنا رخ بدلا۔ گھر کا مالک جو ایک سیال تھا۔ جو نمایاں طور پر خوف زدہ صورت میں ہماری ملاقات کے لئے آیا۔ اس نے دل قوی کر کے ہمیں بتایا کہ چالیس سال گذرے میں نے ۱۰۰ ایکڑ زمین خریدی تھی۔ اور جوں جوں روپیہ آتا رہا زمین خریدتا رہا۔ اب میرے پاس معہ بارہ کوؤں کے ۱۰۰ ایکڑ ہے میں خود کاشت کرتا ہوں۔ اور باقی سب مزارعوں کو دے دیتا ہوں۔ جو ہر دو یا تین سال کے بعد بدل جاتے ہیں۔ صرف ایک شخص چالیس سال سے چلا آیا ہے۔ چند سو گز کے فاصلے پر ایک نیا باغ تھا۔ میں نے پوچھا تم نے یہ کیوں شروع کیا۔ دیہاتی نے جواب دیا عزت کے لئے۔ اسے زندگی کی نفرحتوں کی کچھ خبر نہ تھی۔ اس کے پختہ مکان کا نقشہ و تعمیر جس پر اس نے ضرور کئی ہزار روپیہ خرچ کیا ہوگا۔ ملتان کے کسی شخص کی محنت کا نتیجہ تھی۔ جسے عمارت میں موزونیت کا احساس تھا۔ باہر سے یہ مکان معہ اپنے چوبارے کے دلکش نظر آتا تھا۔ لیکن اندر سے صرف ایک کھلیان تھا۔ اور اسمیں ان گھروں جیسی جو ہم نے جھنگ میں دیکھے تھے۔ کوئی خوبصورتی نہ تھی۔ اور سامان ان سے بہت ہی کم تھا۔ اس نے کہا کہ ہمیں سامان کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ زمین کی ہے۔ مکان کے سامنے صحن محض ایک فراخ گئو شالہ تھی۔ اور اس کے دروازے میں ایک رہٹ تھا۔ جو خوب چل رہا تھا۔ یہ شخص محض اپنی زمین کے لئے زندگی بسر کرتا تھا۔ اور اس لحاظ سے اسمیں اور خوشدل کسان بہادر میں جسے ہم تین دن گذرے ملے تھے زمین آسمان کا فرق تھا۔ بہادر کی باتوں سے یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ زمین انسان کے لئے بنائی گئی ہے۔ لیکن یہاں انسان زمین کے لئے بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ تاہم بہادر کی طرح وہ اپنی چیزوں میں سے دوسروں کو بھی حصہ دیتا تھا۔ غریب آدمیوں کا ایک پورا انبوہ اس کے گھر کے اردگرد آباد تھا۔ چاروں۔ جلاہوں۔ اونٹوں والے بلوچوں قصائیوں اور مصلیوں میں سے دو دو ایک کمہار۔ ایک بہشتی جسکی بیوی بستی میں دایہ کا کام کرتی تھی۔ ایک بخاری فقیر مسجد کی

خدمت کے لئے ایک مولوی اور جاگیر کے حسابات کیلئے ایک اوورسیر جس کا ہونا لازمی ہے۔ وہاں آباد تھے۔ کو ائف بہادر کے مانند یہاں بھی ایک نئے گاؤں کی ابتداء ہو رہی تھی۔ اس سال اپنے باغبان کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اس نے آلو بونے شروع کئے ہیں۔ اور ایک رشتہ دار بیج لانے کے لئے لائل پور بھیجا ہے۔ البتہ وہ محکمہ زراعت کی کارگذاریوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ لیکن ایک چمار کو جو اس کی جاگیر پر رہتا ہے۔ حال ہی کے ایک جلسے میں سے جو تحصیل کے صدر مقام کبیر والہ میں منعقد کیا گیا تھا۔ ایک چھوٹا رسالہ ملا تھا۔ یہ شخص بذاتِ خود تعلیم سے بالکل بے بہرہ تھا۔ حاضرین میں سے اس کا ایک رشتہ دار جو وہاں موجود تھا۔ اور کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ گذشتہ سال نمائشی گاڑی دیکھنے کے لئے خانیوال گیا تھا۔ اس نے کیا کچھ دیکھا تھا؟ جن چیزوں کی موجودگی کا اُسے خیال تھا۔ ان سے کہیں زیادہ چیزیں موجود تھیں۔ (۱۵ میل)

۲۹ جنوری جودھ پور سے کبیر والہ

ایک پختہ مکان :۔ اب ہم قطعی طور پر خشک منطقہ میں ہیں۔ کیونکہ بارش صرف ۶½ انچ ہے۔ لیکن اگر محض بارش سے کچھ نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ تو اس کے بغیر کچھ نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ نہریں اور کنویں بذاتِ خود کافی نہیں ہیں۔ ہم جاٹوں کے ایک گاؤں میں ایک چھوٹا بنگ دیکھنے کے لئے ٹھہرے جو زمینداروں اور مزارعین پر مشتمل تھا۔ لیکن سب سے بڑے زمیندار کے پاس ۲۰۰ ایکڑ سے زیادہ زمین نہ تھی۔ اس نے حال ہی میں اپنے لئے ۲۵۰۰ روپیہ خرچ کر کے ایک پختہ مکان تعمیر کرایا تھا۔ جو ٹھوس اور مربع شکل کا تھا۔ اور بدنما تھا۔ اندر سے کمروں کی ترتیب بالکل ویسی ہی تھی۔ جیسی کہ جھنگ کے گھروں کی ایک کمرے میں احمد پور واقع جھنگ کا ایک کجاوہ تھا۔ جس پر نہایت خوبصورتی سے مینا کاری کی ہوئی تھی۔ صحن میں ایک دستی نلکہ تھا۔ یہ پہلا نلکہ ہے۔ جو میں نے کسی زمیندار کے گھر دیکھا ہے۔ یہاں دفعتہً ان کا رواج ہو گیا ہے۔ چونکہ وہ صرف ۲۳ روپے میں خریدے جا سکتے ہیں۔ اسلئے وہ بجلد اپنی قیمت پوری کر دیتے ہیں۔

پردہ :۔ دولتمند ہونے کی وجہ سے گھر کا مالک اپنی عورتوں کو پردے میں رکھتا ہے۔ جو لوگ کم امیر ہیں۔ وہ اپنی بیویوں سے اپنے کام میں امداد لیتے ہیں۔

اس مولوی نے جو وہاں موجود تھا۔ یہ کہا کہ یہ بڑی غلطی ہے۔ لیکن یہ بھی تسلیم کیا کہ پردے کا کوئی رواج نہیں ہے۔ ایک دیہاتی نے کہا کہ یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں ہے۔ ہم اتنے غریب ہیں کہ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔ اگرچہ مولوی نے اس بات کا اعلان کیا کہ پردے کے متعلق قران شریف میں حکم ہے۔ لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا۔ کہ یہ کہاں لکھا تھا۔ اس نے کہا تاہم میں جانتا ہوں۔ کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں پردہ کرتی تھیں۔ اور وہ سب مسلمانوں کی مائیں ہیں۔ اسلئے دوسروں کو بھی پردہ کرنا چاہئیے۔ میرے عملے کے ایک مسلمان ممبر نے دریافت کیا۔ لیکن جن بیویوں نے لڑائی کے میدانوں میں زخمیوں کی امداد کی ان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔؟ اس نے جواب دیا کہ انہوں نے مجبوری کی حالت میں پردہ چھوڑا۔ امیر افغانستان نے (جس کا اس وقت ذکر کیا گیا) غلطی کی تھی۔ اور اسلئے بغاوت ہو گئی تھی۔

اس گاؤں میں سے جہاں کے لوگ امیر نہیں ہیں۔ گذشتہ سال تین آدمیوں نے زکوٰۃ دی تھی۔ اور ان میں سے ایک مولوی کا باپ تھا۔ میں نے پوچھا کیا تم سب پیر رکھتے ہو۔ کسی نے کہا بغیر پیر کے آدمی کچھ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارا پیر ہمیں تعویذ نہیں دیتا۔ یہ چیز بچوں کے لئے ہے۔ اسکی بجائے وہ دعائیں دیتا ہے۔ یہاں کے جاٹ مشترکہ تعلیم کے قائل نہیں ہیں۔ دو لڑکے مسجد میں مولوی سے قران شریف پڑھتے ہیں۔ اور چھ لڑکیوں کو اس کی بیوی پڑھاتی ہے۔

روپیہ ادھار دینا:۔ انجمن کے بعض ممبروں نے بے حد مقروض ہونے کی وجہ سے گفتگو ساہوکار کے متعلق شروع ہو گئی۔ روپیہ ادھار دینے کی تین صورتیں ہیں۔ غلے یا نقدی کا معمولی لین دین۔ اُن مویشیوں کا لین دین جو کاشتکار کے پاس قسطوں پر فروخت کئے جاتے ہیں۔ اور کپڑے۔ تیل نمک وغیرہ ضروریات کا لین دین جو ادھار دی جاتی ہیں۔ بعض ساہوکار محض مویشیوں کا بیوپار کرتے ہیں۔ شرح سود حسب معمول پیسہ روپیہ ہے۔ لیکن چھ پائی فی روپیہ یا ۱۲ روپے ۸ آنے فی سینکڑہ پہلے ہی کاٹ لیا جاتا ہے۔ جسے چلکانہ کہتے ہیں۔ زیادہ تر ادائیگی ۹۰ فیصدی غلے کی صورت میں لی جاتی ہے۔ نقدی طریق سے بہت کم ادا کی جاتی ہے۔ جب مالیہ۔ رشوت یا وکیل کی فیس ادا کرنے کے لئے نقدی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تو دوسری اجناس کی طرح اسے بھی خریدنا پڑتا ہے۔

اور چونکہ نقدی کمیاب ہوتی ہے۔ اسے مہنگا خریدنا پڑتا ہے۔ ساہوکار اپنا روپیہ خوب وصول
کر سکتا ہے۔ کیونکہ فصل کے موقع پر تولائی کا کام ساہوکار ہی کرتا ہے۔ دستور دہمیر کے
مطابق ہر ایک مالک زمین یہاں تک کہ غریب کے غریب بھی اس کام کے لئے ایک
ہندو دلال رکھتا ہے۔ اور ایک من اناج تولنے کے لئے ایک سیر غلہ دیتا ہے۔ ادنٰے مالکانِ
زمین اعلےٰ کی نقل کرتے ہوئے اسے مقرر کر لیتے ہیں۔ اور ایسا کرنے کو عزت سمجھتے ہیں۔
ایک اور گاؤں میں بھی جس کا ہم نے معائنہ کیا یہی حال تھا۔ ایک آدمی نے جس کے
پاس صرف ۹ ایکڑ زمین تھی۔ یہ کہا کہ میں اپنے دلال کو نصف سیر فی من دیتا ہوں حالانکہ
درحقیقت اسے اسکے لئے کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ ایک تیسرے گاؤں میں ہم نے دیکھا کہ امداد باہمی
کے اثر کی وجہ سے یہ طریقہ ابھی ابھی ترک کر دیا گیا تھا۔

ساہوکار کے مطالبات کا اندازہ لگانے کیلئے ہم نے بنک کے تین ممبروں سے دریافت
کیا کہ ان کے ساہوکاروں نے گذشتہ فصلِ ربیع کے موقعہ پر ان سے کس قدر اناج
لیا تھا۔ پہلا شخص جسکی زمین سو ایکڑ تھی۔ گاؤں کے بڑے زمینداروں میں سے تھا۔
اور اُسے ۲۰۰۰ روپیہ قرض دینا تھا۔ وہ ساہوکار جس نے اسکی گیہوں کا وزن کیا اپنے
حساب میں ۲۶ من گیہوں لے گیا۔ اور ۱۲۵ من اس کے پاس چھوڑی اور یہ کسی جبر
سے نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ اس کی اپنی رضامندی سے۔ دوسرا مالک خود کاشت تھا جس
کے پاس صرف ۱۲ ایکڑ زمین تھی۔ اس کو چار سو روپیہ قرض دینا تھا۔ اس کے ہاں بھی
تولنے کا کام ساہوکار کے ہاتھ میں تھا۔ اور ۱۶ من لے لئے جاتے تھے۔ اور ۲۲ من
چھوڑے جاتے تھے۔ اس صورت میں غالباً جبر اور رضامندی دونو برابر تھے۔ تیسرا
ایک مزارع تھا۔ جو ذات کا گوجر تھا۔ اور ۲۰۰ روپیہ کا مقروض تھا۔ اس کے پاس دو بیلوں
کی جوڑیاں۔ ایک گائے۔ اور ۲۰ بکریاں و بھیڑیں تھیں۔ اس نے ۱۲½ ایکڑ زمین میں
گیہوں بوئی تھی۔ جس میں سے نصف مالک زمین کو دیدی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہاں رضامندی
کی بجائے جبر زیادہ تھا۔ میں نے پوچھا جب تمہاری بارہ من گیہوں ختم ہو گئی تھی۔ تو تم نے
کیا کیا تھا۔ اس نے کہا کہ میں اس سے غلہ اور کپڑا لینے کے لئے گیا۔ لیکن اس نے یہ کہہ
کر انکار کر دیا کہ میں تمہیں اور کوئی چیز نہ دونگا۔ اس کی ساکھ ٹوٹ گئی تھی۔ اور درحقیقت
وہ ۱۸ ماہ تک کچھ ادھار نہ لے سکا تھا میں نے دریافت کیا پھر تم نے کیا کیا۔ اس نے کہا
میرا بیٹا مزدوری کا کام کرتا ہے۔ جو کچھ اس نے کمایا۔ میں نے اس سے کھانے کے لئے چنے
اور بونے کے لئے بیج خریدے۔ فصلِ خریف کے موقعہ پر جو ابھی ابھی ختم ہوئی تھی۔

ساہوکار پھر آیا تھا۔ اور اس کی تمام روئی لے لی تھی۔ (یہ صرف ۴ من تھی) اور اسکے پاس فقط ۲/۱ ۲ من باجرہ گذارے کیلئے باقی رہنے دیا تھا۔ (۸ میل)

۳۰ جنوری کبیروالہ سے قدیر آباد

آب و ہوا:۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ اس ملک میں آج کا دن نہایت ہی سرد دنوں میں سے تھا۔ ایسی سردی جو کانوں کو سُن رکھتی ہے۔ اور جس میں موٹے سے موٹے کپڑے بھی مکڑی کے جالے کی طرح ہمیں معلوم ہوتے ہیں۔ دہقان کے لئے یہ سختی کا دن ہے۔ بہت سے دہقانی جن سے ہم سڑک پر ملے اپنی پگڑیاں اپنی پیشانی کے گرد آنکھوں تک لپیٹے ہوئے چل رہے تھے۔ اور سوتی چادریں اپنے کانپتے ہوئے جسموں کے ساتھ کھینچ کر لی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ اس قدر مکمل طور پر بغلوں میں دبائے ہوئے تھے۔ کہ سلام کرنے کی اگر کوئی صورت تھی تو یہ تھی کہ وہ کاٹنے والی ہوا سے بچنے کے لئے پہلے سے جھکائے ہوئے سروں کو اور جھکا دیتے تھے۔ سردی دھوپ سے اس قدر زیادہ شدت کی تھی۔ کہ جب ہم بنک کا ملاحظہ کرنے گئے۔ تو ہمیں اٹھ کر ایک دیوار کی آڑ میں بیٹھنا پڑا۔

ایک دلہن کا جہیز:۔ تمام ممبر (جاٹ) گھر کا بنا ہوا کھدر پہنے ہوئے تھے۔ صرف پگڑیاں بازاری کپڑے کی تھیں۔ ایک نے کہا کہ ہم لوگ غریب ہیں۔ ہمیں اپنے کپڑے خود بنانے چاہئیں۔ اپنی غربت کا ثبوت دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہم اپنی شادیوں پر ۱۰۰ روپیہ سے زیادہ خرچ نہیں کرتے۔ بنک کا صدر جو ۴۰ ایکڑ زمین کا مالک تھا اگلے دن ہی اپنی لڑکی کی شادی کرنے والا تھا۔ اس لئے ہم جہیز دیکھنے کے لئے اس کے گھر کی طرف گئے۔ آنیوالے شادی کی کوئی بیرونی یا ظاہری علامات نہ تھیں۔ صرف دو عورتیں چھلنی سے چاولوں کا آٹا صاف کر رہی تھیں۔ جو دعوت کے لئے خریدا گیا تھا۔ گھر میں جو کہ پھوس کی نئی چھت کی وجہ سے سنہری دکھائی دے رہا تھا۔ عورتوں نے ہمیں ایک ٹوکری دکھائی جس میں کڑے۔ پازیب۔ اور چندن ہار وغیرہ تقریباً ۲۰۰ روپے کے چاندی کے زیورات تھے۔ ایک ڈھیر صاف ستھری سلاریوں اور گھگریوں کا اور ایک گلابی رنگ کی دلفریب سوتی قمیص تھی۔ جس پر خوشنما کشیدہ کاری کی ہوئی تھی۔ ہر ایک میں سے ایک درجن دینی تھی۔ تمام کپڑے گھر کی عورتوں کے کاتے ہوئے سوت سے بنے ہوئے اور قریب و جوار کے جلاہوں کے بنے ہوئے تھے۔ ان کی قیمت کا اندازہ

۱۰۰-۲۰۰ روپیہ تھا۔ اس طرح سے۔ جہیز کی کل قیمت ۴۰۰ روپے تھی۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ یہ گذشتہ آٹھ یا سات سالوں میں ایک ایک کپڑا اور زیور ایک ایک کرکے آہستہ آہستہ جمع کیا گیا تھا۔ اور اب مہمانوں کی دعوت پر صرف ۱۰۰-۵۰ روپے صرف کئے جائیں گے۔ کفایت شعاری کی قابل ذکر و غیر متوقع مثال ہے۔ بنک نے دلہن کے باپ کو انجمن کا صدر مقرر کرنے میں نہایت عقلمندی سے کام لیا ہے۔

مزارعین :- حاضرین میں سے اکثر مالکانِ زمین تھے۔ لیکن چند ایک مزارعین بھی تھے۔ میں نے ایک سے دریافت کیا۔ آیا تم ایک ایسے زمیندار کو پسند کرتے ہو جو اپنی زمین پر رہے یا اس کو جو دور رہے۔ اس نے جواب دیا اسکو جو اپنی زمین پر رہے۔ لیکن جب اسے زور دیکر کہا گیا۔ کہ تم بغیر کسی ڈر کے اپنے دل کی بات کہو تو اس نے چاروں طرف موجودہ زمینداروں کو شریملے پن سے دیکھا۔ اور خوف زدہ آواز میں کہا کہ میں دور رہنے والے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس پر سب ہنس دئیے۔ اس گاؤں میں مزارعین کسی خاص کنوئیں پر زیادہ عرصے کے لئے نہیں ٹھہرتے۔ صرف ایک شخص پندرہ دن ٹھہرا تھا۔ اور ایک اور دس دن سے زیادہ ان میں سے اکثر دو یا تین دن کے بعد آگے چل دئیے تھے۔ اور یہ عمل زمین کے لئے اچھا ثابت نہیں ہو سکتا۔

یہ دریافت کرنے پر کہ آیا وہ ان دنوں فارغ تھے۔ ایک کاشتکار نے جواب دیا جاٹ کو کبھی فرصت نہیں ہوتی۔ اب اس کے لئے کھیتوں کو پانی دینا اور اپنے مویشیوں کے لئے گھاس کاٹنا ضروری ہے۔ اور اس کے بعد نالیوں کی صفائی۔ ایک اور سوال پوچھنے پر اس نے جواب دیا نہیں۔ ہم اپنی گیہوں میں سے گھاس پات نہیں نکالتے ہمارے ہاں یہ قاعدہ نہیں ہے۔ حاضرین میں سے چار شخص ایک یا دو مرغیاں رکھتے تھے۔ لیکن وہ اس امر کی تشریح نہ کر سکے۔ کہ وہ دو سے زیادہ کیوں نہیں رکھتے تھے۔

۱۱ جنوری قدیر آباد سے ملتان (۱۵ میل)

سڑک کے کنارے۔ بیلوں کی آٹھ جوڑیوں کو ایک کھیت کو ہموار کرتے ہوئے دیکھ کر ہم مالک زمین کے ساتھ بات چیت کرنے کے لئے ٹھہر گئے۔ وہ زمین اس لئے ہموار کر رہا تھا۔ کہ اوورسیئر نے اسی سڑک کے کناروں پر ڈالنے کیلئے جس پر ہم چل رہے تھے۔ کھیت میں سے ایک فٹ گہری مٹی لی تھی۔ اس نے اس کی قیمت کی ادائیگی کے لئے نہیں کہا تھا۔ کیونکہ بقول اس کے یہ مٹی سرکاری

کام کے لئے لی گئی تھی۔ اور وہ اوور سیر کو اس لئے تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ کہ شاید وہ بھی اس کے بدلے میں اسے تکلیف دے۔ وہ ۱۲۵ ایکڑ زمین کا مالک تھا۔ لیکن اس کی ظاہری حالت سے کوئی اس امر کا اندازہ نہ لگا سکتا تھا۔ کیونکہ اس نے سوراخوں سے چھنا ہوا ایک تہ بند اور سیاہ رنگ کے کپڑوں کا ایک داغدار کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اگرچہ ان کے گھر نہایت صاف ہیں۔ لیکن جنوب مغربی علاقے کے لوگوں میں لباس کی تمیز کے لئے کوئی فطری احساس نہیں ہے۔ ان کی پگڑیاں ہمیشہ ایسی نظر آتی ہیں۔ گویا کہ وہ جلدی میں سر کے گرد لپیٹی گئی ہیں۔ اور تہ بند اور لنگیاں ایسی کہ اب گریں کہ گریں۔

ملتان:۔ دوپہر کے وقت ملتان کی خانقاہوں کے دو بڑے گنبد نظر آئے۔ جو دور افتادہ افق کے مقابل اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ یہ خانقاہیں دو مشہور پیروں کی یادگاریں تعمیر ہوئی تھیں۔ وہاں جاتے ہوئے جب امیر تیمور مغلوں کے لشکر کو جو اس کے رنگ کی نسبت زیادہ وحشت خیز تھا۔ لئے ہوئے یہاں سے تیزی سے گذر گیا تھا۔ تو یہ اس سے بھی پہلے اسی پہاڑی کی چوٹی کو زینت بخش رہی تھیں۔ جس پر وہ آج بھی عمدگی سے کھڑی تھیں۔ اس زمانے میں وسط ایشیا کی جہالت کے مقابل ملتان ہندوستانی اسلامی حکومت کی سب سے پہلی حد تھی۔ جیسا کہ اس سے پہلے تین صدیوں تک (۱۰۰۰ء تا ۱۳۰۰ء) یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی آخری منزل رہی تھی۔ اور اس کا اتنا ہی عرصہ بعد یہ جگہ پنجاب کے سکھوں کی آخری حد بن گئی۔ اسی لئے اس کا ذکر تاریخ میں آتا ہے۔ اور یہ تذکرہ فتنہ و فساد سے پر ہے۔ کرنال کی طرح اس علاقے کے لوگوں پر بھی اس فساد کا اثر مخرب اخلاق ثابت ہوا ہے۔ اور گاؤں اور شہر دونوں میں اب بھی اس کا اچانک برباد ہو جانا بعید نہیں ہے۔

(۱۵ میل)

یکم فروری۔ ملتان سے عادی باغ

ایک دیہاتی لائبریری:۔ چکر کاٹ کر ہم ایک گاؤں کے پاس پہنچے جہاں ایک انجمن (جو اسی مقصد کے لئے بنائی گئی تھی) ایک مسجد اور ایک لائبریری بنوا رہی تھی۔ صدر انجمن جو تقریباً بیس برس کا جوان اور زمیندار کا لڑکا تھا۔ سڑک کے کنارے منتظر تھا۔ اس نے دو سال تک ملتان کے ایک کالج میں تعلیم پائی تھی۔ اور اب خانگی امور اور انجمن کے کاموں میں مشغول تھا۔ فی الحال اس کے ممبروں کی تعداد صرف چودہ تھی۔ لیکن اس سے زیادہ کی توقع ہے۔ کیونکہ سنا ہے کہ گرد و نواح میں بہت سے

لوگ کتابوں کی قدر کرنے والے ہیں۔ اس مقصد کے لئے کم از کم معیارِ تعلیم لوئر مڈل مقرر کیا گیا تھا۔

مزارعین:۔ یہی نوجوان ایک نئے دیہاتی بنک کا بھی صدر ہے۔ حسب معمول ہم نے قواعد و ضوابط میں ممبروں کا امتحان لیا۔ اور ان کو خوب تیار پایا۔ سیدوں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے ان میں سے نصف لوگ پڑھ لکھ سکتے تھے۔ قوانین کو حفظ کرنے میں یہ ایک بڑی امداد ہے۔ چند مزارعین حاضر تھے۔ ان میں سے ایک سے جو بوڑھا تھا اور جسکے دو نمائشی دانتوں کے درمیان اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔ میں نے اس کی عمر دریافت کی۔ اس نے جواب دیا۔ کہ لاہور سے آنے والی پہلی ریل گاڑی مجھے یاد ہے۔ ہم نے شور سنا۔ دھوئیں کی گاڑی (دھواں گڈی) آگئی ہے۔ اور ہم سب کھیتوں میں سے اسے دیکھنے کے لئے دوڑے۔ میں نے پوچھا تم نے کتنے کنوؤں پر کام کیا ہے۔ اس نے سب کے نام گنوا دئے اور وہ اٹھارہ تھے۔ ایک کنوئیں پر اس نے ۲۵ سال کام کیا تھا۔ لیکن دوسروں میں سے ہر ایک پر دو یا تین سال سے زیادہ نہیں۔ حاضرین میں سے ایک سید تعلقدار نے بتایا کہ کوئی یہ نہیں چاہتا کہ مزارع آٹھ یا نو سال سے زیادہ عرصے میں شک نہیں کہ یہ طرزِ عمل زمین کے لئے بُرا ہے۔ کیونکہ اس عرصے میں مزارع زمین سے واقف ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ ایک اور گاؤں میں بھی ہمیں بتایا گیا۔ کہ مزارعین پے در پے کھیت در کھیت تبدیل کئے جاتے ہیں۔ دو شخصوں نے جو تقریباً چالیس برس کے تھے۔ یہ بتایا کہ ہم اپنے کنوئیں ہر دو سال بعد تبدیل کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے تعلقدار ہمیشہ اس امر کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ ہم سے زیادہ لگان وصول کیا جائے۔ جہاں تک حقوق ملکیت کا تعلق ہے۔ لگان کی سالانہ ادائیگی کی شرط پر کچھ عرصے کیلئے زمین کو اجارے پر دیدینے کے بعد سوچ بچار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

زراعتی مزدور کی اُجرت:۔ میں نے مزدور کی حالت کے متعلق دریافت کیا۔ سید کے پاس بیس مزدور تھے۔ اور وہ انہیں ہر فصل کے موقعہ پر ان کے کام کے مطابق نو یا بارہ من غلہ دیتا تھا۔ گرمی میں گیہوں اور خزاں میں چاول۔ ایک جانور کیلئے کافی چارہ اور سال میں ایک مرتبہ ایک اونی کمبل۔ ایک جوتیوں کا جوڑا اور اس کے ساتھ ہی گاؤں کے حجام سے وہ حجامت مفت کراتے تھے۔ مزدوروں کے سرداروں کو دن میں دو دفعہ کھانا بھی ملتا تھا۔ ۲۵ سال گذرے جب وہ جوان تھا۔ تو غلہ

۵ یا ۶ من سے زیادہ نہیں دیا جاتا تھا۔ اگر شرح اس سے زیادہ بڑھ گئی تو مالکان زمین تباہ ہو جائینگے۔ کبھی کبھار کی اتفاقیہ مزدوری کی شرح چار سے چھ آنے فی یوم تھی۔ دوسرے گاؤں میں جس کا ابھی ذکر کیا گیا تھا۔ بنک کا ممبر اپنے مزدوروں کو دس روپے ماہوار ایک وقت کا کھانا اور دو من گیہوں ایک فصل پر اور من چاول دوسری پر اس کے ساتھ ہی ایک جانور کے لئے چارہ۔ ہر سال رائج الوقت کمبل اور جوتیوں کا جوڑا دیتا ہے۔ ان جگہوں کی نسبت جو ملتان سے بیس تیس میل دور واقع ہیں۔ قرب وجوار میں شرح مزدوری زیادہ ہے۔ مثلاً شجاع آباد کے نواح میں پانچ سے لے کر آٹھ روپے تک دئے جاتے ہیں۔ لیکن کھانا نہیں دیا جاتا۔ اس نواح کے ایک نیک تعلقدار نے مجھے بتایا کہ میں اپنے بہتر مزدوروں کو ۷ روپے ۱۲ آنے دیتا ہوں۔ اور دوسرے کو پانچ اور کسی کو سوائے ایک کمبل اور جوتوں کے جوڑے کے اور کچھ نہیں ملتا۔ جن جن لوگوں سے میں نے دریافت کیا ہے۔ وہ سب یہی کہتے ہیں۔ کہ مزدور اس قدر مزدوری پر گذارہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے کنبے کے لوگ اور اور زائد کام کرتے ہیں۔ مثلاً روئی۔ چنا گیہوں کاٹنا۔ پڑوسی کی بکریوں و بھیڑوں کی نگہبانی کرنا۔ اور فصلوں کی حفاظت کرنا۔ جس طرح ملتان کے نواح میں دور کے علاقوں کی نسبت شرح مزدوری زیادہ ہے۔ اسی لائل پور میں جہاں مزدوروں کی لگاتار مانگ رہتی ہے۔ شرح اس سے بھی زیادہ ہے۔ میرے عملے کا ایک ممبر جسکی زمین نوآبادی میں ہے۔ دو آدمیوں کو ملازم رکھتا ہے۔ دونو کو دن میں تین بار کھانا ملتا ہے۔ اور ہر سال کپڑوں کا ایک جوڑا جسمیں قمیص۔ دھوتی اور پگڑی شامل ہوتی ہے۔ اور خوشی کے موقعوں پر میلے میں خرچ کرنے کے لئے آٹھ دس آنے مزید برآں انہیں ایک بستر مہیا کیا جاتا ہے۔ جسمیں ایک دری ایک کھیس اور ایک لحاف ہوتا ہے۔ ایک مزدور دس روپیہ ماہوار لیتا ہے۔ اور دوسرا جو غیر معمولی طور پر اچھا آدمی ہے۔ پندرہ روپے۔ ادائیگی کا یہ طریق ۳۰۰۰ سال کا پرانا ہے۔ اس کا ذکر تورات اور پرانے زمانے کے یونانیوں کی کتاب ہومر میں ہے۔ صوبے کے جنوب مغربی حصے میں مزدوروں کی اجرت کم ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ مزدور لوگ اپنی جگہ سے قطعاً حرکت نہیں کرتے اور یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ اپنے گھروں کو چھوڑ دیں۔ میرے عملے کا ایک شخص بیان کرتا ہے۔ کہ جب مجھے شجاع آباد سے ملتان تبدیل کیا گیا۔ جو صرف ۲۵ میل کے فاصلے پر ہے۔ تو میرے نوکر نے جو شجاع آباد کا رہنے والا تھا۔ زیادہ اجرت کا لقمہ دینے پر بھی ساتھ چلنے سے انکار کر دیا

مرغیاں پالنا:- ایک معمولی غیر ضروری خرچ جو صوبے بھر میں عام معلوم ہوتا ہے۔ ٹوکریوں کی خرید ہے۔ جو نہایت آسانی کے ساتھ گھر بنائی جا سکتی ہے۔ یہاں وہ ان لوگوں سے خریدی جاتی ہیں۔ جو مور کہلاتے ہیں۔ غیر متوقع مہمان کے آنے پر گوشت تیار مل جانے کے لئے ایک یا دو مرغیاں رکھنے کی عادت جو ضلع بھر میں عام بنائی جاتی ہے۔ زیادہ دانائی کی بات ہے۔ ان سے زیادہ پالنے کی تکلیف کوئی گوارا نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ فصلوں کو کھا لیتی ہیں۔ اور ان کی اطراف کو خراب کرتی ہیں۔ حال ہی میں دو جاٹوں نے جو ملتان سے ۵۰ میل پرے رہتے ہیں۔ انڈوں کا بیوپار شروع کیا ہے۔ چونکہ یہاں آنے میں بہر صورت سات آنے خرچ ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ اس وقت تک نہیں آتے جب تک وہ کافی مقدار انڈوں کی جمع نہ کرلیں۔ جس کا یہ مطلب ہے۔ کہ وہ انڈے کسی حد تک ملتان والوں کے لئے تازہ نہیں ہوتے۔ تاہم یہ امر ان کی کامیابی کی راہ میں حائل معلوم نہیں ہوتا۔

دوم فروری۔ عادی باغ سے شجاع آباد

گذشتہ شب گیارہ بجے بنگلے کی کڑیوں میں کڑاکا اور دیواروں پر چسپاں کئے ہوئے اطلاعات کے کاغذات میں حرکت پیدا ہونی شروع ہوئی یہ زلزلہ تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے بہت ہلکا۔

جاگیردار:- آج کے سفر کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ آموں کے جھنڈ کے جھنڈ کھڑے تھے اور ان میں سے بہت سے نئے تھے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جاگیردار نہایت اچھی حالت میں ہے۔ اور اس لحاظ سے اسکی حالت ہر اس چیز کی نسبت جو میں نے اور کہیں دیکھی ہے۔ بلند معیار کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ گزٹ کے ایڈیٹر کا بیان ہے۔ کہ ضلع میں تعلقدار بہت ہیں۔ اور ان میں سے بعض محتاط مہتمم ہیں۔ مگر بہت سے لاپرواہ اور فضول خرچ ہیں۔ لگان کی بڑی بڑی فہرستوں کے باوجود بہت سے گھرانوں کا بھاری قرض میں مبتلا ہونا ایک عام بات ہے۔ پھر تحصیل کبیر والا کا جسمیں ہم ابھی سفر کرکے آئے ہیں۔ بڑے بڑے تعلقہ داروں ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے۔ کہ آبادی کا بیشتر حصہ ۱۰۰۰ روپے سے لیکر ۵۰۰۰ روپے تک مقروض ہے۔ اور بعض اشخاص کو ۵۰۰۰ سے لے کر ایک لاکھ روپیہ تک دینا ہے۔ جھنگ میں میں نے دیکھا کہ تعلقہ دار جو مقروض ہے۔ یقینی طور پر زمین اور مزارعین دونوں میں سے ہر ایک کے لئے بہت کم مفید ہے۔ اور یہی بات غالباً تمام جاگیرداروں پر صادق آتی ہے۔ تا وقتیکہ قرض پیداوار کی غرض سے نہ سر چڑھا ہو۔ ایک افسر جو جھنگ

اور کبیر والہ سے واقف ہے۔ یہ کہتا ہے کہ دونوں جگہوں کے تعلقداروں نے کہا کہ بڑے تعلقدار داس تحصیل میں ۱۹ ہیں جو ۱۰۰۰ روپیہ بطور لگان ادا کرتے ہیں۔ افسروں سے زیادہ زبردست ہیں۔ وہ اپنے مزارعین میں ایسا ڈر پیدا کر دیتے ہیں۔ کہ وہ ان سے جو کام چاہیں لے سکتے ہیں۔ کم حیثیت لوگوں کی زمین ہضم کر جاتے ہیں۔ اور اپنے مزارعین کو شاذ ہی ایک کنویں پر دیر تک ٹھہرنے دیتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تصرف کے حقوق کا دعوےٰ کر دیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ کوئی مزارع چند سالوں سے زیادہ نہیں ٹھہرا اور وہ جو دس سال سے زیادہ ٹھہرے خال خال تھے۔ دوسرے مخبر جو حالات سے واقف ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ اگر مجموعی طور پر مزارع اور جاگیردار کے تعلقات اچھے ہیں۔ تو اس وجہ سے نہیں کہ جاگیردار نیک خصلت ہے۔ بلکہ اس لئے کہ مزارع جاہل اور فرمانبردار ہے۔ مزید برآں انہوں نے یہ کہا کہ جاگیردار کو جب ضرورت ہوتی ہے۔ تو وہ بلا معاوضہ پوری پوری خدمت لیتا ہے مثلاً اس وقت جبکہ وہ اپنے بیٹے یا بیٹی کی شادی کرتا ہے۔ یا کسی بڑے جانور کے شکار کو جاتا ہے۔ اور یہ خدمت بغیر کسی شکایت کے انجام دی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ رواج چلا آتا ہے۔ اور دنیا کے اس قدر دور افتادہ حصے میں موجودہ قوتوں نے ابھی تک رواج پر کوئی اثر نہیں ڈالا ہے۔ بلاشبہ یہ رواج ان دنوں میں پڑا جبکہ مزارع کو ہر قسم کی حفاظت درکار تھی۔ اور وہ اس کے عوض نہایت خوشی سے خدمات بجالاتا تھا۔ لیکن اب جبکہ موجودہ زندگی کی زیادہ سلامتی محافظت کی ضرورت کو کم کر دیتی ہے۔ ایسی خدمات باعثِ زحمت خیال کی جاتی ہیں۔ اسی لئے غیر حاضر تعلقدار کو جاگیر پر رہنے والے کی نسبت ترجیح دی جاتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ایک ہی شخص کی یعنی دلال کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ دو ہوتے ہیں۔ یہ امر بذاتِ خود اس بات کو ظاہر کرتا ہے۔ کہ اگر تعلقہ دار مجموعی حیثیت سے اپنے مزارعین کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔ تو قدرتی طور پر غیر حاضر تعلقہ دار کی نسبت جاگیر پر رہنے والے کو ترجیح دی جائے گی۔ نہ ہی تعلقہ دار چھوٹے زمینداروں میں مقبول ہے۔ کیونکہ اسکی آنکھ ہمیشہ اسطرف لگی رہتی ہے۔ کہ اگر ہو سکے تو اسکی زمین خرید کر اپنی جاگیر میں اضافہ کرے۔

ہندو مالک زمین:۔ جھنگ کی طرح یہاں بھی اچھے اور برے دونو قسم کے تعلقدار ہیں۔ درحقیقت جھنگ کی نسبت اچھے تعلقداروں کی تعداد غالباً زیادہ ہے کیونکہ ملتان میں قرض اتنا بھاری اور دور دور پھیلا ہوا نہیں ہے۔ اور فضا زیادہ مہذب ہے۔ آخرالذکر زیادہ تر ہندو تعلقدار کے اثر کی وجہ سے ہے۔ جو جھنگ کی طرح عام طور پر

اروڑا ہے۔ اور قریباً ہمیشہ ہی تجارت پیشہ ذات کا ایک فرد ہے۔

ہندو تجارت پیشہ قوم اس ضلع کے کاشت شدہ رقبہ کے ۱/۲ حصہ کی مالک ہے۔ اور نسبتاً صوبے کے کسی دوسرے ضلع کے مقابلے میں اس کی ملکیت یہاں زیادہ ہے۔ شجاع آباد کی تحصیل میں ۲۶ فیصدی زمین اس کے تصرف میں ہے۔ اور نتائج حیرت انگیز ہیں۔ محض بہت سے کنویں ہی نہیں کھودے گئے۔ بلکہ بہت سے بند بھی بنائے گئے ہیں۔ آم کے درخت بھی بے شمار تعداد میں لگائے گئے ہیں۔ انہیں عام طور پر جھنڈ کی صورت میں لیکن اکثر اوقات کھیت کی اوٹ میں قطاروں کے رنگ میں لگایا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات آباد کرنے کے لئے زمین کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس دورے میں میں نے کوئی چیز اتنی اچھی نہیں دیکھی جتنی کہ یہ۔ اور ایک بار تو مجھے یہ محسوس ہوا۔ کہ زمین کو ترقی بھی دی جا رہی تھی۔ اور زیبائش بھی اس پر یہ کہ ہم ایسے علاقے میں ہیں۔ جہاں بارش صرف ۵ انچ ہوتی ہے۔ بارش محض نہر اور کوئیں کے کام کو تکمیل تک پہنچاتی ہے۔ یہ نہریں نوآبادیوں کی دائمی نہروں کی مانند ہیں۔ جو صرف اس وقت چلتی ہیں۔ جبکہ موسم گرما میں دریا طغیانی پر ہوتے ہیں۔ اور چونکہ دریاؤں کا چڑھنا اور اترنا تغیر پذیر ہے۔ اس لئے ان کے لائے ہوئے پانی پر منحصر نہیں رہ سکتے اور لازمی طور پر گرمی کے موسم میں کوؤں کی امداد کی طرف اس طرح ہاتھ پھیلانے پڑتے ہیں جس طرح کہ سردی کے موسم میں تمام کام جھلسنے والی دھوپ میں کرنا پڑتا ہے۔ اسی واسطے یہاں کاشتکاری کے لئے انتہائی جد و جہد اور لگاتار نگہبانی کی ضرورت ہے۔ جسکی طرف ہندو تعلقہ دار اپنی پوری پوری توجہ دیتا ہے۔ بڑے تعلقہ داروں میں سے دو یا تین صوبے بھر میں نہایت ہی محنتی اور حوصلہ مند ہیں۔ بعض اپنی جاگیروں کے متعلق اتنے محتاط ہیں کہ وہ اپنے دلالوں کو باقاعدہ روزنامچہ پیش کرنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ ایک تعلقہ دار کے متعلق اطلاع موصول ہوئی ہے۔ کہ اس نے گذشتہ سال ۱۰۰۰۰ آم کے درختوں کے لگانے کا حکم دیا تھا۔ چھوٹے تعلقہ داروں میں سے بہت سے اپنے ہاتھ سے کاشت کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ صرف ایک ذیل میں (شجاع آباد) پچاس کنوؤں پر اسی طرح کاشت کی جاتی ہے۔ ان تمام باتوں کا اثر دور دور تک پھیلا ہے۔ اور بہت مسلمان تعلقہ دار آموں کے باغ لگا رہے ہیں۔ اور اپنی زمینوں پر از سرنو توجہ مبذول

کر رہے ہیں۔ افسر بند و بست کا بیان ہے۔ کہ اس علاقے میں بڑے تعلقہ دار اپنی جاگیروں کی دیکھ بھال ضلع کے کسی دوسرے حصے کے تعلقہ داروں کی نسبت بہتر طریق پر کرتے ہیں۔ میرے نہایت ہی قابل اعتبار مخبروں میں سے ایک کہتا ہے۔ کہ بڑے آدمیوں میں سے (تحصیل میں ۱۲۲ اشخاص ایسے ہیں جو ۱۰۰۰ سے زیادہ روپیہ بطور لگان زمین ادا کرتے ہیں،) تقریباً ۲۵ فیصدی احساس ہمدردی کی وجہ سے اپنے مزارعین کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ ۵۰ فیصدی اور بھی ایسا ہی کرتے ہیں کیونکہ وہ دیکھتے ہیں۔ کہ ایسا کرنا ان کے مفید مطلب ہے۔ صرف ۲۵ فیصدی لوگ کچھ نہیں کرتے۔

ایک قابل ذکر تعلقہ دار:۔ شجاع آباد میں یہ دیکھ کر کہ میں تعلقہ داروں کے گروہ میں کھڑا ہوں۔ میں نے ان سے دریافت کیا۔ کہ تعلقہ دار، پیر اور ساہوکار اور تینوں میں سے کس کا اثر زائل ہو گیا ہے۔ انہوں نے اس امر پر اتفاق کیا۔ کہ ساہوکار کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ اور تعلقہ دار اتنا ہی قوی ہے۔ جتنا کہ پہلے تھا میں نے انہیں آگاہ کر دیا کہ یہ صورتِ حالات زیادہ دیر تک نہ رہیگی۔ دیکھو سکول کیسی سرعت پھیل رہے ہیں۔ اور مزدوروں کے نیچے جاؤ۔ وہاں ہم پہنچ جائیں گے۔ ایک نے کہا کہ ہاں سکول نہایت ہی تکلیف دہ ہیں۔ اس مجمع میں ایک شخص ضلع بھر کی انجمن ہائے امداد باہمی کے بہترین ارکان اور نہایت ہی مستعد زمینداروں میں سے ہے۔ لیکن یہ شخص آخرالذکر مقرر نہیں ہے۔ اس کی گذشتہ زندگی کے حالات اور اعمال پنجاب کے دیہات کی بہترین زندگی کا اتنا اچھا نمونہ ہیں۔ کہ وہ کسی دیرپا تعریف کا مستحق ہے۔ وہ ایک سید ہے۔ اور ۸۰۰ ایکڑ زمین کا مالک ہے۔ جسمیں سے صرف ۱۵۰ ایکڑ زمین زیر کاشت ہے۔ وہ صوبے بھر کی سب سے پرانی بینکنگ یونین میں سے ایک کا صدر ہے۔ پنجاب میں اور غالباً ہندوستان میں کوئی شخص بھی تحریک امداد باہمی کے ساتھ اس قدر طویل عرصے تک شریک نہیں رہا۔ کیونکہ ۱۸۹۵ء میں ایکٹ انجمنہائے امداد باہمی کے منظور ہونے سے پہلے وہ اس مجلس کا سیکرٹری تھا۔ جو ایڈورڈ میکلیگن اور کیپٹن کروستھ ویٹ نے قائم کی تھی۔ اور اس وقت سے اب تک امداد باہمی کا کام کرتا رہا ہے۔ اگرچہ گرد و نواح کے لوگوں کی فطرت کے باعث اتنا کامیاب نہیں ہوا۔ جتنا کہ وہ اپنے استقلال کی وجہ سے مستحق ہے۔ لفظ تعلیم کے موجودہ مفہوم کے مطابق اس نے کچھ زیادہ

حاصل کرلیا ہے۔ اس کے چال چلن کی ایک اچھی مثال یہ ہے۔ کہ ایک افسر پر بددیانتی کا الزام لگایا گیا۔ مقدمے کا تعلق اس دستاویز سے تھا۔ جو اتفاق سے سید کے قبضے میں تھی۔ بڑے بڑے لوگ اس افسر کے دوست تھے۔ ان میں سے بعض نے اس کی امداد کرنے میں پوری پوری سعی کی تین یا چار سید کے پاس آئے اور کہا دیں کہانی کو سید کے اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں) "عقلمندی اسی میں ہے۔ کہ رسید دے دو۔ ایک وکیل نے مجھے ترغیب دی کہ رسید چھپا لو اور اپنے بیان کو ذرا جھٹلا دو اس افسر کا باپ جو ایک سربرآوردہ شخص تھا۔ میرے پاس رات کو آیا۔ اور دستاویز کے لئے التجا کی۔ آخر کار جب یہ دستاویز حکام بالا کو دیدی گئی۔ اور مقدمے کا فیصلہ ہو گیا تو پڑوسیوں اور بارسوخ ملاقاتیوں نے مجھے یہ کہکر ملامت کیا کہ یہ تم نے کیا کیا اور جو کام اس نے کیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ ایک دغاباز کو معطل کرادیا تھا۔ یہ کہانی دیہات میں راست بازی سے کام کرنیکی مشکلات پر روشنی ڈالتی ہے۔

میں نے دریافت کیا تمہیں سچ بولنا کس نے سکھایا۔ کیونکہ اصلی مذہبی تعلیم کوئی نہیں حاصل کرتا۔ اس نے جواب دیا۔ میرے والد صاحب خدا ترس تھے۔ اور جو اتالیق انہوں نے میرے لئے مقرر کیا وہ بھی خدا سے ڈرتا تھا۔ میرے اتالیق نے چالیس دن تک مجھے سوائے اس کے اور کچھ نہ بتایا کہ سچ بولا کرو۔ میں نے دو مرتبہ اُس وقت سچ بولا جب وہ زندہ تھا۔ اور تیسری بار اسکے مرنے کے بعد اسطرح سے میں نے عادت پیدا کرلی۔ میری تمام زندگی میں کسی مولوی نے میری رہبری نہیں کی۔ لیکن دو یا تین سال گذرے میں نور فقیر کی باتیں سننے لگ گیا تھا۔ جو یہ کہتا تھا۔ کہ ہندوؤں کو کافر اور مشرک مت کہو۔ سب سے مساوی سلوک کرو ملاں لوگوں کا کوئی ایمان نہیں ہے۔ ان کی طرف دھیان مت دو اور نہ ہی ان کے پیچھے نماز پڑھو۔ سکھوں کے ایک پروہت کی طرح جسے میں نے لائل پور کے ایک دیہاتی گوردوارے میں دیکھا تھا۔ یہ فقیر ایک کمہار کا لڑکا ہے۔ اور اگرچہ وہ اب بھی کسی قدر زمین میں کاشتکاری کرتا ہے۔ لیکن پیر بن گیا ہے۔ اور اس طریقے کی جس سے کہ اب بھی پیر بنتے رہتے ہیں۔ ایک زندہ مثال ہے۔ شفا بخشی کی معجز نما قوتوں کی وجہ سے پہلے سے اس کی ساکھ بندھی ہوئی ہے۔ سید کہتا ہے۔ کہ ہندوؤں کے متعلق میں نے پیر کی نصیحت پر عمل کیا ہے۔ اور میں اور میرا ایک اروڑا پڑوسی ایک دوسرے کی شادی و غمی میں شریک ہوتے ہیں۔

مشترکہ تعلیم اور پردہ:- جو تعلیم دیہاتیوں کو فی زمانہ دی جا رہی ہے۔ سید کو اس کی قدر و قیمت کے متعلق بہت بھاری شبہات ہیں۔ اس پر بھی اس سخاوت کو مدنظر رکھتے ہوئے جو دیہاتی زندگی کا خاصہ ہے۔ اس نے مقامی سکول کیلئے زمین اور عمارت دے دی ہیں۔ اور ہر فصل کے موقعہ پر ایک کوئیں کی پوری پیداوار اور دوسرے کی نصف پیداوار زیادہ غریب طلبا کی امداد کے لئے علیحدہ کر دیتا ہے۔ اب وہ مشترکہ تعلیم کی آزمائش کر رہا ہے۔ اور اس کی اپنی لڑکی اور چھ اور لڑکیوں کو انہی کے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ تعلیم دی جا رہی ہے۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کہاں تک جاری رہ سکتی تھی۔ لیکن امید تھی کہ یہ مڈل کے درجے تک ممکن ہو گی۔ پردہ کے متعلق یہ ہے۔ کہ زیادہ اہمیت والے گھرانے پردہ کرتے ہیں۔ اور اس سے کہیں زیادہ سختی کے ساتھ کرتے ہیں۔ جتنا کہ شریعت کی رو سے ضروری ہے۔ جو صرف اتنا بتاتی ہے۔ کہ وہ چیزیں جو زیبائش کا باعث ہوں مثلاً عورت کے لئے زیور۔ ضرور چھپا لینے چاہئیے۔ یہ سوال کہ آیا چہرہ بھی زیبائش ہے۔ یا نہیں ایک نازک مسئلہ ہے۔ جو نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی کہ دیکھو خوشنما لگتا ہے۔ کیسا چاندنی کہنے برقعے کا استعمال درست نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ قرآن پاک نے حکم دیا ہے۔ کہ جب عورتیں ان لوگوں کے سامنے جائیں۔ جنکے سامنے انہیں پردہ کر کے جانا چاہئے تو وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور گھر سے باہر برقعے میں ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے سات یا آٹھ سال ہوئے اس کے کنبے نے پردہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ان لوگوں نے بھی جو آزاد خیال ہیں۔ ایسا ہی کیا ہے۔ ایسے لوگ اس کے گاؤں میں چند تھے۔ صرف اس کا بھائی اور سکول کا ہیڈ ماسٹر انہیں پردہ چھوڑنے کا مطلق خیال نہ تھا۔ لیکن انہوں نے قرانی احکام سے تجاوز کرنے سے انکار کر دیا۔ سید نے کہا کہ میری سب سے بڑی لڑکی جس کی شادی ایک استاد سے کی گئی ہے۔ گھر کے تمام اخراجات کا حساب رکھتی ہے۔ اور اسمیں زمین کے حسابات بھی شامل ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ اسے اپنے باپ کے چال چلن میں سے کچھ نہ کچھ حصہ ورثے میں ملا ہے۔ کیونکہ ایک ماہ گذرا کنبے کی ایک مجلس میں جسکی روح رواں وہ تھی۔ یہ فیصلہ کیا گیا۔ کہ زیورات پہننے چھوڑ دیئے جائیں۔ اور اسی وقت گھر کی تمام عورتوں کا زیور ایک صندوق میں رکھ دیا گیا۔ اب وہ اس کی فروخت کر کے روپیہ کو کسی کام میں لگانے کے متعلق غور کر رہی ہیں۔ ایسے گھرانے میں یہ لازمی طور پر دیکھا جاتا ہے۔ کہ شادیوں کے گراں بار اخراجات چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ جنمیں مہمانوں کو دو یا تین وقت کا کھانا دینے اور ناچنے والی لڑکیوں کے ناچ و گانے سے اتنی کی مہمان نوازی کی رسم ہوا کرتی تھی۔ اب

صرف ایک دعوت دی جاتی ہے۔ اور ناچنے والی لڑکیاں کوئی حصہ نہیں لیتیں۔ سید خود بھی اس بات پر فخر کرتا ہے۔ کہ اس نے شادی میں بٹے کا رواج چھوڑ دیا ہے۔ اور اپنے کسی بیٹے کی منگنی سن بلوغت کو پہنچنے سے پہلے نہیں کی۔ ان تمام باتوں میں وہ زمانے سے کہیں آگے ہے۔ لیکن ایک پہلو سے وہ پرانی طرز کا آدمی ہے۔ وہ یہ کہ اس نے چار بیویوں سے شادی کی ہے۔ جن میں سے تین زندہ ہیں۔

ایک یا دوسرے تعلقہ داروں کی مانند جن سے میں اپنے دورے کے دوران میں ملا ہوں۔ سید مذکور حکیم بھی ہے۔ اور کسان بھی۔ اس نے یہ علم اپنے چچا سے سیکھا تھا۔ اور اپنی زندگی کے اکثر حصے میں حکمت کرتا رہا ہے۔ اس کے پاس چار یا پانچ مریض روز آتے ہیں۔ اور اس کی سب سے بڑی لڑکی نسخہ جات تیار کر کے اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ اس کے متعلق زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے۔ کہ وہ ساٹھ سالہ ہونے کے باوجود منشی فاضل کا امتحان پاس کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کام کو وہ اسی استقلال سے کر رہا ہے۔ جس سے کہ بابر کی چیونٹی نے اپنا کام کیا تھا۔ کیونکہ پانچ سال ناکامیاب رہنے کے باوجود وہ اگلے سال دوبارہ امتحان دینا چاہتا ہے۔ ایسے لوگ دیہاتی علاقے کی جان ہیں۔ سید مذکور نے یہ بات نہایت حیرت انگیز سنائی کہ اس کی لڑکی کنبے کے حسابات رکھتی ہے۔ اس قسم کی ایک مثال میں نے برما میں دیکھی تھی۔ لیکن ملتان کے مسلمانوں میں مجھے اس کے دیکھنے کی توقع نہ تھی۔ ہندوستان کی دیہاتی زندگی کے اختلاف کی یہ ایک اچھی مثال ہے۔ اور یہ ایک ایسے علاقے کی تمثیل ہے۔ جہاں باوجود ان تمام باتوں کے جو پردے کے متعلق ابھی ابھی بیان کی گئی ہیں۔ عورت کا درجۂ آزادی قابل ذکر ہے۔ سوائے شہروں کے اور سیدوں و شیخوں کے گھروں کے وہ آدمیوں سے آزادانہ گفتگو کرتی ہیں۔ اور ہاتھ ملا کر انہیں خوش آمدید کہتی ہیں۔ اور بہت سی باتوں میں ان کے پہلو بہ پہلو ہیں۔ گھر میں ان کا درجہ ان مجمل الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ "حکم جورو جی یہ از حکم خدا" امیر اور غریب دونوں میں روپیہ کا لین دین اکثر عورتوں کے ہاتھ سے ہوتا ہے۔ عورت ہی یہ فیصلہ کرتی ہے۔ کہ کنبہ کیا کھائیگا اور خاوند کتنا خرچ کرے گا۔ شادیاں بھی زیادہ تر اسی کے ذریعہ قرار پاتی ہیں۔ اور آدمیوں کو صرف رضامندی ظاہر کرنی پڑتی ہے۔ اس پر یہ کہ جب دلہا برات کے ساتھ دلہن کے گھر جاتا ہے۔ تو وہ اس کے ساتھ جاتی ہیں۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے جو عورتیں وسطی پنجاب میں نہیں کرتیں۔ عرصہ نہیں گزرا کہ میرے ضلعے کے ایک رکن نے ایک سوسائٹی کے ممبر سے دریافت کیا۔ تمہیں سوسائٹی کا کس قدر روپیہ دینا ہے۔ اسے ذرا بھی خبر نہ تھی

لیکن اس نے کہا کہ میں اپنی بیوی سے دریافت کرتا ہوں۔ نصف گھنٹے میں وہ ٹھیک حساب لے کر واپس آگیا۔

ایک ابتدائی بنک اور ایک انجمن ثالثی :- اس جگہ قابلِ ذکر ہستیاں آبادیں۔ ایک اور سید جو میری ملاقات کے لئے آیا۔ اُس انجمن امداد باہمی کا صدر تھا۔ جو ۱۸۹۵ء میں جاری کی گئی تھی۔ اور اب ۴۳ سال بعد صوبے کی بہترین انجمن ثالثی میں سے ایک کا صدر ہے۔ ماقبل الذکر میں ۲۲ گاؤں اور کمیٹروں کے سید شامل تھے۔ اور کلکتہ میں رجسٹری شدہ تھی۔ اس کے پچاس یا ساٹھ ممبروں میں سے ہر ایک چالیس روپیہ چندہ دیتا تھا۔ مزید برآں سوسائٹی ۱۰۰۰ روپیہ کی امانت صدر سے اور اتنی ہی رقم کے تین قرضے کسی مقامی ساہوکار سے اور دو گورنمنٹ سے حاصل کرتی تھی۔ یہ سب کچھ انجمن ہائے امداد باہمی کے سرکاری طور پر میدانِ عمل میں آنے سے پہلے وقوع میں آیا۔ انجمن ثالثی میں جو اُنہی اصولوں پر کاربند ہے۔ جن کا تذکرہ پہلے کیا جاچکا ہے۔ ۷۶ ممبر شامل ہیں۔ ان میں سے ۶۰ ہندو ہیں۔ اجراء سے اب تک یعنی دو سال کے عرصے میں ۱۵ جھگڑوں کا فیصلہ کیا ہے۔ اور عدالتوں میں چارہ جوئی کئے بغیر ۹۰۰ روپے واپس لے لئے ہیں۔ ان میں سے ۴ مقدموں کا فیصلہ ثالثوں نے کیا تھا۔ اور باقی صورتوں میں مصالحت کرادی گئی تھی۔ ثالث بلا پنچوں میں سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ جن میں تین ہندو شامل ہوتے ہیں۔ چودہ مقدمات میں ہندو و مسلمان ایک دوسرے کے خلاف تھے۔ لیکن تمام مقدمات تسلی بخش طور پر فیصل کئے گئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جنوب مغربی علاقے میں بھی جہاں دونو قوموں کے مابین تعلقات کبھی کبھی کشیدہ رہے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں ہے۔ کہ ہندو مسلمان کیوں آپس میں صلح جوئی سے نہ رہیں۔ اس کی موافقت میں یہ حقیقت بیان کی جاسکتی ہے۔ کہ اس علاقے میں ہندوؤں کو اب بھی دیہاتی طبقے کا لازمی عنصر خیال کیا جاتا ہے۔ باوجود ان فرقہ وارانہ فسادات کے جو ۱۹۲۲ء میں ملتان میں رونما ہوئے دیہات میں فرقہ داری کا احساس بہت کم ہے۔ اگرچہ حسبِ معمول فسادات کثرت سے ہیں۔

ایک آزاد خیال نقاد :- اس سلسلے میں ایک پٹھان کا ذکر بھی کیا جاسکتا ہے۔ جو اس ہفتے کے دوران میں میری ملاقات کو آیا۔ ایک اچھا خاصہ چوڑی چھاتی والا شخص تھا۔ آتے ہی فوراً سیاسیات میں اُچھل پڑا۔ اس نے کہا کہ جب سے انتخابات نے دیہات میں قدم رکھا ہے۔ زمینداروں کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اگر ایک طرف رائے دیں تو دوسری طرف دشمن شمار کئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی ملاقاتی کے ساتھ

جائے بھی پیر تو بھی یہی سمجھا جاتا ہے۔ سرکار نے اس کی ابتدا کر کے ایک بڑے عمل کا اقدام کیا ہے۔ اور ایسا کرتے وقت زمینداروں کا کوئی لحاظ نہیں رکھا ہے۔ اس نے کسی بڑے پیر کا ذکر نہایت حقارت آمیز الفاظ میں کیا۔ اس نے کہا کہ اکثر لوگ ان کے زیر اثر ہیں۔ اور اس سے پہلے کہ کوئی تبدیلی وقوع میں آئے کئی سال گذر جائینگے۔ لیکن زیادہ تعلیم یافتہ لوگ کہتے ہیں۔ ہم سب خدا کے بندے ہیں۔ پھر ہمارے اور خدا کے درمیان پیر کیوں آئے۔ ہندو ساہوکار کی دست درازیوں کے متعلق بھی اس نے نہایت سخت باتیں کہیں۔ اس نے کہا کہ وہ ہمارا دشمن ہے۔ تاہم کچھ دیر بعد اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ وہ ہندو جو ۲۰۰۰۰ روپے کی آسامی ہے۔ اس کے پاؤں کے پاس نہایت ادب سے بیٹھ جائے گا۔ جبکہ ایک بڑا مسلمان تعلقہ دار ممکن ہے۔ اسے سلام بھی نہ کرے۔ (۱۲ میل)

۳ر فروری شجاع آباد سے خان گڑھ

کل رات اتنی سردی ہو رہی تھی۔ کہ اتنی پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ سردی نے مجھے کئی بار جگایا۔ جب بھی میں جاگا۔ میں نے رہٹ کی روں روں کی لوری سنی بلاشبہ پنجابی کسان گرمی و سردی دونوں میں سخت محنت سے کام کرتا ہے۔

آسیب زدہ عورتیں:۔ ان لوگوں میں سے جو آج میرے ہمرکاب تھے ایک پیر تھا۔ اپنے باپ کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے پانچ یا چھ سال ہوئے اس نے پیری مریدی چھوڑ دی تھی۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ دیہات کے بہترین لوگ پیری مریدی کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میرے ساتھی نے کہا کہ میں نے صرف ایک اچھا پیر دیکھا ہے۔ اس پیر نے کبھی جنوں کو نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے پیروں کو دو مرتبہ جن نکالتے ہوئے دیکھا ہے۔ پہلی مرتبہ اس عورت میں سے جسے اپنے آسیب زدہ ہونے کا یقین تھا۔ ایک خانقاہ کے اندر جب وہ ایک چارپائی پر سو رہی تھی۔ تو پیر نے اسے ایک لاٹھی سے پیٹا اور جب وہ نہ اٹھی تو یہ ظاہر تھا کہ جن ابھی موجود ہے۔ پھر پیر نے ایک پھول گرم کی اور اسے اسکی گردن پر لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ کہ وہ نہایت ڈر اور ڈر سے اٹھ بیٹھی اور کچھ پانی مانگا۔ اس کے خاوند نے اس کا نام دریافت کیا۔ اور جب اس نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا تو یہ ظاہر ہو گیا۔ کہ جن اسے چھوڑ گیا تھا۔ دوسری صورت میں ایک بڑھیا کی بیوی تھی۔ پیر نے اسے کھڑا کر دیا۔ اور زور زور سے تھپڑ مارے۔ اور جن نے فوراً ہی اسے چھوڑ دیا ظاہر ہے۔ کہ جن سمجھدار تھا۔ مظفر گڑھ کا اخبار نویس

جنوں کو نکالنے کا عمل کسی قدر وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ آسیب زدہ عورتیں بیٹھ جاتی ہیں۔ اپنے جسم آگے پیچھے ہلانے شروع کرتی ہیں۔ آہستہ آہستہ اس کی تیزی بڑھتی جاتی ہے۔ اس جوش کو ڈھول بجا کر برقرار رکھا جاتا ہے۔ خلیفہ چاروں طرف پھرتا ہے۔ اور عورتوں کے چابک لگاتا ہے۔ اور ان پر خوشبودار تیل ڈالتا ہے۔ جب ہر عورت تھک جاتی ہے۔ تو خلیفہ کچھ پڑھتا ہے۔ اور تھوڑا سا پانی ان پر چھڑکتا ہے۔ جن نکل جاتا ہے۔ عورت سکون پذیر ہو جاتی ہے۔ یہ اٹھارھویں صدی کا ذکر ہے۔ اور اس وقت تک کوئی خاص تبدیلی - - - - - معلوم ہوتی۔ اُن دنوں کی طرح اب بھی بہت سی عورتیں صرف اس لئے اپنے اندر جن ظاہر کرتی ہیں۔ تاکہ انہیں اُن سالانہ میلوں میں لیجایا جائے۔ جو اکثر خانقاہوں پر لگتے ہیں۔

پیر کی سخت آزمائش:- میرے ساتھی نے تعویذوں کے متعلق بھی ذکر کیا عام طریقہ یہ ہے۔ کہ تعویذ کو کاغذ کے ایک پرزے پر لکھ لیا جاتا ہے۔ اور اسے پانی میں ڈبو دیتے ہیں۔ سیاہی گھل جاتی ہے۔ اور وہ پانی جسمیں تعویذ کا اثر ہو جاتا ہے۔ پی لیا جاتا ہے۔ بعض اوقات پیر سے دریافت کیا جاتا ہے۔ کہ اس بیل یا گائے کے غائب کرنے کا ذمہ دار کون ہے؟ مشتبہ لوگ بلائے جاتے ہیں۔ اور پیر چور کو معلوم کرنیکے لئے باری باری اپنی ہتھیلی کو ہر ایک کی پیٹھ سے رگڑتا ہے۔ اگر آدمی بے گناہ ہوتا ہے تو کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ لیکن اگر وہ قصوروار ہوتا ہے۔ تو پیر کا ہاتھ اس چور کے نام کا نشان اسکی پیٹھ پر چھوڑ دیتا ہے۔ میرے مخبر نے ایک بار ایسا ہوتا دیکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ الزام ایک ایسے شخص پر دھر دیا گیا۔ جسے میں جانتا تھا۔ کہ معصوم ہے۔ بے ایمان پیر ایسے موقعوں پر یہ کرتا ہے۔ کہ اس شخص کا نام جسے وہ مجرم بنانا چاہتا ہے۔ آک کے دودھ سے اپنی ہتھیلی پر لکھ لیتا ہے۔ یہ اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتا۔ جب تک کہ ہاتھ اس شخص کی پیٹھ پر نہیں رگڑا جاتا

عبور دریائے چناب:- آج میں نے دریائے چناب کو عبور کیا۔ دریا کی پہنائی کا سنسنی خیز احساس کہیں بھی یہاں تک کہ سمندر پر بھی اس سے زیادہ نمایاں نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ دنیا کی تمام خوبصورتی و وسعت یہاں کی اس مصفا و مجلا ہوا میں موجود ہے۔ اور تمام کائنات میں انسان کی ہستی ایک خال کے مشابہ ہے۔ دریائی میدان میں گارے کا پلستر کی ہوئی چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جنکی چھتیں دیکھنے میں سونے کی معلوم ہوتی تھیں۔ تقریباً سب نئی بنی ہوئی تھیں۔ کیونکہ گذشتہ سال موسم گرما کا سیلاب۔ بستیوں کو بہا کر لے گیا تھا۔ ان دو گھروں میں جنکو میں نے دیکھا تھا غریب لوگ بستے تھے۔ جنہوں نے گھر کے ساتھ کے کوئیں ایک بڑے جاگیردار سے اجازت پر لئے ہوئے تھے۔ پہلا چالیس سال سے اپنے کوئیں پر کام کر رہا

تھا۔ اور اس سے پہلے اس کے والد اور دادا وہیں رہتے رہے تھے۔ پانچ یا چھ ایکڑ زمین اسکی اپنی تھی۔ لیکن سب رہن رکھی ہوئی تھی۔ قرض کی وجہ سے وہ اور بھی دب گئے تھے۔ اور ان کے ساہوکار نے انہیں اور روپیہ دینا بند کر دیا تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ اسکی شرح کیا تھی۔ اس نے جواب دیا ۲۵ فیصدی۔ اس کی بیوی نے جو چیں بر جبیں ہو رہی تھی۔ کہا یہ غلط کہتا ہے۔ اسے کچھ پتہ نہیں ہے۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ شرح پیسہ روپیہ ہے۔ اور جلگانہ بھی لیا جاتا ہے۔ کل کی اس حقیقت کی کہ عورتیں ہی تمام لین دین کرتی ہیں۔ یہ ایک غیر متوقع مثال ہے۔ میں نے پوچھا تمہارے تعلقہ دار نے تمہیں امداد نہیں پہنچائی تھی۔ عورت نے جواب دیا نہیں۔ اس نے بالکل امداد نہیں دی۔ خاوند نے بظاہر اس ڈر سے کہ یہ بات کہیں تعلقہ دار کے پاس دھرائی نہ جائے دبی ہوئی آواز میں کہا اس کی برائی نہ کرو۔ عورت نے دادخواہی کے طور پر کہا جب اس نے کوئی امداد نہیں دی تو میں ایسا کیوں نہ کہوں۔ گھر کے ایک رکن کے ہاں ابھی ابھی ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اس کی ماں دس دن تک آرام کرے گی۔ اور گیارھویں دن پھر کام کرے گی۔ دایہ ایک سقے کی بیوی تھی۔ جو ان کی امداد کیلئے آئی ہوئی تھی۔ اسے ایک روپیہ دیا جائیگا۔ عورت نے گھر کے سوت سے بُنے ہوئے کپڑے کی ایک چادر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ میں اسے یہ کپڑا بھی دوں گی۔ بظاہر یہ لوگ بہت غریب تھے۔ تاہم اگرچہ وہ اپنے گھروں کی چھتیں ان دیہاتیوں کی طرح بناتے تھے۔ جن سے دو دن ہوئے ہم ملے تھے۔ لیکن ٹوکریاں مُوڑوں سے خریدتے تھے۔ ہم نے چناب کو ایک بڑی چوڑی سطح والی کشتی پر عبور کیا۔ اور دوسرے کنارے پر قدم رکھتے ہی مظفر گڑھ کے لوگوں نے ہمیں خوش آمدید کہی۔

باب دہم
مظفرگڑھ اور دریائے سندھ کی وادی
زندگی کا پرانا معیار

۴ فروری ۔ قیام

ضلع :۔ اگر ملتان میں ساہوکار۔ جاگیردار اور پیر کا اثر جھنگ کی نسبت کم ہے" تو مظفرگڑھ میں دونو سے زیادہ ہے۔ اور اس کے نتائج تباہ کن ہیں۔ پنجاب کے کسی ضلع میں کسان اس قدر مردہ دل بے بس اور پسماندہ نہیں ہیں۔ اور نہ ہی کہیں اور ان کا معیار زندگی اتنا پست ہے۔ خواہ اس کے بنیادی اسباب کچھ بھی ہوں۔ لیکن یہ امر یقینی ہے۔ کہ گذشتہ ایام میں ساہوکار جاگیردار۔ اور پیر نے اسکی ضروریات اور خوف سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ ساہوکار مطالبات کی وجہ سے رسوا ہے۔ اور اسی طرح تعلقہ دار کے گذشتہ حالات بھی اتنے ہی بڑے ہیں۔ اور پیر نے تو بھی لوگوں کو وہ دھوکا دیا ہے۔ کہ اکثر لوگوں میں اس نے خدا کی جگہ لے لی ہے۔ مختصر یہ کہ اس ضلع میں ہم دیہاتی زندگی کو اسکی بدترین حالت میں دیکھتے ہیں۔ اس بنک میں جو میں نے آج شام دیکھا یہ تمام باتیں نہایت درد انگیز طور پر عیاں تھیں۔ اگرچہ سوسائٹی تیرہ سال سے جاری تھی اور اس کے اکثر ممبر کچھ نہ کچھ تعلیم یافتہ تھے۔ لیکن انہیں اپنے ضابطۂ قوانین کی کچھ خبر نہ تھی۔ اور نہ ہی اس کی کوئی نقل ان کے پاس موجود تھی۔ وہ ہمارے سامنے کرسیوں پر براجمان تھے اور ایک سوال کا بھی جواب نہ دے سکتے تھے۔ دوسری سوسائٹی میں جاکر مدرسے کو نفرت دور ہوئی۔ یہ محلے کا ایک بنک تھا۔ اور ایک سال سے جاری تھا۔ اس کا صدر دبلا۔ مہذب۔ سمجھدار اور فرانسیسی خاکستری رنگ کے چمکدار ٹنبول والے کوٹ میں ملبوس ایک بڑا تعلقہ دار تھا۔ ممبر جو تقریباً سب اس کے مزارعین تھے۔ زمین پر ایک بڑے زندہ دل و خراب لباس والے مجمع میں بیٹھے تھے۔ صدر نے جس کو ہم میاں کے نام سے مخاطب کر سکتے ہیں۔ اوپر کے آموں کے درختوں کی طرف اشارہ

کیا اور کہا اس سال پالے کی وجہ سے بالکل پھل نہیں آئے گا۔ دوسری جگہوں کی طرح یہاں بھی پالے نے ان کی موسم گرما کی گہری سرسبزی کو خزاں کی زردی و بھورے رنگ میں تبدیل کر دیا تھا۔ جو خوبصورت مگر برباد کن تھا۔ گیہوں بھی مرجھائی ہوئی تھی۔ اور مٹر تباہ شدہ حالت میں تھی۔ ہم نے ممبروں سے ضابطہ قوانین کے متعلق سوالات پوچھے۔ اگرچہ تقریباً سب جاہل تھے۔ لیکن نہیں خوب یاد تھے۔ چونکہ منڈیاں دور دور ہیں۔ اس لئے وہ بنک میں ادائیگی غلے کی صورت میں کرتے ہیں۔ گذشتہ موسم گرما میں سوسائٹی نے ۹۰۰ من غلہ جمع کیا تھا۔ اور وہی خزاں کے موسم میں بیج اور خوراک کے لئے ادھار دیدیا یہ انتظام خوش قسمتی سے ہو گیا۔ کیونکہ دونو موسموں کے درمیان گیہوں کی قیمت ۵۰ فیصدی بڑھ گئی۔ وادی (بیٹ) میں ۴۰۰ من سے زیادہ غلہ جمع کیا گیا تھا۔ اور ستمبر کے سیلاب کی وجہ سے نہایت خطرے میں تھا۔ لیکن رات بھر کی دوڑ دھوپ سے بچا لیا گیا تھا۔

مزارع اور مزدور:۔ یہ لوگ رات کو کام کرنے کے عادی ہیں۔ کیونکہ پوہ اور ماگھ کے مہینوں میں کوئیں رات دن چلانے پڑتے ہیں۔ یہ ایک کہاوت ہے۔ کہ جس کا کنواں چلتا ہے۔ اسے آرام یا امن نصیب نہیں ہوتا۔ (جنہاں جوتے کھوہ انہاں دے سکھ نہ سنے) رات کو چھ چھ گھنٹوں کی باریوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے۔ بہت سے تمام دن اور نصف رات تک کام کرتے ہیں۔ اگرچہ مزدور کو صرف روزانہ ایک وقت کا کھانا ایک من گیہوں فی ماہ اور حسب معمول سالانہ ایک کمبل اور جوتوں کا جوڑا اور ایک مویشی کے لئے چارہ دیا جاتا ہے۔ لیکن زائد کام کے لئے کوئی اجرت اسے علیحدہ نہیں دی جاتی۔ میاں اپنے مزارعوں کو اتنی چیزیں دیتا ہے۔ اور کھانا نہ دینے پر بھی گردونواح میں ۱۰ روپے ماہوار سے زیادہ کوئی نہیں دیتا۔ افسر بندوبست لکھتا ہے۔ کہ ضلع کے باقی ماندہ حصے کی نسبت اس تحصیل میں مزدوری کا معیار ذرا بلند ہے۔ لیکن اگر اسے نقدی میں تبدیل کیا جائے تو ۸۵ روپیہ سالانہ سے بڑھ نہیں سکتا۔ تاہم میاں یہ کہتا ہے۔ کہ مزدور مزارع سے بہتر حالت میں ہے۔ کیونکہ اسکی آمدنی ہمیشہ یقینی ہوتی ہے۔ اور شاذ ہی مقروض ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے۔ کہ کوئی اُسے ادھار نہیں دے گا۔ میاں اس علاقے کے ایسے لوگوں میں سے ہے۔ جو کمیاب ہیں۔ یعنی اچھے تعلقدار۔ وہ کہتا ہے۔ کہ میں کبھی کسی مزارع کو نہیں نکالتا۔ اور بہت سے اسکے کنوؤں پر برسوں پڑے رہتے ہیں۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا کہ میرا خاندان پانچ پشتوں سے ایک ہی کوئیں پر رہتا آیا ہے۔ ایک اور نے بیان کیا کہ جب مجھے پہلے پہل زمین ملی تو اس وقت میاں صاحب پیدا نہیں

ہوئے تھے۔ گزشتہ دو سال میں میاں نے تین کوئیں اتارے ہیں۔ اور آبپاشی کے لئے بہت سے تالاب بنائے ہیں۔

ساہوکار اور پیر:۔ اس امر میں عوام میرے ساتھ متفق تھے۔ کہ پیر اور ساہوکار کا اثر کافی زائل ہوگیا ہے۔ جتنا پہلے کا اتنا ہی دوسرے کا لیکن تعلقہ دار کا نہیں۔ ایک پیر نے جو وہیں بیٹھا تھا کہا کہ میں اپنے مریدوں سے پہلے کی نسبت بہت کم لیتا ہوں۔ پرانے زمانے گزر گئے۔ لوگ سیانے ہو گئے ہیں۔ اور جتنا ہم ان سے لیتے ہیں۔ وہ اس کی نسبت ہم سے زیادہ لے لیتے ہیں۔ اس پر ایک عام قہقہہ پڑا۔ وہ ساہوکار کے بہت نیچے پڑے ہوئے تھے وہ یہ کہتے تھے کہ اگر زمین رہن کردی جائے۔ یا زیور گروی رکھ دیا جائے تو بھی عام شرح سود پیسہ روپیہ ہے۔ اور ساتھ ہی ایک آنہ چلکانہ لیا جاتا ہے۔ پھر یہاں بنوتی کا رواج ہے۔ جس سے قرض کو پنچائتی نرخ کے مطابق غلے میں تبدیل کرلیا جاتا ہے۔ ان مصائب کے مدافعات پر بحث کرتے ہوئے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ممبر خود بخود شادیوں کے اخراجات کم کر رہے ہیں۔ وسطی پنجاب کے لحاظ سے ۱۰ یا ۱۲ ایکڑ زمین کے مالک کے لئے ۲۰۰ روپیہ تک خرچ کرنا غالباً کچھ زیادہ نہیں لیکن گوڑگاؤں میں جہاں تقریباً اتنا ہی روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ یہ رقم معمولی کسان کی استطاعت سے کہیں زیادہ ہے۔

دونو انجمنوں میں ایک غیر معمولی فرق تھا۔ جو فرق کہ کھڑے اور بہتے پانی میں ہوتا ہے۔ ایک پرانی قسم کے گھاس پات سے اٹی ہوئی اور دوسری تازہ زندگی کے ساتھ رواں تھی ہمارے جانے سے پہلے سورج غروب ہوگیا تھا۔ اور اس کی آخری روشنی مغرب میں جھلک رہی تھی۔ اور جب ہم سوار ہوکر کھیتوں میں سے واپس چلے تو ستارے ہمارے سروں پر چمک رہے تھے۔

۵ فروری خان گڑھ سے کھنجر

ایک سڑک کی مرمت:۔ آج ہم نے ایک ناقابل اعتبار چیز دیکھی وہ یہ کہ قلی سڑک کے اوپر مٹی ڈالنے کیلئے ننھی ننھی گیہوں کے ایک کھیت میں سے مٹی کھود رہے تھے۔ ایک جگہ انہوں نے ۱۲ یا ۲۴ انچ کی گہرائی تک کھود لیا تھا۔ ڈپٹی نے سے یہ پیمائش کی گئی۔ ذرا دیر بعد ہم ٹھیکہ داروں میں سے ایک سے ملے وہ ایک بدشکل غنڈا

تھا۔ جس کی گائیں۔ بیلون ٹائر کی طرح پھولی ہوئی تھیں۔ اس نے یہ حق جتایا کہ وہ سڑک کے کنارے کے ہر ایک کھیت سے ایک فٹ تک مٹی لے سکتا تھا۔ خواہ اسمیں فصل ہو یا نہ ہو سڑک کے ساتھ ساتھ تمام کھیت کھودے گئے تھے۔ اکثر حصے میں وہ کاشت شدہ نہ تھے۔ لیکن ایک جگہ ایک گیہوں کی پٹی کئی سو گز تک نہایت بے رحمی سے کھودی ہوئی تھی۔ کسی اخباری خیالات والے نے بتایا کہ یہ کام عوام کے فائدے کے لئے کیا گیا تھا۔ ہم نے دو زمینداروں کو پکڑ لیا جن میں سے ایک مسلمان تھا اور ایک ہندو۔ دونوں نے کہا کہ ہمیں کچھ نہیں دیا گیا۔ میں نے دریافت کیا کیا تم نے ڈپٹی کمشنر کے پاس شکایت نہیں "نہیں" سردی کی وجہ سے ابھی نہیں کی۔ لیکن اب ہم اسکے خلاف عرضی دینگے۔" ایک تیسرے شخص نے بھی جس کا کھیت سال ہوا کھودا گیا تھا۔ اور اس کے بدلے کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ ابھی تک شکایت نہیں کی تھی۔ اس نے کہا کہ ٹھیکہ دار نے مجھے یہ دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے واجبات کے لئے زیادہ زور دیا تو میں تمہارا نام پولیس میں بدمعاشوں کی فہرست میں درج کرا دونگا۔ بلاشبہ ایک فضول دھمکی تھی۔ لیکن دیہاتی کے لئے منحوس امکانات سے پُر تھی۔ اس لئے اس نے یہی بہتر سمجھا تھا کہ وہ اس کے خلاف کچھ نہ کہے اور اپنے بیل لائے اور زمین کو ہموار کرلے۔ جب آدھا کھیت باقی نصف کی نسبت ایک فٹ گہرا کھدا ہوا ہو تو یہ آسان کام نہیں۔ ملتان کے قریب میں نے بیلوں کی آٹھ جوڑیوں کو اس کام پر لگے ہوئے دیکھا۔

ملا لوگ :- راستے میں میں نے ایک گاؤں میں ایک لڑکے کو ایک تعویذ پہنے ہوئے دیکھا جو اسے ایک پیر نے دیا تھا۔ جو ہر سال مکہ شریف سے وہاں آتا تھا۔ وہ اندھیرے سے ڈرتا تھا۔ لیکن تعویذ کے طفیل اب نہیں ڈرتا تھا۔ گاؤں کا ملاّ دیہاتی زمیندار تھا۔ اور انبالہ کے اُس دیہاتی کیطرح جو ضرب خوردہ ٹانگ کی وجہ سے ملاّ بن گیا تھا۔ وہ بھی ملاّ بن گیا تھا۔ کیونکہ اس کی آنکھیں اسے کھیتوں میں کام کرنے سے مانع تھیں۔ ممکن ہے۔ بعض خیال کریں کہ اچھی آنکھیں قران شریف پڑھنے کے لئے بھی اتنی ہی ضروری ہیں۔ جتنی کہ زمین کاشت کرنے کے لئے۔ لیکن یہ بات نہیں ہے۔ قران شریف پڑھنے کے لئے۔ محض اتنا ہی ضروری ہے۔ کہ اس کی عربی عبارت حفظ کرلی جائے۔ اور اپنے آپ کو حافظ کہلوایا جائے۔ اور ملاّ نے اُسے حفظ کیا ہوا تھا۔ اسے پڑھنا اور سمجھنا بھی یہ ایک مزید خوبی ہے۔ جس کو ضلع بھر کے ملاّوں میں سے معدودے چند نے (زیادہ سے زیادہ ایک فیصدی) حاصل کرنے کی تکلیف اٹھائی ہے۔ اس سے آگے شمال میں میانوالی

بھی یہی حال۔ بیکانیر کا ایک سید مجھے بتاتا ہے۔ کہ اس تحصیل کے تمام حصے میں صرف پانچ ملا ہیں۔ جو اپنی فہم و دانائی سے قران شریف کی تفسیر کر سکتے ہیں۔ کسی زمیندار کو ملا کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے دیکھا۔ مقابلتاً کمیاب ہے۔ کیونکہ ایک عام کاشتکار کے پاس سوائے اپنے کھیتوں کے اور کسی چیز کے لئے نہ وقت ہے۔ اور نہ توجہ وہ ہر دوسری چیز گاؤں کے سوداگر یا کمیں کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ ملا اور دایہ عام طور پر ادنےٰ درجے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور مغربی پنجاب میں ملا عام طور پر جلاہا ہوتا ہے۔ اور دایہ اکثر جلاہے کی بیوی۔ اسکے باوجود ملا کا بڑا اثر ہے۔ لیکن بعض اوقات برا ہوتا ہے۔ جتنا کوئی جنوب کی طرف جائے۔ اثر بڑھتا جاتا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ برا ہوتا جاتا ہے۔

پرانا معیار زندگی:۔ شام کو ہم کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے بلوچوں کے ایک گاؤں میں پہنچے۔ جسے صرف کھجور کے درختوں کی ایک جھالر ویران ریتلی پہاڑیوں سے جدا کرتی تھی۔ عام طور پر ریت اور کھجوروں کی موجودگی معیار زندگی کے پست ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ یہاں یہ اس قدر پست ہے۔ کہ اس دورے میں میں نے کسی چیز کا معیار اتنا گرا ہوا نہیں دیکھا ہمارے بیٹھنے کے لئے لکڑی کے دو سادہ پلنگ مشکل سے دستیاب ہوئے۔ اور ان میں سے ایک معمولی جسم کے زمیندار کے بوجھ سے تڑاخ سے ٹوٹ گیا۔ ان پچیس ممبروں میں سے جو وہاں موجود تھے۔ پانچ صرف ایک قمیص پہنے ہوئے تھے۔ حالانکہ تمام کے تمام زمیندار تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس ۳۰ ایکڑ زمین تھی۔ میں نے دریافت کیا۔ "کیا تمہارے پاس صندوق میں کوئی اور قمیص نہیں رکھا ہوا" اس نے طنز آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ میرے گھر میں صندوق ہی کہاں ہے۔ اور بعد میں جب ہم نے کئی گھروں کو دیکھا۔ تو ہمیں ایک بھی ٹرنک یا صندوقچہ نظر نہ آیا۔ قیاس غالب ہے۔ کہ وہاں ضرور کچھ ہوں گے۔ لیکن زیادہ نہیں ہو سکتے۔ اور نہ ہی یہاں انہیں ملتان اور جھنگ کی طرح سمایا جا سکتا ہے۔ جن گھروں کو ہم نے دیکھا ان اندرونی حصے معیار زندگی کے نہایت پست ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ ان کی رہائش پرانے زمانے کے کسانوں کی طرح تاریک۔ غبار آلود اور وحشیانہ ہے۔ وہ کمرہ جسمیں صدر رہتا تھا۔ اس قدر تاریک تھا۔ کہ میں کچھ نہ دیکھ سکتا تھا۔ اور اس آگ کے دھوئیں سے جو اس کا کھانا پکا رہی تھی۔ اتنا بھرا ہوا تھا۔ کہ میں اپنی آنکھیں مشکل سے کھلی رکھ سکا۔ کسی گھر میں بھی دھات کے برتن نہ تھے۔ اور کوئی سامان ایسا نہ تھا جو انشد ضروریات

میں سے نہ ہو۔ اگرچہ قرضہ زیادہ نہ تھا۔ (تقریباً ۱۰ روپے فی کس) لیکن آئے دن کی غارتگری کی داستان یہاں بھی پیش پیش تھی۔ ایک شخص نے جو ۵ ایکڑ زمین کا مالک تھا۔ گذشتہ سال کی فصل میں سے صرف ۵ من گیہوں حاصل کئے۔ ایک اور شخص کے پاس جو ۴ ایکڑ زمین کا مالک تھا۔ ۲۰ من میں سے صرف ۴ من باقی چھوڑی گئی۔ تیسرے کے پاس جو ایک ایکڑ کا مالک تھا۔ ۱۲ من میں سے صرف دو من باقی رہنے دی گئی۔ یہ تینوں مثالیں اتفاقیہ طور پر منتخب کی گئی تھیں۔ اپنی روزی بڑھانے کے لئے اکثر میر کنجھر کی سڑک پر اپنے پڑوسیوں کے کھیت کھودنے کا کام کرتے ہیں۔ ان کو دو وقت کا کھانا دیا جاتا ہے۔ لیکن جوار باجرہ وغیرہ اور نئے قسم کے غلوں پر گذارہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ انہیں ساگ دیا جاتا ہے۔ جو یہاں شلغم کے پتوں کا پکایا جاتا ہے۔ چاول بھی کھانے میں آتے ہیں۔ لیکن گھی یا گیہوں نہیں ملتی۔ وہ لوگ جو گھی بناتے ہیں۔ فروخت کرتے ہیں۔ اس احمقانہ سوال نے کہ آیا وہ گوشت بھی کھاتے تھے۔ یا نہیں۔ ان سے منطقیانہ جلا بھنا جواب نکلوالیا۔ جب ہم گیہوں ہی نہیں کھاتے تو گوشت کیسے کھا سکتے ہیں۔ تین یا چار آدمی چند مرغیاں پالتے ہیں۔ لیکن انڈے کوئی نہیں بیچتا۔ عوام کی غربت کی ایک معمولی مگر نمایاں علامت یہ تھی۔ کہ انہوں نے اپنے پیر کو جو حال ہی میں ان کے پاس آیا تھا۔ حسب معمول روپیہ دینے کی بجائے ۲ آنے فی کس دئے تھے۔ میرے عملے کا بیان ہے۔ کہ یہ گاؤں تحصیل میں اپنی مثال آپ ہے۔

جب ہم کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے واپس ہوئے تو سلیمان کی پہاڑیاں جنہیں ہم نے سب سے پہلی مرتبہ آج کی صبح دیکھا تھا۔ غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی روشنی میں صاف اور نیلی چمک رہی تھیں۔ اگرچہ اونچائی خوبصورتی اور شہرت کے لحاظ سے ان کا مقابلہ ہمالیہ پہاڑ سے نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس احساس کی وجہ سے جو وہ سرحد اور اس کے پرے کے علاقے کے متعلق پیدا کرتی ہیں۔ وہ زیادہ افسانوی جوش دلانے والی ہیں۔

(۱۱ میل)

۶ فروری کنجھر سے جہتم

دریائے سندھ کی وادی :۔ آج ہم نے دریائے سندھ کو عبور کیا جو مغربی پنجاب کی شاہراہ ہے۔ ایک بجے تیز دھوپ میں (گذشتہ ہفتہ کی سخت سردی ختم ہو گئی ہے)

روانہ ہو کر ہم نے باقاعدہ کاشتکاری کو بہت جلد پیچھے چھوڑ دیا۔ لیکن کبھی کبھی ہم کسی چلتے ہوئے رہٹ کے پاس سے گذرتے تھے۔ جس کے آس پاس ایک یا دو گھروں کے احاطے ہوتے تھے۔ پہلے پہل یہ کیچڑ سے لپی ہوئی دیواروں اور پھوس کے چھت بنے ہوئے تھے۔ لیکن جوں جوں ہم دریا کے پاس پہنچے یہ سراسر جھاڑیوں اور دریا کے کنارے اگی ہوئی گھاس کے بنے ہوئے تھے۔ کنجھر کے قریب ہم ایک گھر میں ایک جاٹ سے ملے جسکے پاس ۱۵ ایکڑ زمین تھی اور ۴۰۰ روپیہ کا مقروض تھا۔ اس نے آم کے آٹھ درخت ایک قطار میں لگائے ہوئے تھے۔ لیکن افسوس کہ پالے نے پانچوں کو مار دیا تھا۔ اس کا ایک کمرے والا گھر صاف تھا۔ لیکن کل کے گھروں کی طرح اسمیں کوئی چیز ایسی نہ تھی۔ جس سے افراط کی بو آتی ہو۔ یہاں تک کہ کوئی دھات کا برتن بھی نہ تھا۔ غلے کی کوٹھیاں خالی تھیں۔ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح وہ بھی کھانے کے لئے باجرہ خریدتا تھا۔ اس کے پاس بیلوں کی جوڑیاں دو تھیں۔ لیکن قمیص صرف ایک۔ اس کے گھر کی چھت اور گھاس کی تہ لگی ہوئی ٹوکریاں خود ساختہ تھیں۔ لیکن شاخوں سے بنی ہوئی ٹوکریاں خریدی ہوئی تھیں۔ ایک اور غیر ضروری خرچ یہ تھا۔ کہ وہ ساہوکار کو غلہ تولنے کے لئے ایک سیر فی من دیتا تھا۔ جسے وہ خود بھی اچھی طرح تول سکتا تھا۔

ہم ایک ٹاپو کے کوئیں پر پہنچے جہاں ایک مزدور کی مدد سے کاشت کی جا رہی تھی۔ اور دریافت کیا کہ آخرالذکر کو کیا ملتا ہے۔ جواب ملا کہ ایک من غلہ فی ماہ۔ (تقریباً ۵ روپیہ کی قیمت کا)، اور سال کے آخیر میں حسب معمول ایک کمبل اور ایک جوتوں کا جوڑا۔ دریا کی دوسری طرف شرح زیادہ تھی۔ (۱½ من)

کل ایک پرانے اخبار میں یہ پڑھ کر کہ لوگ اپنے اونٹوں کو بیماری سے محفوظ رکھنے کیلئے سال میں ایک مرتبہ کسی خانقاہ پر فیض یابی کے لئے جاتے ہیں۔ میں نے پہلے اونٹوں والے سے دریافت کیا کیا تم ایسا کرتے ہو۔ اس نے کہا "ہاں" میں نے ان کو پیر کے پاس لے جاتا ہوں اور اُسے ایک روپیہ دیتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ رواج مظفرگڑھ اور ڈیرہ غازی خان دونوں میں عام ہے۔ مویشیوں کو بھی لے جاتے ہیں۔ اور جب ایسا کیا جاتا ہے۔ تو شام کا تمام دودھ پیر کو دیا جاتا ہے۔ ڈیرہ غازیخاں کا حال ہی کا ایک ڈپٹی کمشنر بیان کرتا ہے۔ کہ اس نے ایک مرتبہ

مویشیوں کے ایک گلے کو مری سے حفظ ماتقدم کے لئے ایک خانقاہ کی طرف فیض یابی کے لئے لیجاتے دیکھا۔ میں نے چرواہوں سے ملائم الفاظ میں مناظرہ کرنے کی کوشش کی انہوں نے مجھے بتایا۔ کہ خدا اور اس کے خدمتگذاروں کے طریقے بہت عجیب ہیں۔ مغرب کے لوگ بھی اس قسم کے بیمہ جات سے ناآشنا نہیں ہیں۔ کیونکہ اٹلی میں گھوڑوں اور مویشیوں کے لئے اکثر فیض حاصل کیا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات فرانس میں موٹرکاروں کے لئے بھی۔ اس علاقے کا دوسرا رواج یہ ہے۔ کہ جب مکھن نہیں نکلتا تو یا تو اس مٹکے کے ساتھ ایک تعویذ باندھ دیا جاتا ہے۔ جس میں دودھ بلویا جاتا ہے۔ یا مہانی کے ساتھ۔ اسی طرح جب غلے کے سنہرے گٹھے کھلیان میں ڈھیر کئے جاتے ہیں۔ تو بری روحوں کو دور رکھنے کے لئے تنگلی (بکھیرنے والی چھڑی) میں ایک تعویذ باندھ کر اُسے ہر ڈھیر میں ٹھونسا جاتا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے۔ کہ تمام پنجاب میں ایسا کیا جاتا ہے۔

عبور دریائے سندھ:۔ ہم تین بجے دریا پر پہنچے اور ایک بہت لمبی چوڑی کشتی میں بیٹھے۔ اس کا مہرہ اور پچھواڑہ اونچی اور مربع شکل کا تھا اس شکل کا ہونےکی وجہ سے اسے چار آدمی آگے دھکیلتے ہیں۔ دو دو ہر طرف اور سب کے پاس اتنے لمبے بانس تھے۔ جو ہر بڑے دریا کی گہرائی تک پہنچنے کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ وہ کشتیاں جن میں سکندر کی گھر کی یاد نے ستائی ہوئی فوج گھر کی طرف پہلا قدم اٹھایا ضرور ایسی ہی ہوں گی۔ ٹٹوؤں کو کشتی پر چڑھنے کے لئے دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ اٹھارہویں صدی کے ولایتی گھاٹوں کی طرح اس مقصد کے لئے کوئی ترکیب نہ تھی۔ اور ہمیں بقول ایک انگریز اہل قلم کے سزا دینے کی ناپاک حرکت کی طرف اقدام کرنا پڑا یہاں تک کہ وہ اچھل کر چڑھ گئیں۔ اور چونکہ کشتی کنارے کے بالکل نزدیک نہ آ سکتی تھی۔ میری گھوڑی دریا میں تقریباً گرتی پڑتی گئی۔ ہم آگے چل پڑے اور آدمیوں کو دل لگا کر کام کرنا پڑا۔ کیونکہ پہلے ہمارا راستہ دریا کے بہاؤ کے خلاف تھا۔ ان کے رہبر نے کہا آؤ اللہ کا نام لیں۔ اور انہوں نے ترنم آمیز نعرے لگائے۔ اللہ ہو بھی اللہ یا پیر مدد اور پھر وہی نعرہ مارا "مدد پیر مدد" مویشیوں کی گھنٹوں کا بھاری ہم آہنگ سرود اگلے کنارے سے پانی کی سطح سطح کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا۔ اور ایک اور مربعہ مہرے والی کشتی معہ اپنے مستطیل بادبان کے جو اس کے اکیلے

مستولوں پر پھیلا ہؤا تھا۔ ایک بہت بڑے سفید پروں والے پرندے کی طرح دریا میں نیچے کیطرف پھسلتی ہوئی آئی یہ ایک عمدہ نظارہ تھا۔

تعلیم اور مذہب :- ہمیں پار جانے میں نصف گھنٹہ سے زیادہ وقت لگا۔ اور یہ وقت ہم نے پردہ۔ ملاؤں۔ اور پیروں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے گذارا۔ کیا بہت سے ملاں قرآن شریف کی تفسیر کر سکتے ہیں۔ ان نمبرداروں میں سے جو ہمیں ملنے کیلئے آئے تھے۔ ایک نے کہا کہ یہ کام بڑے مولویوں کا ہے۔ ان بڑے مولویوں میں سے بعض لاہور سے اور بعض کہیں اور سے آتے ہیں۔ اور مسلمانوں کو حکم دیتے ہیں۔ کہ وہ ہندوؤں سے نہ کھانے کی چیزیں لیں اور نہ پینے کی۔ اسی طرح ہندو پرچارک بھی آتے ہیں۔ اور ہندؤں کو مسلمانوں سے قطع تعلق کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ یہ بات یہاں تین یا چار سال سے شروع ہوئی ہے۔ لیکن شہروں میں یہ دس بارہ سال ہوئے۔ کہ شروع ہوئی تھی۔ جب مسلمانوں نے ہندؤں سے پانی لینا چھوڑ دیا تھا۔ تمام اس امر پر متفق تھے۔ کہ یہ تبدیلی تعلیم یافتہ طبقے کی مثال اور اثر کا نتیجہ تھی۔ اور جب میں نے یہ دریافت کیا کہ دنیا کے اس حصے میں کیا کیا جاتا ہے۔ تو ایک نے جواب دیا "جاہل لوگ پیتے ہیں" یہ بات کہ پڑوسی سے پانی کا ایک پیالہ لے لینا جہالت کی نشانی ہے۔ فرشتوں کو بھی رلانے کیلئے کافی ہے۔ یہ دیکھ کر کہ بعض کسانوں نے جو ہمارے پیچھے دوسری طرف گرتے پڑتے آرہے تھے۔ کھانے اور پینے دونو کی چیزیں ہندوؤں سے خریدیں۔ ہمیں کچھ اطمینان ہؤا۔ اور نیز یہ کہ مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازیخاں کے پسماندہ ضلعوں میں ہندو و مسلمانوں کے دولت مند گھرانے اب بھی ایک دوسرے کو اپنی شادیوں پر دعوت دیتے ہیں۔ نمبرداروں میں سے ایک نے کہا کہ میری شادی پر پندرہ یا سولہ ہندو آئے تھے۔ اور میرے عملے کے ایک رکن نے جو میانوالی کا رہنے والا ہے۔ یہ کہا کہ ہمارے ہاں یہ بات یہاں کی نسبت زیادہ عام ہے۔ پردے کے متعلق سب نے اتفاق کیا کہ یہ اچھی چیز ہے۔ لیکن انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ آزادانہ گھرانوں کی لڑکیاں بعض اوقات پردہ دار گھروں میں بیاہی جانے سے انکار کر دیتی ہیں۔ دو ایک روز گذرے ایک مولوی صاحب نے جو یہ وعظ کرتے پھرتے ہیں۔ کہ عورتوں کو پردہ کرنا چاہیئے۔ اور دوکانوں پر جا کر خریداری کرنی چھوڑ دینی چاہیئے۔ یہ کہا کہ گذشتہ چند سال سے عورتوں کو مسجد۔ امام باڑہ۔ یا مجلس میں جانے

کی اجازت نہیں دی گئی۔ لیکن ان کے لئے خاص انتظامات کر دئے گئے ہیں۔ وہ شیشہ جس میں سے نئی تہذیب کی روشنی چھن کر آتی ہے۔ بہت سے رنگوں کا ہے۔
زمین پر اترتے ہی ہم نے اپنے آپ کو سرکنڈوں والے علاقے میں پایا۔ جو مغرب کی طرف گھاس کے ایک تختے کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ صرف کہیں کہیں سرسوں اور گیہوں کے کھیت اس کی یکسانی کو توڑ دیتے تھے۔ ان کھیتوں میں نیم خانہ بدوش لوگوں نے اپنے کوئیں اتارے ہوئے تھے۔ اور جھونپڑیاں بنائی ہوئی تھیں۔ یہ ڈیرہ غازیخاں کا ضلع تھا۔ مئی سے لے کر ستمبر تک اس علاقے کا اکثر حصہ پانی میں غرق رہتا ہے۔ اور یہ اس وقت نہایت خوش نما نظر آتا ہے۔ جب سنہری گھاس میں پھول کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور سفید پھلکے نما لہریں ہر تنے کے ساتھ ساتھ میلوں تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔

ایک فلاکت زدہ گاؤں :۔ اس سے پہلے کہ ہم دور سے نظر آنے والی کھجوروں کی اس جھالر تک پہنچیں۔ جس سے مستحکم آبادی کا پتہ ملتا تھا۔ سورج بادلوں میں چھپ گیا۔ چند میل آگے دو پنچوں کے ممبر ہمیں آموں کے باغ میں ملے۔ جلد ہی اندھیرا اتنا ہو گیا۔ کہ رجسٹر اور کتابیں نہ دیکھی جا سکتی تھیں۔ پس اس کی بجائے ہم نے باتیں کیں۔ تیس موجودہ ممبروں میں سے تقریباً نصف جاگیردار تھے۔ لیکن کسی کے پاس ۲۵ ایکڑ سے زیادہ زمین نہ تھی۔ چونکہ چاولوں کی فصل خراب ہو گئی تھی۔ اس لئے تقریباً سب ممبر کھانے کے لئے غلہ خریدتے تھے۔ اور ادھار لیتے تھے۔ جو باجرہ اب لیا گیا تھا۔ اس کے ہر من کے بدلے مئی میں ۱½ من گیہوں دینی تھی۔ یہ ایک ایسا سمجھوتہ ہے۔ کہ جس میں اگر قیمت کا فرق بھی چھوڑ دیا جائے تو بھی ۶۰ فیصدی سالانہ سود پڑتا ہے۔ یہ انہیں فصل کے موقعہ تک اسی طرح خریدتے رہنا پڑیگا ظاہر ہے۔ کہ وہ گوشت خاص خاص موقعوں پر کھاتے ہیں۔ مثلاً عید کے دن اور گھی اور مکھن شاذ ہی نصیب ہوتا ہے۔ جن کے پاس یہ چیزیں ہیں۔ وہ فروخت کرتے ہیں۔ یا اسے غلے سے بدل لیتے ہیں۔ ہم نے تین آدمیوں سے پوچھا کہ گذشتہ فصل ربیع میں تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ سب سے بڑے زمیندار نے کہا کہ ساہوکار نے میرے ۱۰۰ من گیہوں میں ½ حصہ خود سمیٹ لیا تھا۔ دوسرے شخص کے پاس جو ۱۰ ایکڑ زمین کا مالک تھا۔ ۴۰ من میں سے صرف ۱۴ من ہی رہ گئے تھے۔

اور تیسرے شخص نے کہ وہ بھی ۱۰ ایکڑ زمین کا مالک تھا۔ یہ کہا کہ ۵۰۰ روپیہ کا قرض چکانے کیلئے ہر چیز لیلی گئی ـــــ اور مجھے مقامی نہر پر کام کرنے کیلئے دھکیل دیا گیا۔

(۱۶ میل)

۷ فروری مہتم سے غازی گھاٹ

جاگیردار :۔ کل کے سفر کے بعد کچی سڑک غنیمت معلوم ہوتی تھی۔ اور چونکہ اس میں جا بجا سرکنڈا گھاس اگی ہوئی تھی۔ یہ گھاس ایک خوبصورت منظر بھی پیش کرتی تھی۔ اور سورج کی روشنی میں سونے کی بنی ہوئی سڑک کی طرح نظر آتی تھی۔ جب ہم ڈراما کے نزدیک پہنچے تو آموں کے درخت پھر نمودار ہونے لگے۔ اور یہ ہندو جاگیرداروں کی موجودگی کی علامت تھی۔ اس تحصیل میں چند ہندو اپنے ہاتھ سے کاشتکاری کرتے ہیں۔ لیکن اکثر کھیتی کراتے ہیں۔ اور ہر شخص اس امر کو تسلیم کرتا ہے۔ کہ وہ اس کام کو مسلمان جاگیرداروں سے بہتر طریق پر انجام دیتے ہیں۔ ہر شخص یہ بھی تسلیم کرتا ہے۔ کہ مسلمان جاگیردار جس کے پاس خرچ کرنے کے لئے روپیہ ہوتا ہے۔ عام طور پر اسے اپنی زمین کو ترقی دینے کیلئے نہیں استعمال کرتا۔ بلکہ معمولی آدمیوں کی زمینیں خریدنے پر صرف کرتا ہے اس الزام کے متعلق میں نے انبالہ میں بھی سنا تھا۔ ایسے لوگوں کے لئے ایکٹ انتقال اراضی کا فروخت زمین پر پابندیاں عائد کرنا ایک غیبی امداد ہے۔ جاگیردار بہ حیثیت جماعت نہ مظفر گڑھ میں اور نہ ڈیرہ غازی خان میں اچھی شہرت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے جو مجھے آج ملنے کے لئے آئے ایک نے قرب وجوار کے جاگیرداروں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ سب گلا گھونٹنے والے ہیں۔ ان لوگوں میں سے اکثر نے جنہوں نے اس ہفتے کے دوران میں اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ اپنے فیصلوں میں سختی سے کام نہیں لیا۔ البتہ اچھے جاگیردار بھی ہیں۔ چند روز ہوئے ہم ایک سے ملے تھے۔ اور ڈیرہ غازی خاں میں بھی کئی ایک کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اور وہ صرف چند ہیں۔ اور دور دور ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ صرف ۵ فیصدی ایسے ہیں۔ جو کسی طرح کا بھی اپنے مزارعین پر تشدد نہیں کرتے۔ مثلاً پیداوار کی تقسیم کے وقت اپنے حصہ سے زیادہ نہیں لیتے اپنے گھوڑے ان کے کھیتوں میں چرنے کیلئے نہیں چھوڑتے مہمان کو کھانا کھلانے کے لئے۔ ان کی مرغیوں وغیرہ کو نہیں گھیرتے ان نیک لوگوں کے خلاف جوا نہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ مقدمہ چلا کر۔ . . . . . یہاں تک

وہ واپس آجائیں تنگ نہیں کرتے۔

بعض تو اپنے پڑوسی کو جس کی زمین کو وہ حریصانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ٹھیک وقت پر نہر کا پانی لینے سے منع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور انتہائی عالم یاس میں اسے فروخت کرنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ اور تقریباً تمام پولیس سے اپنی مطلب براری کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ اور ان سے ملے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے قانون سے مخلصی زندگی کا سائنس ہے۔ اس کے برعکس اچھا جاگیردار نہ صرف برائیوں سے بچا رہتا ہے۔ بلکہ اپنے مزارعین کے لئے بھی بہت کچھ کرتا ہے۔ کھانے کیلئے غلہ دیتا ہے۔ اور بغیر سود بیج مہیا کرتا ہے۔ مویشی خریدنے کے لئے پیشگی روپیہ دیتا ہے۔ اس کیلئے گھر تعمیر کراتا ہے۔ (بہت سے جاگیردار ایسا نہیں کرتے) اس کی زمین کے لئے نہر میں سے جس قدر نالیوں کی ضرورت ہوتی۔ بنوا دیتا ہے اس کے جھگڑوں کا فیصلہ کرتا ہے۔ اور عام طور پر اس کی مشکلات پر اسے غالب رکھتا ہے۔ تحصیل لیہ واقعہ مظفرگڑھ میں مسلمان جاگیرداروں نے اپنی زمین کو ترقی دینی شروع کی ہے۔ لیکن اور جگہ سوائے ہندوؤں کے باقی چند لوگ ہی ایسا کرتے ہیں۔ مظفرگڑھ کے ہندو ضلع بھر میں عمدہ ترین کسان ہیں۔ اور ڈیرہ غازی خان اور ملتان میں وہ ترقی کی راہ میں پیش پیش ہیں۔ ان لوگوں میں سے جو مجھے ملنے کے لئے آئے ایک ہندو جاگیردار تھا۔ اس دورے میں زمینداروں کی جس قدر مثالیں میرے دیکھنے میں آئی ہیں۔ ان سب میں وہ اس لحاظ سے پہلی مثال تھی۔ کہ بغیر بھاری قرض کی امداد کے اپنے آپ کو دوسروں کے قرض سے نجات دلوا رہا تھا۔ اس کے باپ نے .... ۲ سے زیادہ قرضہ چھوڑا۔ اور اس نے اب اتنا تھوڑا کیا ہے۔ کہ .... ارہ گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جب انسان قرض سے نجات حاصل کرنے کا تہیہ کرلے تو وہ کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اسے دوسروں پر ایک فوقیت تو یہ حاصل تھی۔ کہ سود کی شرح جو اس نے ادا کرنی تھی کم تھی۔ (صرف چھ فیصدی) لیکن یہ فوقیت اسے لین دین میں اچھا ہونے کی وجہ سے حاصل تھی۔ سوائے اس کے کہ جلکانہ ہر جگہ وضع نہیں کیا جاتا۔ اس نے ساہوکار کے نرخ ناموں اور تمام طریقوں کی تصدیق کی جنکے متعلق اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اور چونکہ ایک ہندو ہندوؤں کے متعلق خبر دے رہا ہے اسلئے اسکی تصدیق وقعت رکھتی ہے۔

پہیر :- اس تثلیث کا ذکر کرتے ہوئے جو دیہات میں فرماں روائی کرتی ہے۔ اس نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ پیر کا اثر ساہوکار و جاگیردار دونوں سے زیادہ تھا۔ اگرچہ دس سالوں میں یہ بہت زیادہ گھٹ گیا ہے۔ ایک افسر نے جو پیروں کے مشہور خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ چند دن ہوئے بالکل یہی بات کہی تھی۔ وہ تیس برس کا ہے۔ اس نے بتایا کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ پیشکش لے کر خاندانی خانقاہ پر آیا کرتے تھے۔ اور ان تحائف میں اکثر سونے اور چاندی کے زیورات بھی شامل ہوتے تھے۔ لیکن اب یہ بات بہت کم ہے۔ اور خاندان کے مرید جن کا شمار کسی وقت دو یا تین لاکھ تھا۔ ۵۰ فیصدی کم ہو گئے ہیں۔ تاہم حال میں جب یہ سلسلہ ملازمت میں خان گڑھ گیا۔ اور لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا۔ کہ میں کون ہوں تقریباً ۵۰ آدمی عورتیں اور بچے جلد جلد جمع ہو گئے۔ اور چاروں طرف بھیڑ کر کے میرے پاؤں چھوئے اور ہر ایک نے تعویذ کے لئے التجا کی۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ میرے عملے کے ایک ایک ممبر نے ایک گاؤں کے دورے میں دو چار پائیوں کے گرد جن پر دو چاٹیوں جیسے پہیئوں والے پیر لیٹے ہوئے تھے۔ دیہاتیوں کو زمین پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے ایک اونٹ یا بھینس کے عطیے کیلئے پکار پکار کر مطالبہ کر رہا تھا۔ اور یہ دھمکی دے رہا تھا۔ کہ اگر دونوں میں سے کچھ نہ دیا گیا تو میں گاؤں کو بددعا دیدونگا۔ لوگ پیر کی بددعا سے اس قدر ڈرتے ہیں۔ کہ انہوں نے اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔ پیر نے پہلے سے بھی ۲۰ او تہشا تین گھوڑیاں۔ چار مرغیاں اور ایک گائے لے رکھی تھی۔ آج بینک کے معائنے کے موقعہ پر ایک بوڑھا ڈاڑھی والا پیر موجود تھا۔ وہ ایک روئی دار ٹوپی اور پیلے رنگ کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ جن پر نیلے پھول تھے۔ پیری مریدی کے کام سے وہ نہایت خوش معلوم ہوتا تھا۔ آخری مرتبہ جب وہ دورے پر گیا تھا۔ تو حسب معمول مال غنیمت لیکر واپس آیا تھا۔ اس کی مقدار خراب فصل کے موقعہ پر ۲۰۰ روپے اور اچھی فصل کے موقعہ پر پانچ سو یا چھ روپیہ فی سال تک مختلف ہے اس کے تقریباً ۲۰۰ مرید ہیں۔ اور وہ سال میں ایک مرتبہ ان کے ہاں جاتا ہے۔ اس کے گاؤں میں دس یا بارہ اور پیر ہیں۔ جو اسی طرح گزارہ کرتے ہیں۔ وہ کثرت سے تعویذ دیتا ہے۔ زیادہ اس لئے کہ لوگوں کے بیٹے پیدا ہو جائیں۔ نظر بد سے محفوظ رکھنے کے لئے اور جن اُتارنے کے لئے۔ زیادہ سرکش جنوں کی صورت میں وہ

چولہ گرم کرتا ہے۔ لیکن یہ اسے کبھی استعمال کرنی نہیں پڑی ہے۔ اسے گرم سرخ دیکھتے ہی سرکش جن ڈر کر بھاگ جاتا ہے۔ بعض عورتیں جنوں کا بہانہ کرتی ہیں۔ تاکہ اسے سالانہ میلوں میں لے جایا جائے۔ یا وہ کسی خانقاہ کی ناجائز مجلس میں شرکت کر سکیں۔ ایسی عورتوں کا علاج وہ لاٹھی اور گھونسوں سے کرتا ہے۔ آخری جن نکالے ایک سال ہوگیا ہے۔

ایک مشہور خانقاہ :۔ چند میل کے فاصلے پر مسلمانوں کی مشہور خانقاہ سخی سرور ہے۔ جہاں ہندو بھی اُسی آزادی سے جاتے ہیں۔ جس سے کہ مسلمان۔ بعض اوقات ثواب حاصل کرنے کیلئے امرتسر سے لاہور تک پیدل جاتے ہیں۔ میرے عملے میں سے ایک شخص نے کہا کہ سالانہ میلے کے تحائف میں سے ۱۶۰۰ آدمیوں نے حصہ لیا۔ اس قدر تعداد پر شبہ کرتے ہوئے میں نے ایک شخص سے جسے ہم سب سے پہلے ملے دریافت کیا کہ تعداد کیا تھی۔ اس نے فوراً کہا سولہ سو۔ اس سے قبل میں نے یہ بات اس ضلع کے اخبار میں بھی پڑھی ہے۔ اسمیں لکھا ہے۔ کہ جب خانقاہ کے اصلی متولیوں کی اولاد بڑھنی شروع ہوئی تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ سالانہ میلے کے تحائف میں سے ۱۶۵۰ سے زیادہ کو حصہ نہ پہنچے۔ اسی لئے ان کو ۱۶۵۰ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اور ان کی نسل کے زائد لوگ باری باری میلے سے غیر حاضر رہتے ہیں۔ اور پیری مریدی کے شغل سے روزی تلاش کرکے اپنی غیر حاضری کی تلافی کرتے ہیں۔ ۱۶۵۰ مقبول لوگوں میں تقسیم برابر برابر کی جاتی ہے۔ اور بچے کو بھی اتنا ہی حصہ ملتا ہے۔ جتنا کہ بڑے کو۔ میلے کے بعد اس نسل میں سے توانا لوگ اپنے مریدوں سے ملاقات کرنے کے لئے تمام پنجاب میں پھیل جاتے ہیں۔ اور فقرا کے گروہ میں طوفان سے آتے ہیں۔

فقرا :۔ جیسا کہ اس روزنامچہ سے ظاہر ہے۔ پنجاب بھر میں وبالِ جان ہیں۔ یہاں مغربی پنجاب میں وہ پلیگ ہیں۔ جب فصلیں کاٹ لی جاتی ہیں۔ تو ہر سڑک پر وہ کھلیانوں کی طرف لپکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میرے عملے کا ایک ممبر بیان کرتا ہے۔ کہ ایک مرتبہ میں اپنے دورے کے دوران میں پانچ گھنٹے ایک کوئیں پر ٹھہرا تیرہ یا چودہ فقیر وہاں آئے اور ہر ایک کو کچھ نہ کچھ ملا۔ اسطرح سے اندازہ کیا جائے۔ تو ہر ایک فقیر ہر فصل کے موقعہ پر پندرہ یا سولہ من غلہ جمع کر لیتا ہے۔ فقیر اور پیر دونو الفاظ اکثر مترادف استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان کی ساری طاقت یہ ہے۔ کہ وہ

بددعا دے سکتے ہیں۔ سادہ لوح لوگ اس سے بہت خوف کھاتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ سید سے دبتے ہیں کیونکہ وہ اسے پیغمبر کی نسل سے خیال کرتے ہیں۔ ضعیف الاعتقاد لوگوں پر ایک بھنگی تک بھی قابو رکھتا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ سید مجھے بتاتا ہے۔ کہ میں نے ایک مرتبہ ملتان کی گلیوں میں ایک بھنگی کو یہ دھمکی دے کر بھیک مانگتا ہوا دیکھا۔ کہ اگر مجھے کوئی کچھ نہ دیگا۔ تو بددعا دونگا۔ وہ اپنی انگارے جیسی سرخ آنکھیں پھرا پھرا کر کہتا تھا۔ کہ میں۔ نے ایک لوہار کی بیوی کو بددعا دی تھی۔ اور وہ مر گئی تھی۔ اس کی قبر اس کے بعد بھی سات برس تک جلتی رہی تھی۔ لوگ بہت زیادہ خوفزدہ ہوکر دے دیتے تھے۔ مغربی پنجاب میں اور شاید صوبے بھر میں کیا پیر کیا برہمن اور کیا فقیر سب کی وجہ سے کسان پر مذہب کی مفروضہ مجبوری سے جس قدر بوجھ پڑتا ہے۔ وہ ضرور دوسرے لگان کے برابر ہوجاتا ہوگا۔ یہ ایک مذہبی معاملہ ہے۔ جس نے غلط پہلو اختیار کرلیا ہے۔ کسی نے اس کی اتنی تحقیر نہ کی ہوگی۔ جتنی کہ بانئ اسلام نے آنحضرت نے یوں ارشاد فرمایا ہے۔ کہ تم میں سے ہر ایک کے لئے بہ نسبت اس کے کہ بھیک مانگے یہ بہتر ہے کہ وہ رسی لے اور اپنی کمر پر لکڑیوں کا گٹھا لائے اور اسے بیچے اور پھر فرمایا ہے۔ کہ بھیک مانگنا ایسی خراشیں اور زخم ہیں۔ جن سے انسان اپنے چہرے کو زخمی کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ کسان کی ہر امید اور ہر ڈر سے مذہب کا نام لیکر فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ دغابازی لاف زنی اور جان ومال کی حفاظت کیلئے روپیہ دینے کا دستور ہے۔ یہ دیکھ کر ہر شخص یہ خیال کرے گا۔ کہ اس کی نظیر دنیا کے کسی ملک میں نہیں مل سکتی۔

وہ جگہ جہاں ہم نے دن گذارا ڈراما کہلاتی ہے۔ یہ ڈیرہ غازی خان کا پرانا نام ہے کسی زمانے میں یہ معہ اپنے باغات اور کھجوروں کے پنجاب کا سب سے زیادہ دلفریب مقام تھا۔ لیکن اب ان متروک بنگلوں اور دفتروں کا شکستہ ڈھیر ہے۔ جو اس وقت چھوڑ دئے گئے تھے۔ جبکہ دریائے سندھ نے شہر کو بہا کر لے جانا شروع کردیا تھا۔ شام کو ہم دریا کی دوسری طرف غازی گھاٹ اور ریلوے کے صدر مقام کی طرف روانہ ہوئے۔ اور ایک مرتبہ پھر سوار ہوکر ایسی سڑک پر چلے جس پر جا بجا سنہری گھاس اُگی ہوئی تھی۔ ہم نے دریائے سندھ کو پھر عبور کیا۔ یہاں اہم کشتیوں کے ایک پل کے ذریعے جو ۵۰۰ فٹ گز چوڑا تھا۔ سورج کوہ سلیمان سے

اوپر سے سنہری روشنی کے شعلے پھینکتا ہُوا غروب ہو رہا تھا۔ اور بڑے دریا کی سطح بوقلموں ریشم کی طرح چمک رہی تھی۔ مجھے اس خیال سے خوشی ہوئی۔ کہ میرا رزق ہندوستان میں لکھا گیا تھا۔ ہم جھٹ بیڑے میں سوار ہوکر غازی گھاٹ سے چلے اور لائل پور سے لے کر ۲۴۲ میل کے سفر کی آخری منزل تسلی بخش طریق سے انجام کو پہنچی۔

باب یازدہم

اٹک

جاگیردار اور مزارع - ثالثی اور مُلّا

۱۰ فروری بسال سے کندہ

نقشہ مکمل طور پر بدل گیا ہے۔ اور اب میں پنجاب کے شمال میں اتنا ہی دور ہوں۔ جتنا کہ پنجاب کے جنوب میں گوڑگاؤں میں تھا۔ گذشتہ رات میں ۲ بجے صبح بسال پہنچا اور آج صبح ناشتہ کے بعد پنجاب کے شمال مغرب کو نئے کیطرف سوار ہوکر چل دیا۔

دریائے سندھ اور کالا چٹا کی پہاڑیوں کو اپنے پیچھے چھوڑ کر ہم نے اپنا راستہ اونچی شکستہ زمینوں میں سے اختیار کیا جن میں کاشتکاری پھیلی ہوئی اور آبادی کم تھی۔ اگر بارش (۲۵ ا انچ، جنوب مغربی پنجاب کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ لیکن سرسبزی کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ کیونکہ نہر کوئی نہیں ہے۔ اور کنواں بھی مشکل سے کہیں نظر آتا ہے۔ آم اور کھجور کے ثمردار درخت معدوم ہیں۔ اور ان کی جگہ کیکر اور بیر کے پست قد درختوں نے لے لی ہے۔ پتھر کثرت سے ہیں۔ اور چٹانیں اور نالے چھوٹے چھوٹے کھیتوں کو توڑ ڈالتے ہیں۔ ایسے علاقے میں کافی وسائل کے بغیر کوئی آسودہ حال نہیں بن سکتا۔ تلہ گنگ میں جو اس ضلع کی ایک تحصیل ہے۔ ۱۴ ایکڑ زمین ایک کنبے کے گذارے کے لئے مشکل سے کافی ہو سکتی ہے۔ اور غالباً آرام سے گذارہ کرنے کے لئے انہیں اس سے دوگنے رقبے کی ضرورت ہوگی۔ دراصل زمین کا زیادہ حصہ جاگیرداروں کے قبضے میں ہے۔ اور مزارعین اس کی کاشت کرتے ہیں۔ اور تقریباً سب لوگ جو مجھے بسال اور کندہ دونوں جگہوں میں آج ملنے کیلئے آئے جاگیردار تھے۔ ان کی اطلاعات کا خلاصہ مندرجہ ذیل طریق پر درج کیا جا سکتا ہے:-

مزارعین :- تا وقتیکہ مزارعین ایک ایسے گاؤں میں نہ ہوں۔ جو ایک ہی جاگیردار کے پاس ہو۔ وہ اپنی زمینیں ہر چار یا پانچ سال بعد بدلتے رہتے ہیں۔ پہلی صورت میں ایک کنبہ پشتوں تک زمین میں کاشتکاری کر سکتا ہے۔ کیونکہ تبدیلی کا مطلب یہ ہے۔ کہ گاؤں چھوڑ دیا جائے۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے۔ جسے ہر ایک دیہاتی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ تمام اس امر پر متفق تھے۔ کہ متواتر تبدیلی زمین کے لئے بری ہے۔ اتفاقیہ آنے والا مزارع غالباً چبوترے نما کھیت بنانے میں زیادہ وقت صرف نہیں کرے گا۔ لیکن سب نے یہ تسلیم کیا۔ کہ ہم اس کا انسداد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ مزارعین کی کمی ہے۔ اور سب مزارع اچھی زمین چاہتے ہیں۔ سب بہتر زمیندار کے طالب ہیں۔ اور جاگیردار کے مابین یہاں بھی اتنا ہی فرق ہے۔ جتنا کہ اور کہیں بعض مثلاً تندا کے گردونواح میں خاصے ہیں۔ لیکن جنوب مغربی علاقے کے جاگیرداروں کی طرح بہت سے ایسے ہیں۔ جو اپنے مزارعین سے جتنا کچھ روپیہ لے سکتے ہیں۔ لے لیتے ہیں۔ پرانے اچھے دنوں میں جبکہ فیوڈل طریق کا رواج تھا۔ لگان کی رقم مالیات کے کاغذات میں درج نہ کی جاتی تھی۔ بلکہ رواج کے مطابق مقرر کی جاتی تھی۔ یہ عام طور پر شادی کے موقعوں پر کیا جاتا تھا۔ جبکہ مہمانوں کے بڑے بڑے مجمع بھیڑوں بکریوں مرغیوں چارہ اور لکڑی کے تحائف اس سے زیادہ پیش کرتے ہیں۔ جتنے کی عام طور پر ضرورت ہوتی تھی۔ اگر جاگیردار ایک دوسرے کے مزارعین کو کسی خاص مزارع کو لینے کی غرض سے نہیں۔ بلکہ کسی خاص پڑوسی کو تنگ کرنے کی نیت سے پھانسنے کی متواتر کوشش نہ کرتے رہیں۔ تو وہ اپنے کھیتوں کو بہت کم تبدیل کریں۔ اس لحاظ سے شاید جاگیرداروں کے آپس کے تعلقات ان کے اور ان کے مزارعین کے تعلقات کی نسبت کم خوشگوار ہیں۔ مزارعین کی کمی ان کی محافظت پر منحصر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جنوب مغرب کی نسبت یہاں اس سے بہ حیثیت مجموعی اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے۔ کہ وہاں کی نسبت بہت کم جاگیردار قرض میں مبتلا ہیں۔ اس لئے ان کے لئے یہ امر آسان ہے۔ کہ وہ بیج اور خوراک کے لئے اپنے مزارعین کو پیشگی روپیہ دیں۔ اگرچہ اس کے برعکس بھی بعض اہم مثالیں پیش کی گئیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اکثر ایسا کرتے ہیں۔ اور کوئی سود نہیں لیتے۔ خشک سالی کے ایام میں جیسا کہ اب فصل خریف تقریباً مکمل طور پر خراب

رہی تھی) یہ ایک بیش بہا نعمت ہے۔ کیونکہ اسطرح سینکڑوں مزارعین ساہوکار سے
تباہ کن شرح سود پر قرض لینے سے بچے رہتے ہیں۔

جاگیردار:۔ اگرچہ اس ملک کے معیار کے مطابق مزارعین سے بہ حیثیت مجموعی اچھا
سلوک کیا جاتا ہے۔ لیکن اجارہ داری اچھی کاشتکاری کی کمی کو پورا نہیں کرتی سابق
افسر بندوبست لکھتا ہے۔ جب ایک کمزور زمین والا مزارع۔ یہ خیال کرتا ہے۔
کہ اس کو پیداوار کا نصف مالک زمین کو ادا کرتا ہے۔ (یہ کوئی غیر معمولی شرح
نہیں ہے) تو یہ امر ناقابل یقین ہے۔ کہ وہ اس پر زیادہ محنت صرف کرے گا۔ خواہ
وہ ایک ایسا مزارع ہے۔ جس کا زمین پر تصرف ہے۔ یا ایسا جو اپنی مرضی سے
کام کرتا ہے۔ وہ عام طور پر صرف اتنی کاشت کریگا۔ جو اسے نکالے جانے سے بچانے
کے لئے کافی ہو۔ اور وقت کا زیادہ حصہ دوسرے طریقوں سے روپیہ کمانے میں صرف
کرے گا۔ وہ اکثر ایسے کام کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے بہت سے لوگ گاڑیاں
بیل اور گدھے رکھتے ہیں۔ اور کسی نہ کسی کے ذریعے سے سامان لیجا کر منفعت بخش
تجارت کرتے ہیں۔ یہ زیادہ بہتر ہو اگر جرمنی کے بڑے جاگیرداروں کی طرح زیادہ جاگیردار
اپنی زمینوں کا کچھ حصہ خود کاشت کریں۔ ان لوگوں میں سے جو مجھے ملنے کیلئے آئے کوئی
اس طرح نہ کرتا تھا۔ لیکن بعض ایسا کرنے کیلئے غور کر رہے تھے۔ گذشتہ ایام میں ایسا
نہ کرنا اس حقیقت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ کہ ان کے پاس گذارے کے لئے
کثرت سے غلہ ہوتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ انہیں کوشش کرنے کی ضرورت
نہ تھی۔ بعض لوگ مستقبل میں ایسا کرنے کا خیال رکھتے ہیں۔ آؤ اس سے یہ امید
باندھ لیں کہ یہ بیداری کی علامت ہے۔ کسی کسی نے ترقی یافتہ ذرائع بھی اختیار
کئے ہیں۔ ایک نے راجہ ہل خریدا تھا۔ اور دوسروں کے متعلق میں نے یہ سنا کہ وہ
ڈینڈی گیپ میں بارش کے پانی کو حاصل کرنے اور جمع رکھنے کے لئے پشتے باندھے
تھے۔ لیکن ایک شخص نے بتایا کہ اس وقت تک ہمیں اکسانے والا کوئی شخص نہ آیا
تھا۔ چونکہ بنک کے انسپکٹر کو تمام ضلع کی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ اس لئے ہمیں
اس سے ملنے کا موقعہ بہت ہی کم ملتا تھا۔ لیکن اب جبکہ ہر تحصیل میں ایک انسپکٹر
ہے۔ ہم اس سے اکثر ملتے ہیں۔ اور وہ ہمیں ان باتوں کے متعلق بتاتا ہے۔ ان طریقوں
میں کاشتکاری کرنے کے علاوہ جو ان کے پاس پہلے سے ہیں۔ چند ایک جاگیردار کافی

بڑے پیمانے پر نئی زمین خرید تے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک نے اپنے ۳۰۰۰ ایکڑ زمین میں ۲۰۰ کا اور اضافہ کر لیا تھا۔ اور ۵۰ ۴ ایکڑ زمین رہن رکھ لی تھی۔ سوال صرف دلچسپی کا ہے۔ بعینہ یہی واقعات جنوب مغرب میں ظہور پذیر ہورہے ہیں۔ بُری یا بھلی جیسی بھی ہوں۔ ایکٹ انتقال اراضی نے اس طریق کار کیلئے سہولتیں پیدا کر دی ہیں۔ اگرچہ ایسا کرنا اسکے مقاصد میں سے نہ تھا۔

لازمی طور پر سوال یہ پیدا ہُوا کہ آیا بڑے جاگیر دار زیادہ ہیں۔ یا اچھے دو بیتے ججوں نے جاگیرداروں کو اچھے بُرے اور متوسط (نہ اچھے نہ بُرے) میں تقسیم کرتے ہوئے یہ کہا کہ اس تحصیل میں (فتح جنگ) ۱۰ سے ۱۵ فیصدی تک اچھے جاگیردار ہیں۔ اور اسی نسبت سے بُرے ہیں۔ لفظ اچھے سے ان کی مراد ایسے جاگیرداروں سے تھی۔ جو اپنے مزارعین کو پیشگی روپیہ دیتے تھے۔ اور اُن کے ساتھ دوستانہ طریق سے رہتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کی جائدادوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ ممکن ہے۔ کہ دس یا پندرہ فیصدی اچھے جاگیرداروں کیلئے کوئی بہت بڑی نسبت نہ معلوم ہو۔ لیکن یہ کم از کم ہر اس اندازے سے زیادہ ہے۔ جو مجھے مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خان میں دیا گیا تھا۔ کھڑ قوم اس ضلع کی نہایت اہم اقوام میں سے ایک ہے۔ اس کے بہت سے جاگیرداروں کو بُروں کی فہرست میں جگہ دی جاتی ہے۔ اگرچہ اسمیں بے شمار ایسے بھی ہیں۔ جو مستثنٰے کئے جا سکتے ہیں۔ بہت سے لوگ سست آوارہ اور فضول خرچ ہیں۔ اور اپنی زمین میں بالکل دلچسپی نہیں لیتے اور ہر چیز منشیوں کے ذمے چھوڑ دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ مزارعین کے خلاف اکثر جھوٹے مقدمات دائر کئے جاتے ہیں۔ تاکہ پیداوار کو تولتے وقت ان پر دباؤ ڈال کر ان سے زیادہ پیداوار حاصل کیجا سکے۔

اچھا جاگیردار کون ہے؟ پرانے زمانے میں یورپ میں اچھے جاگیردار کی بڑی جانچ یہ تھی کہ وہ اپنے مزارعین کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھتا تھا۔ اور جہاں حملے کا سب سے زیادہ امکان تھا۔ وہیں جاگیرداری کا طریقہ بھی سب سے زیادہ کامیاب تھا انگلینڈ، سکاٹ لینڈ، جرمنی، پولینڈ، روس ورومانیا حدود اسی کی مثالیں ہیں۔ یہی مثال پنجاب میں بھی صادق آتی ہے۔ اور دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ تمام حصے میں جاگیرداروں کے پائے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اور یہ ایک علاقہ ہے۔ جو ہمیشہ سرحد کے حملوں کے لئے کھلا اور وسطی حکومت سے دور ہے۔ محافظت کے

بدرے مزارع ہر وہ کام کرنے کیلئے تیار ہوتا تھا۔ جس کی جاگیردار کو ضرورت ہوتی تھی۔
اور آج بھی بہت کچھ یہی حال ہے۔ اگرچہ متوقعہ محافظت کی اصلیت سراسر مختلف
ہے۔ پرانے زمانے میں جب جسکی لاٹھی اس کی بھینس کا سوال تھا۔ اور ہر شخص دوسرے
سے تلوار یا نیزہ لے کر ملاقات کرتا تھا تو سب سے مضبوط لڑاکا سب سے
بہتر جاگیردار ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ پرکھنے کا اور کوئی معیار نہ تھا۔ لیکن اب جب
کہ سمن، وارنٹ اور مقدمات نے تلوار اور نیزے کی جگہ لے لی ہے۔ اچھے جاگیردار
کا فرض کم واضح ہے۔ جب کوئی مزارع کسی جھگڑے میں الجھا ہوا ہوتا ہے۔ تو خواہ وہ
صورت حال کے مطابق راستی پر ہو یا غلطی پر وہ اب بھی اپنے جاگیردار سے توقع
رکھتا ہے۔ کہ وہ فتح حاصل کرنے یا بدلہ لینے میں ان سب لوگوں سے جن کے متعلق
یہ فرض کیا جا سکتا ہے۔ کہ مقدمے پر ان کا کچھ اثر پڑیگا۔ ملاقات کر کے یا لکھ کر
اس کی مدد کرے اور اگر گاہے گاہے چھوٹے افسران کو نہایت چوکنا اور رحم اب
وہی کے لئے تیار رکھنے کے لئے دستوری یا فصلانہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو یہ
پیش کن جاگیردار دیتا ہے۔ نہ کہ مزارع مشہور معیار کے مطابق اچھا جاگیردار وہ
ہے۔ جو ان عنایات کو جو کچھ زیادہ قابل تعریف نہیں ہیں پورے طور پر پورے۔ اگر
تو پھر ایک ایسا جاگیردار جس کے خیالات موجودہ زمانے کے مطابق ہوں کیا کرے
کیا وہ اپنے مزارعین کی ملامتوں کا سامنا کرے اور ان لوگوں کی جن کو راضی نہیں
تنگ کرنے والی حرکات اور اس سے بھی بری باتوں کا خاتمہ کر دے یا وہ عدم
مداخلت کے اصول پر کاربند ہو کر اور وہ کام کر کے جو اس کے اکثر پڑوسی کرتے
ہیں عوام میں ہردلعزیزی حاصل کرے۔ بقول ایک زمیندار ایک اچھا جاگیردار
خیال کیا جانا بہت مشکل ہے۔ اس شخص کی مشکلات کا حل یہ ہے کہ وہ ہر اٹھنے والے
معاملے کے واقعات کے متعلق تحقیق کر لیتا ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مزارع
راستی پر ہے۔ تو وہ اسے وکیل کرا دیتا ہے۔ اور اس کی فیس ادا کر دیتا ہے۔ لیکن
یہ حل خاص حالات کے لئے ہے۔ کیونکہ ہمیشہ واقعات کی تحقیقات آسانی سے نہیں
ہو سکتی۔ اور دستور یا فصلانے کا سوال پھر باقی رہتا ہے۔ میرے بہترین مخبروں میں سے
ایک کا خیال تھا۔ کہ جاگیردار کی حکومت بہت کچھ زوال پذیر ہو چکی ہے۔ اس نے کہا
کہ بہت سی باتیں ایسی تھیں جن کو میرے والد صاحب کر سکتے تھے لیکن اب انہیں کرنا

ناممکن ہوگا۔ ان دنوں جاگیردار کا کہنا ہی قانون تھا لیکن اب بیرون جات میں تنقیدی روح زیادہ ہے۔ حاصل کلام اس کا خیال یہ تھا کہ جاگیرداروں کو اپنی زمین کا کچھ حصہ مزارعین کو دے دینا پڑے گا۔ تاکہ وہ باقی ماندہ حصے میں سلامتی سے رہ سکیں یہ بات ابھی مستقبل بعید میں عمل میں آئیگی۔ اور غالباً میرے زمانے میں نہ آئے گی۔ بلا شک وشبہ اس زمانے میں فیوڈل طریق کار بھی زوروں پر ہے۔ اور شمالی حصے میں جاگیردار کا منصب اس مرتبے سے بالکل مختلف ہے جو اسے وسطی پنجاب کے خود مختار کاشتکاروں میں حاصل ہے۔ جہاں جاگیردار اور مزارع میں لگان کی ادائیگی کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں ہے۔ ان دولو کے بین بین تحصیل اونہ کے راجپوت ہیں جو تمام کے تمام فیوڈل روایات میں ہی پرورش کئے جاتے ہیں۔ لیکن وہاں بھی جیساکہ ایک رسالے سے ظاہر ہے۔ قصر فیوڈل ریزہ ریزہ ہو رہا ہے

مزارعین کا معیار زندگی ہو۔ شام کو ہیں نے دو مزارعوں کے گھروں کا معائنہ کیا ایک کے پاس بیلوں کی دو جوڑیاں تھیں۔ اور دوسرے کے پاس تین۔ دوسرا اچھی حالت میں تھا۔ اس کے پاس ۲۵ ایکڑ زمین کاشت شدہ تھی اور تقریباً ۵۰ ایکڑ اور بطور چراگاہ کے تھی۔ اسکے باوجود وہ اور اس کا تمام کنبہ (تمام کے تمام معہ ایک بچے کے پانچ تھے) ایک بغیر کھڑکی والے ایک ہی گھر میں رہتے تھے جس کی لمبائی اور چوڑائی پندرہ اور دس تھی۔ اور وہیں مرغیاں بھی رکھتے تھے کمرے میں مقبوضہ اشیا کی رنگا رنگی نہایت حیران کن تھی ان میں دو ڈھیر بستروں کے اور روغنی رکابیوں کی ایک لمبی قطار شامل تھی جو نہایت صفائی سے ایک منبت کاری کئے ہوئے طاق پر جو دیوار کی پوری لمبائی تک بنا ہوا تھا قرینے سے لگائی ہوئی تھیں۔ اکثر رکابیاں از انداز ضرورت تھیں۔ اور محض نمائش کے لئے وہاں رکھی ہوئی تھیں لیکن بستر زائد نہ تھے کیونکہ ملک کے رواج کے مطابق جو مقابلتاً سرد ہے۔ غریب سے غریب اور امیر سے امیر کو اپنے مہمانوں کے لئے بستر مہیا کرنے پڑتے ہیں یہ رواج جنوبی پنجاب سے بہت مختلف ہے جہاں آدمیوں کو لحاف کی ایک بڑی گٹھڑی بغل یا کمر پر لئے ہوئے جاتے دیکھنا ایک عام نظارہ ہے۔ دونوں سے کسی کمرے میں بھی وہ بے داغ صفائی و پاکیزگی نہ تھی جو جھنگ اور ملتان کے گھروں میں دیکھی گئی تھی۔ دولو کے دونو گھر واضح طور پر زبان حال سے غریبوں کی زندگی کی داستان بیان کر رہے

تھے۔ اگرچہ بہت سی چیزیں زائد الاحتیاج تھیں لیکن غلہ خریدنے کے لئے ایک بھینس فروخت کی گئی تھی۔ دوسرا مزارع جو بہت چائے نوش تھا۔ ایک بیٹے اور ایک سالی کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہتا تھا۔ اور چونکہ یہ کمرہ سونے اور باورچیخانے کا کام دیتا تھا کڑیوں والی چھت کاجل سے سیاہ ہوئی پڑی تھی۔ یہ واضح رہے کہ مزارعین اپنے گھر خود تعمیر کرتے ہیں۔ لیکن عمارتی لکڑی اپنے جاگیردار سے مفت لیتے ہیں

فوجی ملازمت:۔ ان میں سے جو لوگ میری ملاقات کو آئے ایک شخص سبکدوش شدہ فوجی افسر تھا۔ جس کی کارگذاریاں نہایت ممتاز تھیں۔ اس نے کہا کہ فوجی ملازمت اتنی ہی ہر دلعزیز ہے۔ جتنی کہ ہو سکتی ہے۔ لیکن جب میں نے اس سے پوچھا کیا لوگ شوق سے بھرتی ہوتے ہیں۔ یا بھوک سے اس نے جواب دیا۔ شوق کیا ہو سکتا ہے؟ یہاں وہ بات نہیں ہے۔ جو حضور کے ملک میں ہے جہاں میں ہو کر آیا ہوں۔ ہماری بات تو یہ ہے۔ کہ جب لوگوں کے پاس کھانے کے لئے کافی خوراک نہیں ہوتی تو وہ سپاہی بن جاتے ہیں۔

کیا وہ فوج میں خوش رہتے ہیں؟

بہت حضور

۱۹۰۹ء میں جب میں بھرتی ہؤا تو ہماری تنخواہ صرف نو روپے تھی۔ اور ہمیں کھانا اپنی گرہ سے کھانا پڑتا تھا۔ اب ہر سپاہی کو ۱۶ روپے اور بھتہ مفت ملتا ہے۔ بھتہ بھی اچھا ہوتا ہے۔ جب لوگ مل جل کر کھاتے ہیں۔ تو وہ سیر ہو کر کھاتے ہیں۔ اور کچھ نہ کچھ بچ رہتا ہے۔ (۱۲ میل)

۱۱ فروری کنڈا سے کوٹ فتح خان

کنڈا میں میں ایک خیمے میں تھا۔ اور سردی اتنی تھی۔ کہ اس دورے میں اتنی کہیں نہ تھی۔ مطلب یہ کہ بہت تھی۔ دس دن گذرے اس علاقے کا تمام حصہ دو انچ برف سے ڈھکا ہؤا تھا۔ اور یہ ایک ایسی چیز تھی۔ جو تیس سال سے زیادہ عرصے سے یہاں نہیں دیکھی گئی تھی۔ صبح نہایت سہانی تھی۔ اور دوریاں صاف تھیں۔ شمال جنوب مشرق اور مغرب میں پہاڑوں کے

فراخ سلسلوں کی طرف نظر بلند و پست سطوح پر سے دوڑتی تھی۔ اور دس یا پندرہ میل پرے کالا چٹا کے سلسلے تک اور اس سے کہیں زیادہ دور کوہاٹ اور ہزارے کے پہاڑوں تک پہنچتی تھی۔ جو برف سے ڈھکے ہوئے آخری پہاڑ تھے۔ ہم جلدی کوٹ کی ریاست میں داخل ہو گئے۔ یہ پنجاب کا سب سے بڑا تعلقہ اور سب سے بہتر جاگیردار کی ملکیت ہے۔ ہم ایک انجمن امداد باہمی قرضہ کو جو اس نے اپنے مزارعین میں جاری کر رکھی ہے۔ دیکھنے کے لئے ٹھہر گئے۔ یہ مخصوص مزارع سب کے سب اس زمین کے پاس جسکی وہ کاشت کرتے ہیں۔ بکھرے ہوئے احاطوں میں رہتے ہیں۔ جنہیں (ڈھوک) کہتے ہیں۔ یہ چیز غیر متوقع تھی۔ کیونکہ ہم پھر گاؤں والے علاقے میں آ گئے ہیں۔ یہ کوئی نہ بتا سکا کہ وہ اسطرح کیوں رہنے لگے لیکن وہ اسے دوسری رہائش پر بہت ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح زمینوں میں کھاد ڈالنا اور فصلوں کی نگہبانی کرنا نہایت آسان ہے۔ اور انہیں ہر روز اپنے مویشیوں کو کھیتوں سے لانا اور لے جانا نہیں پڑتا۔ وسطی پنجاب میں بار بار ظاہر کئے ہوئے ڈر کے یاد آنے پر میں نے اُن سے دریافت کیا۔ کیا انہیں چوروں اور ڈاکوؤں کا خوف نہیں ہے۔ انہوں نے جواب دیا۔ ہم سب کے پاس کتے ہیں۔ جب ایک کتا بھونکتا ہے۔ تو چاروں طرف ڈھوک کے تمام کتے بھونکتے ہیں۔ پھر ہم جاگ اٹھتے ہیں۔ اور بھاگ کر باہر جاتے ہیں اس کے ساتھ ہی ہم بہت غریب ہیں۔ اور زیورات نہیں رکھتے۔ بلکہ بازوں اور کندھوں پر لپیٹنے کیلئے صرف ایک کمبل (جھگی شدگی) رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے ساتھ ہی کہا جب سے انگریزی راج آیا ہے۔ انسان جنگل میں چلا جائے۔ کوئی اسے کچھ نہ پوچھیگا۔

مزارعین کا لباس و خوراک — ان پینتیس مزارعین میں سے جو حاضر تھے۔ صرف تین گیہوں کھاتے تھے۔ اور تقریباً تمام خوراک کیلئے غلہ خریدتے تھے۔
کیا وہ مکھن یا گھی کھاتے ہیں؟
طنزاً جواب ملا جب چرا نہیں ہے۔ گائیں کسطرح دودھ دے سکتی ہیں۔

چند ایک لیکن زیادہ نہیں ایسے بھی ہیں اپنی چپاتیوں پر گھی لگا لیتے ہیں۔ کپڑوں کے متعلق یہ ہے۔ کہ ستر کے پاس صرف ایک جوڑا تھا۔ یہ وہی تناسب ہے۔ جو کل تھا۔ ہم نے سب سے بوڑھے آدمی سے دریافت کیا کہ کیا حالات اب بہتر ہیں۔ یا تمہاری جوانی میں اس نے جواب دیا اُس وقت بہتر تھے۔ ہمارے پاس زیادہ مویشی اور زیادہ گھاس ہوتی تھی۔ اب لاچاری ہے۔ زمین وہی ہے۔ لیکن ہماری تعداد زیادہ ہے۔ اس لئے ہماری مشکلات بڑھ گئی ہیں۔ دہقان کو جلد جلد بڑھتی ہوئی آبادی کی قباحتوں کا احساس ہونے لگا ہے۔ لہٰذا اب وقت ہی ایسا ہے۔ کہ اسے کرنا پڑا ہے۔ (۶ میل)

۱۲ر فروری قیام

صبح کے وقت کوٹ کے سردار نے ان تیرہ ثالثی انجمنوں میں سے جو دس نے اپنے مزارعین میں جاری کر رکھی تھیں۔ ایک مجھے دکھائی جو ایک قابلِ ذکر مجلس تھی۔ وہ معہ ۲۵ بیواؤں اور ۶ یا ۷ ہندو دکانداروں کے ۲۱۷ ممبران پر مشتمل تھی۔ دو سال میں ۹۶ مقدمات کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ جن میں سے ۱۸ صورتوں میں ثالثوں سے انجمن کی کمیٹی میں اپیل کیا گیا تھا۔ جس کا فیصلہ آخری تھا۔ ان میں سے اکثر معمولی تھے۔ لیکن قریب کے پڑوسیوں کے جھگڑوں کے متعلق تھے۔ جنہیں گالیاں دی گئی تھیں۔ اور گھونسے مارے گئے تھے۔ یا فصل کا کچھ حصہ چرالیا گیا تھا۔ یا مویشی کو اِدھر اُدھر کر دیا گیا تھا۔ یا قرضہ ادا نہیں کیا گیا تھا۔ ایک مقدمے میں ایک چور پر جو اپنے پڑوسی کی فصل کاٹتا ہُوا پکڑا گیا تھا۔ اپیل کرنے پر جرمانہ زیادہ کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ عادی مجرم تھا۔ مشکل مقدمات وہ تھے۔ جو لڑکیوں کے متعلق تھے۔ مثلاً منگنی ہو گئی۔ لیکن شادی نہیں کی گئی یا ایک نے لڑکی کو روک کے رکھا اور دوسرے نے مطالبہ کیا۔ کسی نے اغوا تک بھی کر لیا یہ سب کچھ اس طرزِ عمل کا نتیجہ ہے۔ جس کے ماتحت عورتوں کو مویشیوں کی طرح رکھا جاتا ہے۔

میہ میر:- ۹۵ حاضرین میں سے ۷۸ نے کہا کہ ہمارے پاس کپڑوں کا ایک جوڑا

ہے۔ لیکن پیر سب کے ہیں ۔ اور ساتھ ہی ایک مرشد بھی اگرچہ بہت سی صورتوں میں پیر و مرشد ایک ہی شخص تھا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ جب میرا پیر آخری مرتبہ آیا تھا۔ تو میں نے اُسے دستور کے مطابق ۱۴۱ روپیہ دیئے تھے۔ کوئی اس امر کی تشریح نہ کر سکا۔ کہ یہ رقم کیوں دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ یہ پرانے ہندوؤں کے زمانے کی باقی ماندہ نشانی ہے۔ کیونکہ ہندو پانچ کے اجزائے ضربی کو مبارک خیال کرتا ہے۔ اور اسی لحاظ سے اپنے تحائف کا اندازہ لگاتا ہے۔ جھنگ کا ایک پیر کہتا ہے۔ کہ اس اصول پر وہاں عام طور پر عمل کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سب سے چھوٹی رقموں کی صورت میں بھی اور پیر کو ۵ کسروں سے کم کبھی پیش نہیں کئے جاتے۔ کوئی شخص ملا یا پیر کے روپے کو اچھا نہیں بتاتا۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ ان میں سے کوئی پیری مریدی نہیں کرتا۔ تاہم اگر پیر لوگوں کے لئے کچھ نہیں کرتا۔ پھر بھی وہ اثر کے لحاظ سے جاگیردار کا رقیب اور ساہوکار سے بالاتر ہے۔ لیکن یہ اثر اس کی حریصانہ دنیاوی زندگی کے نظارے اور تعلیم سے دیتا جا رہا ہے۔

ملا لوگ:- ملا کا ذکر پیر کی نسبت بہتر الفاظ میں نہیں کیا جاتا صرف ایک فیصدی (غالباً غیر متعصبانہ اندازہ ہے) ایسے ہیں کہ جو کچھ پڑھتے ہیں۔ اس کی تفسیر بیان کر سکتے ہیں۔ باقی سوائے اس کے کہ قرآن شریف حفظ کر لیں اور کچھ نہیں کرتے۔ اور صرف گاؤں کے اعلےٰ قسم کے کمین ہوتے ہیں۔ جن کا اثر بہت کم ہوتا ہے۔ اور علمیت کچھ نہیں۔ بہت سے جلاہے ہیں۔ اور تقریباً تمام اس منصب پر اس لئے کام کرتے ہیں۔ کہ ان کے آباؤ اجداد نے ان سے پہلے اسی جگہ کام کیا۔ ملا عام طور پر قاضی بھی ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ شادی کے موقعہ پر نکاح بھی پڑھتا ہے۔ اور موت کے وقت مردے کو نہلاتا اور قبر میں لٹاتا ہے۔ اس کے عوض اسے اس گاؤں میں ججمانوں میں سے ہر ایک کے گھر سے ایک چپاتی اور ہر فصل پر دو سیر سے لیکر ۸ سیر تک غلہ ملتا ہے۔ دوسری جگہوں میں بعض اوقات اسے زمین کا ایک ٹکڑہ نذر کر دیا جاتا ہے۔ لیکن عام طور پر گاؤں کے دوسرے کمیوں کی طرح اسے بھی فصل کے موقعہ پر غلہ دیا

جاتا ہے۔ اور انہی کی طرح اس کے باقاعدہ ججمان ہیں۔ اور جب وہ مرجاتا ہے۔ تو اس کے بیٹے ججمانوں کو آپسمیں اسطرح بانٹ لیتے ہیں۔ جیسے کہ زمین کو۔ چمار، لوہار اور حجام اور تمام وہ لوگ جو گاؤں کی پیداوار پر حق رکھتے ہیں۔ اسی طرح کرتے ہیں۔ جب میں نے دریافت کیا۔ کیا ملاؤں اور حجاموں کی لازمی ایزادی سے ایسی تقسیم در تقسیم ان کی رہائش کو ناممکن نہیں بنا دیتی۔ مجھے مطلوبہ جواب ملا۔ لیکن ہم بھی گو بڑھتے ہیں"

وہ نادر الوجود انسان یعنی اچھا جاگیردار وہ سردار ہے۔ جس کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور ذکر کرنا چاہئیے۔ جب اس کے والد کا انتقال ہوا تو اس کی عمر صرف ۱۸ ماہ تھی۔ اس کی پرورش اس کی ماں نے کی اور اسے سینڈ ہرسٹ اور چیفس کالج لاہور میں تعلیم دلائی چھ یا سات برس گذرے بالغ ہونے پر اس نے اپنی بڑی جائداد کو اپنے ہاتھ میں لیا (۷۰۰۰۰ ایکڑ) یہ دیکھ کر کہ سپاہیانہ زندگی اور جائداد کے مناسب انتظام کا ارتباط ناممکن ہے۔ اس نے امین کا عہدہ ترک دیا اور کوٹ میں سکونت پذیر ہو گیا۔ اب وہ مجلس قانون ساز میں مغربی پنجاب کے جاگیرداروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک اچھے جاگیردار کی طرح اس نے اپنے مزارعین کو بغیر سود کے پیشگی روپیہ دینا شروع کیا۔ لیکن کچھ عرصے تک اسے آزما کر اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر لوگ خود قرضے دیں۔ اور خود ہی وصول کریں۔ تو زیادہ فائدہ مند ثابت ہوں گے۔ چنانچہ اس نے اپنے چھبیس گاؤں میں سے ہر ایک میں ایک انجمن امداد باہمی قرضہ جاری کی اور ان کی کارروائیوں میں سہولت بہم پہنچانے اور جذبہ امداد باہمی پیدا کرنے کے لئے سب کو یکجا کر کے ایک یونین بنا دی جسکا وہ خود پریذیڈنٹ ہے۔ اور تمام اخراجات خود برداشت کرتا ہے۔ گذشتہ موسم خزاں میں مقامی گندم کو بہتر بنانے کے لئے اس نے پنجاب کی ۸ الف گیہوں کے ۵۰۰ من اپنی یونین اور انجمنوں کے توسل سے اپنے مزارعین میں تقسیم کئے۔ جسقدر روپیہ پیشگی دیا جاتا ہے۔ وہ بغیر سود کے ہوتا ہے۔ انجمنیں اس رقم پر جو اپنے مصارف کیلئے لی جاتی ہیں معمولی شرح فیصدی سے اور کچھ معمولی سا سود حساب کی جانچ پڑتال کے لئے

وصول کر کے اپنی کمی کو پورا کر لیتی ہیں۔ جاگیر دار کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے مزارعین کے جھگڑوں کا فیصلے کرے۔ اس پر پھیر سردار نے سوچا کہ اپنے مزارعین کو یہ کام خود کرنا سکھانا زیادہ بہتر ہوگا۔ اس کا نتیجہ (۱۳) تیرہ ثالثی انجمنوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ وہ کس قدر مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ شمالی علاقے کی دھنی نسل کے بہترین مویشیوں کی افزائش نسل کے لئے ایک فارم کا اجرا ایک اور آزمائش ہے۔ وہ دو بیل اور چالیس گائیں رکھتا تھا۔ اور یونین کی وساطت سے ان کے بچھڑے اپنے مزارعین میں نہایت کم قیمت پر فروخت کرتا ہے اور ان سے صرف یہ پیمان لیتا ہے کہ وہ اسے کسی شخص کے پاس نہ فروخت کرینگے۔ جو اس تعلقے میں نہیں رہتا۔ وہ گھوڑوں کی مقامی نسل کو بھی ترقی دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اپنے گھوڑوں کے اصطبل میں بے شمار انگریزی نسل کے گھوڑے رکھتا ہے لیکن یہ کام پہاڑ کے بالائی حصوں کا ہے۔ کیونکہ بہت سے جاگیر دار اب گھوڑوں کو موٹروں سے بدل رہے ہیں۔ اس نے ایک آزمائش کا اعادہ نہیں کیا ہے اور وہ یہ ہے۔ کہ ایک یا دو سال گذرے اپنے مزارعین کی ایمانداری کا جائزہ لینے کیلئے اس نے پیداوار میں سے اپنا حصہ لینے کے لئے رسمی طور پر تول کر اندازہ کرنے کی بجائے یہ بات ہر مزارع پر چھوڑ دی کہ وہ ہی اس کے حصے کرے لیکن اس سے پہلے ہر ایک کھیت کی پیداوار کا نہایت ہوشیاری سے نرخ لگوالیا گیا۔ اس کے نتائج ایک خشک مزاج کو بھی ہنسا دینے والے تھے۔ اس کے حصے کی اس مقدار سے جس کی قیمت پہلے ٹھہرا لی گئی تھی صرف دو اشخاص زیادہ لائے اور ہر ایک بجائے متوقع پچیس من غلے کے صرف دو من لایا۔ ہم نے دیر تک باتیں کی تھیں۔ مجھے اس امر کے احساس سے صدمہ ہوا کہ آٹھ بج چکے تھے۔ اور یہ رمضان شریف کا پہلا دن تھا۔ اور سردار نے تمام دن کچھ نہ کھایا تھا۔ لیکن مشرق کی تربیت ایسی ہے۔ کہ اس کے باوجود اس نے بے صبری کی کوئی علامت یا اشارہ ظاہر نہیں کیا۔

۱۳ فروری کوٹ فتح خان سے فتح جنگ

ایک ثالثی انجمن اور ایک مشکل مقدمہ :- راستے کے کچھ حصے تک سردار اپنی دوسری ثالثی انجمنوں میں سے ایک، اور دکھانے کے لئے میرے ساتھ سوار ہوکر چلا یہ اتنی اچھی نہ تھی۔ جتنی کہ اس سے پہلے۔ درحقیقت یہ سب سے بڑی ہونے کی وجہ سے خاص طور پر دکھائی گئی تھی۔ تاہم اس نے اپنے ۲۳۴ ممبروں کے لئے کچھ نہ کچھ مبارک کام کیا ہے۔ دو سال میں ۱۳ جھگڑوں کا فیصلہ کیا۔ اور صرف ایک نے کمیٹی کے پاس اپیل دائر کی۔ اس ایک مقدمے نے انجمن کو اپنی ب اط سے بڑھ کر تنگ کیا تھا مقدمے کے واقعات یہ ہیں۔ ا نے اپنی لڑکی کی شادی بچپن میں ب سے کردی تھی۔ پانچ برس گذر گئے۔ اور مکلاوے کا وقت آیا جب ب نے اس دوران میں دوبارہ شادی کر کے اس سے انکار کر دیا ا نے دادخواہی کے لئے سوسائٹی سے درخواست کی چنانچہ ان ثالثوں نے جن کے سپرد مقدمہ کیا گیا یہ حکم دیدیا کہ یا تو ب شادی کو مکمل کرے یا ا کو ۵۷ روپے دے فریقین میں عہدوپیمان ہو گئے۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا اب ب نے یہ اعلان کیا ہے۔ کہ میں لڑکی سے شادی کرنے کے لئے بالکل تیار ہوں۔ لیکن ا اس بات پر اصرار کرتا ہے۔ کہ میں پہلے دو من گڑ اور ۳۵ روپے نقد اسے ادا کروں سوال یہ تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ سردار فریقین کو عدالت میں جانے سے روکنے کے لئے اس فکر میں تھا۔ کہ فیصلہ جلد ہو جائے۔ اس سے پیشتر کہ ثالثی انجمن کا اجراء کیا جائے۔ جھگڑوں کا فیصلہ اکثر سفید ڈاڑھیوں والے بزرگ کیا کرتے تھے۔ جو فریقین میں مصالحت کرانے کیلئے اپنے رسوخ سے کام لیتے تھے۔ سردار نے سوچا کہ یہ طریقہ بھی اس مقدمے میں آزما کر دیکھ لینا چاہیئے۔ ہر فریق نے اپنا پنچ منتخب کیا۔ ان میں سے ایک شخص نے جو اگرچہ مسلمان تھا۔ ایک ہندو دوکاندار کو منتخب کیا۔ اور دونو کی رضامندی سے ایک سفید ریش عینکوں والا شخص سرپنچ منتخب کیا گیا۔ مقدمہ کے بیانات

دئے گئے۔ اسمیں کوئی شک نہ تھا کہ ب ر اکی کا مطالبہ کرتا تھا۔ لیکن چونکہ اس کے ہاں پہلے سے ایک بیوی تھی۔ میں نے یہ رائے دی کہ پہلی کو طلاق دیجائے۔ کیونکہ "تم دونوں کا خرچ کیسے برداشت کروگے"؟

وہ ایک مزارع تھا جسکے پاس دو ہل تھے۔ اس نے تذبذب پر شاکر رہنے والے مشرقی لہجے میں جواب دیا۔ شام کو روزی دینے والا انہیں بھی دیگا تاہم تھوڑی دیر بعد ممکن ہے۔ غیبی امداد پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے اس نے ۱۰۰ روپے کے بدلے لڑکی کو طلاق دینا منظور کرلیا۔ ایک ایسے ملک میں جہاں ہر دیہاتی لڑکی کمیاب ہونے کی وجہ سے نقد قیمت رکھتی ہے۔ یہ مطالبہ نہایت نامناسب تھا۔ انہیں تین آدمیوں کی پنچایت ان کے فیصلے پر غور کرنے کے لئے ایک طرف چلی گئی۔ وہ پانچ منٹ سے بھی پہلے ہی واپس آ گئے۔ اور حکم سنایا کہ لڑکی کو طلاق دیدی جائے۔ اور ج کو ۷۰ روپے ادا کئے جائیں ل رضامند ہوگیا۔ لیکن ج نے ستر روپے لینے سے منہ پھیر لیا۔ سردار نے میری طرف مخاطب ہوکر کہا کہ اب کیا کیا جائے۔ میں نے یہ رائے دی کہ اگر ج اس فیصلے کو قبول کرنے سے انکار کرلے تو اس کا حقہ پانی بند کردیا جائے۔ لیکن سردار کو یہ اندیشہ تھا۔ کہ اس سے بکھیڑا نہ پیدا ہو جائے۔ چنانچہ ہم نے معاملہ یہیں چھوڑ دیا۔ یہ مثال اس مختصر انصاف طریق پر فیصلہ کرنے کی مشکلات پر جس کی بنیاد ڈر کی بجائے مرضی پر ہو کافی روشنی ڈالتی ہے۔ اور یہ ظاہر کرتی ہے۔ کہ دیہاتی زندگی کے زہر یعنی تفرقہ کی ابتداء کیونکہ ہوتی ہے۔

انتظام سلطنت:۔ گاؤں چھوڑنے سے پہلے میں نے سردار کو یہ رائے دی کہ ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ لوگ اس ملک کے انتظام سلطنت کے متعلق کتنا کچھ جانتے ہیں۔ حاضرین کی تعداد تقریباً ۱۰۰ تھی۔ تقریباً سب مزارع یا گاؤں کے کمین تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم جانتے ہیں۔ کہ کیمل پور میں (ضلع کا صدر مقام ہے) کون رہتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ صرف لاٹ صاحب کا نام جانتے تھے۔ ہم نائب تحصیلدار۔ تحصیلدار۔ تھانیدار۔ اور حوالدار کو بھی جانتے ہیں۔ ہم نے ڈپٹی کمشنر کے متعلق بھی سنا ہے۔ لیکن اس کے متعلق جانتے

کچھ نہیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہیں تک دریافت کر سکے۔ آخر کار ہم نے ایک سفید ریش شخص کو منتخب کیا۔ جو دوسروں کی نسبت زیادہ واقف معلوم ہوتا تھا۔ وہ کمشنر کے نام سے واقف تھا۔ اس نے اسے "راول والا کہا" یعنی وہ شخص جو راولپنڈی میں رہتا ہے۔ پھر اس نے لاہور میں چار کونسل والوں کا ذکر کیا۔ لیکن یہ سنی سنائی بات تھی۔ جب تک دریافت کرنے پر اس نے یہ جواب نہ دیا تھا۔ کہ وہ بعض کو پھانسی پر لٹکاتے ہیں۔ اور بعض کو رہا کر دیتے ہیں۔ میرا خیال یہ تھا۔ کہ ایسے طریق اصطلاحات سے غیر متوقع واقفیت ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ چار کونسل والوں سے مراد ہائی کورٹ تھی۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ ایک فنانشل کمشنر اور ایک وائسرائے بھی ہوتا ہے۔ اسے ماقبل الذکر کے فرائض کا علم نہ تھا۔ لیکن دوسرے کے متعلق وہ جانتا تھا۔ کہ وہ بادشاہ ہے۔ اور لوگوں کو مختلف اضلاع میں بھیجتا ہے۔ پھر اس نے لاٹ صاحب کا نام لیا۔ جسے اس نے کمشنروں سے بڑا اور کونسل والوں سے چھوٹا بتایا۔ کیونکہ وہ پھانسی پر لٹکا سکتے تھے۔ اور وہ ایسا نہ کر سکتا تھا۔

جب ہم فتح جنگ کے قریب پہنچے تو ہمالیہ کی بلند و پست پہاڑیاں جو نہایت خوبصورتی سے الجھی ہوئی تھیں سامنے آنے لگیں۔ ان کے بلند حصے برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔

(۱۱ میل)

۱۷ فروری فتح جنگ سے جھنگ

کالا چٹا کی پہاڑیاں :- یہ صبح نہایت شاندار تھی۔ کل کے طوفانی بادل سفید بادلوں کے بیڑے گھرے۔ نیلے آسمان کے ساتھ ساتھ تیرتے ہوئے چھوڑ کر صاف ہو چکے تھے۔ برف صاف نظر آتی تھی۔ اور چکا چوند پیدا کرتی تھی اس کا سلسلہ کناروں دار مسلسل قطار میں ہمیر پنجال کے سلسلے تک پھیلا ہوا تھا۔ جو پنجاب کو کشمیر سے علیحدہ کرتا ہے۔

ہوا شمال مغرب سے چل رہی تھی۔ اور اس قدر تیز و تند تھی کہ سواری کرنے کی نسبت پیدل چلنا زیادہ فرحت بخش معلوم ہوتا تھا۔ ہمارا راستہ کالا چٹا پہاڑیوں کی ایک شاخ کے ساتھ ساتھ تھا۔ جو سیاہ و سفید

ہونے کی وجہ سے اس نام سے پکاری جاتی ہیں۔ ڈھیلے ڈھالے سفید چھلکے
اور بکھری ہوئی گہری سبز جھاڑیوں اور جنگلی زیتون کے درختوں سے ڈھکی ہوئی
ہونے کی وجہ سے وہ ایپین ہائنز کے ننگے سلسلوں اور اٹلی میں دوپہر کے وقت
زیتون کے پھلوں کی بھوری چمک کی یاد دلاتی تھیں۔ وادیاں گیہوں اور سرسوں
سے پٹی پڑی تھیں۔ اور آخرالذکر کے زرد زرد کھیت نیلی پہاڑیوں کے مقابل شاندار
طریق سے سرکشی کر رہے تھے۔ خوب علاقہ ہے۔ اور جنگ اسکے درمیان ایک
پہاڑی پر جہاں سے ہزارے کی برف کے عظیم الشان نظارے بخوبی نظر
آتے ہیں۔ نہایت عمدگی سے آباد ہے۔

ایرانی راہ گیر:- ہم ابھی فتح جنگ سے زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ راہ
گیروں کے ایک ایسے رنگا رنگ گروہ سے ملے۔ جو میں نے پہلے کسی سڑک
پر نہیں دیکھا۔ تقریباً چالیس افراد جن میں مرد عورتیں اور بچے شامل تھے۔
بعض ٹٹوؤں پر بعض پیدل اور بچے تمام کے تمام شوق شوق میں آگے
بڑھ رہے تھے۔ اور دلیرانہ مسکراہٹ آمیز لہجوں میں بخشش کا مطالبہ کر رہے
تھے۔ ان کی ظاہری شکل وصورت بالکل انوکھی تھی۔ ان میں سے ایک ایک
لمبا سیاہ کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ جس کے کالر پر ٹکٹ کلکٹر جیسا فیتا لگا
ہوا تھا۔ ان کے خط وخال اتنے غیر مانوس تھے کہ میں ٹھہر گیا۔ اور یہ دریافت
کیا کہ وہ کون تھے۔ اور کہاں کے رہنے والے تھے۔ مختصر مگر حیران کن جواب
ملا " ہمدان " اور دوسرے نے ساتھ ہی کہا " مکہ شریف" ہم سمجھے کہ یہ
افسانہ کر رہے ہیں۔ لیکن چمڑے کی ایک پرانی خورجی میں سے نکالے ہوئے
پروانہ راہداری (پاسپورٹ) سے ظاہر ہوا کہ وہ ستمبر ۱۹۲۷ء میں شہر جسک
(   ) میں تھے۔ اس کے اگلے مہینے کراچی میں کلکتہ کی ایرانی کونسل
کا بھی مورخہ جولائی ۲۸ء کا ایک خط تھا۔ ان کی اسناد کے مطابق وہ ایران
سے چل کر بذریعہ جہاز سویز پہنچے۔ پھر ریل سے مدینہ شریف آئے۔ مکہ کی
زیارت کی اور پھر افغانستان میں سے ایران جانے کا ارادہ کر کے ہندوستان
آئے یہ لوگ سماسٹہ اور بہاولپور سے پیدل آئے تھے۔ (ریاست بہاولپور
کا اجازت نامہ پیش کیا گیا۔ افغانستان میں ہلچل ہونے کی وجہ سے حال ہی میں

وہاں سے واپس کر دئے گئے تھے۔ وہ چرب زبان تھے۔ لیکن اتنے سمجھدار نہ تھے۔ ہمیں ان کی باتوں سے معلوم ہؤا کہ وہ ایران میں کاشتکاری کرتے تھے۔ اور گیہوں و انگور کی کاشت کرتے تھے۔

ایک کھتری بنک :- اس کے بعد ہم ایک کھتری بنک دیکھنے کے لئے ایک طرف کو ہو لئے۔ کھتریوں کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ یہ لوگ ضلع بھر میں ایک ساتھ ہی بعید الفہم نہایت ہی دلچسپ اور حد سے زیادہ غیر تسلی بخش واقع ہو ئے ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً ۱۰۰۰۰ ہے۔ چھ یا سات سال گذرے ان کے رہبر نے جو اکثر لوگوں کی نسبت زیادہ اچھا تعلقہ دار ہے تمام قوم کے لئے (پنچایت ایکٹ کے ماتحت نہیں) بلکہ اسی طرح کی ایک پنچایت قائم کی جیسی کہ میوؤں نے جنوب میں بنائی ہیں۔ لیکن یہ آزمائش ناکامیاب ثابت ہوئی۔ اور چھوڑ دی گئی۔ بنک کے ایک ممبر نے بتایا کہ اس میں حماقت اور سخت کدورت تھی۔ ہمدردی بالکل نہ تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ روح جو امداد باہمی پھونکنا چاہتی ہے۔ مفقود تھی۔ اس کے ساتھ ہی ثالثی پنچایت اپنے فیصلوں پر عمل درآمد کرانے کیلئے۔ آئینی اختیارات سے عاری تھی۔ جن لوگوں کو ہم نے آج دیکھا ملے جُلے تھے۔ مزارعین پرلے درجے کے جاہل اور ۱۰۰ سے ۲۰۰ ایکڑ والے تعلقہ دار سمجھدار لیکن مردہ دل تھے۔ ان میں زیادہ سے زیادہ ہوشیار سکرٹری تھا۔ وہ ستر برس کی عمر کے قریب پہنچ رہا تھا۔ اور پرائمری کی چوتھی جماعت سے زائد تعلیم نہ پائی تھی۔ لیکن لوگوں نے کہا کہ اُن دنوں تعلیم آج کل سے بہت بہتر تھی۔ سیکرٹری نے دعوےٰ کیا۔ کہ میں نے گلستان و بوستان فارسی زبان میں پڑھی ہوئی ہے۔ اور اقلیدس کا بھی مطالعہ کیا ہؤا ہے۔ بدقسمتی سے روپیہ کے لحاظ سے وہ بھی اسی حالت میں ہے۔ جیسیں کہ اسے ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جب میں نے کہا کہ مجھے میزان (۸ روپے) دکھاؤ تو وہ بے قراری سے اٹھ کھڑا ہؤا۔ اور یہ کہکر احتجاج کرنے لگا۔ کہ یہ میرے کھیت (ڈھوک) میں ہے۔ اور اسے لانے میں دیر لگے گی۔ اس پر وہ لوگ جو پیچھے بیٹھے تھے۔ اپنی مسکراہٹ مشکل سے ضبط کر سکے۔ گاؤں چھوڑنے پر ہم

نے بنکوں کے سب انسپکٹر کو پیچھے چھوڑ رہا تاکہ وہ دیکھے کہ روپیہ پیدا کر کے خزانچی کو دیا جاتا ہے۔ یا نہیں۔ انہیں دو گھنٹے لگے۔

غبن :۔ اس دورے میں اس قسم کی کوتاہی دیکھنے کا کسی طرح بھی یہ پہلا موقعہ نہیں ہے۔ ہر سال ۱۵۰۰۰ بنکوں میں تقریباً ۵ کروڑ روپیہ (۳۷۵۰۰۰۰ پونڈ) کے آنے جانے سے بددیانتی کرنے کے بے شمار مواقع ہیں۔ اور غبن عام طور پر ہوتے ہیں۔ اس ملک میں امداد باہمی کی تو سیع کرنے میں ایک مشکل یہ بھی ہے۔ کہ دوسرے لوگوں کا روپیہ استعمال میں لانے کے متعلق خیالات حد درجہ پھسلاہٹ کی طرف مائل ہیں۔ دیہاتی بنکوں کے خزانچیوں کیلئے سوسائیٹی کے فنڈ کو اپنے روپیہ کے ساتھ رکھنا اور بلا امتیاز دونو استعمال کرنا اکثر سہل ہوتا ہے۔ اور جب دریافت کیا جائے تو یہ امر کہ سوسائیٹی کا روپیہ آجائے گا۔ یا نہیں خزانچی کے پاس اس وقت روپیہ ہونے یا نہ ہونے پر منحصر ہے۔ گذشتہ ماہ میں نے ایک نہایت اہم دیہاتی بنک کا بغیر اطلاع دئے معائینہ کیا۔ اور اُس روپیہ کی میزان دکھانے کے لئے کہا۔ جو کتابوں میں ۲۰۰ سے زیادہ درج تھا۔ اور مہینوں اس سے بڑی تعداد میں درج رہا تھا۔ تمام رقم پوری کرنے کیلئے۔ تھوڑا تھوڑا روپیہ اِدھر اُدھر سے جمع کرنے میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ یہ تمام روپیہ تین علیحدہ علیحدہ قسطوں میں لایا گیا۔ اور اس جگہ کا جہاں سے روپیہ لایا گیا تھا۔ میں صرف قیاس کر سکا۔ یقیناً اس کا بہت کم حصہ خزانچی کے گھر سے لاگیا۔ یہ واقعہ خاص طور پر بُرا تھا۔ کیونکہ سوسائیٹی کو کئی سال سے بنکنگ یونین کو ایک بڑی رقم بہ طور قرض ادا کرنی تھی۔ جسکے لئے وہ ۸ فیصدی سود ادا کر رہی تھی۔ یہ تمام کا تمام واقعہ اچھی مالی حالت اور چال چلن کی باہمی گہری وابستگی پر روشنی ڈالتا ہے اور یہ ہے۔ وہ بات جس پر ان صفحات میں بار بار زور دیا گیا ہے۔

فرصت کا وقت :۔ اس دورے میں جہاں کہیں میں گیا ہوں۔ تقریباً ہر جگہ کاشتکار نے یہی کہا ہے۔ کہ میرے پاس زمین کاشت کرنے کے علاوہ اور کوئی وقت نہیں ہے۔ چونکہ یہ علاقہ سراسر بارش پر انحصار رکھتا ہے۔ اس لئے بہت زیادہ کاشتکاری کا متحمل نہیں ہے۔ میں نے خیال کیا

کہ ممکن ہے۔ یہ علاقہ مستثنیٰ ہو۔ لیکن نہیں۔ انہوں نے کہا کہ خشک سالی کی
وجہ سے ہم صبح سے دوپہر تک کا وقت اپنے مویشیوں کے لئے چارہ لانے
میں صرف کرتے ہیں۔ وہ پہاڑیوں پر جاتے ہیں۔ اور وہاں شاخیں تراشتے
ہیں۔ اور شام کو انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں۔ اور مویشیوں کو کھلاتے
ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر خشک سالی نہ بھی ہو تو بھی ہم خربوزے پیاز اور
تمباکو بونے کی تیاری کرنے۔ مینڈھیں بنانے زمین میں ہل چلانے اور ہموار
کرنے میں مصروف ہوں گے۔ وہ شخص جو چارپائی پر بیٹھتا ہے۔ قرض میں مبتلا
ہو جاتا ہے۔ اور بدمعاش بن جاتا ہے۔

خوراک مرغیاں پالنا۔ عورتیں :۔ اس گاؤں کی خوراک پہلے دیکھے
ہوئے گاؤں سے محض اسلئے نمایاں طور پر اعلےٰ ہے۔ کہ یہاں پندرہ یا سولہ
کوئیں ہیں۔ اور وہاں سبزیاں اُگائی جا سکتی ہیں۔ سب لوگ چند مرغیاں
بھی پالتے ہیں۔ البتہ گیارہ سے زیادہ کوئی نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ مرغیوں کی
بڑی تعداد کی خوراک کا خرچ نہیں برداشت کر سکتے۔ گزشتہ موسم
گرما میں اس کی تقریباً تمام مرغیاں ہفتے کی بیماری سے مر گئی تھیں۔ اور اس
سے تمام ضلع تباہ ہو گیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے۔
کہ ہندوستانی دیہاتی کے لئے۔ مغربی دیہاتی کے طریق پر چل کر اپنی آمدنی
میں اضافہ کرنا کس قدر مشکل ہے۔ سب لوگ بھیڑیں پالتے ہیں۔ لیکن
فی کس پندرہ یا بیس سے زیادہ نہیں۔ کیونکہ ساتھ ساتھ مویشی بھی رکھے
جاتے ہیں۔ سب لسّی پیتے ہیں۔ اور بہت سے گھی کھاتے ہیں۔ وسطی
پنجاب کی طرح دودھ کو گرم نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اسمیں تھوڑی سی لسی جمانے
کے لئے ڈال دی جاتی ہے۔ اپنے صرف کمہار بناتا ہے۔ کیونکہ اسے برتن
بنانے کے لئے ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ زمیندار لوگ پردہ کا خیال
رکھتے ہیں۔ لیکن مزارعین ایسا نہیں کرتے۔ ان کی عورتیں ہل چلانے کے علاوہ باقی سب
کچھ کرتی ہیں۔ اور خریداری کرنے میں بھی حصہ لیتی ہیں۔ آدمیوں نے کہا کہ اسمیں
گھاٹا ہے۔ کیونکہ عقلمندی سے خرید و فروخت نہیں کرتیں۔ ایک نے ساتھ ہی
کہا کہ ان خاوندوں کی نسبت جو خرید و فروخت کرتے ہیں۔ عورتوں ہی کا پلہ بھاری

ہوتا ہے۔ یہاں بعض لوگ گاؤں میں رہتے ہیں۔ اور بعض بکھرے ہوئے احاطوں میں بود و باش رکھتے ہیں۔ (ڈھوک) ان وجوہات کی بناء پر جو تین دن پہلے دئے گئے تھے۔ وہ سب اس امر پر متفق تھے کہ احاطہ بہتر ہے۔ اور وہ بغیر کسی چون وچراں کے راستی پر ہیں۔

انتظام سلطنت :- حاصل کلام ہم نے مزارعین سے یہ دریافت کیا کہ تم اپنے حاکموں کے متعلق کیا جانتے ہو۔ پہلے نے کہا کہ میں پٹواری اور تھانون گو کو جانتا ہوں۔ لیکن اس کے بعد کسی کو نہیں جانتا۔ دوسرا کمشنر تک لیکن اسے یہ خبر نہ تھی۔ کہ لاہور میں کون رہتا ہے۔ تیسرے نے تسلیم کیا کہ میں نہیں جانتا کہ بادشاہ کون ہے۔ اس نے کہا کہ میں اس کا نام بھی نہیں جانتا۔ سیکرٹری نے اُن کی تفسیر یہ کی کہ یہ چہار پایہ جانور ہیں بہترین واقف کار ممبر تمام سرکاری افسروں کی سیڑھی سے آگاہ تھا۔ اور ایک اردو کا اخبار منگواتا تھا۔ (۱۱ میل)

۱۵ فروری قیام

جو بنک ہم نے آج دیکھا وہاں بھی ممبروں سے ان کے حکمرانوں کے متعلق پہلے کی طرح سوال وجواب کئے۔ ایک شخص نے ڈپٹی کمشنر اور ڈسٹرکٹ جج تک بتایا۔ دوسرے نے اسی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ جج کے اوپر گورنمنٹ ہے۔ اور گورنمنٹ سے اوپر خدا۔ ایک تیسرے شخص نے جب اس سے یہ پوچھا گیا کہ لاہور میں کون رہتا ہے۔ جواب دیا چیف کمشنر اور وائسرائے جو حاکموں کا حاکم ہے۔ (ڈاڈھے تے ڈاڈھا) میں نے پوچھا قوانین کون بناتا ہے۔ ہر ایک قیاس علیحدہ علیحدہ تھا۔ سرکار۔ وکلا۔ چار کونسل والے اور وائسرائے ہند۔

وائسرائے کہاں رہتا ہے ؟

کلکتہ اور ولایت میں (یورپ)

حاضرین کی تعداد تینتالیس (۴۳) تھی۔ ان میں سے چالیس زمیندار تھے اور سڑک اعظم ان سے صرف دس میل کے فاصلے پر ہے۔

گایوں سے ہل چلانا :- اس ضلع میں ایک خاص بات یہ ہے۔ کہ یہاں گایوں سے ہل چلایا جاتا ہے۔ یہ بات راولپنڈی اور جہلم کے بعض حصوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ (مثلاً گوجرخان اور چکوال) اس ضلع میں یہ بات عام ہے۔ اور خاص طور پر عزبت کی وجہ سے ہے۔ اس لئے حال ہی میں اسے بند کرنے کی کوشش ناکامیاب رہی۔ جب کوئی خرابی عزبت کی وجہ سے ہو اور عزبت باقی رہے تو اصلاحات کے لئے تمام کوششیں ضرور بے کار ثابت ہوں گی۔ وسطی پنجاب میں تھوڑی زمین والا شخص بھی ہل چلانے کے لئے بیل اور لسی و گھی کے لئے ایک دودھ دینے والی بھینس رکھتا ہے لیکن یہاں دیہاتی اکثر فالتو مویشیوں کا خرچ نہیں برداشت کر سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ چونکہ پہاڑیاں اچھی چراگاہیں ہیں۔ وہ اپنے بیلوں کی پرورش کرتا ہی پسند کرتا ہے۔ وسطی پنجاب میں جہاں مویشی چرانے پر بہت کچھ پابندیاں ہیں۔ معمولی آدمی شاذ ہی اس کے لئے کوشش کرتا ہے اور اپنی ضروریات کے مطابق چارہ خرید لینے کو سستا سمجھتا ہے۔ گائیں دودھ نہ دینے کی وجہ سے نہیں استعمال کی جاتیں۔ لیکن اس صورت میں بھی ان پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ ہل چلانے سے اکثر ان کا دودھ سوکھ جاتا ہے

ساہوکار :- یہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ساہوکار کے متعلق بھی کچھ لکھا جائے۔ وہ فتح جنگ و تلہ گنگ کی تحصیلوں میں اس قدر قوی نہیں ہے۔ اسے نہ صرف ایکٹ انتقال اراضی سے ہی قابو میں رکھا جاتا ہے۔ بلکہ قومی طریق کار سے بھی۔ کیونکہ آوان کتنے اور اگرچہ آپس میں آزادانہ طور پر لڑتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے ساتھی کے خلاف کسی ساہوکار کی ہرگز امداد نہ کرینگے۔ چونکہ ہر فرقے کے پاس اپنا اپنا علاقہ ہے۔ دوسرے یہ کہ مددگار حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ میانوالی۔ راولپنڈی۔ اور ہزارہ جیسے قریب کے ضلعوں میں جہاں فرقے آپس میں مخلوط ہیں۔ ساہوکار کی طاقت زیادہ ہے۔ جنوب مغربی علاقوں کی طرح وہاں بھی وہ غلہ کھلیان میں سے ہی لے جاتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات عام نہیں ہے۔ البتہ سود کی شرح زیادہ ہے۔ اور اس فصل پر اکثر لوگوں نے ۵۰ فیصدی پر غلہ ادھار لیا تھا۔ چند آدمیوں نے سو فیصدی پر

بھی لیا تھا۔ لیکن آخر الذکر وہ تھے جن پر یہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کہ وہ ادا کر دیں گے۔

۱۶ فروری جھنگ سے حسن ابدال

آج کا دن شمالی علاقے کی سی خنکی لئے ہوئے تھا۔ اور آسمان پر گنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ لیکن تیز ہوا سرسوں کی اجتماعی چمکدار زردی اور ارد گرد کے پہاڑوں اور میدانوں کی وسعت مسرور کن اثرات پیدا کر رہی تھی۔ اور یہ خیال کہ یہ سفر ہمارے پچاس سفروں میں سے آخری تھا۔ اسے انتہائی خوشی کی حد تک بلند کر دیتا تھا۔ ہمارے سامنے وہ پہاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ جنکے دامن پر سے کبھی سکندر کا لشکر پنجاب فتح کرنے کے لئے گذرا تھا۔

کچھ نہ کچھ لاچار ہو کر میں ایک مرتبہ پھر بنک کو دیکھنے کے لئے رضا مند ہو گیا۔ لیکن مجھے اس پر افسوس نہ ہوا۔ گاؤں ایک پہاڑی پر واقع تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا پہاڑ کی خاکی طرف کو تراش تراش کر ایک دوسرے کے اوپر مربع ٹکڑے بنائے ہوئے تھے۔ اور پھر ان میں سرکنڈے والی گرہ دی ہوئی تھی۔ ہم نے ۲۵ زمینداروں اور مزارعین کو اپنے استقبال کے لئے انتظار کرتے ہوئے دیکھا۔ ماقبل الذکر دیہاتیوں میں سے اکثر تعلقہ دار تھے۔ یہ مقابلہ ان لوگوں کے جنہیں ہم نے کل دیکھا تھا۔ یہ لوگ زیادہ خوشحال تھے۔ مثلاً ہل چلانے کے لئے کوئی گائیں استعمال نہیں کرتا تھا۔ انہیں ان کی ضرورت دودھ حاصل کرنے اور نسل بڑھانے کیلئے تھی۔ بعض بھینسیں بھی پالتے تھے۔ وہ انہیں ضروریات میں سے خیال کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان کے بغیر ہم جی نہیں سکتے۔ ہمیں گھی نہ ملیگا۔ اور مہمان کیلئے دودھ بہم نہ پہنچے گا۔ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضروریات کا خیال کتنی مناسبت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس علاقے میں جسمیں سے ہم اس ہفتہ گذرے ہیں۔ میں نے ایک بھینس بھی نہیں دیکھی تھی۔ البتہ وہ موجود ہیں۔ (گندا ہیں ایک کا ذکر کیا گیا) کہ ایسی چھپڑیاں مہیا نہیں کر سکتا۔ جسمیں وہ لوٹیں۔ کل کے

تقریباً تمام لوگ ساہوکار اور بنک دونو کے مقروض تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ بنک نے روپیہ ادھار لینے کے لئے ایک دوسرا دروازہ کھول دیا ہے۔ جب یہاں بنک کھولا گیا۔ تو انیس ممبروں میں سے صرف ایک مقروض تھا۔ اب سب نے قرض لیا ہوا ہے۔ اور خاص طور پر مویشیوں کی خرید کے لئے۔ دو آدمیوں نے تجارت کیلئے بھی۔ دونو بنک یہ ظاہر کرتے ہیں۔ کہ انجمن قرضہ کس آسانی سے قرضہ بڑھا سکتی ہے۔ جب تک یہ پیداوار کیطرف رہنمائی کرے اسمیں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن یہ بات ہندوستان میں بہت کم ہے۔ اس کے برعکس حالات کو روکنے کے لئے بہت زیادہ تعلیم اور نگہبانی کی ضرورت ہے۔ گاؤں کی خوشحالی کی معمولی سی علامت وہ بات تھی۔ جو اس وقت کہی گئی۔ جب ہم شادی کی عمر کے متعلق بحث کر رہے تھے۔ بیس سال گذرے کوئی نوجوان عطر نہیں لگایا کرتا تھا۔ جب تک کہ وہ اٹھارہ برس کا نہ ہو جائے۔ لیکن اب وہ دس برس کی عمر سے ہی شروع کر دیتا ہے۔ صوبے کے اکثر حصوں میں شادی کی عمر اوپر کی طرف جا رہی ہے۔ لیکن یہاں یہ دوسری طرف جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اور لڑکے بچپن میں ہی آنکھیں لڑانا شروع کر دیتے ہیں۔

خوراک گھر اور کپڑے :- اس ضلع میں جہاں تک ہم نے دیکھا ہے۔ اس جگہ معیار زندگی سب سے زیادہ بلند ہے۔ بلا شبہ اس وجہ سے کہ یہاں پانی بہت ہے۔ اور ہم سڑک اعظم کے قریب ہو رہے تھے۔ تمام کے تمام فی کس دس سے بیس مرغیوں تک رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ گذشتہ موسم گرما میں سب مرغیوں کا ہیضے کی وبا نے کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن سب خانگی اخراجات کے لئے سب کے سب کسی نہ کسی قسم کا دودھ دینے والا جانور بھی رکھتے تھے۔ لیکن ایک نے کہا کہ ہم مسکین لوگ ہیں۔ جب بچھڑا پیدا ہوتا ہے۔ ہم دودھ اور لسی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن جب گائے سوکھ جاتی ہے۔ تو ہمیں یہ چیزیں دوسروں سے مانگنی پڑتی ہیں۔ کیونکہ ہم زیادہ مویشی رکھنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ ان چوبیس آدمیوں

میں سے گیارہ نے بتایا کہ ہمارے پاس کپڑوں کا صرف ایک جوڑا ہے۔ پنجابی دیہاتی گھر اور خوراک کی نسبت کپڑوں کو بہت کم اہمیت دیتا ہے۔ ہم نے ایک ہل والے ایک فزارع کا گھر دیکھا حسب معمول ایک ہی کمرہ تھا۔ اور تمام کنبہ اسمیں زندگی بسر کر رہا تھا۔ غریبی کی عام علامات یہاں موجود تھیں۔ یہ کمرہ باورچی خانہ بھی تھا۔ اور خوابگاہ بھی۔ رسی کی چار پائیاں پرانی اور بوسیدہ تھیں۔ اور سب سے قیمتی ملکیت ایک چرخہ تھا۔ تاہم ہر چیز نہایت اچھی طرح ترتیب دی ہوئی تھی۔ بستر نہایت صفائی سے تہ کیا ہؤا تھا۔ اور ایک کونے میں لگایا ہؤا تھا۔ اور ایک دیوار کے ساتھ ساتھ مالک مکان کی چھوٹی چھوٹی اشیاء رکھنے کے لئے کیچڑ کے پلستر کے باوجود خوبصورت نقش و نگار والا ایک طاق بنا ہؤا تھا چھوٹی اشیاء میں سے ایک مٹی کی رکابی تھی۔ ایک دیہاتی نے کہا کہ یہ رکابی زینت کے لئے ہے۔ تاکہ جب کوئی شخص گھر میں داخل ہو۔ تو اس کا دل خوش ہو جائے۔ ورنہ اسے غصہ آجائیگا۔ اور تھوکتا ہؤا گھر سے نکل جائے گا۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ دوسروں کے پاس پختہ مکانات اور غالیچے ہیں۔ لیکن ہم زمیندار لوگ صرف ایک ہی گھر رکھتے ہیں۔ اور جتنی خوبصورتی ممکن ہے۔ ہم نے پیدا کی ہوئی ہے۔ ایک طرف اناج کی ایک مزلع کوٹھی تھی۔ جو اچھی طرح پلستر کئے ہوئے گارے سے بنی ہوئی تھی۔ اس کی کھردری سطح کا بھدا پن دور کرنے کیلئے اس پر پھولوں کے نمونے بنائے ہوئے تھے۔ لکڑی کی وہ کھڑکی جو کھلی جگہ کو بند کرتی تھی۔ روغن کی ہوئی اور منقش تھی صریح غربت میں خوبصورتی اپنی انتہائی دہقانی صورت میں جھلک دکھا رہی تھی۔ اور جب میں نے گھر چھوڑا تو یہ محسوس کیا تھا۔ کہ اس احساس کا تھوڑا سا حصہ لیکر بھی میں غریب دیہاتی بننا پسند کرونگا۔ بہ نسبت اس کے کہ میں بغیر کسی حس کے دولت مند نواب بن جاؤں۔ اس ہفتہ میں معائنہ کئے ہوئے دیہات کی طرح یہاں بھی مقامی امداد باہمی کافی ہے۔ جب گیہوں صاف کرنا یا کھیت کو ہموار بنانا ہوتا ہے۔ تو پڑوسی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور ٹھیک ایک دن کی خوراک کے بدلے باری باری ایک دوسرے کیلئے کام کرتے ہیں اس طرح اس وقت کیا جاتا ہے۔ جب کسی گھر کو تعمیر کرنا یا اس پر دوبارہ چھت ڈالنی ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک آدمی شہتیر اٹھا کر نہیں لے جا سکتا۔ اور نہ ہی انہیں مٹی سے ڈھانپ سکتا ہے۔ یہ طریقہ ویسا ہی ہے۔ جیسا کہ وسطی پنجاب میں رسم آبت

لیکن یہاں اسے منگلی کہتے ہیں۔ نیز جب قبر کھودنی ہوتی ہے۔ تو امداد بہم پہنچ جاتی ہے۔ کیونکہ اس پتھریلی زمین میں ایک آدمی اس کام کو انجام نہیں دے سکتا سڑکیں تک مشترکہ طور پر مرمت کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ یہ رسم تمام علاقہ میں ہے۔ (لیکن ضلع بھر میں نہیں، بعض اوقات وہ لوگ جو للّٰہ خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ خود بخود باہر چلے جاتے ہیں۔ اور اپنے آپ ہی کسی خراب، حصّے کی مرمّت کر دیتے ہیں۔ ایسے دو آدمی موجود تھے۔ لوگوں نے کہا کہ گردو نواح کے ہر گاؤں میں کوئی نہ کوئی شخص ان جیسا موجود ہے۔ ایک گاؤں میں ایک مالیار ہے۔ جو اپنے وقت کا بہت سا حصہ اسی طرح گذارتا ہے۔ پندرہ برس گذرے جب وہ ٹھیک پچاس برس کا تھا۔ اسکی بیوی اور بچے پلیگ سے مر گئے۔ اس نے کھیتی کرنی چھوڑ دی اور اپنے آپ کو اللّٰہ کی راہ میں کام کرنے کیلئے وقف کر دیا۔ اس کی خدمت اسی قسم کی ہوتی تھی۔ اس کا گاؤں حسن ابدال سے پندرہ میل پر ہے۔ مہینے کے اکثر ایام میں وہ ان دونو جگہوں کی درمیانی سڑکوں پر کام کرتا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ دوسرے گاؤں کو جانیوالی سڑکوں اور راستوں کی مرمّت بھی کرتا ہے۔ رات کو گاؤں کی مسجد میں آرام کرتا ہے۔ اور خوراک کیلئے سخی لوگوں کے دئیے ہوئے ٹکڑوں پر قناعت کرتا ہے۔ اس واقعہ سے طیما کی یاد آئی جسکا حال ڈاؤٹی نے بیان کیا ہے۔ یہ شخص چاروں بیٹوں کے مرجانے پر اس امید پر دوسروں کی حاجتیں برلاتا تھا۔ کہ خداوند تعالےٰ آخرکار اس پر رحم فرمائیگا۔

ہم ایک یا دو میل سوار چلے اور میدان سے ابھرتے ہی میں نے سفید گرد کا ایک بھرپرا دیکھا۔ یہ ایک گذرتی ہوئی موٹر کار سے پیدا ہو رہا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی۔ کہ ہم اس سڑک اعظم کے قریب ہو رہے تھے۔ جو راولپنڈی سے پشاور جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد ہم نے اس خوشگوار۔ نرم۔ بھوری کچی سڑک کے جس پر ہم گھوڑے سوار چل رہے تھے۔ بالکل مقابلے میں سخت سفید سیدھی اور چمکدار سڑک کو دیکھا اور مقابلہ کرنے سے دونو کے درمیان مشرق و مغرب کا بہت سا فرق معلوم ہوتا تھا اس لئے گھوڑے پر سوار ہونے کی اور سات سو میل کی مہم ختم کرنے کی خوشی کی وجہ سے میں اس امر پر شبہ نہ کر سکا کہ میں نے کس کو ترجیح دی تھی۔ دریائے اسپیرو کو عبور کرنے کے بعد ہم جلد ہی حسن ابدال کی زرخیز، ۔دیا فی دی ہوئی زمین

پر گرتے پڑتے چل رہے تھے۔ وہ پہاڑی جو کبھی ناشائستہ فقیر اور سنت بابا نانک کے جھگڑے کی نظارہ گاہ ہوتی تھی۔ ہمارے سروں کے اوپر کھڑی تھی۔ اب بھی دونوں کی عزت کی جاتی ہے۔ سنت کی تو مچھلیوں سے بھرے ہوئے اور شفاف پانی والے تالاب کے نزدیک پوجا کر کے اور فقیر کی ہر رات کو چراغ جلا کر۔ جسکے لئے عجیب لیکن دیرینہ مقدس رواج کے مطابق مقامی سب انسپکٹر پولیس بہت خرچ ادا کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ یہ خرچ اس لئے دیا جاتا ہے۔ کہ ایسا نہ ہو کہ اس حلقے سے جو کبھی بہت مشہور تھا اس کا تبادلہ وقت سے پہلے ہو جائے۔

اس احساس کے ساتھ جس کے امکان کا گیارہ ہفتے پہلے خیال نہ آیا تھا۔ میں نے اپنی کرایہ کی گھوڑی کو آخری مرتبہ منہ بھر کر گڑ دیا اور لاہور کے لئے ریل گاڑی میں سوار ہو گیا۔ (۱۲ میل)

خاتمہ

۱۶ مارچ اناکیپری (نیپلز کے قریب ایک جزیرے میں ایک گاؤں)

آج صبح بلیو گروٹو تک چل کر میں ایک دیہاتی سے ملا۔ جو بندوق اُٹھائے ایک پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ وہ ایک سیدھا سادا ڈھیلا ڈھالا آرام دہ لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھیں سیاہ و چھوٹی تھیں۔ اور رنگ تازگی بخش گندمی تھا۔ راستے کے متعلق سوال پوچھنے پر گفتگو شروع ہوگئی۔ اپنے کنبے کے دوپہر کے کھانے کیلئے ایک قسم کی چڑیوں کا بعد تو شکار کر رہا تھا۔ دریافت کرنے پر اس نے کہا ہاں یہ میرا کتا ہے۔ دیہاں چڑیاں پکڑنے والے کتے نہیں ہیں) اور یہ میرے باغ کا بڑا دروازہ ہے۔ میں نے پوچھا کیا آپ مجھے اسکے اندر نہیں لیجائیں گے۔ ہم اندر داخل ہوگئے اور اس نے اطالوی دیہاتی کی سی خوشگوار بے ساختگی سے مجھے اپنی زندگی کے متعلق بتانا شروع کیا۔ جنگ عظیم کے بعد بہت سے دوسرے اطالیوں کی طرح وہ امریکہ میں اپنی روزی تلاش کرنے گیا۔ آٹھ سال بونس ایرز میں تجارت کرنے کے بعد وہ ۱۰۰۰ روپیہ کا سرمایہ لیکر کیپری واپس آیا اس کا کچھ حصہ اس نے ۱/۲ ۱ ایکڑ زمین خریدنے میں لگا دیا۔ جو کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ اور باقی ایک بنک میں جمع کرا دیا۔ جو ۵۰ ۱۶ روپیہ سالانہ سود دیتا ہے۔ اس کی مدد سے وہ ایک بیوی اور چار بچوں کو پال سکتا ہے۔ بچوں میں سب سے بڑا دس برس کا ہے۔ اسکے بغیر اسے ۱/۲ ۲ ایکڑ زمین کی ضرورت ہوگی۔ زمین قیمتی بنانے والی چیز انگور کی بیلیں اور زیتون ہیں۔ یہ حقیقت کہ اسے اچھی طرح کاشت کیا ہوا تھا۔ اور کوئی کونہ خالی نہیں چھوڑا ہوا تھا۔ اسے بہت زیادہ زرخیز بنا دیتی ہے۔ انگور کی بیلوں کے درمیانی حصوں میں گیہوں بوئی جاتی ہے اور زیتون کے درختوں کی دیہاتی جگہوں میں سبزیاں اور آلو کاشت کیے جاتے ہیں اس نے دیہاتی فطری احتیاط کو مدنظر رکھ کر یہ کہا کہ ہر ایک چیز تھوڑی تھوڑی ضرور اگانی چاہیئے۔ وہ شراب اور تیل کا اکثر حصہ فروخت کر دیتا تھا دیہ دونو اس

کی تاجرانہ فصلیں تھیں) لیکن باقی تمام چیزیں وہ اولاً اپنی ہستی کو قائم رکھنے کیلئے اگاتا تھا۔ اور وہ چیزیں فروخت کرتا تھا۔ جنہیں اسکا کنبہ اپنے استعمال میں نہ لا سکتا تھا۔ خرید کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ زیادہ تر کافی چینی اور کپڑے خریدے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی گوشت بھی خریدا جاتا ہے۔ یہ آخری چیز ہوتی ہے۔ جسے وہ جمعرات اور اتوار کے دن کھاتے ہیں۔ تھوڑے سے خرچ پر مختلف قسم کی غذا یقینی طور پر حاصل کرنے کے لئے وہ پچاس کے قریب مرغیاں ایک عمدہ سوئر جسکا وزن ۲۶۰ پونڈ ہے۔ دودھ کے لئے ایک بکری بے شمار خرگوش اور ایک جوڑا کبوتروں کا رکھتا ہے۔ تمام کے گھر سادہ لیکن کافی اچھے بنے ہوئے تھے۔ اس نے اطمینان بھری مسکراہٹ سے بتایا کہ کبوتر ہر ۲۹ دن کے بعد بچے دیدیتے ہیں۔ ان مختلف قسم کے چرپائیوں کی بنجال بھی زمین میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ کھاد پر صرف ۲۰ روپیہ سالانہ صرف کئے جاتے ہیں۔ کوئی گائے یا بیل نہیں رکھا جاتا۔ جائداد اس قدر کم ہے۔ کہ ہل کی بجائے کدال استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی بیوی کھیت کے کام میں اس کی امداد کرتی ہے۔ اور ہر اس کام میں جو وہ کرتا ہے۔ اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ یہاں تک کہ کدال سے کھودنے میں بھی اگر وہ اس طرح اس کی امداد نہ کرے تو اسے کوئی شخص امداد کے لئے ملازم رکھنا پڑے۔ اور وہ اس خرچ کے برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ وہ ساڑھے پانچ بجے اٹھتے اور ساڑھے نو بجے بستر پر لیٹ جاتے تھے۔ میں نے شادی کے متعلق دریافت کیا تو اس نے کہا کہ لڑکیوں کی شادی اٹھارہ یا بیس برس میں کی جاتی ہے۔ لیکن جوان آدمی پچیس یا چھبیس برس کی عمر تک انتظار کرتے ہیں شادی پر ۴۰۰ سے لے کر ۱۰۰۰ روپیہ تک خرچ آجاتا ہے۔ اسمیں طرفین کا خرچ اور زیورات اور پارچات کے مصارف شامل تھے۔ عام طور پر زیورات پر ۲۰۰ روپیہ سے زیادہ نہیں خرچ کئے جاتے۔ اگر کسی وقت روپیہ ادھار لینے کی ضرورت پڑے تو یہ ۶ سے لیکر ۱۱ فیصدی تک سود پر لیا جا سکتا تھا آخر الذکر شرح زیادہ سے زیادہ شرح سود تھی۔ وہ خود ۴½ سے ۵ شرح سود پر روپیہ ادھار لیتا تھا۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ وہ اپنے روپیہ کو بطور ضمانت رہن رکھ سکتا تھا۔ اس کی نظروں سے اطمینان ٹپکتا تھا۔ اور اس کی وجہ

یہ تھی کہ اس کے پاس گذارے کے لئے کافی کچھ تھا۔ کام کی بہتات تھی ایک عمدہ سادہ طور پر آراستہ کیا ہوا گھر تھا۔ جس کے چاروں طرف اس کی زمین تھی۔ (نصف درجن مختلف ٹکڑوں میں تقسیم شدہ تھی۔) سخت ضرورت کے وقت روپیہ کی ایک مناسب رقم بہم پہنچ سکتی تھی۔ اور سمندر پار رہنے کی وجہ سے کچھ تعلیم اور تجربہ حاصل تھا۔ اور پیچھے نزدیک ہی دنیا کا سب سے زیادہ خوبصورت سمندر اپنی آب وتاب دکھاتا تھا۔

رکن ۶

تیسرا حصّہ

نتائج
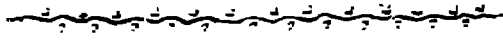
اثرات

باب دوازدہم

ساہوکار۔ تعلقہ دار اور پیر

پرانی و نئی تہذیب

ساہوکار اور اس کا رقیب د- ڈاروِن کہتا ہے۔ کہ مجھے واقعات اور حقائق سے ابتدا کرنی چاہیئے۔ نہ کہ ایک اصول سے (جسمیں ہمیشہ کسی نہ کسی مغالطہ کا شبہ ہوتا ہے۔) اور جتنا زیادہ نتیجہ چاہو گے پیدا ہو جائے گا۔ اب ہم نے اپنے واقعات جمع کر لئے ہیں۔ اور اب نتائج کے اخذ کرنے اور عام اثرات کو ظاہر کرنے کا وقت آگیا ہے۔ بعض حالات میں واقعات ماقبل الذکر کی صداقت کے لئے کافی ہیں۔ دوسری صورت میں (اور بھی زیادہ) صرف آخرالذکر کے متعلق میں روپیہ قرض دینے والے سے شروع کرتا ہوں۔ یعنی اس شخص سے جسے عام اصطلاح میں ساہوکار کے نام سے پکارتے ہیں۔ کیونکہ دیہاتی کے بعد گاؤں کی زندگی کا سب سے اہم جزو وہ ہے۔ تقریباً ہر جگہ ہم نے اسکی طاقت کو زوال پذیر دیکھا ہے۔ جہاں کہیں اسکا مالی اقتدار جما ہوا ہے۔ اس کا نفسیاتی اثر کمزور پڑ گیا ہے۔ وہی ساہوکار جو کبھی گورنمنٹ کا لاڈلا بچہ تھا۔ اب سوتیلا بیٹا بن گیا ہے۔ اور اب وہ دیہاتی کی زمین اور مقبوضات پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے۔ تو اسے اپنے سامنے قانونی حقوق و استحقاق کے ناگ پھن کی باڑ نظر آتی ہے۔ گذشتہ تیس سال میں دیہاتی کو بے دخلی اور قرقی سے بچانے کے لئے استحقاق کا زیادہ حصہ اسے مرحمت کیا گیا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد سے ان حقوق کی مہربانی سے دیہاتی بہت کچھ جاندار ہو گیا ہے۔ اور وہ اشتمال اراضی کے قواعد بھی جلد جلد سیکھ رہا ہے۔ صوبے میں اب ۲۰۰۰۰ انجمہائے امداد باہمی ہیں۔ جن میں سے تقریباً

۱۹۰۰۰ دیہاتی بنک ہیں۔ ان بنکوں کے ممبروں کی تعداد ۴۵۰۰۰۰ سے زیادہ ہے۔
چونکہ ان میں سے اکثر لوگ اپنے کنبوں کے سردار ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۵ ملین
(ایک کروڑ پچاس لاکھ) آدمیوں میں سے جن کا گذر کاشتکاری پر ہے۔ بیس لاکھ
دیہاتی بنکوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسلئے امداد باہمی ساہوکار کے لئے
ہیبتناک رقیب بن گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسکا ایک رقیب اور بھی ہے
جو اتنا ہی مہیب ہونے کی دھمکی دیتا ہے۔ وہ کاشتکار ساہوکار ہے۔ میں نے
کہیں اسکا مفصل ذکر کیا ہے۔ اور یہاں محض اس بات کے اضافہ کرنے کی
ضرورت ہے۔ کہ بہت سی علامتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ مستعدی سے آگے
بڑھ رہا ہے۔ خاص طور پر وسطی پنجاب اور نہری آبادیوں میں جہاں سکھ جاٹ غالب
ہے۔ صرف لائل پور تحصیل میں غالباً ۱۰۰۰ اسکھ ہیں۔ اور تمام صوبہ میں اس تعداد کا
بیس گنا ہیں۔ قانونی محافظت (جو کاشتکار کو دی گئی ہے) امداد باہمی کی اشاعت
اور کاشتکار ساہوکاروں کی ترقی ان تینوں باتوں کا مجموعی اثر یہ پڑا ہے۔ کہ ساہوکار
گاؤں سے نقل مکانی کر کے شہروں میں چلے گئے ہیں۔ یہ بات لائل پور میں خاص
طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ہوشیارپور میں ہمیں اس سے سابقہ پڑا ہے۔ نہری
آبادیوں میں ساہوکار اس دباؤ کو اس تیزی سے محسوس کر رہا ہے۔ کہ اس نے اپنے
مفاد کی حفاظت کے لئے ایک منظم جماعت بنائی ہے۔ اور تقریباً ہر جگہ ساہوکار
سے ملاقات کے یہ معنی ہیں۔ کہ تجارتی مشکلات کی شکایت یقینی طور پر بلند آواز
میں سنی جائے۔ حاصل کلام یہ ہے۔ کہ ساہوکار کا پچاس سالہ مختصر اقتدار جاتا
رہا ہے۔ اور اس کی طاقت اگرچہ عام طور پر پسپا نہیں ہوئی۔ لیکن بری طرح
سے ہلا دی گئی ہے۔

اگر پیشہ ور ساہوکار کی طاقت روبہ زوال ہے۔ تو اس زوال کی وسعت میں
علاقہ در علاقہ بہت زیادہ اختلاف ہے۔ ہوشیارپور اور جالندھر جیسے علاقوں
میں جہاں دیہاتی کی آنکھ کھلی ہوئی ہے۔ روپیہ کافی اور امداد باہمی کے پاؤں جمے
ہوئے ہیں۔ اور ہر ضلع میں ایک ہزار سے زیادہ انجمنیں ہیں۔ اس کی طاقت بالکل
ٹوٹ گئی ہے۔ لیکن جہاں سلسلہ آمدورفت خراب اور منڈی دور ہے۔ جیسا
کہ ہمالیہ کے دامن کی پہاڑیوں میں اور جہاں گوڑگانواں اور مظفرگڑھ کی طرح لوگوں

کی غربت مایوسی کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ اور وہ سراسر لاچار ہیں۔ اسکی طاقت قریب قریب بحال ہے۔ اور وہ اب بھی عین کھلیان میں سے جتنا کچھ وہ لے جا سکتا ہے۔ لے جاتا ہے۔ اور ایندھن چارہ اور گھی جیسی معمولی واجبات سے زمیندار کو تنگ کرتا ہے۔ جہاں اس کی طاقت ٹوٹ چکی ہے۔ اس جگہ بھی یہ سوال باقی ہے۔ کہ آیا اسے اسطرح گاؤں سے باہر نکالا جا سکتا ہے۔ یا نہیں جیسا کہ جرمنی اور اسٹریلیا میں کیا گیا ہے۔

بہت کچھ زیادہ تر اس بات پر منحصر ہے۔ کہ آیا ایک معمولی بنک اپنے ممبروں کی تمام رسومات کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اب تک مقابلتاً دیکھا جائے تو صرف چند ایسا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اور بہت سے ممبر (۳۰ سے ۴۰ فیصدی تک) دیہاتی بنک اور ساہوکار دونو سے لین دین کرتے ہیں۔ اسکی ایک وجہ یہ ہے۔ کہ شادی کے لئے روپیہ ادھار لینے کی رسم قریب قریب عام ہے۔ کوئی دیہاتی بنک اپنے ممبروں کے نفع یا اپنی سلامتی کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسی بڑی رقمیں دینے پر غور نہیں کر سکتا۔ جنکی اس مقصد کے لئے عام طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ساہوکار روپیہ وصول کرنے میں زیادہ تجربہ کار ہونے کی وجہ سے اور صرف اپنے مفاد کا خیال رکھنے کی وجہ سے اکثر انہیں روپیہ دیدیگا۔ اور ان وجوہات کی بناء پر جنکی تشریح کی جا چکی ہے۔ وہ انجمن کی نسبت بڑا نقصان اٹھانے کیلئے تیار ہے۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ اس کا دروازہ اُس وقت بھی کھلا رہتا ہے۔ جبکہ بنک اس سے بہت پہلے بند ہو جاتا ہے۔ لاچار اور فضول خرچ لوگ اس دروازے کے گرد آتے ہیں۔ اور جب تک ان لوگوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ساہوکار ضرور پھولے پھلیگا۔

رہن رکھنے والے بنک :- اگر شادیوں کے فضول اخراجات بند کر دیئے جائیں - اور لاچار و فضول خرچ لوگوں کو کفایت شعار تاجروں میں تبدیل کر دیا جائے تو بھی ساہوکار کو باہر نکالنے کے لئے دیہاتی بنک ناکافی ہوگا۔ کیونکہ یہ قلیل المیعاد قرضوں کا لین دین کرتا ہے۔ جو زیادہ سے زیادہ تین سال کے بعد دیے جاتے ہیں۔ کوئیں اتارنے گھر تعمیر کرانے زمین خریدنے اور پرانے قرضے بے باق کرنے کیلئے طویل المیعاد قرضوں کی زیادہ ہی زیادہ

ضرورت ہوگی۔ ایسے قرضوں کے لئے کاشتکار ضرور ساہوکار کے پاس جائے گا۔ اور اگر زمین رہن کرانا لازمی ہوا تو وہ اس کے لئے بھی تیار ہوجائیگا۔ حال تک بھی صوبے میں رہن رکھنے کا معاملہ ساہوکار کے ہاتھوں میں تھا۔ لیکن ۱۹۰۱ء میں ایکٹ انتقال اراضی نے اس کے لئے دیہاتی سے زمین لینا حقیقی طور پر ناممکن بنادیا۔ البتہ یہ نہایت ثابت قدمی سے کاشتکار ساہوکار کے پاس جاتی رہی ہے۔ جس کے راستے میں اس قسم کی رکاوٹ نہیں ہے۔ اس لئے اگر ساہوکار کے خلاف بطور ہتھیار رہن بنک کی ضرورت ہے۔ تو کاشتکار ساہوکار کے خلاف اس کی دوگنی ضرورت ہوگی۔ اس کی محافظت کے بغیر یہ خطرہ ہے کہ ایکٹ انتقال اراضی کے باوجود دیہاتی کی یہ چیز بڑے پیمانہ پر دوسرے کے پاس نہ جانی شروع ہوجائے۔ مغربی پنجاب میں جہاں بڑا تعلقہ دار دیہاتیوں کا نقصان کرکے اور اپنی زمین میں اضافہ کرکے ایکٹ سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس کے امکان کی علامات پہلے سے موجود ہیں۔ لیکن اگر رہن رکھنے والے بنکوں کی ضرورت ہے۔ تو اس بات کا یقین کرنا کہ وہ نقصان پہنچانے کی بجائے اچھا کام کریں گے۔ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بعض خیال کرتے ہیں۔ کہ روپیہ صرف دیہاتی کے دامن میں ڈال دینا پڑتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے قرض کا بوجھ اتارے اور ترقی کرے۔ دوسرے جو عمل کو پسند کرتے ہیں۔ وہ فوری مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر قرضے کو اگر اسے پورا کرنے کیلئے کافی ٹھوس ضمانت موجود ہے جائز خیال کرتے ہیں۔ خواہ رقم قرضہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ قرضے کی ضرورت ہے۔ اس لئے دے دینا چاہئیے۔ یہ سوال کہ اس سے فائدہ ہوگا یا نقصان مدنظر نہیں رکھا جاتا۔ اگر ہم ایک ایسے کفایت شعار اور دور اندیش کاشتکار سے لین دین کرتے ہیں۔ جیسا کہ فرانسیسی دیہاتی تو اس پر غور کرنیکا کوئی موقعہ نہ ہوتا۔ لیکن ہندوستانی دیہاتی شاذ ہی کفایت شعار یا دور اندیش ہوتا ہے۔ اس لئے اس صورت میں یہ سوال نہایت ضروری ہے۔ نرائن گڑھ کا مارگیج بنک یہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ دنیا میں بہترین ارادوں والے بنک کے لئے غیر دوراندیشانہ طور پر قرض دینا کتنا سہل ہے۔ اور ہم نے بارہا دیکھا ہے۔ کہ آزادانہ قرض لینے کی قدرت حاصل کرکے دیہاتی مشکلات اور قرض کی خطرناک دلدل میں پھنس جاتا ہے

ایسی جگہوں کے واسطے جہاں روپیہ کو عقلمندی سے استعمال کرنے کے لئے کافی سمجھ یا اسے بروقت ادا کرنے کے لئے اخلاقی مادہ نہیں ہے۔ جھنگ کے مار کیبچ بنک میں ۱۲ اناد ہندوں کا وجود روپیہ مہیا کرنے اور ایسے بنکوں کو بہت جلد بڑھانے کے خطرات کی ایک اور اطلاع ہے۔

اخلاق اور مالی حالت :- اخلاق اور عمدہ مالی حالت کے باہمی گہرے ارتباط پر وضاحت سے روشنی ڈالنا تحصیل حاصل ہے۔ حال ہی میں میں نے آسٹریا میں ایک رہن رکھنے والا بنک دیکھا جو دس لاکھ کی رقم میں سے طویل المیعاد قرضوں کیلئے روپیہ دے رہا تھا۔ اور جو بعض اوقات ۵۷ برس کیلئے لئے جاتے تھے۔ حیرانی ظاہر کرنے پر مجھے بتایا گیا۔ کہ بنک یہ کام بیالیس برس سے کرتا رہا تھا۔ اور اسمیں کوئی خطرہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ دیہاتی جن سے یہ عام طور پر لین دین کرتا تھا۔ اتنے کفایت شعار محنتی اور معتبر تھے۔ کہ قرضے شاذ ہی خطرے میں تھے۔ اور رہن شدہ زمین چھوڑنے کی ممانعت بہت کم دیکھنے میں آتی تھی۔ مینہ آندھی کی طرح متواتر برستا رہتا ہے۔ اس لئے جمع امانت داروں کے مطالبات ہمیشہ پورے کئے جا سکتے ہیں۔ یہ واقعہ اس وقت ادھار دینے کے امکانات پر روشنی ڈالتا ہے۔ جبکہ لوگ محنت کرتے ہوں۔ سوچ سمجھ کر خرچ کرتے ہوں۔ اور ذاتی طور پر قابل اعتبار ہوں۔ مختصر یہ کہ جب ان میں اخلاق ہو۔ ساکھ کے معنی ہی اخلاق کے ہیں۔ اور جہاں یہ نہیں ہے۔ وہاں جتنا ادھار دینا خطرناک ہے۔ اتنا ہی ادھار لینا اخلاق کو پست کرنے والا ہے۔ یہ ذوقت منظفر گڑھ اور گوڑ گاؤں جیسے لیس ماندہ اضلاع میں ہے۔ ایک طرف دیہاتی روپیہ کے بغیر ساہوکار کا جوا اتار کر نہیں پھینک سکتا۔ دوسری طرف اس پر یہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خوشی سے چھوٹی سے چھوٹی رقمیں بھی ادا کردیگا۔ اس لئے معمولی رقیں بھی اس صورت میں پیشگی دی جا سکتی ہیں۔ جبکہ نہایت اچھی طرح نگہبانی کرنا ممکن ہو۔ یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اگر پنجاب کے دیہاتیوں کا اخلاق ہر جگہ ویسا ہی ہوتا جیسا کہ جالندھر میں تو جتنی رقم اس وقت سہولت سے دی جاتی ہے۔ اس سے دوگنی رقم بھی پیشگی دیجا سکتی ہے۔ روپیہ موجود ہے۔ یا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بقدر احتیاج اخلاق فہم کی کمی ہے۔ عام دیہاتیوں نے ابھی نفع بخش وغیر نفع بخش اخراجات میں تمیز کرنی

اور حاقبل الذکر کیلئے ادھار لینا اور آخر الذکر کیلئے بچانا سیکھنا ہے۔ اور جب کبھی وہ ادھار لے ہمیشہ قرض کو اسی مقصد کے لئے استعمال کرے۔ جسکے لئے یہ ادھار لیا گیا ہے۔ اسے یہ بھی سیکھنا ہے۔ کہ لیت ولعل کیلئے ہر ممکن بہانہ سازی کرنے کی نسبت قرض کی ادائیگی میں پابندئی وقت سے کام لے۔ اپنے اخراجات کم کرے اور نادہندگی کی بجائے دہندگی کے جذبہ کو بڑھائے۔ اپنی سمجھ اور کفایت شعاری سے اس حالت میں گذارہ کرے۔ جس میں پہلے نہ ہو سکتا ہو۔ اور کافی عرصے میں برے وقت کیلئے کچھ رقم پس انداز کرے۔ مختصر یہ کہ بجائے اس کے کہ کسی مجبوری کے پیش آنے پر اسے ٹالے اسکے آنے سے پہلے ہی اسکے لئے تیار ہو جائے۔ اس لئے دیہاتی کی مالی مشکلات کا انسداد کرنے کیلئے اسکے اخلاق کو سنوارنا اور اس کی سمجھ کو ترقی دینا ضروری ہے۔ اور جہاں ایک دفعہ یہ شے حاصل ہوگئی تو روپیہ گاؤں میں پانی کی طرح برسیگا۔ ہمارے ۱۶۰۰۰ دیہاتی بنک اسی امر کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور جہاں وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لوگ اپنے آپ کو قرض سے نجات دے لیتے ہیں۔ اور اتنا ہی روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ جتنی کہ انہیں ضرورت ہوتی ہے۔ مہتہ لوگ جن سے کہ ہم ہوشیار پور ضلع میں ملے تھے۔ اس امر کی ایک اچھی مثال ہیں۔ وہ اتنی محنت سے کام کرتے ہیں۔ اور اتنی کفایت شعاری سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ کہ ساہوکار ان پر کوئی اختیار نہیں رکھتا اور اب انہیں دیہاتی بنک سے روپیہ ادھار لینے کی نسبت اسمیں اپنا روپیہ جمع کرانے کی زیادہ ضرورت ہے۔ لائل پور کے لدھیانہ والے سکھ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مالی آزادی بنک کی امداد کے بغیر بھی حاصل کیجا سکتی ہے۔ لیکن وہ مستثنے ہیں۔ اگر یہی صورت عام ہوتی تو زمین کی ترقی کیلئے رہن رکھنے والے بنک جنکی تعداد اب صرف بارہ ہے۔ ہر جگہ جاری کئے جا سکتے ہیں اور دیہاتی ساہوکار کو گاؤں سے جلد رخصت کیا جا سکتا ہے۔

شرح سود:۔ ایک بات میں دیہاتی ساہوکار پر غیر منصفانہ تنقید کی جاتی ہے۔ مثلاً اس کے سود کی شرح۔ دیہاتی تعلقہ دار کیلئے وہ ۱۲ سے ۲۴ فیصدی تک ہے۔ اور عام شرح پیسہ روپیہ ہے۔ ایسے علاقوں میں جہاں تعلقہ دار و مزارعین کی حالت گری ہوئی ہے۔ اور وہ لاچار ہیں۔ شرح سود ۳۷½ فیصدی تک بڑھی ہوئی ہے۔ عام طور پر سود کی شرح روپیہ بہم پہنچانے۔ اسکی مانگ

اسے ادھار دے کر خطرے میں پڑنے اور اسے وصول کرنے میں تکلیف اور خرچ کے لحاظ سے مختلف ہے۔ پہلی باتوں سے ہم سب واقف ہیں۔ لیکن آخری بات کے متعلق سوائے ساہوکار کے اور کوئی نہیں سوچتا حالانکہ یہ بھی اتنی ہی اہم ہے۔ جتنی کہ کوئی دوسری بات ایک کوتاہ اندیش کاشتکار سے ۱۰۰ روپیہ وصول کرنے میں اتنی ہی وقت اور خرچ ہے۔ جتنی کہ ایک اچھے سوداگر سے ایک لاکھ روپیہ وصول کرنے میں اور چونکہ خطرہ اور تکلیف پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ سود کی شرح زیادتی کی طرف مائل ہے۔ ۱۹۲۶ء میں ڈچ ایسٹ انڈیز کی حکومت نے جو کہ مختلف طرح سے روپیہ کے لین دین کا بے حساب کام کرتی ہے۔ ۱۹ کروڑ روپیہ ادھار دیدیا جسکی اوسط ۵ کروڑ چیزوں کی ضمانت پر جو قرض خواہوں نے رہن رکھ دی تھیں صرف تین روپیہ فی شے تھی۔ شرح سود بارہ سے بہتر فیصدی سالانہ تک مختلف تھی۔ اور اگرچہ اوسط شرح ۴۴ تھی۔ لیکن سال کے لین دین پر جس قدر خالص منافع ہوا وہ صرف چوبیس فیصدی تھا۔ اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ اخراجات کا اندازہ ۲۰ فیصدی ہے۔ اور اگر اسی شرح سے سود لیا جاتا تو قطعاً کوئی منافع نہ ہوتا اور چونکہ ہر قرضہ نہایت اچھی طرح محفوظ تھا۔ اس کا یہ مطلب بھی نکلتا ہے۔ کہ یہ ۲۰ فیصدی لین دین کرنے کے خرچ کی بجائے اس کے خطرے کو ظاہر کرتا ہے۔ ہندوستان کے دیہاتی حالات سے زیادہ گہرے مشابہ شاید جاوا کے ۴۰۰۰ نیم بنک ہائے امداد باہمی ہیں۔ اگرچہ ان کے قرضے رہن رکھنے کے لین دین سے زیادہ بڑے ہیں۔ ان کی شرحیں اور بھی زیادہ ہیں۔ اور ۳۰ سے ۸۰ فیصدی تک ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ میں جہاں کہ سرمایہ کی زیادہ سے زیادہ بڑی مقررہ شرح سود ۱۲ فیصدی ہے۔ اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ کہ (یونی فارم سمال لون لاء)
ضابطہ مساویانہ ہائے مختصر منظور کیا جائے۔ جو ایک خاص مقدار اور قسم کے قرضوں پر ۴۲ فیصدی سالانہ (۳½ فیصدی ماہوار) سود وصول کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ یہ شرح بالکل منصفانہ ہے۔ کیونکہ ایسے قرضے دینے میں خطرہ زیادہ ہے کیونکہ ان کی مدت طویل ہوتی ہے۔ قرضہ دینے کے اخراجات زیادہ ہوتے ہیں۔ اور ضمانت عام طور پر اس قسم کی نہیں ہوتی۔ جیسے ایک تجارتی بنک

قبول کرے۔ ایک امریکن مصنف تو یہ بھی لکھتا ہے۔ کہ اگر ضرورت مند قرض خواہ ۱/۲ ۳
فیصدی ماہوار سے کم شرح پر سود لینا چاہتا ہے۔ تو وہ قرضہ کی پابندہ و منظم جماعت
یعنی امداد باہمی قرضہ کے ذریعے اپنی نجات
حاصل کرے۔ انگریز ساہوکارہ ایکٹ ۱۹۲۷ء اسی نظریے کو دوسری صورت
میں پیش کرتا ہے۔ کیونکہ یہ زیادہ سے زیادہ ۴۸ فیصدی شرح سود کی اجازت
دیتا ہے۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو پنجاب کی مروجہ شرح جب تک اسے
ایمانداری سے لگایا جاتا ہے۔ زیادہ نہیں ہے۔ پس اندازہ کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ
ساہوکار پر اکثر دغابازی و دست درازی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے
کہ یہ الزام کہاں تک انصاف پر مبنی ہے۔ البتہ جہاں دیہاتی معمول کی نسبت زیادہ
لاچار و بے بس ہے۔ وہاں اسمیں سچائی کی بو آتی ہے۔ اس کی کچھ کچھ علامت
جھنگ میں پائی گئی تھی۔ لیکن نئی بستیوں کی طرح جہاں کہیں دیہاتی اپنے مفاد کا
خیال رکھنے کے قابل ہے۔ اور قرض میں زیادہ مبتلا نہیں ہے۔ یہ بات غالباً بے بنیاد ہے۔

شہری اور دیہاتی شرح کا مقابلہ:- کسی اور جگہ میں نے یہ اندازہ لگایا ہے۔
کہ دیہاتی زمیندار اپنے قرض پر ۱۵ فیصدی شرح سود ادا کرتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔
کہ جب صحیح حسابات میں کمی کی بناء پر دیہاتی ساہوکار کی قرض دی ہوئی رقم پر
گول مول شرح سود لگا کر اسکی آمدنی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ تو عام طور پر شرح
یہی ہوتی ہے۔ لازمی طور پر مختلف جگہوں کی شرح مختلف ہے۔ لیکن کہیں یہ بارہ
سے کم یا اٹھارہ سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اسکا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ عام طور
پر زیادہ زیادہ سے شرح سود ۱۸ فیصدی ہے۔ بلکہ صرف یہ کہ یہ سب سے
بڑی مقدار ہے۔ جو ایک اوسط درجے کا ساہوکار منصفانہ طریق سے بطور خالص
منافع وصول کرتا ہے۔ اس کے مقابل شہروں میں روپیہ ادھار دینے کی شرح ۶
سے ۱۲ فیصدی تک ہے۔ اور عام طور پر نو یا دس فیصدی شرح کام میں لائی جاتی
ہے۔ اس لئے واضح طور پر یوں کہا جا سکتا ہے۔ کہ دیہات میں سود کی شرح شہری
شرح سے دوگنی ہے۔ ان دونو کا تفاوت دو قسم کے لین دین کی تکالیف و خطرات
کے فرق کا اور دیہاتی و تاجر کے چال چلن کے اختلاف کا یونہی سا اندازہ ہے۔ جہاں
کہیں دیہاتی یا کسان ایسا معاملے کا پکا اور قابل اعتبار ہے۔ جیسا کہ تاجر تو وہ

آخرالذکر سے زیادہ شرح سود نہیں اداکرتا ۔ یا صرف اس قدر زیادہ دیتا ہے۔ جتناکہ بکھرے ہوئے موکلوں سے روپیہ وصول کرنے کی لاگت اور تکلیف کو پورا کرنے کیلئے ضروری ہے۔ ہم نے دیکھا کہ مغربی پنجاب میں ہندو زمیندار مسلمان کی نسبت جوکہ لین دین اور اعتبار کے لحاظ سے اس سے کم شرح سود پر قرض لے سکتا ہے ۔ اور اونا کی تحصیل میں سپاہگری نے اخلاق اور سمجھ کا معیار بلند کر رکھا ہے۔ عام شرح ۱۲ فیصدی تھی ۔ جبکہ تحصیل کے جنوبی حصے میں جہاں بہت کم لوگ فوج میں بھرتی ہوتے ہیں۔ شرح دریا تین گنی تھی۔ دیہات اس شرح کے خلاف سخت شکایت کرتے ہیں۔ جو انہیں روپے کے عوض ادا کرنی پڑتی ہے ۔ گذشتہ ایام میں اس کی وجہ تھی۔ کیونکہ اس کی جہالت اور احتیاج پر اکثر بے رحمی سے ڈاکہ ڈالا جاتا تھا۔ لیکن تعلیم کی نشر و اشاعت بتدریج ایک کا اسی طرح علاج کر رہی ہے۔ جس طرح امداد باہمی کی ترقی نے پہلے ہی عملی طور پر دوسری سے نجات دلادی ہے ۔ اور موٹر لاری کی آمد (صوبے میں ۵۰۰ ۴ لاریاں اجرت پر کام کر رہی ہیں۔) دیہات کی علیحدگی کو جلد جلد مٹا رہی ہیں ۔ اور دیہاتی کے لئے یہ بات آسان بنا رہی ہیں۔ کہ وہ اپنا لین دین ساہوکار سے جو اس پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ قطع کرلے اور ایک ایسے شخص کے ساتھ جاری کرے۔ جو اس کے ساتھ منصفانہ سلوک کریگا۔ تاہم وہ بات جس میں اب تک کوئی تبدیلی نہیں آئی ۔ دیہاتی کا اخلاق ہے۔ کسی نہ کسی موجودہ نقطہ نظر سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے ۔ کہ وہ لین دین کا اچھا نہیں ہے ۔ اور جہاں کہیں برا لین دین بڑھتا ہے ۔ سود کی شرح زیادہ ہوتی ہے۔

جاگیردار

اسکا ثبوت :۔ اب میں جاگیردار کا ذکر کرتا ہوں۔ اگرچہ یہ بنگال اور صوبہ متحدہ کی نسبت پنجاب سے کم مخصوص ہے۔ لیکن وہ ایک ایسا عنصر ہے۔ جسکا شمار ضروری ہے ۔ صوبے کے مغربی حصے میں وہ ساہوکار اور پیر کے ساتھ مل کر ایک ایسی تثلیث پیدا کرتے ہیں۔ جو دیہات میں غالب ہے۔ اس علاقے میں کسی زمانے میں ملکی و زراعتی بدامنی اس قدر زیادہ تھی۔ کہ اس کی امداد کے بغیر کسان پڑوسیوں

سے مفسدانہ حملوں اور قدرت کی تباہ کاریوں کے مقابلے میں قائم نہ رہ سکتا خواہ اس کی ابتداء کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس نے اپنے مزارعین کو محفوظ رکھ کر اپنی ہستی کا ثبوت دیا ہے۔ اور آج تک ایک اچھے جاگیردار کے متعلق یہی خیال مشہور ہے۔ وہ ان کو تمام زبردستیوں سے بچاتا ہے۔ اور تمام مشکلات میں خواہ حقیقی ہوں۔ یا غیر حقیقی ان کی امداد کرتا ہے۔ اس کے بدلے میں وہ دستور کے مطابق لگان دیتا ہے۔ یہ رشتہ ذاتی ہوتا ہے۔ اور معاہدے کے خیال سے اسی قدر سرتا سر مستغنی ہوتا ہے۔ جتنا کہ زمین کو ترقی دینے کی کسی شرط سے دور ہوتا ہے آخر الذکر ایک مغربی خیال ہے۔ جو حال ہی میں یہاں لایا گیا ہے۔ اور ابھی تک مشکل سے ذہن نشین ہو سکا ہے۔ اسی طرح کا خیال یہ ہے۔ کہ جاگیردار کو اپنے مزارعین کی امداد جائز ذرائع سے اور اس وقت کرنی چاہئیے۔ جبکہ وہ راستی پر ہوں۔ ان کسوٹیوں پر پرکھا جائے۔ تو صوبے بھر میں کوئی اچھا جاگیردار نہیں ہے۔ اور رسمی معیار سے اندازہ لگانے پر بھی اُن کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ البتہ بہت سے لوگ مستثنےٰ ضرور ہیں۔ (ان صفحات میں چند ایک ایسے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے) لیکن صوبے کو بہ حیثیت مجموعی سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ جاگیردار سوسائٹی پر ساہوکار سے بھی زیادہ بھاری بوجھ ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ ساہوکار کی ہستی ایک بُرا وجود ہے۔ لیکن جب تک اس کی جگہ تبدیل کی جائے وہ ایک لازمی برائی ہے۔ لیکن اس کے برعکس جاگیردار اکثر مفت خور ہوتا ہے۔ اور اپنے مزارعین کے آسرے پر زندگی بسر کرتا ہے۔ اپنی دولت کو برباد کرتا ہے۔ اور گردونواح کو بگاڑتا ہے۔ اس قسم کے لوگ مظفر گڑھ میں عام ہیں۔ وہاں وہ فرانس کے بڑے سے بڑے جاگیردار کے ہم پلہ ہیں۔ ۱۷۸۹ء کی بغاوت سے پہلے سابق افسر بندوبست نے ایک تحصیل کے لوگوں کے متعلق لکھا نہ یہ اپنی اپنی زمین کو خود ترقی دیتے ہیں۔ اور نہ دوسروں کو ترقی دینے دیتے ہیں۔ حب الوطنی کے متعلق ان کا خیال محض یہ ہے۔ کہ وہ کبھی کبھی مذہبی تعصب کی آگ سے مشتعل ہو جائیں یہ لوگ ان قرآنی احکامات کو بھلا بیٹھے ہیں " خدا وہ ہے۔ جس نے تمھیں زمین پر اپنا نائب مقرر کیا ہے۔ اور تم سے بعض کو اوپر بعض کے درجوں میں فضیلت دی ہے۔ تاکہ وہ تمھیں اس شے میں آزمائے جو اس نے تمھیں دی ہے" میانوالی

جھنگ۔ ملتان اور ڈیرہ غازیخان کے متصل کے اضلاع کسقدر ترقی یافتہ ہیں۔ خاص طور پر ملتان لیکن مغربی پنجاب میں ہر جگہ کسی جاگیردار کی تعریف کم سننے میں آئی ہے اور مسلمان جاگیردار شاذ ہی اپنی زمین کو ترقی دیتا ہوا دیکھا جاتا ہے۔ وہ جاگیردار جواب کرتے ہیں۔ قریب قریب وہی ہیں جو ہندؤں کی اروڑا یا کھتری قوم کے نام سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ من حیث الجماعت ان کے پاس سرمایہ حوصلہ اور قوت ہے۔ اور جب کہ ہم نے شجاع آباد میں دیکھا انہوں نے زمین کے معاملے میں ان تینوں میں سے کام لے کر وہ نتائج پیدا کئے ہیں۔ جو صوبے کے ہر دوسرے حصے سے فوقیت رکھتے ہیں۔ مسلمان جاگیردار عام طور پر اتنا سست اور مقروض ہے۔ کہ وہ کسی قسم کی ترقی کیلئے قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اور مقروض نہ ہونے کی صورت میں بھی اپنی موجودہ زمین کو ترقی دینے کی بجائے زیادہ زمین خریدنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اگر صوبے کے کسی حصے میں جاگیرداروں کی غلطیاں کم نمایاں ہیں۔ تو وہ محض اس وجہ سے ہیں۔ کہ اس کی عظمت کہیں زیادہ کہیں کم ہے محکمہ زراعت کے ڈائرکٹر نے لنلتھگو کمیشن کے سامنے یہ کہا کہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ بڑے جاگیردار تقریباً ایسے لوگوں کے برابر ہیں جن کیلئے آگے حرکت کرنا مشکل ہے۔ ایک اور شخص نے شہادت دی کہ جب وہ امیر ہو جاتے ہیں۔ تو وہ شہروں میں چلے جاتے ہیں۔ اور کوئی دوسرا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اور حقیقی زراعت سے تعلق کھو بیٹھتے ہیں۔ نہری آبادیوں میں خوب مستعد لوگ ہیں۔ لیکن بعض خاص خاص قابل ذکر لوگوں کو مستثنیٰ کر کے باقی لوگ زیادہ تر درمیانے درجے کے ایسے جاگیردار ہیں۔ جو محکمہ زراعت اور امداد باہمی کے زیر اثر ہیں۔ بڑے جاگیردار جب کبھی دیکھو عدم موجود ہوتے ہیں۔ اور اس کا مطلب وہی ہے۔ جو ہم نے ضلع لائل پور میں سے گذرتے ہوئے محسوس کیا۔

اس کے فرائض :- اس وقت جبکہ تمام قدیم اداروں کے متعلق تحقیق اور گہری چھان بین کی جا رہی ہے۔ ایسے جاگیرداروں کے وجود کیلئے جو نہ اپنے مزارعین کی امداد کرتے ہیں۔ اور نہ اپنی زمین کو ترقی دیتے ہیں۔ کسی ثبوت کا بہم پہنچنا مشکل ہے۔ ملکی بدامنی اب باقی نہیں ہے۔ نہروں کے انتشار و امداد باہمی کی ترقی نے اقتصادی خطرے کو بڑی حد تک کم کر دیا ہے۔ پھر ایک جاگیردار کو اپنی

ہستی کے ثبوت کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ سب سے اعلےٰ درجے والی بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو قرض سے نجات دلائے۔ کیونکہ مقروض جاگیردار مقروض مزارع کی اتنی ہی امداد کر سکتا ہے۔ جتنی کہ ایک اندھا ایک دوسرے اندھے کی رہنمائی کر لے یں۔ یہ کرنے کے بعد اسے چاہیئے کہ وہ موجودہ خیالات کے مطابق اپنے مزارعین کو تمام وہ امداد بہم پہنچائے۔ جسکی انہیں ضرورت ہے۔ مناسب شرح پر روپیہ دے کر انہیں ساہوکار کے پاس جانے اور ان کے جھگڑوں کے فیصلے کر کے انہیں عدالتوں یں جانے سے بچائے۔ اسے زمین کے قبضے کیلئے ضمانت دینی چاہیئے۔ اور ایک ہی کوئیں پر زیادہ عرصے تک نہ ٹھہرنے دینے کی عام رسم چھوڑ دینی چاہیئے

اسے اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ اس کے ملازمین کو معاش کے لئے کافی مزدوری ملتی ہے ورنہ جلد یا بدیر وہ دیکھیگا۔ کہ مزدور اور مزارع دونوں اس پر حملہ کرینگے۔ لائل پور یں زراعتی اجرت کافی زیادہ ہے۔ اور اس مزدوری سے جو یورپ کے بعض حصوں یں دی جاتی ہے۔ کچھ زیادہ کم نہیں ہے۔ لیکن مغربی پنجاب یں جہاں وہ اس قدر کم ہو جاتی ہے۔ کہ ۷ روپے ماہوار (۱۰ شلنگ ۶ پنس) رہ جاتی ہے۔ تو وہ موجودہ زمانے کی انسانی ہمدردی کی نسبت پرانے زمانے کے رواج کی رو سے مناسب قرار دی جا سکتی ہے۔ اگر جاگیردار عقلمند ہے۔ اور آگے بڑھنے کی خواہش رکھتا ہے۔ تو وہ امداد باہمی کی ایسی انجمنوں کا اجرا کر سکتا ہے۔ جیسی کہ کوٹ یں ہیں۔ اور اگر اسکے پڑوس یں رہن رکھنے والا بنک ہو تو وہ اسکے انتظام یں حصہ لے سکتا ہے۔ ایسے بنک قائم کرنے یں دقت یہ ہے۔ کہ یہ بطور ڈائرکٹر کام کرنے کے لئے کافی لائق خود مختار اور اخلاق دوست لوگ تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ جاگیردار جس نے انتظام کرنا سیکھ لیا ہے۔ اور جو مقروض نہیں ہے۔ اس کام کے لئے ایسا مناسب شخص ہے۔

یہ وہ فرائض تھے۔ جن کا تعلق اس کے ماتحتوں اور پڑوسیوں کے ساتھ ہے۔ اس کے ذمہ زمین کا قرض بھی ہے۔ کم از کم اس کے ایک حصے یں اسے خود کاشت کرنی چاہیئے۔ یہ بات اسمیں اپنی جاگیر پر رہنے کا حوصلہ پیدا کریگی۔

اس کے لئے صحت بخش کام پیدا کر گی۔ اور قدرتی رشتے کے ذریعے سے اسے مزارعین کے ساتھ مربوط کر دے گی۔ تاہم بہت سے لوگ اپنے لگان پر گذارہ کرنے پر ہی قناعت کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ پر بار اور پڑوسیوں کے لئے باعث عبرت ہوتے ہیں۔ اور چند جاگیردار اس قدر حصے میں کاشت کرتے ہیں۔ جتنے میں کہ انہیں کرنی چاہیئے۔ جنگ عظیم سے پہلے۔ آخر الذکر ۲۰۰۰ ایکڑ زمین میں کاشت کرتا تھا۔ اور انہیں کھیتوں کی بناء پر جرمن نے سائنٹیفک زراعت کے مقابلے میں فتح حاصل کر لی تھی۔ پنجاب میں نئی آبادیوں کے باہر یہ مقابلہ ابھی شروع بھی نہیں ہوا ہے۔ ہر ملک میں زراعتی ترقی کا انحصار مسلسل تجربات پر ہے۔ اور سب سے مفید خدمت جو کوئی جاگیردار اپنے پڑوسیوں کے لئے انجام دے سکتا ہے۔ یہ ہے کہ وہ تجربات کرے۔ چھوٹا جاگیردار ناکامیابی کا نقصان نہیں برداشت کر سکتا۔ لیکن وہ دوسروں کے کامیاب تجربوں سے فائدہ اٹھانے میں خوب ہوشیار ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جرمن کے ماہران فن کیوں بڑے اور چھوٹے جاگیرداروں کی دور اندیشانہ اختلاط کے حامی ہیں۔ لیکن یہ ملاپ اسی صورت میں پھل لائے گا۔ جبکہ بڑے جاگیردار اپنے فرائض بجا لائینگے۔

جاگیردار کی حیثیت یورپ میں :۔ اگر تحقیق کا رویہ پنجاب کے جاگیردار کی طرف مناقدانہ رنگ لئے ہوئے ہے۔ تو اس کے حق میں اس بات کا ضرور اضافہ کرنا چاہئیے۔ کہ وہ ہندوستان کے کسی اور حصے کے جاگیردار کی نسبت زیادہ مفت خور ہے۔ بلاشبہ ایسے ملک صرف چند ہیں۔ جہاں جنگ عظیم سے پہلے ایک اوسط درجے کے جاگیردار نے جاگیر دار یا زمین کے لئے کوئی حس ظاہر کی ہو۔ جنگ عظیم کے بعد کا جاگیردار مختلف ہے۔ وہ اس بات کو سمجھتا ہے۔ کہ اگر وہ اپنے چال چلن کو درست نہیں کریگا۔ تو اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ بات روس اور رومانیہ میں پہلے ہی وقوع میں آ چکی ہے۔ رومانیہ میں اسے ایک برائے نام معاوضہ دے کر ایک کروڑ بیس لاکھ (۱۲۰۰۰۰۰۰) ایکڑ زمین سے محروم کر دیا گیا ہے۔ زیکو سلاویکیا میں اس کی اپنی زمین کا بھی اکثر حصہ اس کے ہاتھوں سے نکل گیا ہے۔ ہندوستان میں ان حقائق کے معنی عام طور پر نہیں سمجھے جاتے۔ اور صرف چند لوگ ہیں۔ جو ان روحانی تغیرات کے احتمال کی قدر کرتے ہیں۔ جو ان کے چاروں طرف

عمل میں آرہے ہیں۔گذشتہ زمانہ کے جاگیردار پر اس قدر مہربان رہا ہے۔کہ وہ اس بات پر یقین بھی نہیں کرسکتا کہ مستقبل سخت ہو سکتا ہے۔خوش قسمتی سے ہندستان میں عقلمندانہ طبع کی علامات پائی جاتی ہیں۔کہیں کہیں ٹیوب ویل لگائے جارہے ہیں۔پھلوں کے درخت اگائے جارہے ہیں۔اچھی نسل بڑھائی جارہی ہے۔اور کاشتکاری کے پرانے طریقوں کو ترقی دی جارہی ہے۔کاشتکاری میں زیادہ دلچسپی لی جارہی ہے۔اور مزارعین کیطرف زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔خاص طور پر اس وقت جبکہ ان کی تعداد کم ہوتی ہے۔تعلیم کو حقارت سے کم دیکھا جاتا ہے۔اور لوگوں کی شرائط پر زیادہ غور کیا جاتا ہے۔اگر یہی رویہ عام ہوجائے (اس وقت یہ صرف چند لوگوں تک محدود ہے) تو جاگیردار جیتا رہیگا۔ورنہ جلد یا بدیر اسے تاریخی غلطی کے ایسے قیدخانہ میں دھکیل دیا جائے گا جس پر کوئی افسوس نہ کریگا۔

پیر۔ملّا اور پروہت

جاگیردار کی جو حالت مادی فضا میں ہے۔وہی حالت پیر کی روحانی میں ہے جاگیردار کے پاس مزارعین ہیں۔اور پیر کے پاس مرید جاگیردار لگان پر زندگی بسر کرتا ہے۔پیر اپنے نذرانوں پر دونو سے یہ توقع کی جاتی ہے۔کہ وہ اپنے ماتحتوں کی حفاظت کریں۔خواہ وہ راستی پر ہوں۔یا غلطی پر ایک اچھا جاگیردار اس دنیا میں ان کی بہبود کو ترقی دیتا ہے۔اور اچھا پیر (ایسے صرف چند ہیں) دوسری دنیا میں انہیں نجات کا یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے۔مغربی پنجاب میں دونو پورے عروج پر ہیں۔جاگیردار بیان کردہ وجوہات کی بنا پر اور پیر اس لئے کہ ۹۰ فیصدی آبادی مسلمانوں کی ہے۔اور علاقہ موجودہ زمانے کی نسبت زمانہ وسطی سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔دونو کا انتہائی ادب ملحوظ رکھا جاتا ہے۔اور دونو صورتوں میں ادب ان کی خوبیوں کی نسبت ان کے مرتبے کے لئے زیادہ خراج ہے۔لیکن اگر جاگیردار کے حق میں کچھ کہا بھی جا سکتا ہے۔تو معمولی پیر کے حق میں کہنے کے لئے تقریباً کوئی بات نہیں ہے۔وہ مفت خور سے بھی بڑھ کر ہے۔دوسری دنیا کے متعلق دیہاتیوں کی جہالت سے اس منتظم طریقے سے فائدہ اٹھاتا ہے۔جس سے کہ ساہوکار اسکی اس دنیا کی جہالت

سے لیکن پیر اس کے اقتدار کا یہ عالم ہے۔ کہ ایک دیہاتی نے جسے ہم ملتان میں ملے تھے یہ کہا کہ (پیر کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں ہے) وہ پیر جو پیری مریدی کرتا ہے۔ اس کی مدد سے غضب کی تجارت کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہزاروں پیر جن میں سے اکثر پیغمبرؐ کی اولاد سے ہونے کا دعوٰے رکھتے ہیں گھوڑوں پر سوار تمام ملک میں نذرانے جمع کرتے اور تعویذ بانٹتے پھرتے ہیں۔ یہ تعویذ سوائے ایک کاغذ کے پرزے کے جس پر کچھ حروف لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور کچھ نہیں ہوتے۔ لیکن ایمان اتنا کمزور ہے۔ کہ ان کی مدد سے خوف کم کئے جاتے ہیں۔ اور امیدیں بڑھائی جاتی ہیں۔ اور بعض اوقات اعصابی کمزوریوں اور خرابیوں کا بھی علاج کیا جاتا ہے۔ یہ جھوٹے طبیب اکثر کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ واقعی روحانی جھوٹے طبیب ہیں۔ جو یہ بات بھول جاتے ہیں۔ کہ ابتدائی پیروں میں سے جنکی نسل سے ہونے کا وہ دعوٰے رکھتے ہیں۔ اور جن سے وہ اختیار حاصل کرتے ہیں۔ اکثر واقعی طبیب تھے۔ وہ روح کو شفا بخشنے والے اور زندگی میں روح پھونکنے والے تھے۔ حضرت عیسٰے علیہ السلام کی طرح وہ پیغمبر جو پچیس سو سال گذرے اپنے زمانے کے پیر تھے۔ ایسے لوگ تھے۔ جو خدا کی بشارتوں کو سمجھتے تھے۔ اور وہ اپنی بشارتیں دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ وہ پیر جو مغلوں کے زمانے سے پیشتر وسط ایشیا سے ہندوستان میں آئے ایسے ہی تھے۔ اور خوب مغربی پنجاب کے لوگوں کا اسلام پر ایمان لانا کسی فاتح کی تلوار کی نسبت ان کی رضاجوئی اور شہرت پر زیادہ منحصر ہے۔ آج بھی اچھے پیر پیری مریدی کرنے کی نسبت جس سے نفرت کرنے میں وہ حق بجانب ہیں۔ خداوند تعالٰے کی بشارتوں سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ اور اگر بعض پیروں کو ان کی مفروضہ معجزانہ قوتوں کی بنا پر عروج حاصل ہے۔ تو ان میں سے اکثر کو یہ بات اپنی زندگی کے تقدس کی وجہ سے حاصل ہے۔ اگر یہ تقدس عام پیروں میں پایا جائے تو پیر کے حق بجانب ہونے میں کسی ثبوت کی ضرورت نہ ہو۔ اور اسکی حالت قوی تر ہو۔ جب وہ گاؤں در گاؤں اپنے مریدوں کی دعوتیں اڑاتا اور ان کے نذرانوں سے اپنی ثروت میں اضافہ کرتا جاتا ہے۔ تو وہ اپنے اثر کو کافی قوی خیال کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ ٹھہر کر گذشتہ زمانے پر نظر

ڈالے تو وہ دیکھیگا۔ کہ وہ عمارت جس کی بنیاد توہم اور جہالت کی ریت پر ہے۔ موجودہ قوتوں کے اٹھتے ہوئے طوفان کے سامنے زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتی لائل پور میں اسکا اثر پہلے سے زوال پذیر ہے۔ اور اگر وہ تعلیم یافتہ ہے۔ تو جب وہ گذشتہ حالات پر نظر ڈالیگا۔ تو اس کا دماغ شبہات سے پر ہو جائیگا۔ وسطی پنجاب میں ایک پیر کے بیٹے نے جو کہ بی۔ اے تھا۔ یہ کہا کہ ہمیں یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ کہ میرے والد نے بیس دن میں ۱۰۰۰ روپے پیدا کئے تھے۔ یہ نئی روشنی کے خلاف ہے۔ یہ اس لحاظ سے اور بھی زیادہ بری ہے۔ کیونکہ پیری مریدی نئی و پرانی دونوں تہذیبوں کے خلاف ہے۔

ملاں اور پروہت :۔ ان پر بھی اچھے پیر کے لئے اتنی ہی گنجائش ہے۔ جتنی کہ اچھے جاگیردار کے لئے۔ لوگ صرف روٹی پر ہی گذر نہیں کر سکتے خواہ وہ نئی تہذیب کی طرف دیکھیں خواہ پرانی روشنی کیطرف وہ علم اخلاق اور روحانی رہنمائی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ یورپ میں دیہاتی کے اخلاق کو بڑا فائدہ یہ ہے۔ کہ اسے یہ دونو باتیں حاصل ہیں۔ پنجابی دیہاتی کو دونو میں سے تھوڑا تھوڑا حصہ بہم پہنچایا جاتا ہے۔ پروہت اور ملاں بے شمار ہیں۔ لیکن ان لوگوں میں سے جو دیہات میں ہیں کوئی تعلیم یافتہ نہیں ہے۔ اور سب حقیقی معنوں میں جاہل ہیں۔ ایک جاگیردار نے ملاؤں کے متعلق کہا۔ کہ وہ خدا کا نام اس لئے لیتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے پیٹ روٹی سے بھر لیں۔ اور ایک دیہاتی نے پروہتوں کی نسبت کہا کہ وہ گھنٹیاں بجاتے ہیں۔ اور صور پھونکتے ہیں۔ ملاں قرآن شریف کو عربی میں دہرانا سیکھتا ہے۔ لیکن جو کچھ وہ پڑھتا ہے۔ اسے سمجھنا بہت کم سیکھتا ہے۔ اور تمام تعلیم جو وہ گاؤں کے لڑکوں کو دیتا ہے۔ یہی بے ثمر تعلیم ہوتی ہے۔ پجاری ہندووانہ زندگی کے تکلفات اور مندر کی رسومات سے خوب واقف ہوتا ہے۔ اور پروہت زائچہ ڈال سکتا ہے۔ اور مشکوک و منحوس مواقعہ میں تمیز کر سکتا ہے۔ لیکن اگرچہ آخرالذکر پڑھ سکتا ہے۔ مگر یہ پڑھائی اس کی جماعتوں کے لئے کسی کام کی نہیں ہے۔ کیونکہ ہندوؤں کی الہامی کتابیں سنسکرت میں لکھی ہوئی ہیں۔ جسکی وہ عام طور پر تفسیر نہیں کر سکتا۔ چونکہ گرنتھ صاحب پنجابی زبان میں لکھا ہوا ہے۔ اس لئے سکھوں کا حال

ذرا بہتر ہے۔ لیکن اس پر بھی اس میں سے بہت کچھ دیہاتی کی سمجھ کیلئے اس قدر
مشکل ہے۔ یقینی کہ انگلستان کے دیہاتی کے لیئے۔ چاسر۔ لڑکیوں کا سب
سے برا حال ہے۔ کہیں کہیں ان میں سے بعض کو لڑکوں کی طرح پڑھایا جاتا ہے
لیکن عام طور پر وہ کسی قسم کی تعلیم حاصل نہیں کرتیں۔

مذہبی تعلیم :- مذہبی امام بہ حیثیت جماعت (یہ بات میں ان کے متعلق کہہ
رہا ہوں نہ کہ مذہب کے متعلق) اپنے کام کے لائق نہیں ہیں۔ ایسی معزز ہستیاں
بھی ہیں۔ جن کو مستثنےٰ کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بعض سے ہم ملے اور بعض
کے متعلق سنا لیکن جیسا کہ جاگیردار کی صورت میں سوائے اس کے کہ وہ یہ
بتائیں کہ اب کیا ہے۔ اور اس کے بعد کیا ہو سکتا ہے۔ اور کوئی کام کرنے والے
لوگ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مذہبی جذبات حد سے زیادہ
قوی ہیں۔ ہم نے جگہ جگہ ایسی مسجدیں اور مندر دیکھے ہیں۔ جو عوام کی محنت اور
روپے کی قربانی سے تیار کیئے جا رہے تھے۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد ایک یا دو
گھنٹہ روز نماز میں صرف کرتے ہیں۔ اور رمضان شریف میں روزے رکھتے
ہیں۔ لیکن لوگ بحیثیت مجموعی ایسی بھیڑوں کے مانند ہیں۔ جن کا چرواہا کوئی
نہیں۔ ایسے گڈریے موجود ہیں۔ جنہیں بھاڑے کے ٹٹو کہا جا سکتا ہے۔
اور جو مذہب کے نام پر اور تعلیم کے بہانے ایک ملت کو دوسری کے
خلاف اکسا دیتے ہیں۔ اور ان مربیانہ رسم اور خوش اخلاقیوں کا یک قلم خاتمہ
کر دیتے ہیں۔ جنہوں نے سالوں تک ہندو مسلمانوں کو دیہات کی مشترکہ زندگی
میں مربوط رکھا ہے۔ لیکن اصل چرواہے یعنی وہ لوگ جو رہنمائی اور حفاظت
کرنے کیلئے موزوں ہوں۔ بالکل نہیں ہیں۔ مگر رہنمائی کی اس قدر اشد ضرورت
کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ دیہات کی تنہائی جلد جلد غائب ہو رہی ہے۔ موجودہ
اڑنے والی دنیا اس کے دروازے جھانکتی ہے۔ رسم و رواج کی پرانی دیواریں
جن پر صدیوں کی بالیدگی نے پلستر کیا ہوا ہے ریزہ ریزہ ہو رہی ہیں۔ نئے
آفاق ہویدا ہو رہے ہیں۔ اور نیا سفیدہ صبح نمودار ہو رہا ہے۔ بہت سے لوگوں
کے نزدیک نئی تہذیب پرانی کے مقابلے میں ہے۔ اور دونو انفرادیت اور مادیت
کی تیز ہواؤں سے جنکو بعض اوقات آزادی و ترقی کے ساتھ الجھا لیا جاتا ہے

مٹ جانے کے خطرے میں ہیں تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے بھی زندگی آسان نہیں ہے۔ اور غیر تعلیم یافتہ کے لئے گمراہ کن ہے۔ آخر اس کا علاج کیا جارہا ہے۔ یہ بات مجھے متعلقہ لوگوں کے غور کرنے کیلئے چھوڑ دینی چاہیئے۔ کیونکہ ایک ایسے شخص کے لئے جو اس ملک کا رہنے والا نہ ہو۔ یہ سوال اتنا غیر مانوس اور نازک ہے۔ کہ حل نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے صرف برائی کو ظاہر کرنے کی جرأت کی ہے۔ وہ بھی اس لئے کہ اس دورے میں جس کسی سے میں ملا کسی نے بھی اس کے وجود سے انکار نہیں کیا۔ دیہاتی زندگی کے متعلق جو کچھ میں نے یورپ کے مختلف حصوں میں دیکھا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ہر گاؤں میں ایک ایسے تعلیم یافتہ شخص کا وجود نہایت ضروری ہے۔ جسکی زندگی اس کی خدمات کیلئے وقف ہو۔ اور جسکے مدنظر بھلائی۔ خوبصورتی اور سچائی کی کوئی شبیہہ ہو۔ (خواہ وہ کتنی ہی مدھم کیوں نہ ہو) یورپ میں دیہاتی پادری نے باوجود حد بندیوں کے دیہاتی زندگی کو مہذب بنانے والے بڑے بڑے اثرات میں سے ایک کا کام کیا ہے۔ کیا ہندوستان میں ملا اور پروہت کو اسی طرح کام کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ یا کم از کم ان کو بذاتِ خود اچھا نہیں بنایا جا سکتا۔

نئی اور پرانی تہذیب

اس سلسلے میں دو چیزوں کی بازی لگی ہوئی ہے۔ (پرانی تہذیب و نئی) رسومات اور ایمان کی سرگشتگی نے پرانی تہذیب کو اتنا دھندلا بنا دیا ہے۔ کہ بہت سے لوگ اسے دیکھ بھی نہیں سکتے۔ مثال کے طور پر جب ٹیگور کے ناول "گورا کا ہیرو" بنگال کی دیہاتی زندگی سے آشنا ہو گیا۔ تو وہ اس مذہب کا جو خدمت۔ محبت۔ ہمدردی و ذاتی عزت اور بہ ہیئت مجموعی انسانیت کی عزت کے ذریعے سے سب کو طاقت و خوشی اور زندگی بخشتا ہے۔ کوئی نشان نہ پا سکا۔ اس پر بھی تہذیب وہاں موجود ہے۔ اور اس کی روشنی خواہ وہ کتنی ہی مدھم کیوں نہ ہو۔ لوگوں کی تمام تر جہالت گرد اور غربت میں سے جھلکتی ہے۔ اس کی ایک جھلک ہم نے حسن ابدال کے نزدیک ایک سڑکوں کی مرمت کرنے والے کی سرگرمی میں اس نمبردار (حکیم) کی خدمت میں جو اپنے

مریضوں کا مفت علاج کرتا تھا۔ اس زمیندار کے "توبہ توبہ" کہنے میں جس سے یہ دریافت کیا گیا تھا۔ کہ کیا وہ ان لوگوں سے کرایہ لیتا تھا۔ جو اس کی بستی میں آباد تھے۔ ان احسانات میں جنہوں نے لائل پور کے ایک سکھ گھرانے کو ایک سادھو کے لئے گھر بنانے اور راہگیروں کے لئے ایک کنواں لگانے پر مجبور کر دیا۔ ان سراؤں میں جو سوداگروں نے اونٹ اور گھوڑا گاڑیوں میں مسافروں کے لئے بنوائی تھیں۔ دیہاتیوں کے اس احتجاج میں جب وہ کنواں اُتارنے یا باغ کیلئے زمین صاف کرنے اور ایک سے زیادہ مندروں یا مسجدوں کی عام تعمیر میں حصہ لیتے آتے تھے۔ دیکھی وہ منبع جہاں سے یہ روشنی پھوٹتی ہے۔ یہ ہے۔ کہ دیہاتی قدرت اور پڑوسی پروردگانہ منحصر ہے۔ قدرت پر منحصر رہنے نے اسمیں ان دیکھی چیزوں کا ہمارے درجہ کا گہرا اور دلنشین رعب پیدا کر دیا ہے۔ اور اس امر کا باطنی اعتراف ہے۔ کہ مادی دنیا کی دولت انجام کار کسی کام کی نہیں اور پڑوسیوں پر انحصار رکھنے کی وجہ سے دیہاتی طبقہ پیدا ہو گیا ہے۔ جس نے اس کے افراد میں صدیوں اس تیز حس کو ترتیب دی ہے۔ کہ ایک انسان اپنی ضروریات کے لئے دوسرے پر انحصار رکھتا ہے۔ ہم جہاں کہیں گئے۔ ہم نے دیکھا کہ زمانے کی پارہ پارہ کرنے والی قوتوں کے باوجود یہ حس موجود ہے۔ جو اپنے آپ کو امداد باہمی کی مختلف صورتوں میں ظاہر کرتی ہے۔ جو اتنی ہی بیش قیمت ہیں۔ جتنی کہ اور منظم صورتیں۔ کیونکہ یہ مقامی ہیں۔ اور ان کا تعلق دیہاتی زندگی کی تعمیر سے ہے۔ پرانی تہذیب کی کمزوری اس حقیقت کی بناء پر ہے۔ کہ قدرت پر انحصار رکھنے کے انسانی عقیدے میں توہمات کی کیلیں جڑی ہوئی ہیں۔ اور دیہاتی طبقے پر انحصار رکھنے میں رسم و رواج کی چھینٹ لگی ہوئی ہے۔ توہمات کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ رسم کے متعلق یہ دعوے کیا جا سکتا ہے۔ کہ یہ ایک پائدار سوسائٹی کا لازمی عنصر ہے۔ اور جہاں تک ایک آدمی کا دوسرے سے تعلق ہے۔ یہ قاعدے اور خوشی کی کمی کو پورا کرتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں توہم کے ساتھ مربوط اور مذہب کے ساتھ مخصوص ہونے کی وجہ سے یہ اتنی خود سر ہو گئی ہے۔ اور اس قدر اندھا دھند فرمانبرداری کا تقاضہ کرتی ہے۔ کہ یہ اس کی نشوونما میں رخنے پیدا کر دیتی ہے۔ اور بہت سی ایسی عادات کو قائم رکھتی ہے۔ جو کبھی فطری تھیں۔ لیکن اب انسانیت کے بالکل خلاف ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہزاروں عورتوں کو سخت قید کی زندگی

میں دھکیل دیا گیا ہے۔ کروڑوں کو اچھوت خیال کیا جاتا ہے۔ اور دنیا کے غریب ترین لوگوں کے خرچ پر تنومند۔ نفیروں کے گرد ہوں اور بے کار مویشیوں کے گلوں کی زندگی کو قائم رکھا جاتا ہے۔ یہ صرف ان چند لاچاریوں کا ذکر ہے۔ جن سے ہمیں اس دورے میں سابقہ پڑا ہے۔ اور اس کی طاقت اس قدر غالب ہے۔ کہ اکثر وہ مسلمان جو ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہیں۔ چھوت چھات کا خیال رکھتے ہیں۔ اور وہ ہندو جو مسلمانوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ پردہ کرتے ہیں۔ پھر یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ کہ اکثر لوگوں کو نئی تہذیب مشکل سے نظر آتی ہے۔

نئی تہذیب:- نئی تہذیب کی روشنی بالکل صاف ہے۔ اور کسی اور سمت سے چمکتی ہے۔ یہ انسان کے فطرت پر منحصر رہنے کو سائنس کی مدد سے اس پر فتح پانے سے بدل دیتی ہے۔ اور اس کے رسومات و دیہاتی طبقے پر انحصار رکھنے کے سامنے عقل اور آزادی کو مقابلے میں لے آتی ہے۔ یہ امداد باہمی کی نسبت اپنی مدد آپ کرنے کی اور قومیت کی نسبت انفرادیت کی تلقین کرتی ہے۔ میں یہ بات کسی سیاسی نقطۂ نظر سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ خوف اور توہم کی تاریکی کو جس نے پرانی تہذیب کے گرد گھیرا ڈال رکھا ہے۔ تعلیم اور علم سے دور کر دے گی۔ اور تقدیر پر شاکر رہنے کو جو فطرت پر انحصار رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ انسانی قوتِ ارادی کے اعتقاد سے بدل ڈالیگی۔ اس بات پر یقین رکھتے ہوئے کہ اکثر لوگوں کی دماغی و روحانی بہتری ان کی مادی بہبود کے ساتھ پیچیدہ طور پر مربوط ہے۔ (مثلاً غربا کی تباہی ان کی غربت ہے) یہ اپنا رخ دولت کے خلاف نہیں پھراتی۔ بلکہ اس کا تعاقب کرنے کے لئے دل بڑھاتی ہے۔ اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہوئے کہ یہ چیزیں صحت کے لئے ضروری ہیں۔ اور یہ کہ صحیح الدماغی کے لئے صحت مند جسم کا ہونا لازمی ہے۔ یہ چاہتی ہے۔ کہ ہر ایک کو مناسب خوراک کپڑے اور گھر ملے اور وہ صاف ستھرے نواح میں رہیں۔ آج کل کے دیہات میں ان نعمتوں کی اس قدر کمی ہے۔ کہ ان کا اجرا اس کے رواج کو بدل ڈالے گا۔ ہم نے گوڑگاؤں کے لوگوں کو نہایت سرگرمی سے اس کے لئے استدعا کرتے دیکھا ہے۔ اور لائل پور اور صوبے کے مشرقی حصے میں ہم نے لوگوں کے دماغوں کو اس کے نور سے مجلا ہوتے دیکھا ہے۔ اب ایک نیم حکیم کی نسبت جس

کے طبی اصول ایک انگریز سلوتری کیلئے بے عزتی کا باعث ہوتے ہیں۔ تربیت یافتہ حکیم کی اور اس کی نسبت ایک اچھے ڈاکٹر کی زیادہ تلاش کی جاتی ہے۔ دواؤں کو تعویذوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اور پلیگ کو روکنے کے لئے ٹیکہ لگوانے کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ حالانکہ دس سال گذرے لوگ اس سے خوف کھاتے تھے۔ بعض لوگ اپنے مویشیوں کو بھی گاؤں کے دروازے کے آرپار بندھی ہوئی ٹھیکری کے نیچے سے گذارنے کی نسبت انہیں ٹیکہ لگوانے کو زیادہ اچھا سمجھتے ہیں۔ اب بیلوں کو آختہ کرانے پر کوئی معترض نہیں ہوتا۔ اور بہت سے ہندو اور سکھ مذہبی احکام کی پیروی نہ کرتے ہوئے۔ اپنے بیل اور گائے کو غیر مفید ہونے کی صورت میں فروخت کر دیا کریں گے۔ چھوت چھات جسے مسٹر گاندھی نہایت برا اور انسان کی مذہبی ذہنیت کا مخالف اصول کہتے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک اندرونی اور پہاڑی علاقوں اور ستلج کے جنوب میں زوروں پر ہے۔ بتدریج کمزور ہو رہی ہے۔ بعض جگہوں میں منطقی دلیل کی بناء پر یعنی یہ کہ اچھوت اب مردہ جانور کا گوشت نہیں کھاتے۔ نہروں کے انتشار اور اس قدرت کے باعث جو کاشتکار کو باقاعدہ پانی ملنے کی وجہ سے زمین پر حاصل ہے۔ تقدیر پر شاکر رہنے کا عقیدہ کم عالمگیر ہے۔ اور کھیتی کرنے میں زیادہ محنت اور تجربہ کاری کو کام میں لایا جاتا ہے۔ امداد باہمی کی توسیع سے کفایت شعاری بڑھ رہی ہے۔ اور فضول خرچی معدوم ہو رہی ہے۔ فضول خرچی کی معتبر مثالیں شادی و غمی کے گراں بہا اخراجات ہیں۔ اور جہاں کہیں ان کی زیادتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے۔ کہ لوگوں میں انہیں کم کرنے کی بڑی خواہش ہے۔ تین سو انجمن ہائے اصلاح رسومات اس کے لئے کافی ثبوت ہیں۔ اور ان میں سے اکثر اتنی کامیاب ہیں۔ کہ وہ شادیاں جن پر ۵۰۰ سے لے کر ۱۰۰۰ روپیہ تک خرچ آیا کرتا تھا۔ اب اس رقم کے پانچویں حصے میں کی جاتی ہیں۔ ایسے موقعوں کے مہمان نوازی کے اخراجات کو بھی بڑی حد تک کم کر دیا جاتا ہے۔ اور زیورات اور کپڑوں پر بھی پہلے کی نسبت بہت ہی کم خرچ کیا جاتا ہے۔ نیز لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کی عمر بڑھانے کی طرف بھی رجحان ہے۔ آخری بات جو کسی سے بھی کم نہیں ہے۔ یہ ہے کہ ایک ایسی جماعت پیدا ہو رہی ہے۔ جو

یہ سوال کرتے ہیں۔ کہ پردہ کا رواج کہاں تک دانائی پر مبنی ہے۔

مغربی پنجاب :۔ نئی روشنی مقابلتاً صوبے کے مغربی حصے میں بہت پھیلی ہوئی ہے۔ ان پانچ امور کو دہروں کا کھیلنا امداد باہمی۔ تعلیم۔ ذرائع آمد و رفت کی ترقی اور نقل مکانی اور جنگ عظیم سے حاصل کیا ہوا تجربہ جنہوں نے مشرقی حصے کے ساتھ دیا ہے۔ مغرب میں بہت کم دسترس حاصل ہوئی ہے۔ خوش قسمتی سے بہت سی صورتوں میں اس کی ضرورت کم ہے۔ زندگی گاؤں کی نسبت زیادہ قدیم اور کوئیں پر انحصار رکھتی ہے اسمیں انفرادیت بھی زیادہ ہے۔ مذاہب ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اور رسم و رواج جو اپنی منظوری اسلام کے سادہ اخلاقی مجموعہ قوانین سے حاصل کر رہا ہے۔ کم پیچیدہ ہے۔ ناکارہ مویشیوں کو مذہب کی بناء پر نہیں رکھا جاتا۔ چھوت چھات کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ شادیوں پر بہت کم خرچ کیا جاتا ہے۔ اور لوگ بچپن میں شادی نہیں کراتے۔ عورتوں کو بہت سخت کام نہیں کرنا پڑتا۔ اور جب پردہ نہیں کیا جاتا تو وہ مقابلتاً آزاد ہوتی ہیں۔ رہائش گاہیں بھی پہلے سے زیادہ صاف ہیں۔ اور احتیاط سے ترتیب دیتے ہوئے ان کے اندرونی حصے اکثر خوبصورتی کے احساس کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ بات اٹک کے دیہاتی کے فقرے سے خوب ظاہر ہے۔ " جو شخص کسی گھر میں کوئی خوبصورت چیز نہیں دیکھیگا۔ وہ اسے تھوک کر چھوڑ دیگا۔ مغربی حصے کی لعنت غربت اور وہم ہے جس کی وجہ سے دیہاتی ساہوکار۔ جاگیردار۔ اور پیر کے رحم پر زندگی بسر کرتا ہے۔ دو تو باتیں نئی روشنی کی دشمن ہیں۔ غربت تو خاص طور پر کیونکہ نئی روشنی کی بنیاد عمدہ معیار زندگی پر ہے۔
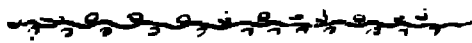
باب سیزدہم

معیارِ زندگی عورتیں اور دیہاتی کے ذرائع معاش

معیارِ زندگی

خوراک :- گذشتہ تیس سال کے دوران میں پنجابی دیہاتی کا معیارِ زندگی مادی حیثیت سے بڑھ گیا ہے۔ یہ بات صوبے کے مشرقی حصے میں بہت نمایاں ہے۔ صاف طور پر بیان کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہاں دیہاتی کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ عمدہ گھر میں رہے۔ لیکن مغرب میں ابھی تک اس کی خوراک مقدار سے کم اور لباس نہایت غریبانہ ہے۔ ہم بہت سے ایسے لوگوں کو ملے جنکے پاس صرف وہی کپڑے تھے۔ جنہیں وہ پہنے ہوئے کھڑے تھے۔ اور بہت سے ایسے لوگوں سے بھی ملے جو خوراک بہم پہنچانے کے لئے ادھار لیتے تھے۔ یہ سب کچھ پس انداز کرنے کی کمی اور فصل خریف خراب ہو جانے کا نتیجہ تھا۔ یہ بات بغیر کسی شک و شبہ کے کہی جا سکتی ہے۔ کہ وہ لوگ جنہیں اس مقصد کے لئے ادھار لینا پڑتا ہے وہ کھانے اور بچانے کے لئے کافی غلہ حاصل نہیں کرتے اس کے ساتھ ہی وہ سب سے سستی اور کم مقوی غذا پر قانع ہو جاتے ہیں۔ اس امر کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے۔ کہ مشرق کی نسبت مغرب میں پیداوار بڑھائی جائے۔ اس کی سب سے زیادہ ضرورت مظفرگڑھ میں ہے۔ وہاں غربت اور تنزل ان لوگوں کے لئے مایوس کن ہیں۔ جو ان کا علاج کرتے ہیں۔ ان تمام مشابہتوں میں سے جو تمام دنیا کے دیہاتیوں کو ایک برادری میں منسلک کرتی ہیں ایک کے ذریعے سے کتاب موسومہ "انگلستان کا سرسبز و خوشگوار علاقہ" کے مصنف کو اسی قسم کا مسئلہ دیہاتی انگلستان کے ایک کونے میں پیش آیا۔ اور اس کے ارشادات پس ماندہ علاقوں سے اس قدر مناسبت رکھتے ہیں۔ کہ میں انہیں بجنسہ لکھتا ہوں

وہ دریافت کرنا ہے۔ کہ ان لوگوں کی حالت کیونکر بدلی جا سکتی ہے۔ کیا ان کی تجدید کی جا سکتی ہے؟ ان باتوں میں سے اکثر جنکی انہیں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ نراقی لین دین۔ صبر۔ مستقل مزاجی۔ تربیت دیر تک تکلیف اٹھانے اور زیادہ واضح الفاظ میں مذہبی تعلیم سے (جو کہ ان کی تمام خامیوں کو پورا کرتی ہے) پوری کی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد جلد باز خیال پرست کیلئے چوکنا کر دینے والی برمحل بات لکھی ہے۔ وہ یہ کہ ان باتوں کے لئے جوان لوگوں کیلئے کی جا سکتی ہیں۔ حدود ہیں۔ کیونکہ ان کاموں کے لئے بھی حدود ہیں۔ جو ان سے لئے جا سکتے ہیں۔ اور وجہ یہ کہ وہ ایک ایسا طبقہ ہے جو جسمانی دماغی لحاظ سے کمزور ہے۔ ایسے مسئلے کے حل کے لئے کسی قسم کی پگ ڈنڈی کا اختیار کرنا فضول ہے۔ بہترین شخصیتوں کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اچھا دماغ اور وافر وقت بھی درکار ہے۔ اگر یہ تینوں باتیں مظفر گڑھ کو حاصل ہو جائیں۔ تو وہ بیس برس بعد صوبے کے لئے باعث ندامت نہ رہیگا۔ گوڑگاؤں کو چھوڑ کر مشرقی پنجاب میں جسکے بعض حصوں میں لوگ اتنے ہی غریب ہیں۔ جتنے کہ مظفر گڑھ میں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ بصورتِ مجموعی دیہاتیوں کے پاس کھانے کے لئے کافی ہے۔

یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ کہ اس کی خوراک اگر مقدار کے لحاظ سے نہیں تو کم از کم صفات اور تنوع کے لحاظ سے بہتر ہوتی جا رہی ہے۔ غذاؤں کے بوقلموں ہونے کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ سبزیوں کی کھپت بڑھ گئی ہے۔ اب بہت سے لوگ انہیں کاشت کرتے ہیں۔ خاص طور پر آلوؤں کو۔ وہ لوگ جو ۵ برس پہلے اس قسم کی کوئی چیز نہ بوتے تھے۔ (اور یہاں تک کہ اونچے درجے کے راجپوت بھی) اب انہیں کہیں کہیں بوتے ہیں۔ اور جہاں وہ پیدا نہیں کی جا سکتیں۔ وہاں یا تو قریب قریب کے گاؤں سے سبزی بونے والے بیچنے کے لئے لے آتے ہیں۔ یا موٹر لاریوں کے ذریعے سے منگوائی جاتی ہیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں لوگ دراصل سبزی خور ہیں۔ اس تبدیلی کے فائدے کا غلط قیاس لگانا مشکل ہے۔ اگر یہ بات عام ہو جائے۔ تو یہ دواؤں کی اثرات کی نسبت دیہاتی کی صحت پر اچھا اثر ڈالیں گی۔

پنجاب کے مشرقی حصے میں دیہاتی مجموعی حیثیت سے کافی اچھا کھاتے اور پہنتے ہیں۔ لیکن ان کے گھر بہت بڑی حالت میں ہیں۔ ہم نے آدمیوں۔ عورتوں

اور بچوں کو اکثر کمروں کی نسبت غاروں میں بغیر چمنی والے باورچی خانوں کے دھوئیں
اور گرد سے سراسر سیاہ ہوئی ہوئی چھتوں کے نیچے اور کوڑے اور کھاد سے اٹے
ہوئے صحنوں میں مع ان کے مویشیوں کے سوتے دیکھا۔ اگر اکثر لوگ صحنوں اور
کھیتوں کی کھلی ہوا میں زندگی بسر نہ کرتے تو یہ رہائش گاہیں چوہوں پسوؤں اور
مکھیوں کی آماجگاہ ہونے کی وجہ سے باقاعدہ موت کے پنجرے بن جاتیں۔ جیسا
کہ یہ درست ہے۔ ان کو ضرور لوگوں کی صحت کو خاص توجہ کی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔
اور اس کے ساتھ ہی جیسا کہ ہر شخص خیال کرتا ہے۔ انہیں اپنے خیالات سے
ڈرنا چاہیے۔ یہ برائی اس قدر عام ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحت کو یقینی
بنانے اور مناسب معیار زندگی قائم کرنے کے لئے صوبے کے ..... ۳۴۰۰ دیہات
میں سے اکثر کو دوبارہ بنانا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ اکثر لوگوں کو یہ بات محض خیالی
معلوم ہو۔ لیکن جالندھر اور ہوشیارپور جیسے اضلاع میں جہاں نقل مکانی کر کے
واپس آئے ہوئے لوگ اپنے ساتھ نئے خیالات اور بے شمار روپیہ لائے ہیں۔ اسی
عمل کا اقدام کیا جا چکا ہے۔ بلاشبہ روپیہ کے بغیر کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جہاں
کہیں یہ میسر ہے۔ نئے گھر تعمیر ہو رہے ہیں۔ اور پرانے گھروں کو بہتر بنایا جا رہا ہے۔
قصبہ نبڈالہ میں جسے ہم نے جالندھر میں دیکھا ہے گزشتہ بیس سال میں تقریباً
نصف لاکھ روپیہ ضرور اس کام پر خرچ کیا گیا ہوگا۔ اسمیں شک نہیں کہ اخراجات کا
کچھ حصہ نمائش کی خواہش کے اکسائے جانے کی وجہ سے یا مغرب کی طفلانہ نقالی
پر صرف ہؤا ہے (شہادت کے لئے مثلاً بے سروپا چمنیاں) لیکن یہ بات اب
تقریباً ناممکن ہوگی کہ کوئی نیا گھر پرانے غار نما طریق پر تعمیر ہوتا ہؤا دیکھا جائے۔
اب لوگوں میں ایک ایسے گھر کو حاصل کرنے کی زیادہ سے زیادہ خواہش ہے جو نہ
صرف پختہ ہو۔ بلکہ ہوادار بھی ہو۔ اگر جیسا کہ بعض اوقات دیکھنے میں آتا ہے۔ نئے
گھر میں نیچے کے فرش کے قریب کھڑکیاں نہیں ہیں۔ تو یہ غالباً اس وجہ سے ہے کہ
مالک مکان کے پاس بہت سے زیورات اور نقد روپیہ ہے۔ اور وہ ڈاکوؤں اور
نقب لگانے والوں سے ڈرتا ہے۔ اسمیں دو اخلاقی اسباق ہیں۔ ایک تو یہ کہ
زیورات کم خریدنے چاہیئے اور دوسرے یہ کہ روپیہ جمع کر کے گھر میں نہ رکھنا چاہیئے
بلکہ گاؤں کے بنک میں جمع کرا دینا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی یاد

رکھنی چاہیئے کہ امن کے بغیر کوئی مادی ترقی نہیں ہو سکتی۔ اور اس صورت میں معقول تنخواہ دار قابل پولیس کے بغیر امن قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر دیہاتی امن کا بلند معیار بھی قائم رکھا جا سکے۔ تو کافی روشندانوں والے گھروں کا رواج ہو جائے گا۔ اور جو بات اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ وہ یہ کہ لوگ اپنی صحت اور کاشتکاری دونو کی زیادہ ترقی کی خاطر گنجان آباد اور گرد سے اٹے ہوئے گاؤں کو چھوڑ کر اپنی اپنی زمینوں پر رہنے لگ جائیں یہ طریق کار جالندھر میں پہلے ہی شروع کیا جا چکا ہے۔ یہاں اشتمال اراضی سے اسمیں اور بھی زیادہ سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اور اگر اس کا رواج ہو گیا، تو ممکن ہے۔ کہ یہ اس علاقے کی کایا پلٹ دے۔ نئے گھروں کا ایک یہ پہلو نہایت پر زور تفریق نیمجے بغیر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اکثر گھر اس قدر گندے ہیں کہ انہیں دیکھ کر طبیعت پریشان ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا کوئی بچہ اینٹوں کے صندوق سے کھیل رہا ہے۔ عجیب بات یہ ہے۔ کہ گوڑ گاؤں کے گرد و نواح میں غربت اور انتہائی گندگی کے باوجود اب بھی خوبصورتی کی حس گھات لگائے ہوئے ہے۔ میں نے کوئی عمارت ایسی نہیں دیکھی۔ جو فن تعمیر کی خوبیوں میں سے کسی ایک کا دعوٰے نہ رکھتی ہو۔ ایک اچھے کاریگر کے لئے جس کے خیالات دیہاتی کی زندگی کی سادگی اور اس کی نقدی کی گنجائش کے ساتھ مناسب رکھتے ہوں۔ سنہری موقعہ ہے۔ جیساکہ بے شمار کٹیاؤں اور چھوٹے گاؤں کی خوبصورتی سے ثبوت ملتا ہے۔ یورپ میں ایسے لوگ بہت پائے گئے ہیں۔ اگر کوئی ایسی ہستی پنجاب میں مل سکے تو ممکن ہے کہ زمانہ مستقبل کا گاؤں اس نئی روشنی کے مقابل بن جائے۔ جس کے لئے اب نہایت غیر موزوں خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ایک اور خرابی جس کا نہایت آسانی سے دفعیہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہے۔ کہ اکثر نئے گھروں کی اندرونی حالت نہایت خستہ و بے ترتیب ہوتی ہے۔ صوبے کے دو نصف حصوں میں اس وصف کے لحاظ سے فرق ہے۔ اور وہ یہ کہ مغربی حصے کی سب سے وحشیانہ رہائش گاہیں مشرقی حصے کے اچھی حیثیت کے گھروں سے اکثر زیادہ صاف اور زیادہ اچھی ترتیب دئیے ہوئے ہوتی ہیں۔ کیا یہ اس لئے ہے۔ کہ مغربی حصے میں عورتوں کی ہستی زیادہ آزاد اور بے فکری کی حالت میں ہے۔

عورتیں

خامیاں :- مسٹر برین جن کے تجربۂ گوڑگاؤں کا ذکر پانچویں باب میں کیا گیا ہے۔
خیال کرتے ہیں۔ کہ عمدہ معیار زندگی کی کنجی یہ ہے۔ کہ عورتوں کی حالت کو ترقی دیجائے۔
ممکن ہے کہ صرف یہی ایک کنجی نہ ہو۔ لیکن اسمیں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ کہ گاؤں کی
بہبودی نہایت گہرے طریق پر عورت کی بہبودی سے وابستہ ہے۔ اس وقت پنجاب
اور دوسری جگہوں میں اس کی یہ حالت ہے۔ کہ نہ وہ نئی روشنی سے مطابقت رکھتی
ہے۔ نہ پرانی سے۔ پرانی تہذیب کے مطابق ہندو اپنے داماد سے کچھ نہیں لے
سکتا۔ یہاں تک کہ ایک پانی کا گلاس بھی۔ ابھی تک شادی کے وقت عورتوں کو
مویشیوں کی طرح تبادلے سے لیا جاتا ہے۔ ایک اچھے منصف کا اندازہ
ہے۔ کہ خرید کا عنصر وسطی پنجاب کی ۰۰ فیصدی شادیوں میں پایا جاتا ہے۔ اس سے
ظاہر ہوتا ہے۔ کہ نئی روشنی نے کہاں تک اثر کیا ہے۔ کہ وسطی پنجاب صوبے کا
ترقی یافتہ حصہ ہونے پر فخر کرتا ہے۔ اس پر یہ کہ رواج (جتنا کچھ بھی ہے) بڑھ رہا
ہے۔ اور کسی طرح بھی جاہل طبقہ تک محدود نہیں ہے۔ مسٹر گاندھی نے سندھ کے
طلبا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ عورت کو "اردھن انگنا" یا انسانی زندگی کا دوسرا بہترین
نصف کہا گیا ہے۔ لیکن آپ نے اسے غلام کے درجے تک گرا دیا ہوا ہے۔ اور نتیجہ
جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں۔ یہ ہے کہ تمام ملک میں تہلکہ مچا ہوا ہے۔ ایک اور بُرا رواج
جو گرم ملک میں زیادہ معقول لیکن اسی قدر مضرت رساں ہے۔ بچپن کی شادی ہے۔
خوش قسمتی سے اس صورت میں بھی تبدیلی کرنے سے زیادہ اچھی حالت پیدا ہو رہی
ہے۔ اگرچہ اس کی رفتار اتنی سست ہے۔ کہ مشکل سے دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے
علاوہ ایک بری رسم وہ ہے۔ جو یہ بتاتی ہے۔ کہ بچے کی پیدائش کے وقت عورت
کی تیمارداری کرنے والی ایک ایسی دایہ ہونی چاہیئے۔ جو ہمیشہ غیر تربیت یافتہ ہو
اور عام طور پر نیچ ذات سے ہو اور فرشتوں کو رُلا دینے والی بدقسمتی یہ ہے۔
کہ یہ کام کرنے والی زیادہ تر وہ ایک اچھوت ہوتی ہے۔ اس دورے
میں ہم نے کتنی مرتبہ دیکھا ہے۔ کہ وہ کسی بھنگی۔ چمار۔ یا فقیر کی بیوی ہوتی ہے۔ اور
بعض اوقات ہم نے نہایت کوڑھی۔ کمزور یا اندھی بھی دیکھی ہے۔ یہ برائی رو رو کر

آتی فریاد آسمان تک پہنچا رہی ہے۔

پردہ:- ایک اور رسم جسکی تبدیلی یا ترمیم کی ہر شخص خواہش کرتا ہے۔ چار دیواری کا پردہ ہے۔ جو اونچی ذات کی عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں قید کر دیتا ہے۔ اور دن کی روشنی میں صرف اُسی صورت میں انہیں باہر نکلنے کی اجازت دیتا ہے۔ جبکہ وہ سر سے پاؤں تک پردے میں ہوں۔ اور ان کے چہرے جنکو خدا نے انسانی دنیا کی خوشی کے لئے پیدا کیا ہے۔ ہیبتناک بدگمانی کی صورت اختیار کر لیں۔ اور سوائے ہاتھوں کے اور کوئی چیز نظر نہ آئے۔ ملا یہ کہتے ہیں۔ کہ وہ روش جسکا قرآن شریف میں ذکر ہے۔ امیر جاگیرداروں اور شرفا تک محدود ہے۔ ایک معمولی دیہاتی خاص ضروری خلوت خانے بنانے کی تاب نہیں رکھتا۔ اور نہ ہی وہ اپنے کام میں عورتوں کی امداد کو ترک کر سکتا ہے۔ اس طرح سے محدود ہو کر پردہ عزت اور ساتھ ہی مذہب کی ایک بات بن گیا ہے۔ اور جیسا کہ انبالہ کے ایک راجپوت نے کہا کہ اگر راجپوتوں نے پردہ چھوڑ دیا تو پھر ان میں کیا باقی رہ جائیگا۔ وہ ایسے ہی ہو جائینگے جیسے کہ اور لوگ۔ ہندوؤں میں جن میں پردہ محض رواج پر منحصر ہے۔ اس کی طاقت کمزور ہو رہی ہے۔ لیکن مسلمانوں میں مذہب اور رواج کی حمایت میں اور معاشرتی خواہش اور تقدس کا منظور نظر ہونے کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ پھیل رہا ہے۔ راجپوتوں میں جو ہندوؤں و مسلمانوں پر مشتمل ہیں۔ اقتصادی عمل کے زیر اثر اس کی ہستی معرض زوال میں ہے۔ ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اور وہ قرض میں اس قدر بری طرح پھنس گئے ہیں۔ کہ انہیں ایسی ذاتوں کے مقابلے میں کھڑا ہونا مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ جن کی عورتیں صحن اور کھیتوں میں ان کی امداد کرتی ہیں۔ انبالہ کے ایک اور راجپوت نے بتایا کہ ہم پانچ بھائی ہیں۔ اور پانچوں کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ لیکن اگر پردہ نہ ہوتا تو ہم دس کام کرنے والے ہوتے۔ اس کے ساتھ ہی صحت کا بھی خیال ہے۔ جو آخر کار ایک ایسا مسئلہ بن جاتا ہے۔ جس کے لئے عام لوگوں کی توجہ درکار ہے۔ ایک ایسی عورت جو اپنی تمام زندگی تنگ چار دیواری میں بسر کرتی ہے۔ اُس قدر صحت مند یا ایسے طاقتور بچوں کی ماں نہیں بن سکتی۔ جتنی کہ وہ جو گھر سے باہر رہتی ہے۔ اور دن کا اکثر حصہ کام میں گذارتی ہے۔ جب تک ہر روز دو یا تین گھنٹے چکی پیسنی پڑتی تھی۔ باقاعدہ ورزش

ہوجاتی تھی۔ لیکن اب جبکہ اناج اکثر کل کی چکی میں لے جاتے ہیں۔ یہ بات حد درجہ مشکل ہے۔ صرف چند لوگ ایسے ہیں۔ جو اپنی بیویوں کو ایسا پردے والا ٹیلنس کورٹ بنوا کر دے سکتے ہیں۔ جیسا کہ اس پیر نے بنوایا ہوا تھا۔ جسے ہم ملتان میں ملے تھے۔ اس طرح صحت پر اثر پڑنا لازمی ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں صرف کھیت ہی رفع حاجت کی جگہیں ہیں۔ اس پر ان خلاف فطرت قیود کا بھی بُرا اثر پڑ گیا۔ جو پردے نے عورتوں پر عائد کر رکھی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ذاتی آزادی کی دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ اس قدر امن ہوتے ہوئے اب قید کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور عورت کو اس طرح سے بند کرنا گویا دہ جیل خانے میں ہے۔ نئی تہذیب کے سخت خلاف ہے۔ اور بلا شبہ پرانی کے بھی۔ کیونکہ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے چار دیواری کے پردے کو یہاں کوئی نہ جانتا تھا۔ اور نہ ہی قرآن شریف نے اس کا حکم دیا ہے۔ مسٹر گاندھی ہندؤوں کو اسے چھوڑ دینے کا فتویٰ دیتے ہیں۔ اور نہایت روشن خیال مسلمان اسے اپنی ذات کے لئے ترک کر رہے ہیں۔ تاہم لائل پور کے ایک ارائیں کی یہ بات یاد رکھتے ہوئے کہ ابھی ہماری تعلیم اتنی نہیں ہے۔ کہ ہم عورت کو متاثر ہوئے بغیر دیکھ سکیں۔ میں یہ رائے نہیں دیتا۔ کہ پرانی تہذیب سے بالکل قطع تعلق کر لیا جائے۔ بلکہ یہ کہ ظالمانہ رواج کی سختیوں کو بتدریج کم کیا جائے۔ یہاں تک کہ بلا تردد پوری آزادی دی جا سکے۔

کام :۔ ہندوستانی زندگی میں حیران کر دینے والی حقیقتوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کہ ایک گاؤں میں ممکن ہے کہ عورتیں بالکل نظر نہ آئیں۔ اور دوسرے میں تمام کھیتوں میں کام کرنے والوں کے سا تھ ہوں۔ کھیتوں میں کام کی مقدار فرقہ در فرقہ اور ایک ہی قریے میں ضلع در ضلع بہت زیادہ اختلاف رکھتی ہے۔ بیاس کے شمال میں عورتوں کا کام عام طور پر روئی چننے اور اپنے خاوندوں کے لئے کھانا بہم پہنچانے پر ختم ہے۔ بعض جگہ گوبر سے اپلے بھی بنائے جاتے ہیں۔ بیاس کے جنوب میں اس سے بہت کچھ زیادہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً گھر اور مویشی خانہ میں جھاڑو دینا۔ دودھ نکالنا۔ چارہ کاٹنا اور بونا۔ گوڈائی کرنا اور کاٹنا۔ جالندھر کی ارائیں عورتیں اور رہتک کی جٹیاں سوائے ہل چلانے اور کنوئیں پر کام کرنے کے

باقی سب کام کرتی ہیں۔ اور جنوبی علاقے کے بہت سے حصوں میں عورتیں۔ آدمیوں سے زیادہ سخت کام کرتی ہیں۔ ایک ایسے شخص کے لئے جو ڈاکٹر نہ ہو یہ کہنا یقینی طور پر مشکل ہے۔ کہ عورتوں سے اس قدر کام لینا کہاں تک عقل پر مبنی ہے۔ اور اگر نہیں تو سنہری طریقہ کونسا ہے؟ تاہم چند نکات مدنظر رکھے جا سکتے ہیں۔ اول تو یہ کہ اگر زمیندار صرف چند ایکڑ زمین پر گذارہ کرنا چاہتا ہے۔ تو یہ نہایت ضروری ہے۔ کہ اس کی عورت گھر کے اندر اور باہر جہاں تک امداد دے سکتی ہو۔ دے۔ جب سے میں نے دیہاتی علاقوں میں دورہ کیا ہے۔ کسی چیز نے میری توجہ اس قدر نہیں کھینچی جس قدر عورتوں کے کھیتوں میں کام کرنے کی مقدار نے کسی قسم کی محنت ایسی نہیں۔ جو میں نے انہیں کرتے ہوئے نہ دیکھا ہو۔ آسٹریا کے ایک ضلع میں میں نے دیکھا۔ کہ وہ سردی گرمی میں چار بجے اٹھتی تھیں۔ گرمیوں میں کھیتوں میں امداد دینے کے لئے اور سردیوں میں کاتنے کے لئے وہ مشکل جو انہیں زندگی کا اچھا معیار قائم رکھنے میں پیش آتی ہے۔ انہیں اس قدر سخت محنت کے لئے مجبور کرتی ہے۔ لیکن اگر کوئی جسم اور چہرے کے لحاظ سے اندازہ لگائے تو معلوم ہوگا کہ انہیں صحت و اطمینان کی شکل میں اس کا نہایت عمدہ معاوضہ ملتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جب عورتیں تقریباً وہ تمام کام کرتی ہیں۔ جو آدمی کرتے ہیں۔ تو اس کے ساتھ اگر چکی بھی پیسی جائے۔ تو کام حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ بچوں کی طرف سے لاپروائی ہو جاتی ہے۔ اور نیند کے گھنٹے اتنے کم ہو جاتے ہیں۔ کہ ان کے لئے فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ اور عورتیں آدمیوں کی غلام بن جاتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ جب کام حد سے زیادہ ہوتا ہے۔ تو پیسنا چھوڑ دینا ایک نعمت ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ انہیں کم مقوی آٹا ملتا ہے۔ اس صورت میں نیند زیادہ عرصے تک میسر آ سکتی ہے۔ اور جسم دن کے دوسرے کاموں کے لئے تازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جب کام حد سے زیادہ نہ ہو تو اس سے پہلے کہ پسائی اور کتائی جیسے پرانے کام چھوڑ دئے جائیں۔ (عقلمند عورت کبھی کاتنا نہ چھوڑے گی) کوئی نہ کوئی اور کام ہونا چاہئے۔ جو ان کی جگہ تبدیل کیا جا سکے۔ جب تک عورتیں غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ انہیں وہ نصیحت نہیں بھولنی چاہئیے۔ جو جلالؔ نے بیوہ کو کی تھی "تمہارے پیچھے ایک دیوار ہو۔ اور تمہارے سامنے ایک چرخہ اپنے آپ کو پیسنے اور

کاتنے میں مصروف رکھو۔ تو تم اپنے دن اچھی طرح کاٹ دوگی۔ ترقی کرتے ہوئے معیار زندگی اور عورتوں میں تعلیمی کام کرنے کا (خاص طور پر عیسائی مبلغین کا) یہ ایک فرحت بخش نتیجہ ہے۔ کہ وسطی پنجاب کے دیہات کی گھریلو دستکاریوں میں نئی اصلاحات گھر کر رہی ہیں۔ مثلاً جرابیں اور جرسیاں بننا۔ بچوں کے کپڑے بننا آزاربند اور رومال بنانا اور دریاں بننا۔ جوں جوں یہ شعور پھیلتا جائے۔ اس کی باگ پرانی دستکاریوں کو ترقی دینے کی طرف موڑنی چاہیئے۔ جن میں ہر قسم کی کشیدہ کاری شامل ہو۔ اور ایسی سادہ چیزیں شامل ہوں۔ جن کی دیہاتی کے گھر کو ضرورت ہے۔ نہ کہ ایسی جو مشرقی مذاق کی نسبت مغربی مذاق کے زیادہ مطابق ہوں۔ یا شاید بالکل ہی غیر ضروری ہوں۔ اس کے بعد کی دو باتیں پہلے ہی لکھی جا چکی ہیں۔ یعنی صوبے کے مغربی حصے میں عورت کی زیادہ آزادی اور گھر اور اس کی ترتیب پر زیادہ توجہ دینا ان دونو صورتوں میں ترقی یافتہ مشرق کو پس ماندہ مغرب سے کچھ نہ کچھ سبق لینا چاہیئے۔ اور یہ بات کہ یہ اسی طرح ہونی چاہیئے۔ پرانی تہذیب کی خوبی کے لئے خراج ہے۔ عورتوں کے سلسلے میں بھی پرانی تہذیب کو بھول نہ جانا چاہیے۔ اگرچہ اس لمحہ اسے نئی تہذیب کی زیادہ ضرورت ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں عورت کے گھر اور اس کی زندگی کو نئی تہذیب کے سانچے میں ڈھالنے کی اب بہت کوشش کی جا رہی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ امید بخش یہ ہے۔ کہ۔۔ اس سے زیادہ باہمی کفایت شعاری کی انجمنیں جاری کی گئی ہیں۔ جن کی تمام کی تمام ممبر عورتیں ہیں۔ چند سالوں میں انہوں نے تقریباً ایک لاکھ روپیہ جمع کر لیا ہے۔ کفایت شعاری اگرچہ ضروری ہے۔ لیکن عورت کی زندگی کے صرف ایک چھوٹے حصے سے تعلق رکھتی ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ انگلستان کی دیہاتی یا ضابطہ مجلس جیسی کوئی انجمن ہو۔ جسکا منشا یہ ہو کہ وہ زندگی کو ہر پہلو سے آراستہ کرے۔ اس کی ابتداء یہاں بھی کی گئی ہے۔ خاص طور پر بنگال میں۔

دیہاتی کے ذرائع معاش۔

ایک دیہاتی زمیندار جسے اس کی بیوی سے پوری پوری امداد بہم پہنچتی ہے۔

ممکن ہے۔ کہ گذارہ کر سکے لیکن وہ اس قابل نہ ہوگا۔ کہ اس معیار کو جو ہمارے ذہن میں
ہے۔ حاصل کر سکے اور قائم رکھ سکے تاوقتیکہ وہ کاشتکاری کو ترقی نہ دے کیسی قسم
کے امدادی مشاغل نہ رکھے اور سال کے اکثر حصے تک پورے طور پر مشغول نہ ہو۔ اور
کہیں میں نے اس موضوع پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اب میرے زیر تجویز
یہ ہے۔ کہ میں مختصراً یہ دیکھوں۔ کہ یہ رسالہ ان تینوں باتوں میں سے ہر ایک پر کیا روشنی
ڈالتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے۔ کہ کیا کسان کاشتکاری کو ترقی دے رہا
ہے۔ بعض علاقوں میں مثلاً جالندھر کے بعض حصوں میں اس کی کاشتکاری اتنی
اچھی ہے۔ کہ اس سے زیادہ اچھی کا تصور میں لانا بھی مشکل ہے۔ البتہ اس میں بہت
سی ایسی ہیں۔ جسے ترقی دی جا سکتی ہے۔ یہ صورت خاص طور پر مغربی حصے
میں ہے۔ گذشتہ ایام میں افسوس ہے۔ کہ مغرب کی طرف کوئی توجہ نہیں دی
گئی۔ پھر اسے مشرق پر دو فوقیتیں حاصل ہیں۔ جن میں سے دونوں کی دونوں زراعتی ترقی
کی حامی ہیں۔ زمین زیادہ تر اچھی ہے۔ اور بہت سے لوگ گاؤں میں رہنے کی
بجائے کھیتوں میں رہتے ہیں۔ اسے ایک تیسری فوقیت بھی حاصل ہے۔ اور
وہ یہ کہ بڑے جاگیرداروں کی زمین آزمائش کے لئے قابل ستائش مواقع بہم پہنچاتی
ہیں۔ یہ سچ ہے۔ کہ بحیثیت جماعت وہ سب ادنیٰ ترقی یافتہ لوگوں میں سے ہیں۔
لیکن ان میں سے بعض پہلے سے اپنے آرام طلب پڑوسیوں کے پیش پیش
ہیں۔ مشرق میں زمین کے بہت زیادہ ٹکڑوں میں تقسیم ہونے کی وجہ سے اصل ترقی
تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے۔ لیکن اب امداد باہمی کی انجمنوں نے ...... سے زیادہ
ایکڑ زمین کو اکٹھا کر دیا ہے۔ اور جہاں کہیں ایسا کر دیا گیا ہے۔ زراعت دن دوگنی
رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ بعض اتنی پیش رو کاشتکار کی طرح جسے ہم جھنگ
میں ملے تھے۔ کافی طاقت سمجھ اور کفایت شعاری رکھتے ہیں۔ وہ اپنے لئے
سب کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن زیادہ لوگ ایسے ہیں۔ جنکو منظم امداد کی ضرورت ہے
ایسے لوگوں کے لئے بے شمار [illegible] مقامات اور [illegible] ہیں۔ اور
آخر الذکر میں سے ... سے زیادہ امداد باہمی کی انجمنیں برائے اصلاح رسومات ہیں۔ جن کا
مقصد یہ ہے۔ کہ وہ اپنے ممبروں کی کاشتکاری کو ترقی دیں۔ زیادہ تر اچھا بیج اور ترقی
یافتہ آلات مہیا کر کے۔ اچھے نتائج کی ہر جگہ قدر کی جاتی ہے۔ خاص طور پر اس

صورت میں جبکہ یہ کسی ایسی نئی قسم کی گیہوں یا روئی کا بیج ہوتا ہے۔ جسے محکمہ
زراعت کے مدبر سائنس دانوں نے پیدا کیا ہوتا ہے۔ لیکن ان نئے آلات میں
سے جو دیہاتی کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ اکثر کو وہ کن آنکھوں سے دیکھتا
ہے۔ بلاشبہ اس وجہ سے کہ وہ لکیر کا فقیر ہے۔ لیکن کچھ اس وجہ سے بھی کہ وہ
انہیں خریدنے کا مقدور نہیں رکھتا اور تجربہ اسے بتاتا ہے۔ کہ تھوڑی جائداد والے
شخص کو دوسرے لوگوں کی مشینوں کی نسبت اپنی محنت پر زیادہ انحصار رکھنا چاہئے
اس وقت جبکہ اس کے سرکاری مشیر اسے ہر قسم کے ہلوں اور کلوں کی
خوبیاں بتاتے ہیں۔ تو یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔ وہ خود یقینی ذاتی عقل کے ساتھ
آہستہ آہستہ ایسے کام کی طرف رجوع ہو رہا ہے۔ جس کے لئے آخرکار نہ ہل کی
ضرورت ہوگی۔ نہ کلوں کی میرا اشارہ سبزیوں کی کاشت کی طرف ہے جس
کی ترقی ان تمام فائدہ مند تبدیلیوں میں سے جو اس دورے میں دیکھی گئی ہیں۔
ایک یہ ہے۔ میں نے پہلے بھی صحت اور خوراک کے اعتبار سے اس کی اہمیت پر
زور دیا ہے۔ پیداوار اور کام کے لحاظ سے بھی یہ اتنی ہی مفید ہے۔ زیادہ پیداوار
کی وجہ سے یہ انسان کی آمدنی میں اضافہ کرتی ہے۔ اور زیادہ کام کی وجہ سے
(کام بھی باقاعدہ قسم کا) یہ تھوڑی جائداد والے کے لئے یہ امر آسان بنا دیتی
ہے۔ کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے کنبے کو تمام سال مستعدی سے مصروف رکھے
صوبے کی چھوٹی جائدادوں کا لحاظ رکھتے ہوئے (اکثر جائدادیں غالباً دس ایکڑ سے
کم ہیں) ایک ماہر نباتات کی اشد ضرورت ہے۔

پانی:- تاوقتیکہ چھوٹی جائداد والے کی زمین کو نہایت محنت سے زیر کاشت
کیا جائے۔ وہ مٹے جاتے تھے۔ لیکن ایسی کاشتکاری کے لئے پانی اور
کھاد دونوں کی ضرورت ہے۔ ما قبل الذکر کا باقاعدگی سے مہیا ہونا اور آخر الذکر
کی کافی مقدار بہم پہنچنا۔ اس لحاظ سے پنجاب نہایت خوش نصیب ہے۔
کہ اس میں ......٢ لمبی نہریں ہیں۔ لیکن اکثر اس خوش نصیبی کا برا استعمال کیا
جاتا ہے۔ اور بہت سا پانی دیا جاتا ہے۔ کہ ٢٠ فیصدی ضائع کر دیا جاتا ہے۔
گذشتہ بیس سالوں میں یہ اس قدر افراط سے بہم پہنچایا گیا ہے۔ کہ اس کے
کفایت شعارانہ استعمال یا ان علاقوں میں جہاں نہر کا پانی نہیں مل سکتا۔ اسے

حوضوں میں جمع کرنے کی طرف بالکل توجہ نہیں دی گئی ہے۔ تاہم پانی ہندوستان کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ ہوشیارپور اور جالندھر دونو جگہوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ اس کی کمی کے نتائج کیا کچھ ہو سکتے ہیں۔ ان دونو ضلعوں میں ایک بہت بڑے علاقے میں جس کے ساتھ ہزاروں لوگوں کی خوش نصیبیاں وابستہ ہیں۔ بے شمار کوؤں میں پانی کی سطح کوؤں کی تہ سے نیچے ہوجانے کی وجہ سے تمام دیہاتی اقتصادیات درہم برہم ہوجانے کے خطرے میں ہے۔ اور یہ زیادہ فکر کی بات ہے۔ کیونکہ یہ دونو صوبے کے بہترین کاشت کئے جانے والوں اور حد درجہ گنجان آباد ضلعوں میں سے ہیں۔

کھاد:۔ پانی سے کم اہمیت رکھنے والا کھاد ہے۔ جیسا کہ مہابھارت کی ایک کہانی سے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کسطرح بے مثل دیوی شری نے اپنی رہائش گائے کے گوبر میں اختیار کر لی۔ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ قدیم ہندوستان کے لوگ اس بات سے بخوبی آشنا تھے۔ لیکن گذشتہ صدی کا ہندوستان اسے بھول چکا ہے۔ اور اپنے ایندھن کے ذریعوں کو احتیاط سے محفوظ رکھنے کی بجائے انہیں گوبر سے امداد بہم پہنچائی جاتی ہے۔ اور یہاں تک کہ اس سے بالکل تبدیل بھی کر لیا گیا ہے۔ جہاں لکڑی نہیں ہے۔ دیہاتی اب اس کے سوا اور کچھ استعمال نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ اتنا غریب ہے۔ کہ پتھر یا لکڑی کا کوئلہ نہیں خرید سکتا۔ لیکن جہاں جیسا کہ اب بھی صوبے کے مغرب میں بنجر زمین کے بڑے بڑے علاقے موجود ہیں۔ اور ایندھن کثرت سے ہے۔ وہ اسے صرف دودھ کو آہستہ آہستہ گرم کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ کہ اس کے بغیر دودھ اچھی طرح گرم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جہلم کے شمال میں اسے اس کے لئے بھی استعمال نہیں کیا جاتا۔ اس لئے اگر اس کا بدل مل سکا تو ملک کے کھاد کا تمام یا اکثر حصہ کھیتوں میں جائے گا۔ اور ہندوستان کی زمین بہت زیادہ زرخیز بن جائے گی۔ اور یہاں کی عورتیں اُپلے تھاپنے کے گندے کام سے بچ جائینگی۔ ۱۹۰۸ء کے اندازے سے کہ گائے کے ہر فی من گوبر سے جو بطور ایندھن کام میں لایا جاتا ہے۔ ملک کو ۱/۲ ۲ آنے کا نقصان پہنچتا ہے۔ یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ موجودہ نقصان کس قدر زیادہ ہے۔ یہی

فیصلہ اس اندازے سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ جو اس کے بیس برس بعد لگایا گیا۔
یعنی یہ کہ ۵ افراد کا ایک کنبہ سالانہ ۲۲۰ من گوبر بطور ایندھن استعمال کرتا ہے۔ یہی
اگر زمین میں ڈالا جائے۔ تو ان کی فصلوں میں ۔ ۱۷۵ روپیہ کا اضافہ ہو جائے۔
دیہاتی اس کی اہمیت کو آہستہ اور بہت آہستہ محسوس کر رہا ہے۔ ایندھن
کے طور پر کھاد کم استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس کے عوض کپاس کے تنے
اور شیشم کے پتے تک استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس معاملے میں اور شاید
دوسری صورتوں میں بھی وہ ملک جس کی طرف ہندوستان کو رجوع کرنا چاہئیے
چین ہے۔ وہاں کھاد کے گڑھے کا استعمال عام ہے۔ لوگ مویشیوں کے فضلے
کو دیہات میں اور قافلوں کے راستوں میں باقاعدہ تلاش کرتے ہیں۔ اور اسے
جمع کرتے ہیں۔ رات بھر کا گوبر کوڑا نہایت احتیاط سے جمع کیا جاتا ہے۔ اور
تمام ضائع شدہ چیزیں کھیت میں لے جاتے ہیں لیکن ایسا کرنے سے
پہلے وہ اسے ایک گھر میں جمع کرتے ہیں۔ تاکہ موسم اسے خراب نہ کرے۔
ان گھروں کا احاطہ نہایت ہوشیاری سے بنایا ہوا ہوتا ہے۔ اور ایک تین یا
یہاں تک کہ چھ ماہ میں تعمیر کیا ہوا ہوتا ہے۔ تاکہ ان چیزوں کو کھاد کا کام یا
فصل کی خوراک بننے کے لئے بہترین مناسب صورت میں لایا جا سکے مسٹر
برین کے کھاد کے گڑھوں کی ابتدا کر کے اس طرف پہلا قدم اٹھایا ہے۔

مرغیاں پالنا :- میں اب دوسری بات بیان کرتا ہوں۔ یعنی امدادی جائداد
رکھنے کا مسئلہ اس سے میری مراد ایسے جانداروں سے ہے۔ جو کھیت کی
فضول پیداوار پر بڑی تعداد میں رکھے جا سکیں۔ عام طور پر اسمیں مرغیاں اور
سؤر شامل ہیں۔ میں یورپ میں کبھی کسی ایسے دیہاتی سے نہیں ملا۔ جو ان
میں سے ایک یا دوسرے کو نہ پالتا ہو۔ اور ایسے لوگ ابھی بہت کم دیکھے ہیں۔
جو دو کو نہ پالتے ہوں۔ وہ ہندوستانی دیہاتی جس کا اختتام کتاب میں ذکر
ہے۔ اور جس کے پاس ۵۰ مرغیاں خرگوش اور کبوتر اور ۱۶۰ پونڈ کا سؤر ہے۔
دوسروں کے لئے تمثیل ہے۔ البتہ یہ فضول ہے کہ مسلمانوں کو سؤر پالنے کے
لئے ترغیب دی جائے۔ (بعض لوگ تو اس کے نام لینے کو ہی گناہ سمجھتے
ہیں) لیکن جو لوگ استطاعت رکھتے ہوں۔ انہیں مرغیاں پالنا چاہئیں۔

ان اندراجات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مغربی پنجاب میں بہت سے لوگ ایسا کر رہے ہیں لیکن مشرق میں کوئی نہیں پالتا۔ لیکن مغرب میں بھی مرغیوں کو خانگی ضروریات کے لیے پالا جاتا ہے۔ ہم نے صرف دور دراز جگہوں میں یہ دیکھا ہے۔ کہ لوگ دس یا بیس سے زیادہ مرغیاں رکھتے ہیں۔ جب دیہاتی سے یہ دریافت کیا جاتا ہے۔ کہ وہ مرغیاں کیوں نہیں پالتا تو وہ ہمیشہ یہ جواب دیتا ہے۔ کہ یہ چارہ گندہ کر دیتی ہیں۔ یا بیج کھا لیتی ہیں۔ یا ننھے پودوں کو توڑ دیتی ہیں۔ لیکن یہ عادتیں تمام دنیا کی مرغیوں میں ہیں۔ اگر یورپ میں انہیں قابو پایا جا سکتا ہے۔ زیادہ قابل غور بات بیماریوں کے خطرات ہیں۔ اٹک ان چند اضلاع میں سے ایک ہے۔ جہاں مرغیاں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ گذشتہ سال یہاں مرغیوں کے کے ہیضے کی بیماری سے تباہ کن اثر پڑا۔ ایک جگہ جالندھر میں ہم نے یہ سنا۔ کہ جوؤں کی وجہ سے بہت زیادہ ناگہانی اموات ہوئیں۔ حال ہی میں ایک پولٹری ایکسپرٹ کو ملازم رکھا گیا ہے۔ اسے چاہیے کہ ان میں تخفیف کرے۔ لیکن اتنے لوگوں میں ایک ایکسپرٹ کیا حقیقت رکھتا ہے۔ اگر موجودہ روش کے مطابق مرغیاں کہیں نہیں پائی جاتی۔ لیکن شمالی حصے میں ایسے لوگ بہت ہیں۔ جو پرانے طریقے سے ان کی نسل بڑھاتے ہیں۔ اور پیش روی کرنے والے لوگ صوبے بھر میں نمودار ہو رہے ہیں۔ ہم ان میں سے بعض کو ملے۔ ان کی عجیب بوقلمونی (انہیں ایک راجپوت ایک سید ایک ماسٹر ایک ملا ایک حجام اور ایک باغ شامل تھے) یہ امیدیں بندھاتی ہے۔ کہ ممکن ہے۔ کہ وقت آنے پر مرغیاں پالنا مقبول عام ہو جائے۔ ان لوگوں میں راجپوت کا شامل ہونا۔ خاص طور پر تعجب خیز ہے۔ کیونکہ راجپوت مرغیوں کو گندی خیال کرتے ہیں۔ اور انہیں پالنا اتنا معیوب سمجھتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ ایک راجپوت نے ایک بڑے افسر سے کہا کہ میں انہیں پالنے کی نسبت مرنے کو بہتر سمجھتا ہوں۔ دوسری نمایاں مثال ایک استاد کی ہے۔ (ایک ارائیں) جس نے یہ بتایا کہ میں نے زمین کا لگان مرغیوں کی آمدنی میں سے ادا کیا ہے۔ حجام کے واقعہ سے بھی اس امر کا امکان ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ایک میٹرکولیٹ ہے۔ اور مرغیاں پالنے کی تربیت حاصل کرنے کے بعد مرغیاں پال کر اپنی روزی کمانے

کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا بہت سے بے کار زمیندار میٹریکولیٹ بھی نہیں کر سکتے ؟

تعلیم :۔ کاشتکار میٹریکولیٹ موجودہ زمانے کا نہایت مشکل اقتصادی سوال پیش کرتا ہے۔ کاشتکار کو مدتوں سے اس امر کی تاکید کرتے رہے ہیں۔ کہ وہ اپنے بچوں کو سکول بھیجے۔ اور وہ آخر دم تک اس کی تکمیل کر رہا ہے۔ اگر جیسا کہ اکثر صورتوں میں ہوتا ہے۔ تعلیم پرائمری سے آگے نہ بڑھے تو لڑکے بہت جلد زمین کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ بہت کم تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور جو کچھ وہ حاصل کرتے ہیں۔ جلد بھول جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر وہ ہائی سکول میں جائیں اور دسویں جماعت پاس کر لیں۔ تو وہ اس قدر پڑھ لیتے ہیں۔ کہ انہیں زمین چھوڑنے اور گورنمنٹ کی ملازمت حاصل کرنے کی نسبت اس قدر آسان اور یقینی ہے) لیکن میٹریکولیٹ طلباء کی آئے دن کی تعداد ان کی مانگ سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی لئے ایسی جگہوں میں جہاں سکول کثرت سے ہیں۔ مثلاً جالندھر اور ہوشیارپور میں دیہات میں۔ بیکار میٹریکولیٹ طلباء کی تعداد بے شمار ہے۔ کوئی یہ خیال نہ کرے گا۔ کہ ملازمت حاصل کرنے میں ناکامیاب ہو کر وہ ہل چلانے کی طرف متوجہ ہوں گے۔ جو لوگ عقلمند ہیں۔ وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ یا کریں گے۔ اگر وہ ایسا کر سکے۔ لیکن اس صورت میں نکتہ یہ ہے۔ کہ جب تک لڑکا دسویں جماعت پاس کرتا ہے۔ وہ کاشتکار کی سی زندگی بسر کرنے کے ناقابل ہو جاتا ہے۔ وہ نہ یہ کام کر سکتا ہے۔ اور نہ ہی دھوپ برداشت کر سکتا ہے۔ یہ بات عموماً اس قدر سننے میں آئی ہے۔ کہ اس پر اعتبار نہ کرنا مشکل ہے۔ اور اگر یہ سچ ہے۔ اور اس کا کوئی چارہ نہیں تو کسانوں کو اپنے بچوں کو مڈل کے درجے سے زائد تعلیم دینے سے باز رکھنا چاہئیے۔ کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس درجے تک انہیں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ لیکن کیا اس کا کوئی علاج نہیں ہے ؟ ان تمام دیہاتیوں میں سے جنہیں میں حال ہی میں یورپ میں ملا ہوں۔ میں نے کسی کو کبھی یہ کہتے نہیں سنا۔ کہ تعلیم لڑکے اور کھیت کے کام حائل ہوتی ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے۔ کہ یہ اسے گاؤں چھوڑ کر شہر میں جانے کی ترغیب دیتی ہے۔ معمولی حیثیت کے لڑکے اپنے باپ کے کھیت میں

رہتے ہیں۔ اور طویل تفصیلات میں کاشتکاری میں امداد دینا سیکھتے ہیں۔ اس کی روزانہ سیر یعنی سکول آنا اور جانا اسے تندرست رکھتی ہے۔ اور وہ جسم و دماغ دونوں کی اچھی نشوونما ہونے کی وجہ سے اپنی طاقت قائم رکھتے ہیں۔ شاید یہی صورت ہندوستان کے ہائی سکول کے طالب علم کو درپیش ہے۔ اسے خوراک مناسب مقدار سے کم ملتی ہے۔ اور سکول کے دوران میں کتابوں کے ساتھ بہت سخت محنت کرتا ہے۔ اور تعطیلات میں کاشتکاری میں بہت کم حصہ لیتا ہے۔ کیا صورت حال یہ بھی ہے۔ کہ وہ کاشتکاری کو سرے سے باعثِ ذلت خیال کرتا ہے۔ ان سوالات کے جوابات ہمیں ماہرانِ فن تعلیم کے ذمے چھوڑ دینے چاہئیں۔ اور ہم بلاتردد ایسا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ دیہاتی تعلیم کی مشکلات سے خوب واقف ہیں۔ اور ان پر عمل کرنے میں اپنی سی سعی کر رہے ہیں۔

گھریلو صنعتیں:۔ تیسرا غور طلب مسئلہ کاروبار کا سوال ہے۔ تھوڑی جائداد والے کو جو اچھی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ محنت کرنے کے لئے اور ہر وقت کرنے کے لئے تیار ہونا چاہیئے۔ لیکن ہندوستان میں ایسے موسم بھی ہیں۔ جن میں اسے بے کار رہنا پڑتا ہے۔ اور اس کی زمین اس کے لئے کافی کام مہیا نہیں کرتی۔ پھر اس کی مثال ایک ایسے معمولی افسر کی سی ہوتی ہے۔ جو رخصت پر ہوتا ہے۔ اور جسے نصف تنخواہ ملتی ہے۔ یا بالکل ملتی ہی نہیں کوئی افسر شاذ اپنے لئے ایسی صورت پیدا کرتا ہے۔ لیکن بہت سے دیہاتی سال میں ایک یا دو مرتبہ ایسی صورت اختیار کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس سے بچنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔ کہ وہ کوئی ایسا منفعت بخش کاروبار اختیار کریں جو گھر پر کیا جا سکے۔ جاپان میں کاشتکاروں کی آبادی کا ایک تہائی حصہ ریشم کے کیڑے پالنے کی وجہ سے سمندر پر تیرتا رہتا ہے۔ اور یورپ میں گھریلو صنعت کی اہمیت کو ہمیشہ سمجھا گیا ہے۔ اور پنجاب میں اسے ہمیشہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ ہوشیارپور میں بیری کے درخت سے لاکھ حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن درخت کا مالک شاذ ہی ایسا کرتا ہے۔ بعض اضلاع میں گھر کے کام کے لئے ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں۔ لیکن مظفر گڑھ اور گوڑگاؤں جیسے دو غریب

اضلاع میں انہیں خریدا جاتا ہے۔ چارپائیوں کے لئے رسیاں اکثر بنائی جاتی ہیں۔ اور
کبھی کبھی موٹے رستے اور نواڑ بھی بنائی جاتی ہے۔ گورداسپور اور سیالکوٹ کے
نیم پہاڑی اضلاع میں (میدان اس کے لئے بہت گرم ہے)
کا کام کیا جاتا ہے۔ اور چند پہاڑی علاقوں میں شہد کی مکھیاں بھی پالی جاتی
ہیں۔ لیکن کسی جگہ کوئی ایسا کام نہیں کیا جاتا جسے گھریلو صنعت کہہ سکیں۔
ماسوائے اس کے کہ گھی تیار کیا جاتا ہے۔ جس سے چند بڑی بڑی چراگاہوں
والے اضلاع کافی آمدنی حاصل کرتے ہیں۔ کہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔
جہاں کہیں کاشتکاری نہایت پرزور طریق سے کی جاتی ہے۔ اور اس کا انحصار
کوئیں پر ہے۔ وہ غالباً ٹھیک کہتے ہیں۔ جالندھر میں ایک سکھ نے کہا کہ ہمارے
پاس اس قدر کام ہے۔ کہ ہمیں اپنے کیس سنوارنے کی بھی فرصت نہیں ملتی
یہ بہانہ نہری آبادیوں میں بھی قابل قبول ہے۔ اگرچہ یہ ان نتائج سے مطابقت
نہیں رکھتا جو حال ہی میں نوآبادیوں کے بے شمار کھیتوں سے اخذ کئے گئے
ہیں۔ لیکن ایسے علاقوں میں جن کا انحصار محض بارش پر ہے۔ یقیناً ایسے موسم
آتے ہیں۔ جبکہ کسان کو نہایت ہی کم کام کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر وہ اس کے
خلاف جرح کرتا ہے۔ تو یہ صرف اس وجہ سے ہے۔ کہ وہ کاہل ہے۔ اور اپنے
کام کو باقاعدہ نہیں کرتا۔ یہ کہتے وقت میں اس امر کو فراموش نہیں کرتا۔ کہ ان
خالی مہینوں میں اسے گھر چھپر اور مینڈھوں کی مرمت کرنی پڑتی ہے۔ اور
کھاد لے جانا ہوتا ہے۔ اور خشک سالی کے دوران میں اسے اپنے مویشیوں
کو چارہ بہم پہنچانے کے لئے جھاڑیوں اور درختوں کی ٹہنیاں کاٹنی پڑتی ہیں۔
یہ متفرق کام نہایت آہستہ آہستہ کئے جاتے ہیں۔ اور بلاشبہ کاشتکار
میں یہ احساس پیدا کرتے ہیں۔ کہ اس کے پاس کام بہت ہے۔ ان کے زائد
کام نہ کرنے کی وجہ گوڑگاؤں کے ایک دیہاتی کی اس بات سے ظاہر ہے۔
کہ ہم صرف کاشتکاری کرتے ہیں۔ دوسری باتوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں
ہے۔ ہندوستانی گاؤں میں ہر شخص کا کام مقررہ ہے۔ اور کوئی کبھی بھی
کسی دوسرے کام کے کرنے کا خیال تک دل میں نہیں لاتا۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ کاشتکار
اپنے ہاتھ پاؤں سے کام لینا نہیں جانتا۔ اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں۔ وہ ان کی طرف

حقارت سے دیکھتا ہے۔ پس اگر یہ کہا جائے کہ گھریلو صنعتوں کا وجود نہیں ہے۔ تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اور عورتوں میں چرخہ کاتنے کا رواج جلد جلد مٹنے کی وجہ سے حالات بد سے بدتر ہو رہے ہیں۔

اسی طرح یورپ میں (یہ عمل ابھی تکمیل کو نہیں پہنچا) کارخانوں کا بنا ہوا کپڑا گھر کے بنے ہوئے کپڑے کی جگہ لے رہا ہے۔ یہ سب تسلیم کرتے ہیں۔ کہ گھر کا بنا ہوا کپڑا دیرپا ہوتا ہے۔ لیکن پانچ مختلف قومیں مختلف ترکیبوں سے روئی سے کپڑا حاصل کرنے میں اُلجھی ہوئی ہیں۔ اور کارخانے کا کپڑا خریدنے کے لئے جو ترکیب عمل میں لانی پڑتی ہے۔ وہ صرف یہ ہے۔ کہ بازار تک جانا پڑتا ہے۔

گاندھی جی اور چرخہ :۔ اگر مسٹر گاندھی کے کہنے پر یقین کیا جائے۔ تو بازار تک چل کر جانا ہی دیہاتی کی تباہی کا سبب ہے۔ چرخے کے متعلق مسٹر گاندھی کے عقیدے سے سب لوگ واقف ہیں۔ اور بعض اسے ناقابل عمل تاریخی غلطی خیال کرتے ہیں۔ جب ان دیہاتیوں نے جنہیں ہم دورے میں ملے یہ سنا کہ وہ ان سے اسی طرح چرخا چلوائیگا۔ جس طرح کہ عورتوں سے تو ان سب نے فوراً یہ کہا کہ ہمارے ہاں اس کا رواج نہیں ہے۔ اور اس موضوع کو بند کرنے کے لئے اتنا ہی کہنا کافی تھا۔ ایک گاؤں کے لوگوں نے اتنا تسلیم کیا کہ خیال اچھا ہے۔ لیکن زمانے کی رفتار اس کے خلاف ہے۔ اُن لوگوں میں سے جن کو مسٹر گاندھی سے گہری دلچسپی ہے۔ بہت سے اس امر کی تصدیق کریں گے۔ تاہم اگر یہ ایک اچھا خیال ہے تو خواہ لوگ زمانے کے متعلق کچھ ہی کیوں نہ خیال کرتے رہیں۔ تاوقتیکہ اسے عمل میں لانے کی ہر ممکن کوشش کر کے نہ دیکھ لی جائے۔ کیا اسے مسترد کر دینا چاہیئے؟ یہ سوال اتنا بڑا ہے۔ کہ یہاں اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا البتہ دو باتیں ضرور دیکھ لینی چاہئیں پہلی یہ ہے۔ کہ ہم سب جانتے ہیں۔ کہ ہندوستانی دیہاتی غریب ہے۔ اور اکثر حالتوں میں اس کی غربت مایوس کن ہے۔ لیکن مسٹر گاندھی نے کسی اور علاج کی نسبت یہ بات زیادہ واضح طور پر دیکھی ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ اگر وہ اپنی غربت سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تو اسے اپنی دولت کے ایک ایک پیسے

اور اپنے وقت کے ایک ایک لمحے کی احتیاط کرنی چاہیئے۔ لیکن پنجاب میں بھی ایسے علاقے ہیں جہاں لوگ اس قدر غریب ہیں کہ انہیں اس کی ضرورت ہے۔ اور ملتان کے ایک دیہاتی نے یہ بات کہکر اسے کنایتہً ظاہر بھی کیا۔ کہ ہم غریب لوگ ہیں۔ اور ہمیں اپنے کپڑے خود بنانے چاہئیں۔

نقل مکانی: نہایت ہی خوشحال علاقوں میں بھی کسان اس بات کیلئے بہت محنت کرتا ہے۔ کہ وہ کچھ عرصہ آرام سے زندگی بسر کرے جہاں کہیں زندگی کا معیار پست ہے۔ لوگ اس قدر جلد بڑھتے ہیں۔ (گاؤں میں لوگ تحفظ پیدائش کے امکان سے ناواقف ہیں۔) کہ زیادہ گنجان آباد علاقوں میں اکثر خاندانوں میں جلد یا بدیر افراد اس قدر زیادہ ہو جاتے ہیں۔ کہ وہ انہیں پال نہیں سکتے نتیجہ یہ ہے کہ وسطی اضلاع سے نقل مکانی کرنے والوں کی مسلسل رَو جاری ہے۔ گذشتہ سال جالندھر اور ہوشیار پور سے ۰۰۰ھ لوگ نقل مکانی کر گئے۔ اور اگر زیادہ ولفریب ملکوں کے دروازے بالکل کھول دئے جائیں۔ تو اس سے کہیں زیادہ لوگ جائینگے۔ پھر دیہاتی زندگی پر اثر اتنا ہی گہرا ہوگا۔ جتنا کہ اٹلی اور سسلی میں جہاں نقل مکانی کرکے واپس آئے ہوئے لوگوں نے دیہاتی جاگیرداروں کو مٹ جانے سے بچالیا ہے۔ چونکہ یہ امر ایک حقیقت ہے۔ اس کے اثرات قابل ذکر ہیں۔ ہماری تحقیقات کا ایک موضوع یہ تھا۔ کہ یہ کہاں تک مفید ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس اعتقاد اور خلوص سے جس کی ہر وہ شخص جو دیہاتیوں سے محبت رکھتا ہے۔ تہ دل سے تعریف کریگا۔ اس نے اپنے آپ کو اس کام پر لگا دیا ہے۔ کہ وہ ہندوستان کے ہر گھر کیلئے ایک ایسی صنعت کو آزمائے اور مہیا کرے۔ جو اس کی مالی آمدنی اور ملازمت دونو میں اضافہ کرے۔ بعض سمجھتے ہیں۔ کہ آمدنی میں صرف اس قدر اضافہ ہوگا۔ جو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ یہ نہایت قلیل ہوگا۔ (مسٹر گاندھی خود لکھتا ہے۔ کہ یہ آمدنی دو آنہ یومیہ ہوگی۔) لیکن وہ لوگ جو ہندوستانی معیارِ زندگی اور اس کی غربت کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ آمدنی کے ہر اضافہ کو غنیمت خیال کریں گے۔ دو آنے یومیہ کے حساب سے تقریباً ۵۰|۱ روپیہ سالانہ ہوتے ہیں اور ہر دیہاتی جانتا ہے۔ کہ یہ رقم جب

قرض لی جاتی ہے۔ تو کتنی جلدی سینکڑوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اگر جیسا کہ اغلب ہے۔ پنجاب کو جرتے کی اتنی ضرورت نہیں ہے۔ جتنی کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں کو تو یہ کوؤں اور نہروں کی برکت ہے۔ کہ وہ دوسروں سے زیادہ خوشحال اور اور مکمل طور پر مصروف ہے۔ مادی طور پر ان کے اچھا ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ بقول شخصے کہ جہاں پہلے بیس آدمی بھوکے مرتے تھے۔ اب بیس کے پاس کھانے کو ہے۔ تقریباً پہلی مرتبہ ہم نقل مکانی کر کے آئے ہوئے دیہاتی کو سرمایہ دار دیکھتے ہیں۔ دوالیسی پر ایک لاکھ روپیہ تک لایا جا سکتا ہے یا اور ہم اس کا اثر اس کے مرنے پر بھی دیکھتے ہیں۔ وہ اب اپنے لئے اچھا مکان بنوا سکتا ہے۔ کنواں لگوا سکتا ہے۔ بلکہ اگر وہ پسند کرے تو خود ساہوکار بن سکتا ہے۔ اخلاقی اور عقلی نتائج کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اگر وہ ساہوکار بن جائے (جیسا کہ اکثر کرتے ہیں) تو اغلب ہے۔ کہ وہ بُرا بن جائیگا۔ اور ہر صورت میں کھیتوں میں سخت محنت کرنے کی صلاحیت مفقود ہوتی جائے گی۔ اور وہ اپنا روپیہ بہت ہی جلد خرچ کر ڈالیگا۔ کہا جاتا ہے۔ کہ دس بیس فیصدی لوگ قرض واپس بھی نہیں دیتے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی دیہاتی علاقے کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ نقل مکانی انسان کو زیادہ سمجھدار۔ تعلیم۔ صاف گرد و نواح اور اچھے ماحول کا شائق بنا دیتی ہے۔

ان تمام باتوں میں ہمیں پھر اٹلی کے دیہاتی کا خیال آتا ہے۔ کیونکہ اس نے بھی نقل مکانی کی تھی۔ اور اوسط درجے کا سرمایہ لے کر واپس آیا تھا۔

بہت سی باتوں میں وہ یورپ کے چھوٹے خوشحال زمینداروں کا نمونہ ہے۔ (فصلوں اور جانوروں کی مختلف اقسام کے لحاظ سے اور اس وجہ سے کہ اس کے کھیت اس کے گذارے کیلئے کافی ہوتے ہیں۔ اپنی زندگی کی سادگی اور اس محنت کے لحاظ سے جو اسے اور اس کی بیوی کو صبح ساڑھے یا پانچ بجے اٹھنے پر مجبور کرتی ہے) اگرچہ ممکن ہے کہ ہندوستان اور یورپ کے دیہاتیوں میں درجوں کے اعتبار سے بہت زیادہ

فرق ہو۔ لیکن خواہ کوئی ایک کے متعلق بات کرے۔ یا دوسرے سے وہ اس امر
سے آگاہ ہے۔ کہ وہی مسائل۔ وہی فطرت سے جنگ اور وہی ان دیکھی چیزوں میں
فطری اعتقاد۔ وہی کینے سے گہری محبت وہی زمین سے انس وہی دل و دماغ
کی سادگی جسمیں خوبصورتی کی چاشنی بھی ہو۔ دونو جگہ ہے۔ البتہ ایک بات
میں اختلاف ہے۔ یورپ کا دیہاتی ان تمام مستقل اقتصادی قیود سے بالکل
آزاد ہے۔ جو مذہبی و معاشرتی طریق نے جسکا ہونا یا نہ ہونا مادی ترقی کے لئے
برابر ہے۔ ایک ہندوستان پر عائد کر رکھی ہیں۔ یہ اختلاف بنیادی ہے۔ اور جب
تک یہ باقی ہے۔ ہندوستانی دیہاتی کبھی غربت سے سر باہر نکالنے کی امید نہیں
کرسکتا۔ سوال یہ ہے۔ کہ آیا وہ پرانی تہذیب پر کاربند رہے۔ اور اس کے نقصانات
برداشت کرے یا نئی تہذیب اختیار کرے اور اس سے فائدہ اٹھائے یا دونو کے
بین بین کوئی ایسا راستہ ممکن ہے۔ جو نئی و پرانی دونو تہذیبوں سے منور ہو۔ آخری
باب اس مشکل ترین سوال کے جواب دینے کی کوشش کرنے کیلئے وقف ہے؀

باب پانزدہم

ہندوستانی گاؤں میں!

مذہب اور اقتصادیات

جو سوال گذشتہ باب کے آخر میں دریافت کیا گیا ہے۔ اس کا جواب اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ مذہب و اقتصادیات کا باہمی تعلق معلوم نہ کر لیا جائے۔ اس لئے ہم پہلے اسی کے متعلق کچھ غور کریں گے۔

مغرب :۔ اقتصادی تاریخ کا ایک مشہور اہل قلم مسٹر ٹاؤنی لکھتا ہے۔ کہ قرونِ وسطیٰ کے ماہر اقتصادیات نے یوں ابتداء کی کہ کوئی اخلاقی اقتدار ایسا ضرور ہے۔ جسے لازمی طور پر اقتصادی احتیاج کی مصلحتوں پر غالب رہنا چاہیئے۔ اور یہ کہ کسی ایسی اقتصادی دلچسپی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ جس کا تعلق اخلاقی انجام سے نہیں ہے۔

ان ایام میں مذہب نے انسان کی طمع پر بہت سی قیود عائد کر رکھی تھیں۔ مثلاً سود خوری کی ممانعت اور منصفانہ قیمت لینے کا اصول۔ سولھویں صدی کی تجارتی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے اقتدار کا بھی مقابلہ کیا گیا۔ اور سترھویں صدی کے آخیر تک مذہب آئندہ اقتصادیات پر حکمرانی نہ کر سکا۔ تاہم اس اقتدار کی دھجیاں باقی رہ گئیں۔ کیونکہ منصفانہ قیمت کے اصول نے مناسب مزدوری کا پہلو اٹھارھویں صدی میں بھی قائم رکھا۔ یہاں تک کہ آدم سمتھ نے بھی اس امر کو پر زور بنانے کے لئے کہ انسان کو اپنے طور پر اپنے مفاد کو حاصل کرنے میں آزاد ہونا چاہیئے۔ مزید برآں کہا کہ اسے قوانین عدل و انصاف میں

رد و بدل نہیں کرنا چاہیئے۔ اٹھارھویں صدی کے پرزور مقابلے میں اس کی تعلیم کا بنیادی اصول فراموش کر دیا گیا۔ اور احتیاج و مانگ کے قانون اور نفع و راحت کے نام پر اقتصادیات اور مذہب کو طلاق دیدی گئی۔ بیسویں صدی میں حالات نے پھر پلٹا کھایا اور ماہر اقتصادیات اس امر پر شبہ کرنے لگا۔ کہ آیا یہ طلاق دونوں میں سے کسی ایک کے لئے اچھی بھی ہے یا نہیں۔ وہ جنگ عظیم جو سیاسیات و اقتصادیات کو مذہب کے طلاق دینے سے وجود میں آئی تمام مسئلے کو پیش پیش لے آئی اور اب جیسا کہ مسٹر ٹاؤنی لکھتے ہیں۔ کہ مذہب اور دنیاوی لین دین کا درمیانی خط اپنی جگہ بدل رہا ہے۔ اور حدود دوبارہ حرکت میں ہیں۔ یہاں تک کے قرونِ وسطیٰ کے بعض وہ اصول جنہیں اٹھارویں صدی میں نہایت حقارت آمیز طریق سے رد کر دیا گیا تھا۔ اب دوبارہ عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ تجارتی اتفاق کے ہوا خواہ نے نہایت مناسب اجرت کا اصول اختیار کر لیا ہے۔ اور امداد باہمی کا ہمدرد منصفانہ قیمت کے مسئلے کا حل سوچ رہا ہے۔ اور صرف دو ہی سال گذرے۔ انگلستان نے سود خوری پر قابو پانے کیلئے ایک بل منظور کیا۔

لیکن اگرچہ بعض صورتوں میں ایسا نظر آئے گا۔ کہ رجحان قرونِ وسطیٰ کیطرف ہے۔ لیکن دراصل یہ بات نہیں ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اقتصادی دلچسپیوں پر رواج کی نسبت مذہب کا غلبہ کم تھا۔ احتیاج اس رواج کی روح تھی۔ کیونکہ اس کی بنیاد انفراد کی جبری جماعتوں پر تھی۔ جو کسی نہ کسی قدر علیحدہ علیحدہ گروہوں میں منقسم تھی۔ اور صرف بیرونی سخت خول مذہب یا اخلاقیات سے بنا ہوا تھا۔ رواج نے اپنی جگہ مصلحت کو دیدی۔ جسکی فرمانروائی کی بنیاد ایسے انفراد کے آزادانہ مقابلے پر ہے۔ جو اب اپنی علیحدگی کی وجہ سے باہم رہنے یا کام کرنے پر مجبور نہیں ہیں۔ بلکہ ہر ایک اپنے طور پر اپنے مفاد کا تعاقب کرنے میں آزاد ہے۔ یہ ہے وہ قانون جس کی رو سے ہماری موجودہ اقتصادی دلچسپیاں ظہور میں آ رہی ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو اسے خطرناک سمجھتے ہیں۔ ایک بار پھر اقتصادیات کو مذہب یا اخلاقیات کے ماتحت لے آئیں گے۔ لیکن احتیاج اور رواج کے بنائے ہوئے قرونِ وسطیٰ کے پرانے ضابطۂ قانون

کے ماتحت نہیں۔ بلکہ اخلاق کے اس طریق پر جسکی بنیاد ایسے افراد کے لئے اتفاقِ آنِ ملاپ پر ہو۔ جو مشترکہ اور ذاتی مفاد کیخاطر آزادی سے مل جل کام کررہے ہوں۔ اسکا بہترین و سراسر عملی اظہار عالمگیر تحریک امداد باہمی ہے۔

ہندوستان میں بھی اقتصادیات اور مذہب کی درمیانی حدود اپنی جگہ بدل رہی ہیں لیکن مخالف سمت میں یعنی یہ کہ اقتصادیات کے حق میں صدیوں تک اس ملک کی اقتصادی زندگی پر رسم و رواج کا غلبہ رہا ہے۔ جس کی ابتداء اگرچہ مذہبی نہ تھی۔ لیکن عرصہ گذرنے پر رائے عامہ میں بہت زیادہ مذہبی بن گیا۔ زمانہ حال کا گاؤں اب بھی قرون وسطیٰ کی یادگار نظر آتا ہے۔ اور غالباً قرون وسطیٰ کے عام مصنفین کی اختیار کی ہوئی۔ مفروضہ بنیادی باتیں اس پر صادق آتی ہیں۔ یعنی یہ کہ اقتصادی مفاد و نجات سے جو کہ زندگی کا حقیقی مقصد ہے۔ دوسرے درجے پر ہیں۔ اور یہ کہ اخلاقیات کے قوانین اقتصادی روش کے لئے لازمی ہیں۔ تاہم یہ خیال کیا جائے گا۔ کہ لفظ اخلاق تقریباً تقریباً لفظ رسم کا مترادف ہے۔ البتہ گذشتہ بیس سالوں میں تغیر رونما ہوا ہے۔ اور پنجاب کے ظاہر و باطن دونو سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔ صدیوں کی جدائی کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ اور ذرائع معاش یقینی اور غربت کم عام ہوتی جاتی ہے۔ زندگی کا ایک بلند معیار آہستہ آہستہ نمو پذیر ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی گاؤں کا مرکز ثقل خدائی مقرر کردہ رواج کی بنیاد پر سے ہٹ کر اقتصادیات کی مصنوعی! بنیادوں کی طرف جارہا ہے۔ یہ سلسلہ عمل ابھی تک زیادہ دور تک نہیں پہنچا ہے۔ لیکن جیسا کہ اس رسالے سے ظاہر ہے۔ یہ نہایت اچھی طرح دیکھا جا سکتا ہے۔

اسلام:۔ اگر ہندو اور مسلمانوں کے متعلق علیحدہ علیحدہ غور کیا جائے۔ تو یہ مضمون اور بھی زیادہ واضح ہو جائیگا۔ میں پہلے مسلمانوں کا ذکر کرتا ہوں اسلام زیادہ تر ایک اخلاقی ضابطۂ قوانین ہے۔ جو ایسے لوگوں کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ جنکی عادات سادہ تھیں۔ اور جو زیادہ تر چوپانی سے اور کچھ تجارت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اور زراعت پر بالکل بسر اوقات نہ تھی۔ اور جنہیں اپنے

دشمنوں سے متواتر حملے کا ڈر رہتا تھا۔ اس کے بنیادی احکام نہایت سادہ تھے۔ اور اتنے صاف تھے۔ جتنے کہ اس صحرائے عرب کے خطوط محیط جہاں وہ وضع ہوئے تھے۔ ایک سچے مسلمان کیلئے ضروری ہے۔ کہ وہ خدا کو ایک اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا رسول جانے۔ وہ دن میں پانچ مرتبہ ضرور نماز پڑھے۔ رمضان شریف کے روزے رکھے۔ اور زکوٰۃ ادا کرے اور اگر وہ توفیق رکھتا ہو۔ تو مکہ معظمہ کو (عمر میں ایک مرتبہ) حج کیلئے جائے۔ یہ پانچ فرائض بنیادی ہیں۔ چھٹا ایک اور ہے۔ جو ذرا کم اہمیت رکھتا ہے (اس کو نہ ربا قبول کرنا چاہیئے۔ اور نہ ادا کرنا چاہیئے۔ ہمارے موجودہ مقصد کے لئے یہ امر نہایت ہی دلچسپ ہے۔ کیونکہ یہ بات اسلام میں اقتصادیت اور مذہب کے باہمی گہرے تعلق پر روشنی ڈالتی ہے۔ مولوی محمد علی صاحب نے ربا کا ترجمہ مرکب سود کیا ہے۔ اور اس موضوع کے متعلق قران شریف کے نہایت اہم جملوں کا ترجمہ اسطرح کیا ہے "وہ لوگ جو ناجائز چیزوں کو نگل جاتے ہیں۔ ترقی نہیں کر سکتے۔ مگر وہ جسکو شیطان نے اپنے اشارے سے پچھاڑ دیا ہو" ہم ایک اور جملے کا حوالہ بھی دے سکتے ہیں۔" اے وہ لوگو جو خدا پر ایمان رکھتے ہو سود میں اضافہ در اضافہ کر کے نہ کھاؤ" تھوڑا عرصہ گذرا جب تک یہ سمجھا جاتا تھا۔ کہ یہ آیات نہ صرف اس چیز سے منع کرتی ہیں۔ جسے عام طور پر سود لیا جاتا ہے۔ بلکہ ہر قسم کے منافع سے روکتی ہیں۔ اسمیں کوئی بات ایسی نہیں جو تاریخ کے طالب علم کو حیرانی میں ڈالے۔ کیونکہ یورپ میں صرف گذشتہ تین سو سالوں سے سود لینا بہت برا گناہ نہیں خیال جاتا۔ سترھویں صدی کے آخر تک اور اس وقت تک جب تک کہ مذہب اور اقتصادی قوتوں کے مابین طویل و سخت کشمکش نہ ہوئی۔ مذہب نے ہار نہ مانی۔ اس وقت اس نے اپنے ضابطہ قوانین میں ترمیم کی اور حسب منشاء سود لینے کی اجازت دی۔ اس کے برعکس اسلام ابھی تک وہیں ہے۔ جہاں تیرہ سو برس پہلے تھا۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ اس کی ترقی کی راہ میں اس نے تباہ کن نتائج پیدا کئے۔ دی لائف آف دی پروفٹ آف اریبیا (پیغمبر عرب کی سوانعمری) کے مصنفین اسے اسلام کے زوال

کے تین بڑے اسباب میں سے ایک بتاتے ہیں۔ اس وقت وہ یہ لکھتے ہیں کہ تمام بڑے بڑے کاموں کے لئے ادھار بغیر چارہ نہیں اور اب جبکہ صراف اور مہاجن دنیا کے حقیقی مالک ہو گئے ہیں۔ اسلام آیاتِ قرآنی کی سختی سے پابندی کرنے کی وجہ سے ایک لحہ کیلئے مالی و سیاسی تباہی میں آ گیا ہے۔

سود لینا:۔ اب دیکھنے والی دلچسپ بات یہ ہے۔ کہ شریعت کی پابندی کے قلعے پر موجودہ قوتیں جلد جلد حملہ کر رہی ہیں۔ اور یہ کہ قلعے کے اندر مختلف تجاویز ہیں۔ ایک فرقہ تو یہ چاہتا ہے۔ کہ خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو قلعہ کو قائم رکھا جائے۔ اس عقیدے کی طاقت اس امر سے ظاہر ہے۔ کہ پوسٹ آفس سیونگ بنکوں میں مسلمانوں کی جمع شدہ امانتوں کی رقوم پر طلب نہ کردہ سود کی میزان لاکھوں روپیہ ہو جاتی ہے۔ دوسرا فرقہ سود اور مرکب سود میں فرق کرنے کے حق میں ہے۔ اور ایک پر کاربند ہے۔ اور دوسرے کو منع کرتا ہے۔ اس مسئلے کا کہ آیا مسلمان جائز طور پر انجمن امداد باہمی کا ممبر بن سکتا ہے۔ یا نہیں۔ مسلمانوں کی سب سے مقتدر ہستی نے پہلے ہی انجمن کے حق میں فیصلہ کر دیا ہے۔ یہ بات حملہ آور نوجوان کو خطرناک طور پر قلعے کے دروازے کے نزدیک لے آئی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وقت آنے پر اور جگہ بھی سپرد کر دینی پڑے گی۔ دیوار پر کا مسلح شخص جلسوں میں روپیہ لئے ہوئے پہلے ہی سے دشمن سے صلح کی گفت و شنید کر رہا ہے۔ اور یہاں تک کہ بعض لوگ جگہ چھوڑ رہے ہیں۔ درحقیقت جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا ہے۔ پنجابی مسلمان ساہوکار کی مانند سود لے رہا ہے۔ اول الذکر پہلے پہل اپنی ضمیر کو تسلی دینے کے لئے وہ اسے خدمت یا جنس کی صورت میں نے معلوم طریق پر وصول کرتا ہے لیکن جلد یا بدیر سود نقدی کی صورت میں وصول کرنا۔ اس کیلئے سہل بن جاتا ہے۔ اعلےٰ معیار زندگی کا قائم رکھنا مشکل ہے۔ اور ان تمام کاروبار کی نسبت جنہیں کسان چلا سکتا ہے روپے کا لین دین کرنا زیادہ پر نفع ہے۔ اس لئے یہ رغبت رک نہیں سکتی

اور مذہبی اصول اقتصادی مفاد کو جگہ دینے کیلئے مجبور ہے۔ موجودہ اسلام میں دوسرے ایسے مقاصد موجود ہیں۔ جن میں زمانہ حال کی اقتصادی قوتوں کے اثرات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً ایک بیوی کرنے کی طرف رغبت پردہ سسٹم کی کمزوری اور زکوٰۃ کو زیادہ بلند معیار زندگی سے اور رمضان کے روزوں کو زیادہ بلند معیار محنت کے ساتھ پیوست کرنے کی مشکل۔ پردے کی طرف لوگوں کا رویہ خاص طور پر نمایاں ہے۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہ یہ مذہبی حکم ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے متعدد مرتبہ دیکھا ہے۔ صرف خوشحال استطاعت رکھتے ہیں۔ اور ان میں سے بھی بہت سے لوگ اقتصادی دباؤ کی وجہ سے اس پر تنقید کرتے ہیں۔ بعض اسلامی ممالک میں مذہب اور اقتصاد کی باہمی جنگ اس سے بھی زیادہ نمایاں رہی ہے۔ افغانستان میں سابق امیر افغانستان کا تختہ پلٹنے میں یہ ایک نہایت اہم عنصر تھا۔ اور ترکی میں اسکا انجام تمام ملک کو تقریباً دنیا پرست بنانے میں ہوا۔

ہندو مذہب:۔ ہندو مذہب میں ہم ایک بالکل مختلف فضا میں داخل ہوتے ہیں۔ جو ایسی فریب دینے والی اور اضطراب بخش ہے۔ کہ اسے چند الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ وہ مغربی جو یرانی اسلامی کتابوں سے واقف ہے۔ اور قرون وسطیٰ کے حالات سے پورا پورا آگاہ ہے۔ اسلام میں کوئی بات ایسی نہیں دیکھتا۔ جسے وہ جلد نہ سمجھ سکے۔ لیکن ہندو مذہب میں اسے تقریباً نئی دنیا نظر آئے گی۔ ایک طرف تو وہ ان حالات سے خبردار ہے۔ جن کے متعلق وہ یہ فرض کرتا ہے۔ کہ وہ اس وقت موجود ہوں گے۔ جبکہ ان کے قدیم ترین بروگ درختوں کے تنوں اور پتھروں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اور دوسری طرف ہر لمحہ وہ اپنے آپ کو ایسی بے نظیر بلندیوں پر محو حیرت دیکھ سکتا ہے۔ جہاں وہ مشکل سے سانس لے سکتا ہے۔ اکثر تبدیلی اس قدر اچانک ظہور میں آئی ہے۔ جس قدر پنجاب میں میدان دفعتہً پہاڑ سے بدل جاتا ہے۔ اور یہ بات مجھے اس پہلے موقع کی یاد دلاتی ہے۔ جبکہ میں نے لاہور سے انبالہ کیطرف سفر کیا تھا۔ اپنے چاروں طرف لا منتہاہی سطح چٹیل میدانوں کو دیکھ کر تقریباً

ایسا محسوس ہُوا گویا کہ میں بے پایانی دیکھ رہا ہوں۔ اور میرے دل میں کچھ ایسی کپکپی پیدا ہوگئی۔ جیسی کہ زمانہ قدیم کی ویرانی کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ لیکن اچانک ہی میں نے نہایت ہی تحیر خیز نظارہ دیکھا۔ ہمالہ کے پہاڑ غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی آخری جھلک لئے ہوئے میرے سامنے تھے۔ اور بے پایانی کی جگہ ہمیشگی (ہمیشہ قائم رہنے والی شے) کو دیکھا دیہاتی کے ساتھ تعلق دیکھنے سے ہم سراسر میدان میں رہتے ہیں۔ اور پہاڑوں کی جھلک تک بھی کبھی شاذ ہی نظر آتی ہے۔ بلاشبہ ہمیں ان کے وجود کا مشکل سے یقین ہوتا اگر ہم ان تین بڑے دریاؤں کو نہ دیکھتے جن کا منبع ان کی بلندیوں پر تھا۔ اور جو میدانی حالات پر نہایت گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ پہلا دریا کرم ہے دوسرا اہنسا اور تیسرا ہمہ اوست بعض آخری دریا کو کثیر الارباب خیال کریں گے کیونکہ یہ بے شمار ایسی نہروں میں بٹا ہُوا ہے۔ جن میں سے ہر ایک ایک علیحدہ دیوتا کیلئے مخصوص ہے۔ ان تینوں دریاؤں کے علاوہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندو دیہاتی کا مذہب سراسر اس کے گردو پیش کے سانچے میں ڈھلا ہے۔ اور یہ اسی بات کا نتیجہ ہے۔ کہ یہ دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ ہندو کا کھانا پینا نہانا اور گناہ کرنا سب مذہب پر مبنی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ ہندو مذہب میں مذہب اور اقتصادیت ایک دوسرے میں جذب ہیں۔ اور اسکا نتیجہ زندگی کا ایک ایسا طریق ہے۔ جو دنیا میں زندگی کے ہر دوسرے طریق سے ممیز ہے۔ اس طرح گداز (آپس میں مل جانے میں) ہونے میں جہاں تک دیہاتی کا تعلق ہے۔ نہایت ہی اہم عنصر اقتصادیت ہے۔ اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس کے مذہب کا تین چوتھائی خداوند حقیقی کا اثر لئے ہوئے نہیں ہے۔ بلکہ نیچر کا (جسے ہندوؤں میں خدا تسلیم کیا جاتا ہے) سر الیفرڈ لائل مشرق کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ کہ تقریباً تمام ہندوانہ رسومات جنہوں نے مذہبی تصدیق حاصل کرلی ہے۔ دراصل بعض مادی فوائد کی بنیادوں پر قائم ہیں۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے۔ کہ فطری مذہب زمین پر انسانی تقدیر کا صرف عکس ڈالتا ہے اور تقدیر کو ضبط تحریر میں لاتا ہے۔

توہمات:۔ مغربی یورپ میں انسانی مقصد نرم مگر تلون مزاج فطرت پر

بہت بڑی حد تک غالب آگیا ہے۔ لیکن ہندوستان میں فطرت ایک دیوی ہے جس کی طاقت نہایت زبردست اور جس کا تخیل بے اندازہ ہے۔ اور جس کے ہاتھوں میں دیہاتی بغیر کسی امداد کے اسی طرح سراسر عاجز ہے۔ جس طرح کہ رعیت کا ایک فرد ایک بے رحم مطلق العنان بادشاہ کے ہاتھ میں۔ لیکن جس طرح ایک مطلق العنان بادشاہ کی نازبرداریاں کی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح ایک دیوی کو بھی خوش کیا جا سکتا ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ بے شمار رسومات و توہمات پیدا ہو گئے ہیں۔ جو تمام فطری مذاہب کی ایک خصوصیت ہیں۔ اور جن سے تم میں سے کوئی بھی سراسر آزاد نہیں ہے۔ مسٹر لائل کے خیال یہ توہمات انسانی جذبات کے سائے اور باطل خیالات ہیں۔ اور ابتدائے آفرینش سے ہی لاینحل مصائب کا باعث ہیں۔ اور قابل ذکر وقوف سے وہ یہ بھی لکھتا ہے۔ کہ ہم اس تمام کی تمام فضا کو جس میں ناپائیدار توہمات پیدا ہوتے ہیں۔ اور نشوونما پاتے ہیں۔ تبدیل کر رہے ہیں۔ اور ہم یہ امید کر سکتے ہیں۔ کہ مافوق الفطرت باتوں کے یہ پرانے طریقے بغیر کسی بیرونی ضرب اور بغیر کسی پیش از وقت معلوم شدہ اندرونی زوال کی علامات کے۔ اچانک نابود ہو جائینگے۔ اور بیٹھ جائینگے۔ یہ بالکل وہی بات ہے۔ جو اس لمحہ آج کل پنجاب میں وقوع میں آرہی ہے۔ اور وسطی پنجاب میں جہاں اقتصادی ترقی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس کے ڈھلنے کی علامات نہایت ہی واضح ہیں۔ اور تبدیلی محض رسم سے کہیں زیادہ آگے بڑھ گئی ہے۔ یہ آہستہ آہستہ دیہاتی کے اس نقطہ نگاہ پہ اثر ڈال رہی ہے۔ جو وہ زندگی کے متعلق رکھتا ہے۔ ضرورت صرف اتنی ہے۔ کہ جو کچھ تقدیر پہ شاکر رہنے کے متعلق کہا گیا ہے۔ اس کی یاد دہانی کرا دی جائے۔ انسانی جہاں کہیں۔ اپنے آپ کو قدرت کے قبضے میں محسوس کرتا ہے۔ یہ خیال، اس کے دل میں گہری جگہ لئے ہوئے ہے۔ صوبے کے بیرونی حصوں میں جہاں کوئی اقتصادی ترقی نہیں ہوئی اور فصل بارش کے ہاتھوں میں جوئے کا سا کھیل ہے۔ اس کی جڑیں اتنی گہری ہیں۔ جتنی کہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن نہری آبادیوں میں جہاں پنجابی دیہاتی اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ قدرت کو اپنے مقاصد کا کسی قدر مطیع دیکھتا ہے۔ اور جہاں وہ اپنی افزونی پیداوار

خدا کی مرضی کے مطابق نہیں۔ بلکہ انسان کی محنت کے مطابق دیکھتا ہے۔ ہمیں
اُس نئے مطمح نظر کی ابتداء کا پتہ ملتا ہے۔ جو ایک دیہاتی کے ان الفاظ سے بخوبی
ظاہر ہے۔ کہ "کھاد دوسرا خدا ہے"۔

مویشی اور مسئلہ :- پس ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ عام ہندو مذہب اثر ڈالے
بغیر کوئی اہم اقتصادی تبدیلی وقوع میں نہیں آ سکتی اس پر ایک دلچسپ سوال
پیدا ہوتا ہے۔ آیا یہ تبدیلی جو اب واقع ہو رہی ہے۔ جانوروں کی زندگی کا لحاظ
رکھنے اور خاص طور پر گائے کے تقدس پر جو ہندو مذہب کا مرکزی اصول ہے
کوئی اثر ڈالے گی؟ ایک ہندو نے ایک بار کہا کہ خواہ اسے تعصب سمجھو خواہ
جوش خواہ مذہب کی اخوت کہہ لو لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندو
کے دل و دماغ میں کوئی بات اتنی گہری جگہ لئے ہوئے نہیں ہے۔ جتنی کہ گائے
کا تقدس۔ ایک طرح سے کسی حد تک یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ہندو مذہب گائے
کو کھیت سے اٹھا کر مندر میں لے آیا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ اسے پھر مندر
میں سے کھیت میں لے جایا جائے۔ کیا کبھی ہندو اپنے ناکارہ مویشیوں
کے ذبح کئے جانے پر رضامندی ظاہر کرے گا۔ کیا کبھی وہ اس امر پر بھی اتفاق
کرے گا۔ کہ ان جنگلی جانوروں کو جو اس کی فصلوں پر دھاوے بولتے ہیں۔ ہلاک
کر دیا جائے۔ ہندو مذہب جواب دیتا ہے "اہنسا پرمو دھرما" سب سے بڑی
نیکی یہ ہے۔ کہ کسی جانور کو نہ مارا جائے۔ پنجاب میں ہم نے دیکھا ہے۔ کہ ان
اضلاع میں جو دریائے ستلج کے جنوب میں واقع ہیں۔ قصابوں کے پاس
مویشی بیچنے والے لوگوں کو مذہب سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ اور ۱۹۱۸ء میں
ایک ناکارہ گائے کے ذبح کئے جانے پر گوڑگاؤں میں سخت ہندو مسلم فساد
ہو گیا۔ ہم نے یہ بھی دیکھا (ایک نمایاں حقیقت) کہ اس علاقے کے پچاس
فیصدی مویشی نکمے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے یہ بھی دیکھا کہ وسطی
اضلاع میں جہاں ہندو مذہب کو اسلامی اثر کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اور
زندگی کا معیار بلند ہو رہا ہے۔ ہندو اور سکھ ناکارہ مویشیوں کو آزادی سے
قصابوں کے ہاں فروخت کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اگرچہ آزادی سے ایسا
کرنے کی جرأت کوئی نہیں کرتا۔ پنجاب سے باہر بھی پرانی تہذیب نئی روشنی

کے ساتھ الجھ رہی ہے۔ نئی کا بانی مہاتما مسٹر گاندھی ہے۔ وہ ایک خاص دُور اندیشی و بے باکی سے رقمطراز ہے۔ "ان ذرائع کی نسبت جن سے ہم اپنے مویشیوں کو قصاب کی چھری سے بچاتے ہیں۔ وہ ذرائع زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ جن سے ہم ان کی نسل کو کمزور ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ اگر سبزیاں اگانے اور پھلدار درختوں کے لگانے کیلئے بندروں کو مارنے کی ضرورت ہے۔ تو ایسا کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں وہ درحقیقت اس گروہ میں شامل تھا۔ جس نے ایک آہستہ آہستہ دم دیتے ہوئے بچھڑے کو ہلاک کر دیا تھا۔ پھر بھی یہ مثال اس بات کو ظاہر کرتی ہے۔ کہ جان لینے کی نفرت کا جذبہ کس قدر گہری جگہ لئے ہوئے ہے۔ اس لئے کہ اس سے ہندو دنیا میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا۔ اور اس پر نفرت کا اظہار کرنے کیلئے بمبئی میں ایک عام جلسہ کیا گیا۔ تعبض لوگ ممکن ہے۔ یہ خیال کریں کہ یہ نئی یا پرانی تہذیب کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ جہالت پر مبنی ہے۔ لیکن ایسا کرتے وقت یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ یورپ کے اسی نظرئیے کی ایک اور مثال ہے۔ جس کی رو سے انسانی زندگی معقول حد تک مقدس ہے۔ اور جس کی تصدیق ہمہ اوست کا عقیدہ اور مسئلہ تناسخ ارواح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ کہ ہر جاندار شے مقدس ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی بھولنا نہیں چاہیے۔ کہ بہت سے دیہاتی اپنے مویشیوں کے متعلق ایسے ہی احساسات رکھتے ہیں۔ جیسے کہ خاص خاص انگریز اپنے گھوڑوں کے متعلق۔ ایک کاشتکار نے جس سے ہم نے ملاقات کی یہ کہا کہ جب کسی بیل نے دس برس میرے لئے کام کیا ہے تو کیا میں اسے اس لئے فروخت کر دوں۔ کہ وہ اب کام نہیں کر سکتا۔ میں رحم کے جذبہ سے اس قدر عاری نہیں ہوں۔ جتنے کہ وہ ۔

مستقبل :- غالباً یہ ظاہر کرنے کیلئے بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ کہ اولاً ہندوستان میں مذہب اور اقتصادیت میں ایک غیر معمولی گہرا تعلق ہے۔ اور ثانیاً یہ کہ اس تعلق کی اصلیت، مذہب کے ساتھ ساتھ مختلف ہے۔ اسلام میں مذہب نے اقتصادیت کو اپنے احکام کے تابع بنایا ہے۔ لیکن ہندو مذہب میں اقتصادیت نے مذہب پر حکومت کی ہے یہاں تک کہ برہمن اٹھے اور انہوں

اقتصادیت کو برہمنی مذہب کی کہربا میں جگہ دی جہاں یہ ۲۰۰۰ سال سے زیادہ عرصے تک ٹھہری رہی ہے۔ اب نئی اور طاقتور اقتصادی قوتیں کام کر رہی ہیں اور اقتصادیت اور مذہب کی وہ حدود جنہیں کبھی اٹل خیال کیا جاتا تھا۔ اب آہستہ آہستہ حرکت میں آ رہی ہیں۔ ہندو مذہب کے سامنے گائے کا سوال ہے اور اسلام کے مدنظر سود اور پردے کا مسئلہ اور اگر زمانۂ سابق کی غربت سے بچنا چاہتے ہیں۔ تو جلد یا بدیر دونوں کو تحفظ پیدائش کے سوال کا بھی سامنا کرنا پڑیگا کیونکہ لوگ بہت جلد جلد بڑھ رہے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ سوائے غربت کے اور کچھ نہیں ہے۔ گذشتہ ایام میں ہندو اور اسلام دونوں مذاہب میں اس بات کی پرواہ نہ تھی۔ کہ کوئی امیر ہے۔ یا غریب۔ البتہ یہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ کہ وہ زندہ ضرور ہے۔ لیکن اس امر پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا۔ کہ اسے زندگی کی ضروریات محض کے علاوہ اور کوئی چیز بھی درکار ہے۔ ہندو کو یہ سکھایا جاتا ہے۔ کہ وہ مادی دنیا کو مایا تصور کرے اور مسلمان کو یہ کہ وہ بہشت کے انعامات کیطرف دھیان لگائے۔ اس کا اثر یہ ہوا۔ کہ غربت یقینی لازمی دکھائی دی۔ اور رسم و رواج ناقابل تاراج۔ لیکن اب ایک کو سڑکوں۔ ریلوں اور نہروں کی توسیع مٹا رہی ہے۔ اور دوسرے کا علم کی اشاعت نیچے ہی نیچے صفایا کر رہی ہے۔ اس لئے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس انقلاب کیطرف دیہاتی کا کیا رویہ ہونا چاہیئے۔ کیا اسے اس امر کا یقین دلاتے ہوئے کہ نجات کا راستہ یہی ہے۔ یہ مشورہ دیں کہ وہ مذہب کے ساتھ چمٹا رہے۔ اور اپنی غربت پر قناعت کرے یا مغربی مثال کی تقلید کرتے ہوئے ہم اسے یہ نصیحت کریں کہ مصلحت کی خاطر دستور کو تخت سے اتار دے اور آرام والے معیار زندگی کے لئے پرانے قوانین و وفاداریوں کو پس پشت ڈال دے یا ہم مغرب کی غلطیوں سے فائدہ اٹھا کر کوشش کریں۔ اور دونو کے بین بین کوئی ایسا راستہ نکالیں جس پر پرانی و نئی دونو تہذیبوں کا پر تو پڑتا ہو اور توہم و جہالت جو ایک کو تاریک بناتی ہے۔ اور مادہ پرستی و غارتگری کو جو دوسری پر چھائی ہوئی ہیں۔ بالائے طاق رکھدیا جائے۔ ان سوالات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جو ایک طرف تو اوسط درجے کے خانگی چراغ سے چھوتا ہے۔ اور دوسری

دائمی ستاروں تک جا پہنچتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ انہیں دیہاتی کیلئے چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ خود اپنے لئے سوچے لیکن جیسا کہ مسٹر گاندھی کہتے ہیں کہ وہ اپنی پُر مشقت اور بے ثبات ہستی کی ذمہ داریوں میں اس قدر مشغول ہے۔ کہ ایسا نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہمیں خود کچھ نہ کچھ جواب دینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

عزبت کی تعلیم :- پہلی بات جس پر زور دینا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں تقریباً ۲۲۴ ملین (بائیس کروڑ چالیس لاکھ) لوگوں کا انحصار زراعت پر ہے۔ اور وہ ایسے حالات میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو یورپ کے معیار زندگی کے خلاف ہے۔ تاوقتیکہ انہیں بنیادی حیثیت سے تبدیل نہ کیا جائے۔ وہ لوگ جو بنیادی تبدیلیوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ وہ قصداً اختیار کی ہوئی عزبت سے پیدا شدہ صفات کو انتہائی طور پر ترقی دینے کے مدعا اور ضرورت کو ترجیح دے سکتے ہیں۔ تقدیر پر شاکر رہنے والے کو عزبت ہی صرف ایک ممکن قسمت نظر آتی ہے۔ اجمیر میں ایک دیہاتی نے جس کے سامنے مغرب کی دلچسپیوں کی تشریح کی جا رہی تھی یہ کہا کہ ہم انسان نہیں ہیں۔ اور وہ عیش جو یورپ میں کاشت کرنے والے اڑاتے ہیں۔ ہمارے لئے نہیں ہیں۔ کیونکہ ہماری تقدیر میں صرف زمین کرید کرید کر پیٹ بھرنا لکھا ہے۔ اس زمانے میں جب عیسٰے علیہ السلام زندہ تھے۔ تو یہودیوں میں سے بہت سے لوگ عزبت کو ربانی قوانین کی پابندی کی قیمت خیال کرتے تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے۔ کہ یہ خدائی معاوضہ اور نجات کی ضمانت ہے۔ اور ہندوستان میں ہر زمانے میں پرہیزگاری اور عزبت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ لیکن ہندوستانی روایات سے خواہ ایسے کتنی ہی مناسبت کیوں نہ ہو۔ اس پر شک کیا جا سکتا ہے۔ کہ آیا عزبت کی تعلیم دیہاتی کو پسند آئے گی۔ جبکہ اسے اس امر کا احساس ہو جائے۔ کہ زندگی کی پُر لطف نعمتوں تک پہنچنا اس کے اختیار میں ہے۔ اور یہ یقیناً ایسی تعلیم نہیں ہے۔ جسے کوئی معقول مغربی شخص بھی اعتقاد کے معمول احساس کے ساتھ پیش کر سکے۔ کیونکہ مغرب میں مادی بہبود کو ہر قسم کی بہتری کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے۔ لارڈ بک ماسٹر نے

کہا کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ غربت کے ساتھ کشمکش کرنے سے قلب کی صفائی
ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں۔ انہیں
کبھی اس کشمکش سے سابقہ نہیں پڑا ہے۔ ان تمام کشمکشوں میں سے جن میں کسی
انسان کو پھنسایا جا سکتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ پست اور ذلیل کرنے والی ہے۔ اس
لئے غربت کی تعلیم ایسی نظر نہیں آتی کہ قبول کی جائے تو کیا پھر ہم کسان کو یہ نصیحت
کریں کہ وہ موجودہ زمانے کی اقتصادی طاقتوں کو پورے طور پر کام میں لائے اور مذہب
و اقتصادیات کی جنگ میں وہ ماہر اقتصادیات کا ذوق شوق سے ساتھ دے نہ
کہ ملا یا پروہت کا کیا ہم انہیں یہ حوصلہ پیدا کرینگے۔ کہ وہ اپنی ضروریات بڑھائے
اور اپنی مقبوضہ اشیاء میں اضافہ کرے۔ تاکہ وہ ایک ایسے بلند معیار زندگی سے
حظ اٹھائے۔ جو اسے پہلے کبھی حاصل نہ ہُوا ہو۔ کیا ہم اس بنا پر کہ کا انجام خوشحالی
اور اس کے حصول کا طریقہ سخت محنت ہے۔ اس کو حاصل کرنے۔ قبضے میں رکھنے
اور مقابلہ کرنے والی ذاتی عقل کو ترقی دیں۔ کیونکہ اگر غربت کی تعلیم پرہیزگاری کے ساتھ
ہے۔ تو بے پایاں نفع کی تعلیم (جیسا کہ ہم اسے کہیں گے) قابلیت سے ملی ہوئی
ہے۔ اس پر غور کرتے وقت ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ تعلیم پرانی تہذیب کے
بالکل برعکس ہے۔ اور موجودہ زمانے کی دو قابل ذکر ہندوستانی شخصیتوں نے اس کے
خلاف فتوے دیا ہے۔ مسٹر گاندھی کے رویے سے سب آشنا ہیں۔ اور سر رابندرناتھ
ٹیگور بھی اسی کا جسم انسان کی اندرونی روح میں اسکی حقیقی دوا اور طاقت تلاش
کرنے میں اس کی مدد کرتی ہے۔ ایک دوسرے پارہ میں وہ لکھتا ہے۔ ضرورت
ہے۔ کہ ہماری تہذیب معاشرتی اتحاد کی بنیاد پر قدم جمالے نہ کہ اقتصادی مہمات و
جنگ و جدل پر۔ یہ بات نئی تہذیب کی خوبیوں کے بھی خلاف ہے۔ مثال کے
طور پر ڈین اینج (ہمارے زمانے کا بہترین فلاسفر) کہتا ہے۔ کہ اگر مجھے یہ کہا جائے
کہ اس عالمگیر بے چینی اور بددلی کو جس نے مغربی تہذیب پر قابو پا لیا ہے۔
ایک لفظ میں ادا کرو تو میرا جواب "زمانہ پرستی" ہوگا۔ موجودہ سرمایہ داری کے متعلق
مسٹر کینس (جو انگلستان کے ماہران اقتصادیات میں پیش پیش ہیں) لکھتے ہیں
کہ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ اس میں اندرونی اتحاد ہے۔ اور نہ
خدمتِ خلق کا جذبہ یہ اکثر (اگرچہ ہمیشہ نہیں) قبضے میں رکھنے والوں اور تعاقب

کرنے والوں کی محض اجتماعی صورتیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ لکھتا ہے۔ کہ یہ بات انسان کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ کہ مذہب اور کاروبار کو علیحدہ علیحدہ رکھنے سے جو مادی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ وہ اخلاقی نقصانات کی تلافی بھی کر سکتے ہیں۔ یا نہیں۔ ان فیصلوں کو سامنے رکھتے ہوئے اور انگلستان میں سیاہ علاقے کی ہیبتناک تنہائی اور بمبئی کے صنعتی حصوں کے گھروں کی خطرناک حالتوں کو یاد کرتے ہوئے کیا ہم یہ شبہ کر سکتے ہیں۔ کہ بے پایاں نفع کی تعلیم سے انکار کر دینا چاہیئے۔

آسودگی اور فائدے کی تعلیم :- پھر ہمارے لئے کیا باقی ہے۔ کیا ان دونو تعلیموں کا کوئی بدل نہیں ہے۔ جن میں سے ایک کسان کو بتاتی ہے۔ کہ تم غریب ہو اور تم غریب ہی رہو گے۔ لیکن چونکہ تم غریب ہو تم ان لوگوں سے زیادہ قانع ہو جو امیر ہیں۔ اور ممکن ہے تم میں سے بعض ولی بھی ہو جائیں۔ اور دوسری یہ کہتی ہے۔ سخت سے سخت محنت کرو اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاؤ ممکن ہے۔ تم خوش اور مطمئن نہ ہو لیکن خوشحال اور قابل ضرور بن جاؤ گے۔ اس سے پہلے کہ ہم اس سوال کا جواب دیں ہمیں مختصر طور پر دیہاتی کی حالت کا دوبارہ جائزہ لینا چاہیئے۔ اس وقت وہ پرانی اور نئی روشنی کے درمیان ہے۔ اور ایک ایسے آدمی کی طرح ہے۔ جو رات کو لالٹین لے کر چل رہا ہو۔ اور دفعتہً کسی آنے والی موٹر کار سے دوچار ہو جائے۔ تو وہ نئے زمانے کی سامنے کی روشنیوں سے وہ یکایک چندھیا جاتا ہے۔ اور اپنے پہلو میں درمیانے درجے کی روشنی والے لیمپ کو مشکل سے دیکھ سکتا ہے۔ تاہم یہ لیمپ مدہم ہونے کے باوجود اس کے لئے خاص وقعت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس نے صدیوں سے اُس کی رہنمائی کی ہے۔ اور اس سے ستاروں کی روشنی بھی نظر آتی رہی ہے۔ اسی کی وساطت سے اس نے خدا اور اپنے پڑوسی کے ساتھ سادہ اگرچہ قدیم رشتہ حاصل کر لیا ہے۔ اگر اس کا نتیجہ غربت اور جہالت ہے۔ تو وہ اس وجہ سے ہے۔ کہ خدا اور اس کے درمیان توہمات نے جگہ لے لی ہے۔ اور رسومات اس کے اور اس کے پڑوسی کے درمیان حائل ہو گئی ہیں۔ نئی روشنی کی وقعت اس اہمیت کی وجہ سے جو یہ تعلیم آزادی اور کوشش کو دیتی ہے۔ اور اسکی بے ساختہ کشش اس نجات میں ہے۔ جو یہ غربت سے دلاتی ہے ؟

(پنجاب میں ساہوکار کا پچاس سالہ اقتدار زیر غور معاملہ ہے) اور یہ کہ ممکن ہے۔ کہ کسان کا غربت سے نجات پانا اسے مادہ پرستی کی طرف لے جائے۔ پس جس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ کوئی ایسی تعلیم ہے۔ جو پرانی و نئی تہذیب سے ہمدردی رکھے۔ جو ایک گاؤں کی متحدہ زندگی اور مادی اشیاء کی وقعت کی طرف دیہاتی کے مقابلتاً تغافل کو قائم رکھے۔ اور دوسری طرف ہر آدمی اور ساتھ ہی ہر عورت کیلئے وہ شے حاصل کرے جس کے بغیر چارہ نہیں۔ اور جسے پرانی دنیا کا یونانی فلاسفر اعظم اچھی زندگی کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔

آسودگی :- آسودگی کی تعلیم اس قدر پرانی ہے۔ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ اے خدا مجھے نہ غربت دے نہ ثروت۔ مجھے ایسی روزی دے جو میرے لئے آرام دہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ میرا پیٹ زیادہ بھر جائے۔ اور میں تجھ سے انکار کر دوں۔ اور یہ کہوں کہ حاکم کون ہے۔ ایسے ہی پرانے زمانے کے دو مختلف خصلتوں والے مصنفوں نے بھی یہی بات ثابت کی ہے۔ ارسطو کہتا ہے۔ کہ آپ اپنے لئے کفایت کرنا زندگی کا انجام ہے۔ اور بہترین انجام ہے اس کے ساتھ ہی وہ معقولانہ طور پر کہتا ہے۔ جائداد کی وہ مقدار جو ایک اچھی زندگی کے لئے درکار ہے۔ غیر محدود نہیں ہے۔ دوسرا مصنف ایک بہت بڑا عیسائی سینٹ پال ہے۔ "آؤ کھانا اور کپڑا حاصل کر کے اس پر قانع ہو جائیں۔ کیونکہ دولت کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے" زیادہ جدید الفاظ میں تعلیم یہ کہتی ہے۔ کہ اگر انسان مطمئن زندگی بسر کرنا چاہے۔ تو اسے اپنی ضروریات کی ایک حد مقرر کر دینی چاہئیے۔ یہ بات کافی لوگوں کو بہت مشکل دکھائی دیتی ہے۔ ہمیشہ اپنی جائداد میں اضافہ کرنے کی خواہش کرتے ہوئے اور آرام کو تہذیب سمجھتے ہوئے۔ لوگ ان تاجروں کی جماعت کا شکار ہو جاتے ہیں جن کا مدعا اپنی ضروریات میں بے حد اضافہ کرنا ہے۔

یونانی فلاسفر ڈیو جانس [illegible] ممکن ہے لغوی طور پر صحیح نہ ہو۔ یعنی یہ کہ کسی شخص کی دولت کا اندازہ ان چیزوں سے کیا جا سکتا ہے۔ جن کے بغیر وہ گذارہ کر سکتا ہے۔ لیکن یہ امر یقیناً حقیقت ہے۔ جب [illegible] کہتا ہے۔ کہ ضروریات کا متواتر پورا کئے جانا اور اس کے ساتھ ہی نئی ضروریات کا پیدا ہوتے رہنا۔ انفرادی مایوسی اور بے چینی کا راز ہے۔ قدیم قرون وسطیٰ کا علم اخلاق

جس کی رو سے لالچ کو سات مہلک گناہوں میں سے ایک شمار کیا جاتا تھا عقلمندی پر مبنی تھا۔ ایک اور ماہر اقتصادیات مسٹر ایشلے کہتے ہیں۔ اس وقت لالچ کا یہ مطلب نہ تھا جو ہم آج لیتے ہیں۔ بلکہ منافع سے زیادہ کی آرزو جو انسان کو بحیثیت انسان قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ لوتھر دفاضل جرمنی اور میلینختن دمغربی فاضل جیسے بڑے ماہران اخلاقیات کا خیال تھا۔ کہ کسان کی زندگی سب سے بہتر زندگی تھی۔ کیونکہ تجارتی تخمینوں کی کاٹ کھانے والی روح کا بالکل اثر نہیں تھا۔ اور یوریپیڈز جیسے مشہور یونانی شاعر کا بھی یہی خیال تھا۔ ایک اور یونانی مصنف پلوٹارک نامی نے ۱۸۰۰ سال پیشتر لکھا " لالچ کی خواہش دوسروں سے زبردستی چیزیں لینا۔ اور ایسی چیزوں پر غیر منصفانہ قبضہ کر لینا جس میں سے کوئی بھی ان کی نہیں ایک اچھے کسان میں کبھی نہیں دیکھی جاتیں۔ اس کے یہ الفاظ بھی پر معنی ہیں۔ کہ دنیا میں کوئی کام یا پیشہ ایسا نہیں ہے۔ جو انسان میں اسی قدر اچانک خاموشی کی خواہش اور محبت پیدا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ کاشتکاری وزراعت۔ اس قدر سخت محنت کے باوجود اور شاید اسی کی وجہ سے میرا یقین ہے۔ کہ کسان اب بھی موجودہ دنیا میں نہایت ہی قانع انسان ہے۔ اور چونکہ یہی قناعت اس کے حاصل کردہ سرمائے میں نہایت ہی قیمتی چیزوں میں سے ہے۔ اس لئے اسے اسکی حفاظت کرنی چاہئے۔ پنجاب کے سرمایہ دار علاقے روحانی اہمیتوں کا خیال رکھے بغیر دنیاوی دولت میں اضافہ کرنے کے خطرے سے متنبہ کرتے ہیں۔ اور حال ہی کا ایک ناول موسومہ موروگن دی ٹلر ———— یہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ یہی سبق ہندوستان کے دوسرے حصوں سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص لکھتا ہے۔ کہ ثروت کا انجام سوائے مصیبت کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس لئے کہ گاؤں کی ضروریات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اور اگر تمہارے پاس تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے۔ سوائے اس کے کہ برائیوں کی طرف دھکیل دئے جاؤ اور کچھ نہ ہوگا۔ کیونکہ موروگن کی خوشحالی کا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ کہ اس کی ضروریات اچھی اور بری دونو بڑھتی جاتی تھیں۔ اور اگر ہندوستانی دیہاتی کو اس کے اپنے منصوبوں پر چھوڑ دیا جائے تو سراسر یہی حالت اس کی بھی ہو جاتی

ہے۔

دیہاتی کو کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ اگرچہ ضروریات کو بے اندازہ نہ بڑھانا چاہئے لیکن پھر بھی یہ ظاہر ہے۔ کہ دیہاتی کو اس کی موجودہ ضروریات سے بہت کچھ زیادہ درکار ہے۔ پھر اسے کہاں رک جانا چاہیئے۔ اگر کوئی دیہاتی ہم سے یہ سوال پوچھتا تو ہم اسے ان دو بھجنوں کی یاد دلاتے جن کا ذکر دوسرے باب میں کیا گیا ہے۔ اور یہ کہتے کہ اوسط درجے کی ضروریات کے علاوہ جن چیزوں کی اسے ضرورت ہے وہ یہ ہیں ایک اچھا ہوا دار مکان (ضروری نہیں کہ پختہ ہو) بطور جائے رہائش ہموار زمین اگر ممکن ہو تو ہندوستانی طریق کے مطابق خوبصورتی سے آراستہ کی ہوئی مویشیوں کے لئے اچھے مویشی خانے کاشتکاری کے لئے مناسب آلات سبزیوں اور پھولوں سے بھرا ہوا ایک باغ اچانک ضروریات کے لئے دیہاتی بنک میں کچھ روپیہ اور ایسی تعلیم جو اسے زیادہ اچھا کاشتکار اور دیہاتی اور اس کی بیوی کو زیادہ اچھی بیوی اور عورت بنا دے اگر وہ ان چند چیزوں کو حاصل کر لے (چند اس لئے کہ مغربی ضروریات مقابلتاً زیادہ ہیں) اور اگر اسکا گاؤں صاف رکھا جائے اور وہاں ایک اچھا ملاں یا پروہت ایک آرام دہ غسل خانہ عمدہ پینے کا پانی بچوں کے لئے کھیلنے کا میدان اور دوسروں کے لئے ایک چھوٹی لائبریری اور ایسے دیگر ادارے جنکی اسے ضرورت ہے۔ موجود ہوں۔ تو وہ ان تمام چیزوں کو حاصل کرے گا۔ جن کی ایک اچھی زندگی کے لئے ضرورت ہے۔ لیکن یہ پوچھا جا سکتا ہے۔ کہ یہ اس منافع کی تقسیم سے کس طرح مختلف ہے۔ جو اپنی پسندیدہ اغراض کو پیش کرتی ہے۔ شروع شروع میں فرق صرف زور دینے کا ہے۔ منافع کی تعلیم کے ہوتے ہوئے اس قسم کا زور روپیہ کے حصول پر دیا جاتا ہے یعنی یہ کہ زندگی کے ہر مشاغل میں اسباب و دولت سے اپیل کی جاتی ہے۔ لیکن آسودگی کی تعلیم کے وسیلے سے زور ان خاص چیزوں کے حصول پر دیا جاتا ہے۔ جو اس قدر احتیاط سے انتخاب کی ہوئی ہوتی ہیں۔ کہ وہ تقریباً اتنی ہی اچھی ہوتی ہیں۔ جتنا کہ لفظ اچھا خود ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دیہاتی کو کسی نئے مجرب نسخہ کے استعمال کرنے یا کچھ زیادہ کوشش کرنے کے لئے ترغیب دینے کا رائج طریقہ یہ ہے۔ کہ اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کی جائے۔ کہ اس کی مدد سے اسے زیادہ روپیہ

حاصل ہوگا۔ اس کا مسلّم طریقہ یہ ہوگا کہ حصول دولت کو بالکل مدّنظر نہ رکھا جائے۔ بلکہ اسمیں زیادہ صاف گاؤں۔ عمدہ صحبت۔ اور کسی قسم کی تعلیم کے حاصل کرنے کی روح پھونکدی جائے۔ اور مذکورہ مجرّب نسخہ استعمال میں لایا جائے۔ جس کے ذریعے سے یہ نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اسطرح سے اس کے دماغ میں ہر وقت دولت کا ہی خیال نہ رہیگا۔ جو ممکن ہے۔ کہ برائی کی بنیاد بن جائے بلکہ ایک ایسی چیز کا جو اس قدر قابل حصول ہے۔ کہ وہ اسے بہم پہنچانے کے لئے۔ رضامندی سے ضروری کوشش کریگا۔ اور چونکہ اس کی ضروریات صرف چند ہونگی۔ وہ زیادہ مقدار کی نسبت بہتر جنس کی اور بدصورتی کی بجائے خوبصورتی کی خواہش کریگا۔

ہم نے دیکھا ہے۔ کہ اس لحاظ سے مشرقی و مغربی پنجاب میں بہت زیادہ فرق ہے۔ باوجود اس کے کہ مغربی حصہ مفلس ہے۔ ہم نے وہاں بارہا یہ دیکھا ہے۔ کہ مکانوں کے اندرونی حصے اس قدر صاف باترتیب اور مناسب طور پر آراستہ کئے ہوئے ہیں۔ کہ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہاں آسودگی کیوں نہایت قلیل ذرائع اور خوبصورتی کے پہلو بہ پہلو نہ رہے۔ اور جب دہلی میں سے گذرتے ہوئے۔ میں نے شہنشاہ شاہجہان کا شاہ نشین دیکھا تو میں کوئی وجہ معلوم نہ کرسکا کہ آسودگی کیوں خوبصورتی اور دولت کے بھی دوش بدوش نہ رہے۔ کیونکہ وہاں سامان تقریباً مفقود تھا۔ لیکن کمرے کی ہر ایک چیز دغالیچے گدیلے اور کرسیاں حقہ۔ خنجر اور تلوار) اپنی قسم کی خوبصورت چیزوں میں سے تھی۔ اور ایک ایسے شخص کے شایان شان بھی جو ایک سلطنت پر حکومت کرتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں ایک دولتمند جاگیردار کے مہمان خانے کا وہ افسردہ نظارہ ہے جو ایک یا دو سال ہوئے دیکھا تھا۔ یورپی طریقہ پر آراستہ ہونے کی وجہ سے اس کی بیٹھک میزوں۔ کرسیوں۔ معمولی وغیرہ ہر قسم کی اشیائے زیبائش نفیس سامان و تصاویر اور چوکھٹوں سے جو اس بہتات میں آخری اور بلاشبہ قیمتی چیز تھی۔ اٹی پڑی تھی یہ ایک ایسی صورت تھی جس میں افراط دولت کے ساتھ ملی ہوئی تھی اور جس سے دل و دماغ میں تقریباً دم بند کرنے والے احساسات پیدا ہوتے تھے ممکن ہے۔ بعض خیال کریں کہ طاقتور دیہاتی طبقہ کے سامنے آسودگی کی تعلیم پیش کرنا عادت سے زیادہ نازک نظریہ ہے۔ اگر صرف یہی نظریہ ہی پیش نظر

ہو تو بھی اکثر کے لئے یہ ایسا ثابت نہ ہوگا۔ کیونکہ کوئی بھی زندگی کے اس معیار تک نہیں پہنچا جس پر آسودگی دلالت کرتی ہے۔ اور نہ ہی کئی سال تک پہنچنے کی امید کر سکتا ہے۔ لیکن خدمت کے ساتھ ہم رشتہ ہونے کی وجہ سے کافی طور پر سب لوگوں سے اس کے لئے تقاضا کیا جا سکتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے اور اپنے کنبے کے لئے کام کرے گا۔ تو وہ ہمیشہ اپنے پڑوسیوں کو امداد پہنچانے کے لئے تیار ہوگا۔ اور جب وہ کافی سرمایہ بہم پہنچا لیگا۔ تو دوسروں کے لئے کام کرتا رہیگا۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے۔ کہ وہ اتنی محنت سے کیوں کام نہ کرے۔ جتنی کہ وہ جو نفع کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ لیکن اگر وہ کم محنت سے بھی کام کرے۔ تو یہ ان فوائد کی معمولی سی قیمت ہوگی۔ جنکا حاصل ہونا یقینی ہے۔ مثلاً اسے خود زیادہ مطمئن دل، اس کے ساتھیوں کو اس کی خوشحالی میں سے حصہ اور گاؤں کو ایک ایسی فضا جسے حسد اور لالچ نے ناپاک نہ بنایا ہو۔ مثال کے طور پر یہ کہ رامپہ کے دولتمند راجپوت دوکاندار کی دولت کو کوئی شخص عناد کی نظر سے نہیں دیکھ سکا۔ ہوگا۔ جب اس نے اسے ۱۰۰۰ روپیہ گاؤں کے مقدس مقامات پر خرچ کرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ لیکن اس ا لمٹے ملتے گاؤں کے باشندوں میں جس کے قریب ہم ستلج کے دریائی علاقے میں سے گذرے اس بڑھئی کے دو منزلہ مکان کو دیکھ کر جو اس نے افریقہ سے واپس آکر بنوایا تھا۔ ناجائز حسد کے جذبات ضرور خوب ابھرے ہوں گے۔ مسٹر ٹاونی کہتے ہیں۔ کہ اقتصادی آرزوئیں بطور خادم اچھی ہیں۔ لیکن بحیثیت آقا بُری ہیں لیکن اگر انہیں لگام دے کر ان کا رخ مجلسی مقاصد کی طرف پھیرا جائے۔ تو وہ حسب منشاء کام کرینگی دیکی پھرائینگی اور غلہ پیسیں گی

ہندوستان میں جہاں صرف چند لوگ ہی اپنی قوت سے امیر ہو سکتے ہیں۔ یہ امر دوچند لازمی ہے۔ کہ لوگ یہ محسوس کریں۔ کہ وہ مذہبی اور مجلسی قوانین کے ماتحت اپنی دولت میں سے کچھ حصہ سب کی خاطر استعمال کرنے کے لئے سخت مجبور ہیں۔

خدمت کی قدر و قیمت پر زور دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مغرب میں پرانے مقاصد میں سے شاید صرف یہی ایک ایسا ہے۔ جو جنگ کے موقعہ پر زیادہ

مدِ نظر ہوتا ہے۔ مشرق میں دیہاتی طبقہ اس کے بغیر مدتوں تک خوشحال نہ ہو سکتا
اس لئے یہ پرانی تہذیب کی بنا پر اب بھی ہندوستان میں زوروں پر ہے۔ پنجاب
کے تمام حصوں میں ہم نے دیہاتی کو ضرورت کے وقت پڑوسی کی یا یہ بھی ہو سکتا
ہے۔ کہ گاؤں کی خدمت کرنے کا خوب عادی پایا ہے۔ یہ خیال کر کے کہ ہندوستان
کی ۲۲۰ ملین (۲۲۰۰۰۰۰۰۰) آبادی کا ۹۰ فیصدی حصہ دیہات میں آباد ہے۔
یہ نہایت اہم ہے۔ کہ اس جماعتی خدمت جذبے کو قائم رکھا جائے۔ اس کے بغیر دیہاتی
طبقہ آنیوالے زمانہ میں مشکل سے زندہ رہنے کی امید کر سکتا ہے۔

اور اگر اسے فی الفور
جائز ٹھہرانے کی خواہش ہے۔ تو یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ امداد باہمی کی کامیابی کے
لئے اس کا ہونا ضروری ہے۔ ہر ایک انجمن امداد باہمی بہت بڑی حد تک اپنے
بہترین ممبران کی خدمت پر انحصار رکھتی ہے۔ اور چونکہ اب صوبے میں تقریباً
۲۰۰۰۰ انجمنیں ہیں۔ اور ہر انجمن کے انتظام کے لئے کم از کم پانچ اشخاص کی ضرورت
ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کی گنجائش رکھنے کے باوجود جو ایک سے زیادہ انجمنوں
میں کام کرتے ہیں۔ ۸۰۰۰۰ اشخاص ضرور ایسے ہیں۔ جو کسی قسم کے معاوضے
کے بغیر اپنے ہم جنسوں کی خدمت کر رہے ہیں۔ اور زمانہ مستقبل میں اگر پنجاب
میں سلسلہ تنظیم دیہات امداد باہمی کے اصولوں کے ماتحت جاری رہا۔ تو ان
سے دوگنے لوگوں کی ضرورت ہو گی۔

امداد باہمی :- امداد باہمی کا طریق کار اپنی خاصیت کے لحاظ سے آسودگی اور
اور خدمت کی تعلیم پر عملی اظہار کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اس کا یہ اصول
حیات کہ "ہر ایک سب کے لئے ہے۔ اور سب ہر ایک کے لئے مکمل طور
پر خدمت کی تعلیم کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اگر یہ صاف طور پر آسودگی کی تبلیغ نہیں کرتی
تو کم از کم یہ ہر ایک شخص کے لالچ کی حد بندی ضرور کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ
ہی جہاں تک اس سے ہو سکتا ہے۔ یہ منصفانہ قیمت کیلئے اقرار کرتی ہے۔
اور یہ مطالبہ کرتی ہے۔ کہ طاقتور کمزوروں کی کمزوری سے یا سمجھدار جاہلوں کی
جہالت سے فائدہ اٹھا کر اپنے مدعا نہ حاصل کرینگے۔ اور یہ امیروں کو غریبوں کی
امداد کے لئے اور عقلمندوں کو بے وقوفوں کی رہنمائی کے لئے پکارتی ہے۔ اس

لئے یہ باہمی امداد اور آسودگی کا خیال پرانی تہذیب سے امداد باہمی مدد آپ کرنے اور محنت اٹھانے کا تصور نئی تہذیب سے اور خدمت کا دونوں سے مستعار لے کر پرانی اور نئی تہذیب کی مبارک آمیزش کی ہے۔ پرانی تہذیب میں یہ کمزوری ہے۔ کہ غربت اس کے ساتھ ساتھ ہے۔ اور نئی میں یہ خطرہ ہے۔ کہیں یہ مادہ پرستی کی طرف نہ لے جائے۔ امداد باہمی دیہاتی کے سامنے غربت سے نجات حاصل کرنے کا بہترین اور شاید صرف ایک ہی راستہ پیش کرتی ہے۔ اور خدمت کے مدّعا کے ذریعے سے مادہ پرستی کے خلاف کارگر بند لگاتی ہے۔ انیسویں صدی کا نظریۂ آزادیٔ اقتصادی یا گورنمنٹ کا انفرادی معاملات میں دخل نہ دینا ہندوستانی دیہات کیلئے جہاں فرقہ وارانہ زندگی بسر کی جاتی ہے۔ بالکل غیر مناسب ہے۔ امداد باہمی اس اصول کو ایسے بہترین اندازہ کئے ہوئے مقصد سے بدل دیتی ہے۔ جسکی رو سے انسان آپس میں ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں۔ اور اپنی قومی متحدہ زندگی رکھنے کی وجہ سے یہ اس فرقہ داری کے بالکل خلاف ہے۔ جو بہت سے شہروں میں زندگی کو زہر آلود بناتی ہے۔ اور اگر جیسا کہ اس ڈائری سے ظاہر ہے۔ فرقہ داری نے گاؤں کی طرف بہت کم رخ کیا ہے۔ تو یہ زیادہ تر اس لئے ہے۔ کہ وہاں امداد باہمی دیہاتی جذبۂ قومیت کی مدد سے اسے روکنے کیلئے موجود تھی۔ حاصل کلام یہ کہ محض تجارتی طریق کار سے کسی قدر افضل ہونے کی وجہ سے یہ معاشرتی و اقتصادی دونوں پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہے (املاحظہ ہوں ثالثی و اصلاح رسومات کی انجمنیں) اور اس تعلق کے لحاظ سے کہ انسان کو نہایت ہی عمدہ زندگی بسر کرنی چاہئے۔ صرف مذہب سے دوسرے درجہ پر ہے۔

آسودگی اور خدمت کی تعلیم ہم سب کو ایک پیغام دیتی ہے۔ اور شاید ان لوگوں کو خاص طور پر جو اپنے آپ کو صنعت اور تجارت میں مشغول رکھتے ہیں۔ جب ایک مرتبہ روپیہ پیدا کرنے والا کوئی پیشہ اختیار کر لیا جائے تو ترک جانا کسی کو آسان نہیں معلوم ہو تاہم جرمنی میں ایک شخص ارنیسٹ ایبے نامی ایسا موجود ہے۔ وہ ایک کاتنے والے کارخانے کے کاریگر کا بیٹا ہے۔ اس نے ذی ایس (جرمنی) کے بڑے کارخانے ایک ذمہ وار جماعت کے سپرد کر دئے۔ اور جہاں تک جرمنی قانون نے

اجازت دی اس نے اپنے لئے کارخانے کی انتظامیہ کمیٹی میں ایک عہدہ رکھتے ہوئے
اپنی تمام کی تمام ذاتی جائداد بھی اسی کیطرف منتقل کر دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کارخانوں میں
کام کرنے والوں کے لئے بے شمار ایسے ذرائع اختیار کئے گئے جو بیس برس پہلے
کہیں اور عام طور پر اختیار کئے گئے تھے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ کہا جائے کہ ایک پھول کھلنے
سے بہار نہیں آجاتی اسی ضمن میں ہم ڈاکٹر سٹینمنس کی مثال
بھی پیش کرتے ہیں بجلی کے استعمالات کو ترقی دینے میں وہ پیش پیش تھا۔ اس کلیے
کے متعلق اسے فطرت نے خاص ملکہ عطا کیا ہوا تھا۔ اور کئی سال تک وہ امریکہ کی
سب سے بڑی صنعتی انجمنوں میں سے ایک میں ایک ماہر صنعت کی حیثیت سے
خدمت کرتا رہا تھا۔ اس کے متعلق یہ مشہور تھا۔ کہ وہ حد درجہ امیر ہے۔ اور کمپنی
میں اس کے حصوں اور اس بڑی تنخواہ کے متعلق جو وہ اپنی خدمات کے صلے میں
لیتا تھا۔ بڑی بڑی داستانیں سنائی جاتی تھیں۔ لیکن جب اس کی وصیت
کا اعلان کیا گیا۔ تو یہ معلوم ہوا کہ اس دنیا کا تمام اثاثہ جو اس کے قبضے میں تھا ۳۰۰۰ پونڈ
میں ایک کاریگر کی زندگی کے بیمے ایک پرانی موٹر کار اور چند دوسری معمولی چیزوں پر
مشتمل تھا پھر یہ معلوم ہوا کہ اس کے حصص نفی کے برابر تھے۔ اور اس نے کوئی
تنخواہ قطعاً وصول نہ کی تھی۔ اس نے اپنے ذاتی عمل اور اپنی مرضی سے ان چیزوں کو قربان کر
دیا تھا۔ اس نے کہا کہ میں اپنا کام کام کیلئے کرونگا۔ روپیہ کا اس کے ساتھ کوئی
تعلق نہ ہوگا۔ ان دونو آدمیوں نے روپیہ کو ایک طرف رکھا یا یہ کہو کہ اس سے انکار کر دیا
کیونکہ انہوں نے اس گہری حقیقت کو جان لیا کہ اصلی آزادی صرف آسودگی اور خدمت
سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ وہ راز ہے۔ جسے موجودہ زمانہ آہستہ آہستہ معلوم کرتا جا رہا ہے۔
یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ کسان کو کسی قسم کی بھی تعلیم دینا غیر ضروری ہے۔ اور یہ کہ اس
کا مستقبل قدرتی قوتوں کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیئے۔ یہ بات یقیناً مغرب میں انیسویں
صدی کے نظریئے کے مطابق ہوگی۔ لیکن جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا ہے۔ بیسویں صدی
میں لوگوں نے مختلف طریق سے غور کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہندوستان میں ہم بھی
مختلف طور سے سوچ سکتے ہیں۔ کیونکہ اقتصادیت کا ایک ایسا طریق جس سے مذہب
نے منہ پھیر لیا ہے۔ غالباً ہندوستانی دیہاتی کے لئے موزوں نہیں ہے۔ مسٹر
سی۔ ایف۔ اینڈریوز لکھتے ہیں۔ کہ میں متواتر ہندوستان کے دیہات میں ایک اجنبی

اور نووارد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک واقف کار کی طرح زندگی بسر کرتا رہا ہوں۔ اس طرح سے مجھے نہایت اچھی طرح یہ معلوم ہوا ہے۔ کہ معاشرت کے ہر جزو میں ہندو مذہب نے کس قدر گہری جگہ بنائی ہے۔ اور بڑی حد تک یہی بات پنجاب کے دیہاتی پر بھی صادق آتی ہے۔ ان لوگوں میں سے جو انہیں خوب جانتے ہیں۔ ایک شخص جو ہندوستانی ہے۔ مجھے ان الفاظ میں لکھتا ہے۔ جتنا تم لوگوں سے اس امر کے متعلق گفتگو کرو کہ مذہب کا زندگی میں کیا مرتبہ ہے۔ اتنا ہی وہ سختی سے اس خیال کے حامی ہوتے ہیں۔ کہ یہ زندگی کا اصل جزو ہے۔ ان کے لئے کوئی چیز جو مذہب سے علیحدہ ہے۔ نہ صرف ایک ایسی شے ہے۔ جس کا مذہب سے تعلق نہیں بلکہ ایسی ہے جو لامذہبی پر مبنی ہے۔ وہی شخص یہ بیان کرتا ہے۔ کہ میں نے سمجھدار دیہاتیوں کے ساتھ مباحثہ کر کے یہ بات معلوم کی ہے۔ کہ پرانے معیار زندگی میں ترمیم کرنے کو عام طور پر ترقی قرار دینے کی بجائے گر جانے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ کہ وہ ہندو جو گائیں فروخت کرتا ہے۔ وہ سکھ جو تمباکو کی کاشت کرتا ہے۔ اور وہ مسلمان جو سود لیتا ہے۔ اکثر اس بات کو جرم سمجھتا ہے۔ اور اسی بات نے اس کے ایک مسلمان دوست کو یہ کہنے پر مجبور کیا تھا کہ اگرچہ روپیہ ادھار دینے سے میری زندگی آسودہ اور مطمئن ہو گئی ہے۔ لیکن میں اپنے دل میں یہ محسوس کرتا ہوں۔ کہ میں نے کوئی ایسی بات کی ہے۔ جو انسانیت سے بعید ہے۔ جب ضمیر اور مادی فوائد کی چپقلش ہو جاتی ہے۔ تو انسان خود خطرے میں پڑ کر آخر الذکر کی پیروی کرتا ہے۔ اور یہ دیکھنے کے لئے زیادہ دور حانی بصیرت کی ضرورت نہیں کہ وہ لوگ جو اپنے مویشیوں کو مکاری سے فروخت کرتے ہیں۔ جب کہ ہم نے انہیں گوڑگاؤں میں کرتے ہوئے دیکھا اپنے آپ کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک عقلمند آدمی کو جب وہ اس قسم کی کشمکش و پیچ میں پڑ جائے۔ سوچنا چاہیئے کہ جو تعلیم اسے بطور مذہب دی گئی ہے۔ آیا وہ واقعی مذہبی ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہ کیا بعض اوقات جاندار کو زندہ رکھنے کی نسبت ہلاک کر دینا زیادہ پُررحم نہیں ہوتا آیا قصاب کے چھرے کا خیال رکھے بغیر گائے کی نسل اور اس کی دودھ دینے کی استعداد کو ترقی دے کر اس کے مفاد کا بہترین خیال نہیں رکھا جائیگا اور آیا سود اور ناجائز روپے میں فرق نہیں کرنا چاہیئے۔

پس خواہ اور کہیں کچھ ہی صورت کیوں نہ ہو ہندوستان میں اقتصادیت اور مذہب

کو بالائے طاق رکھنا یقینی طور پر مضر ہے۔ کیونکہ کاشتکاری کا مرتبہ معاش پیدا کرنے کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ یہ زندگی کا ایک ایسا طریقہ ہے۔ جو روح اور دماغ دونو پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ اور اگر مذہب اور اقتصادیت کو مربوط کر دیا جائے۔ تو کیا یہ آسودگی اور خدمت کی تعلیم کی نسبت جسمیں نئی اور پرانی تہذیب ملا جلا کر ایک کر دی گئی ہے۔ کسی اور طریق سے بہتر طور پر ہو سکتا ہے۔ اگر میں ایک ماہر اقتصادیت کی نسبت کسان کی زندگی کے اُس پہلو پر زیادہ زور دیتا رہا ہوں۔ تو میں عذر کے طور پر لشپ بر کلے صاحب کا یہ قول پیش کرتا ہوں کہ خواہ دنیا کچھ بھی سوچے وہ شخص جس نے خدا انسانی دل و دماغ اور سب سے بڑی نیکی کے متعلق غور نہیں کیا ممکن ہے کامیاب زمینی کیڑا بن جائے لیکن وطن دوستی اور سیاست دانی کے حیثیت سے وہ بلاشبہ فرو تر حیثیت کا انسان متصور ہوگا۔

باہتمام ملک فیروزالدین مینیجر کوآپریٹو سٹیم پرنٹنگ پریس وطن بلڈنگ لاہور میں چھپی۔ اور دفتر پنجاب کوآپریٹو یونین لاہور سے شائع ہوئی۔

الحمد للہ کاتب بقلم خود